خاص نمبر

دُنیا کے قیدی

اشتیاق احمد

WWW.PAKISTANIPOINT.COM

بسم اللہ الرحمن الرحیم

محمود، فاروق، فرزانہ، انسپکٹر جمشید
آفتاب، آصف، فرحت، انسپکٹر کامران مرزا
اور شوکی برادرز کی مشترکہ مہم

سیریز 9

خاص نمبر

دنیا کے قیدی

اشتیاق احمد

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

ناشر : طاہر ایس ملک
تزئین : محمّد سعید نامدار
سرورق : انداز

اس ناول کے تمام واقعات، مقامات اور کردار
فرضی ہیں۔ کسی قسم کی مشابہت یا مطابقت محض
اتفاقی امر ہوگی جس کے لیے مصنّف یا پبلشر
ذمہ دار نہ ہوں گے۔

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

طاہر ایس ملک
نے (صفدر علی) لال عبدالرشید پرنٹرز، لاہور
سے چھپوا کر
انداز پبلی کیشنز (مطبوعاتِ اشتیاق) لاہور
سے شائع کیا۔

قیمت : [redacted] روپے

انداز پبلی کیشنز
سیکنڈ فلور، میاں مارکیٹ، غزنی سٹریٹ
اُردو بازار۔ لاہور۔

ANDAZ PUBLICATIONS

مطبوعاتِ اشتیاق
۹/۱۲ نصیر آباد، مسلم پورہ، سانڈہ کلاں لاہور
فون : ۷۲۴۶۳۵۶ — ۷۱۱۲۹۶۹۔

حدیث شریف

حضرت عبداللہؓ بن مسعود سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
جنت میں ایسا شخص داخل نہیں ہوگا جس کے دل میں ذرہ برابر بھی غرور و تکبر ہوگا۔۔۔ ایک آدمی نے دریافت کیا' انسان پسند کرتا ہے' اس کا کپڑا اچھا ہو' اس کے جوتے اچھے ہوں۔۔۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا' اللہ جمیل ہے جمال کو پسند کرتا ہے۔۔۔ تکبر اترانے اور لوگوں کو حقیر سمجھنے کا نام ہے۔

تشریح: جائز حدود میں رہتے ہوئے اگر کوئی شخص اپنی حیثیت کے مطابق لباس اور رہائش میں زیب و زینت اختیار کرتا ہے تو اس سے اس پر غرور کا الزام نہیں لگایا جاسکتا۔ غرور تو یہ ہے کہ لذتوں اور عیش و عشرت میں آدمی اس قدر ڈوب جائے کہ اللہ کے حقوق ادا نہ ہوسکیں اور نہ بندوں کے حقوق کی پرواہ رہے۔ (صحیح مسلم' مشکوۃ)

○

ابوالاحوصؓ سے روایت ہے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میرا لباس بہت ہی معمولی تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا: تمہارے پاس مال ہے' میں نے جواب دیا' ہاں۔۔۔ آپ نے فرمایا: کس قسم کا مال ہے؟ میں نے عرض کیا' اللہ تعالیٰ نے مجھے ہر قسم کے مال سے نوازا ہے۔ اونٹ' گائے' گھوڑے اور غلام سبھی کچھ میرے پاس موجود ہے۔ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب اللہ تعالیٰ نے تمہیں مال و دولت سے نوازا ہے تو اس کی نعمت و کرم فرمائی کا نشان بھی تو بظاہر کچھ نظر آنا چاہئے۔

تشریح: اس حدیث میں کنجوسی سے منع فرمایا گیا ہے' کیونکہ کنجوسی کفران نعمت کا باعث بنتی ہے' لیکن اس کے ساتھ ہی آدمی کو نعمت کے اظہار میں حد سے بڑھ نہیں جانا چاہئے' یعنی فضول خرچی سے بچنا بھی لازم ہے۔ (نسائی' مشکوۃ)

○

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
عطیہ (تحفہ وغیرہ) دے کر واپس لینے والے کی مثال اس کتے کی سی ہے جو قے کرکے چاٹ لیتا ہے۔۔۔ اس بارے میں اس سے بدتر مثال اور کیا ہوسکتی ہے۔

تشریح: یعنی دوسروں کو جب کوئی چیز دے دو تو پھر اسے واپس نہ لو۔ (مشکوۃ)

○

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
مومن وہ نہیں جو خود پیٹ بھر کر کھائے' حالانکہ پڑوس میں اس کا ہمسایہ بھوکا تڑپ رہا ہو۔ (مشکوۃ)

دو باتیں

السلام علیکم!

لاڑکانہ سے شیخ زاہد حسین کا ایک دردمندانہ خط موصول ہوا ہے۔ ایسے اور بھی لوگ ہوں گے' لہٰذا ان کی دلجوئی کے لیے پہلے خط نقل کرتا ہوں' لکھتے ہیں:

"محترم اشتیاق احمد' السلام علیکم! بہت دنوں کی بات ہے' جب میں آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا' تب سے آپ کے ناول پڑھ رہا ہوں۔ آپ کے ناولوں سے بہت کچھ سیکھ چکا ہوں۔ یوں سمجھیں کہ آپ کے ناول میرے ذہن کی رہنمائی کرتے تھے اور کر رہے ہیں۔ آج اللہ کی مہربانی سے ایم۔ اے کا طالب علم ہوں۔ بی کام کا امتحان پاس کیا ہوا ہے۔ ملازمت نہ ملنے کے سبب آج کل دکان کھولی ہے۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کی مہربانی اور آپ کی رہنمائی (بذریعہ کتب) کا نتیجہ ہے۔ ایک اہم مسئلے کے لئے آپ کو یہ خط لکھا ہے۔ میں آپ کو بزرگوں کی طرح سمجھتا ہوں۔ امید ہے' جواب ضرور دیں گے۔

عرض یہ ہے کہ ہم ذات کے شیخ ہیں۔ ہمارے بڑے شاید پردادا وغیرہ ہندو تھے۔ آج اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے ہم مسلمان ہیں' لیکن کچھ تعصب پرست لوگوں نے ہمارا جینا حرام کر دیا ہے۔ طعنہ یہ دیتے ہیں کہ تم ہندو ہو' جس سے بہت صدمہ ہوتا ہے۔ اب تو انہوں نے ہمارے خلاف کھلے عام یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ "شیخ بیٹا شیطان کا' ہندو نہ مسلمان کا"۔ یہ سن کر بہت دکھ اور صدمہ ہوتا ہے۔ آخر لوگ ہمیں ایسا کیوں سمجھتے ہیں' حتیٰ کہ کبھی کبھی دوست وغیرہ بھی یہ کہنے لگتے ہیں کہ "ارے تم تو شیخ ہو"۔

بڑے بھائی' خدارا میرا بلکہ ہمارا مسئلہ حل کر دیں' ورنہ ہم نفسیاتی مریض بن جائیں گے۔

"شیخ زاہد حسین' لاڑکانہ' سندھ"

خط آپ نے پڑھا' اب ایک واقعہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور کا سن لیں۔ ایک جنگ میں ایک مسلمان نے ایک کافر کو نیچے گرا لیا اور اسے قتل کرنے لگا' لیکن کافر نے اچانک کہہ دیا' لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ مسلمان نے کلمہ پڑھنے کے بعد بھی اسے قتل کر دیا۔ جب اس واقعے کا علم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس مسلمان پر ناراض ہوئے اور فرمایا' جب اس نے کلمہ پڑھ لیا تھا تو تم نے اسے کیوں قتل کیا۔ انہوں نے جواب دیا کہ میں نے خیال کیا' وہ موت کے خوف سے کلمہ پڑھ رہا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا' کیا تم نے اس کا دل چیر لیا تھا۔

اب ایک خاندان جو مسلمان ہو چکا۔ اسے ہم ہندو کہیں۔ یہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کی خلاف ورزی ہوگی اور قیامت کے دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ناراضی کا سبب بھی ہوگا۔ ایسے مسلمان بھائیوں کو تو گلے لگانے کا حکم ہے نہ کہ انہیں طعنہ دینے کا۔ آپ بھی اپنے آس پاس دیکھ لیں' آپ بھی تو کسی مسلمان کو کوئی دوسرا نام دے کر طعنہ نہیں دیتے۔

عام طور پر اب تک ہوتا یہ آیا ہے کہ جب بھی خاص نمبر کی دو باتیں لکھنے بیٹھا' سنجیدگی طاری ہو گئی اور دو باتیں بھی سنجیدگی کی لپیٹ میں آتی چلی گئیں۔ اس بار شروع سے یہ ٹھانے بیٹھا ہوں کہ سنجیدگی کو نزدیک نہیں آنے دوں گا۔ اگر آ بھی دھمکی تو کسی نہ کسی طرح پرے دھکیل دوں گا' لیکن یہ ضروری تو نہیں کہ انسان جو کچھ چاہے' وہ ہو بھی جائے' لہٰذا آیئے دیکھتے ہیں' میں اپنی کوشش میں

کس حد تک کامیاب رہتا ہوں اور سنجیدگی مجھے کس حد تک شکست دینے میں کامیابی حاصل کرتی ہے۔

اس مرتبہ خاص نمبر شروع کرنے سے پہلے سب سے خوف ناک، ہول ناک اور خطرناک بات یہ تھی کہ اس میں شوکی برادرز کو بھی شامل کرنا تھا کہ یہ میرے زیادہ تر پڑھنے والوں کی دلی خواہش تھی۔ میں اپنے قارئین کی دلی خواہش پر پورا نہ اتروں۔ یہ بھی ممکن نہیں تھا، ادھر شوکی برادرز کو شامل کرنا بھی "ثریا" ناممکن تھا۔ اس میں کئی عجیب و غریب پریشانیاں سامنے آ کر ڈٹ گئی تھیں اور کسی طرح ٹلنے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔۔۔ ایک تو یہ مصیبت کہ شوکی اپنی کہانی خود بیان کرتا چلا آیا تھا۔۔۔ دوسرے یہ کہ یہ لوگ لڑائی بھڑائی کے کاموں سے بالکل ناآشنا ہیں۔ اب ان کا گٹھ جوڑ ہوتا تو کیسے۔۔۔ اس طرح میں نے خود کو چکی کے دو پاٹوں کے درمیان گھرا ہوا پایا۔۔۔ یوں لگا جیسے دونوں پاٹ مجھے پیس ہی تو ڈالیں گے اور گھن کی طرح پیس کر گھن چکر بنا ڈالیں گے۔ مرتا کیا نہ کرتا، شوکی برادرز کے حصے کی کہانی شوکی کی زبانی کی بجائے اپنی زبانی لکھنا شروع کی اور اس طرح ناول شروع ہو سکا۔ الحمدللہ، ختم کرنے میں بھی کامیاب ہوگیا۔ اب رہا پسند ناپسند، اچھائی اور برائی کا سوال، انصاف، ناانصافی اور برابری کے سلوک کی بات، تو ان تمام باتوں پر رائے آپ دیں گے، میں تو بس اتنا کروں گا کہ ان آراء کو جمع کرتا رہوں گا اور آئندہ ناولوں میں شائع کر کے خود کو اور آپ کو آئینہ دکھا دوں گا۔

اب آپ کہیں گے، میں سنجیدگی سے واقعی پیچھا نہیں چھڑا سکا تو بات دراصل یہ ہے کہ اتنا لمبا خاص نمبر لکھ کر آدمی اچھا بھلا چوں چوں کا مربہ بن جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں، میں اس وقت آدمی کم اور مربہ زیادہ ہوں، لیکن منہ میں پانی بھر لانے کی ضرورت نہیں۔ یہ مربہ آپ کو راس نہیں آئے گا، آپ کے پیٹ میں خوب گڑبڑ مچائے گا اور آپ چوہے اور بلیاں دوڑتے محسوس کریں گے اور ہاں خاص نمبر کا نام دنیا کے قیدی بھی فاروق کی مہربانی کا نتیجہ ہے، سرورق کے بارے میں بھی رائے دیجئے گا۔ بہت سوچ بچار کی گئی ہے۔ میرا خیال ہے، دو باتیں کچھ تر ہو چلی ہیں۔ تر نوالہ نہ بنا لیجئے گا انہیں، لیکن نہیں، آپ میری کیا مانیں گے۔ دو باتیں کی تو بات ہی کیا ہے، آپ تو پورے ناول کو تر نوالہ بنا جائیں گے۔

ناول اگر ہر موڑ پر آپ کو چونکائے۔ آپ اگر روانی میں بہتے چلے جائیں اور روکے نہ رکیں، مہمات کا طوفان اگر آپ کو اپنی لپیٹ میں لے لے، سسپنس اور حیرت اگر آپ پر چھا جائے، جنگ کے بالکل انوکھے اور نئے انداز اگر آپ کو اچھل پڑنے پر مجبور کر دیں تو مجھے برا بھلا کہنا نہ شروع کر دیجئے گا، کیونکہ یہ سب تو آپ کی خواہشات کے احترام میں لکھتا ہوں۔ بھئی اب اگر میں بالکل پھس ناول لکھنے لگوں تو آپ تو مجھے لیں گے دونوں ہاتھوں اور ابھی میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں کہ آپ مجھے دونوں ہاتھوں لیں۔۔۔ دو باتیں پھر طویل ہو رہی ہیں۔ اس سے پہلے کہ ان پر شیطان کی آنت کا الزام عائد کیا جائے، میں ہی قلم کو روک لیتا ہوں، اس امید کے ساتھ کہ اس بار سنجیدگی کے ساتھ ساتھ کچھ غیر سنجیدہ باتیں بھی ہو گئی ہیں جو آپ کو مطمئن کرنے کا کام کر گزریں گی۔

اشتیاق احمد

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں، کار کشا، کارساز
علامہ اقبال

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

"ہو ہو ہو۔ ہا ہا ہا — ہی ہی ہی۔"

انہوں نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا اور اس عجیب و غریب آدمی کو دیکھ کر حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکے — جسم پر لباس تو بے ڈھنگا تھا ہی، اس کی شکل و صورت بھی ہونقوں کی سی تھی۔ لمبے کوٹ کے نیچے وہ چوڑے پائنچوں والی پتلون پہنے ہوئے تھا اور کوٹ کے نیچے قمیص دور دور تک نظر نہیں آ رہی تھی۔ ہاتھوں پر اتنے بال تھے کہ ریچھ نظر آ تا تھا۔ سر پر ایک ہیٹ تھا۔ آنکھوں میں ایک خوف ناک چمک تھی۔ ناک فدا سے لمبی اور چہرہ گزنائی لیے ہوئے تھا، لیکن ان سب سے زیادہ عجیب اور بھونڈی اس کی ہنسی تھی۔ انہوں نے اتنی عجیب ہنسی شاید ہی پہلے کبھی سُنی ہوگی۔ ہنسی روکنے کے بعد بھی اس نے کچھ نہ کہا تو شوکی تلملا اٹھا:

"آپ کی اس شاندار ہنسی کا مطلب؟" وہ تنک کر بولا۔

"بہت گہرا، بہت اہم۔" وہ پاگلوں کے سے انداز میں بولا۔ ابھی تک اس نے وہ دروازہ عبور نہیں کیا تھا، چوکھٹ سے لگا کھڑا تھا —

"کتنا، ایک کنویں جتنا یا اس سے بھی زیادہ۔" آفتاب نے مذاق اڑانے والے لہجے میں کہا۔

"کنویں کی بات نہ کرو۔ میں کنویں کا مینڈک نہیں، سمندر کی گہرائی کی بات کرو۔" اس نے بُرا سا بنایا۔

"تو آپ کی اس ہنسی کا مطلب سمندر کی گہرائی سے بھی گہرا ہے۔" اشفاق جل کر بولا۔

"ہاں، بالکل یہی بات ہے۔" اس نے پرغرور لہجے میں کہا۔

"ہم سمجھے نہیں، آخر آپ چاہتے کیا ہیں؟"

"یہ سمجھانے کے لیے مجھے اندر آنا ہوگا —" اس نے بھاڑ سا منہ کھولا — ہوگا کہنے کے بعد اس نے منہ بند کرنے کی کوشش نہیں کی۔

"اور ہم نے آپ کو اندر آنے سے روکا نہیں۔" اخلاق نے اسے گھورا —

"تم لوگ مجھے روک بھی نہیں سکتے۔" یہ کہہ کر وہ اندر داخل ہو گیا۔ انہوں نے دیکھا، وہ لمبے سیاہ بوٹ پہنے ہوئے تھا۔ اس نے انتہائی پھوہڑپن سے خالی کرسی گھسیٹی اور اس پر بیٹھ گیا۔ چند سکینڈ تک انہیں گھورتا رہا، پھر بولا:

"میرے دوست نے ٹھیک ہی کہا تھا۔"

"کیا کہا تھا آپ کے دوست نے۔" شوکی حیران ہو کر بولا۔

"یہ کہ تم لوگ بہت تیز طرار اور ذہین ہو اور میرا کام ضرور کر سکو گے۔"

"پتا نہیں، ہم کس حد تک تیز طرار اور ذہین ہیں اور آپ کا کام کر بھی سکیں گے یا نہیں؛ بہر حال آپ کام بتائیے، لیکن نہیں، کام سے پہلے تو آپ یہ بتائیے کہ آپ کا وہ دوست کون ہے، جس نے آپ کو ہمارے بارے میں بتایا تھا؟"

"اس کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں۔ میں نے اپنی پریشانی کا اظہار کیا اور اس نے تم لوگوں سے ملنے کا مشورہ دے دیا اور بس —"

اسے درمیان میں زگمسیٹو:

"جی نہیں، آپ کو ان کا نام بتانا ہوگا۔"

"خیر کوئی بات نہیں، بتائے دیتا ہوں۔ اس کا نام گھوڑے شاہ ہے۔ وہ ایک بزرگ ہے۔ جھاڑ پھونک کا کام کرتا ہے۔ میں بھی اپنی پریشانی لے کر اس کے پاس گیا تھا، لیکن اس نے جھاڑ پھونک کی بجائے مجھے تم لوگوں کے پاس بھیج دیا اور میں چلا آیا۔"

"لیکن آپ تو کہہ رہے تھے کہ وہ آپ کا دوست ہے۔"

"اگر کوئی شخص میری مدد کرتا ہے تو میں اسے دوست ہی کہا کرتا ہوں۔ اگر تم لوگوں نے میرا کام کیا تو میں تمہیں بھی اپنا دوست خیال کروں گا۔"

"حیرت ہے، ایک جھاڑ پھونک کرنے والے نے آپ کو ہمارے پاس کیوں بھیج دیا۔" اخلاق کے لہجے میں واقعی حیرت تھی۔

"پتا نہیں، میں یہاں نیا ہوں — ایک طرح سے اس ملک میں اجنبی ہوں — کسی نہ کسی سے تو رہنمائی لینا پڑے گی مجھے۔"

"ہوں، ٹھیک ہے — خیر اب آپ بتا سکتے ہیں، معاملہ کیا ہے — آپ کیوں پریشان ہیں۔"

اس نے منہ سے کوئی لفظ نہ کہا — کوٹ کی جیبوں میں دونوں ہاتھ ڈالے اور جب اس کے ہاتھ باہر نکلے اور دونوں میں سرخ سرخ نوٹوں کی گڈیاں تھیں۔ گڈیاں اس نے میز پر رکھ دیں۔ اس کے ہاتھ ایک بار پھر کوٹ کی جیب میں گھسے اور اس بار پھر گڈیاں باہر نکلیں۔ اس نے انہیں پہلی گڈیوں کے اوپر رکھ دیا — تیسری بار اس نے اندرونی جیبوں میں ہاتھ ڈالے — چوتھی بار بھی یہی کیا۔ یہاں تک کہ ان کے سامنے میز پر گڈیوں کے چھوٹے چھوٹے دو مینار بن گئے۔

"ان میناروں کو دیکھ رہے ہو — میرا مطلب ہے، دولت کے

Pakistanipoint Waqar Azeem

میناروں کو۔"

"آپ نے چونکہ ہمیں آنکھیں بند کرنے کی ہدایت نہیں کی تھی، اس لیے دیکھنے پر مجبور ہیں" آفتاب بولا۔

"شکریہ، میرا بھی یہی خیال ہے کہ تم لوگوں کی آنکھیں کھلی ہیں اور نوٹوں کے ان میناروں کو دیکھ کر تو اور بھی کھل گئی ہوں گی" اس نے جلدی جلدی کہا۔

"جی نہیں، عام حالات جتنی ہی کھلی ہوئی ہیں" شوکی بولا۔

"خیر، یہ سب گڈیاں آپ کی ہو سکتی ہیں، اگر آپ میرا ایک کام کر دیں"

"دیکھیے جناب ....." شوکی نے کہنا شروع کیا ہی تھا کہ اندرونی دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ چونک اٹھے، پھر شوکی کرسی سے اٹھا اور اندرونی دروازے پر پہنچا — وہاں ان کی امی موجود تھیں —

"جی فرمایئے امی جان" اس نے با ادب ہو کر کہا۔

"شش، شوکی — م، میری بائیں آنکھ ....." انہوں نے گھبرا کر کہا۔

"کک کیا ہوا، آپ کی بائیں آنکھ کو؟" شوکی بوکھلا اٹھا —

"یہ — یہ آج پھر بُری طرح پھڑک رہی ہے — آج کوئی کیس نہ لینا شوکی"

"امی جان، آپ کو معلوم ہے، اس وقت ہماری میز پر سرخ نوٹوں کی کتنی گڈیاں رکھی ہیں"

"کک کتنی؟" وہ ہکلائیں —

"تقریباً دس! گویا ایک لاکھ روپے میز پر موجود ہیں۔ ہمارے مؤکل یہ سب ہمیں دینے کے لیے تیار ہیں، اگر ہم ان کی الجھن دور کر دیں۔ آپ ہی بتائیں ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ کیا انہیں مایوس لوٹا دیں۔ گھر آئی دولت کو ٹھکرا دیں"

"یہ، یہ سب میں نہیں جانتی شوکی — میں تو صرف یہ جانتی ہوں کہ میری بائیں آنکھ پھڑک رہی ہے اور اس کا پھڑکنا بہت خطرناک ہے۔ پہلے بھی تم لوگوں کو تجربہ ہو چکا ہے"

"جی ہاں، یہ ٹھیک ہے — آپ فرمائیں، ہمیں کیا کرنا چاہیے"

"انہیں آج کی بجائے کل بلا لو" وہ بولیں —

"اچھا — آپ آرام کریں، ہم ان سے بات کرتے ہیں"

اسی وقت مشتاق احمد خان کے قدموں کی آواز سنائی دی۔

"یہ کیا کھسر پھسر ہو رہی ہے بھئی؟"

"جج جی، وہ امی جان کی بائیں آنکھ" شوکی ہکلایا۔

"کیا ہوا بائیں آنکھ کو — اور تم نے فوراً ڈاکٹر کو فون کیوں نہیں کیا — ٹھہرو، پہلے میں ڈاکٹر کو فون کر دوں، پھر باقی بات سنوں گا" انہوں نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا اور جلدی سے مڑے:

"اوہ — ابا جان، ڈاکٹر صاحب کو فون کرنے کی کوئی ضرورت نہیں" شوکی نے جلدی سے کہا۔

"کیوں ضرورت نہیں — یہ تمہاری امی جان کی بائیں آنکھ کا معاملہ ہے، کوئی معمولی بات نہیں —" یہ کہہ کر وہ چند قدم اور اندر کی طرف بڑھ گئے۔

"آپ سنیے تو سہی ابا جان، بات صرف اتنی سی ہے کہ امی جان کی بائیں آنکھ آج پھر پھڑک رہی ہے اور یہ چاہتی ہیں کہ آج ہم کوئی کیس نہ لیں"

"لا حول ولا قوۃ، تو بات صرف اتنی سی ہے۔ تم نے مجھے بلا وجہ ہی ڈرا دیا اور میں تمہیں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ اس قسم کے وہموں میں نہ پڑا کرو۔ یہ ہندووانہ ذہن کی باتیں ہیں۔ مسلمان تو بس ایک خدا پر ایمان رکھتا ہے، اس قسم کی فضول باتوں پر نہیں" انہوں نے بُرا سا منہ بنایا —

"تو پھر آپ امی جان کو اندر لے جایئے، تاکہ ہم اپنے مؤکل سے بات چیت کر لیں"

"ٹھیک ہے، تم ضرور ایسا کرو — بے فکر ہو کر معاملے کی بات کرو" یہ کہہ کر انہوں نے اپنی بیگم کا ہاتھ پکڑا اور بولے:

"آؤ بیگم چلیں، اب تمہاری بائیں آنکھ کو واقعی کسی ڈاکٹر کو دکھانا ہوگا، یہ بلا وجہ واقعی نہیں پھڑکتی ہوگی۔ اس کے عضلات میں ضرور کوئی نقص واقع ہو گیا ہے"

"لیجیے، اب آنکھ کے عضلات میں نقص واقع ہو گیا۔ میں کہتی ہوں، یہ پھڑکنا دوسرا پھڑکنا ہے"

"دوسرا ہو یا تیسرا — آنکھ کا معائنہ ضروری ہے"

شوکی نے مسکراتے ہوئے دروازہ بند کر دیا اور کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا:

"جی فرمایئے، اور ہاں، میں آپ پر یہ بات واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ ہم لالچی نہیں ہیں۔ ہمیں ایک لاکھ روپے کا لالچ دینے کی کوئی ضرورت نہیں — اگر کیس ہمارے حل کرنے کے قابل ہوا تو ہم اس سے بہت کم معاوضہ لے کر آپ کا کام کر دیں گے — آپ تفصیل بتایئے —"

"میرا چھوٹا بھائی..... لیکن نہیں، پہلے تو مجھے اپنا نام بتانا چاہیے۔ میں برمن ہوں، میرے چھوٹے بھائی کا نام سارمن ہے۔ مجھے سارمن سے بہت محبت ہے۔ ایک سال پہلے اس نے اس ملک کی سیر کی خواہش ظاہر کی۔ میں نے انتظامات کر دیے اور وہ سیر کی غرض سے یہاں آ گیا — صرف ایک ماہ یہاں گزارنا تھا۔ ایک ماہ کے بعد میرے پاس واپس آنا تھا، لیکن ایک سال گزرنے کو آیا ہے، وہ واپس نہیں لوٹا — تنگ آ کر میں اس کی تلاش میں یہاں آ گیا — ایک ہفتہ ہو گیا، مجھے ٹھوکریں کھاتے، تب کہیں جا کر بھائی کے بارے میں معلوم ہوا۔ میں اس سے جا کر ملا، لیکن اس نے مجھے پہچاننے سے انکار کر دیا — اس کا کہنا ہے کہ وہ مجھے بالکل نہیں جانتا"

"اوہ" ان کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"ہاں، میں نے اسے ہر ہر طرح ایک ایک بات یاد دلانے کی کوشش کی، مگر اس نے ایک ہی جواب دیا، یہ کہ وہ مجھے نہیں جانتا — اس کی طرف سے مایوس ہو کر میں شہر میں بھٹکتا پھر رہا تھا کہ ایک جگہ

گھوڑے شاہ کا ڈیرا لکھا نظر آیا ــــ لوگوں سے اس کے بارے میں پوچھا تو پتا چلا، وہ ایک اللہ والے بزرگ ہیں اور لوگوں کو مشکلات سے نجات دیتے ہیں۔ میں بھی چونکہ مشکل میں گھرا ہوا تھا، اس لیے فوراً ان کی خدمت میں حاضر ہو گیا ــــ وہ بہت شفقت سے پیش آئے ــــ میں نے اپنی پریشانی کہہ سنائی ــــ انہوں نے مجھے جھاڑا پھونکا۔ ایک تعویز دیا اور ساتھ (ہی) تم لوگوں سے ملنے کا مشورہ دیا، سو میں تم لوگوں کے پاس آ گیا، یہ ہے کہانی ــــ"

"آپ کے بھائی سارمن کیا اسی شہر میں رہتے ہیں؟" آفتاب نے بے چین ہو کر پوچھا۔

"ہاں، وہ یہاں ایک بہت بڑے آدمی کا اسسٹنٹ بن کر زندگی گزار رہا ہے ــــ یہ بات بھی مجھے معلوم ہوئی ہے کہ وہ اس بڑے آدمی کے ساتھ چھ ماہ کے لیے کہیں چلا گیا تھا۔ ابھی ایک ماہ پہلے ہی واپس لوٹا ہے۔ ہو سکتا ہے، مجھے نہ پہچاننے میں چھ ماہ کی غیر حاضری کا کوئی تعلق ہو، لہذا آپ کو یہ بھی معلوم کرنا چاہیے کہ وہ کہاں گئے تھے اور یہ بھی کہ میرا بھائی مجھے کیوں نہیں پہچانتا۔"

"یہ کام کچھ مشکل نہیں، ہم نہایت آسانی سے کر سکیں گے، لہذا اس کام کے لیے ہم ایک لاکھ روپے معاوضہ ہرگز نہیں لے سکتے۔ آپ ایسا کریں کہ میز پر پانچ ہزار روپے رہنے دیں۔ باقی اٹھا کر واپس اپنی جیب میں رکھ لیں اور ہاں، اتنی دولت آپ ساتھ نہ لیے پھرا کریں۔ یہاں کے جیب کترے بہت ماہر ہیں، کہیں آپ کی جیبیں صاف نہ کر دیں ــــ" شوکی نے جلدی جلدی کہا۔

"صرف، پانچ ہزار روپے ــــ" اس کے لہجے میں بلا کی حیرت تھی ــــ

"ہاں، صرف پانچ ہزار روپے ــــ ہم اتنے سے کام کے اس سے زیادہ پیسے لینا ناجائز خیال کرتے ہیں ــــ اب آپ ہمیں اس بڑے آدمی کا نام پتا بتائیں، جس کے ساتھ آپ کا بھائی بطور اسسٹنٹ رہ رہا ہے۔"

"ہاں ضرور، نام نوٹ کریں ــــ لیکن اس بات کا خیال رہے کہ آپ ان کی چھ ماہ کی غیر حاضری کی تفصیلات کے بارے میں ضرور معلوم کریں گے ــــ اصل راز مجھے اسی بات میں نظر آتا ہے ــــ دوسرے یہ کہ میرا بھائی بہت چڑ گیا ہے ــــ تم اس پر یہ بھی ظاہر نہ کرنا کہ میرے بھیجے ہوئے ہو، ورنہ شاید کچھ بھی معلوم نہیں کر سکو گے ــــ" اس نے نوٹوں کی گڈیاں پھر جیبوں میں رکھتے ہوئے کہا۔

"آپ فکر نہ کریں، ہم اپنا کام کرنا خوب جانتے ہیں ــــ نام پتا بتائیے ــــ"

"اس بڑے آدمی کا نام پروفیسر ایم اے خان ہے ــــ شہر کے جنوبی سرے پر اس کی رہائش ہے ــــ اس علاقے میں سب سے اونچی رہائش اسی کی ہے۔ تم لوگوں کو تلاش کرنے میں دشواری نہیں ہوگی۔"

"آفتاب، نام اور پتا نوٹ کر لو۔" شوکی نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"جی بہتر بھائی جان، ابھی لیجیے ــــ" اس نے کہا اور نوٹ کرنے لگا۔

"میں ایک بار پھر کہے دیتا ہوں ــــ بہت ہوشیاری کی ضرورت ہے ــــ میرے بھائی کو اس بات کی ہوا بھی نہ لگے کہ تم لوگ میرے بھیجے ہوئے ہو اور نہ پروفیسر ایم اے خان کو اس بات کا احساس ہو، ورنہ ناکام ہو جاؤ گے ــــ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میرا بھائی سارمن پروفیسر کے پاس کسی اور نام سے رہ رہا ہو ــــ"

"آپ فکر نہ کریں، ہم بالکل مختلف انداز میں تفتیش کریں گے اور معلومات حاصل کرنے کے لیے خاص طریقے اپنائیں گے ــــ یہ دونوں حضرات آپ کے بارے میں خیال تک دل میں نہیں لا سکیں گے۔" اشفاق نے جلدی جلدی کہا۔

"بہت بہت شکریہ، اب میں آپ کے پاس کب حاضر ہوں؟" برمن بولا۔

"کل اسی وقت ــــ" شوکی بولا اور اٹھ کھڑا ہوا ــــ

"مجھے تو کوئی چکر معلوم ہوتا ہے ــــ" آفتاب نے اس کے جانے کے بعد کہا۔

"ہو گا، ہمیں کیا ــــ" شوکی نے کندھے اچکائے۔

"ادھر امی جان کی بائیں آنکھ پھڑک رہی ہے ــــ" اخلاق نے فکرمندانہ لہجے میں کہا ــــ

"دیکھا جائے گا، آؤ چلیں ــــ ارشد، اگر ہمیں دیر ہو جائے تو تم دفتر بند کر کے چلے جانا اور ہاں، آج کی تاریخ میں ہم کوئی اور کیس نہیں لیں گے۔"

"جی بہتر ــــ" اس نے کہا۔

"ایک بات سمجھ میں نہیں آئی ــــ شہر کے جنوبی سرے کی طرف ہم کئی بار گئے ہیں، لیکن یہ نام اس طرف کبھی سننے میں نہیں آیا ــــ" اشفاق بولا۔

"تو ہم نام سننے کے سلسلے میں کب گئے وہاں؟" اخلاق جل کر بولا۔

"بھئی، اس میں لڑنے جھگڑنے یا جلنے بھننے کی کیا ضرورت ہے۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا، ابھی چل کر دیکھ لیتے ہیں ــــ"

جلد ہی وہ ایک ٹیکسی میں بیٹھے جنوبی سمت میں چلے جا رہے تھے اور جب شہری حدود ختم ہونے کے قریب تھی، تو ڈرائیور نے تنگ آ کر کہا۔

"کہاں اترنا ہے جناب؟"

"بھئی یہاں سب سے اونچی جو عمارت ہے، اس کے سامنے اتار دیں ــــ" شوکی نے نرم آواز میں کہا ــــ

"اس وقت آپ سب سے اونچی عمارت کے سامنے سے ہی گزر رہے ہیں۔" ڈرائیور بولا اور ٹیکسی روک لی ــــ

"اوہو اچھا، پہلے کیوں نہیں بتایا تھا؟" شوکی خوش ہو کر بولا۔

"پہلے کس طرح بتاتا، پہنچا ہی اب ہوں یہاں۔" اس نے کہا۔

وہ ٹیکسی سے اترے، بل ادا کیا اور عمارت کی طرف مڑے۔ دوسرے ہی لمحے وہ حیران رہ گئے۔ یہ عمارت تو ان کی جانی پہچانی تھی۔ عمارت کے دروازے پر پروفیسر عقلان لکھا تھا۔

☆ ☆ ☆

انہوں نے پریشانی کے عالم میں چاروں طرف نظریں دوڑائیں، لیکن آس پاس عمارتیں ہی چند تھیں اور تھیں بھی پروفیسر عقلان سے بہت نیچی — پروفیسر عقلان ملک کے مشہور و معروف سائنس دان تھے۔ ان سے اچھی طرح واقف تھے اور یہ اتفاق بہت عجیب تھا کہ ان کے مؤکل نے انہیں ان کے پاس بھیج دیا تھا۔ نام کی تختی پر نظر ڈالی تو ان کا پورا نام پروفیسر محمد عقلان خان لکھا نظر آیا؛ گویا پروفیسر ایم اے خان یہی تھے —

"اب کیا کریں؟" شوکی نے الجھن کے عالم میں کہا۔

"کرنا کیا ہے، بسم اللہ کریں یعنی گھنٹی بجائیں۔ اب ہم پیچھے تو ہٹنے سے رہے۔ یہ بھی تو معلوم کرنا ہے کہ برمن کے بھائی کا چکر کیا ہے۔ پروفیسر صاحب ایسے آدمی تو ہرگز نہیں ہیں جو کسی کو زبردستی اپنا اسسٹنٹ بنائے رکھیں — معاملہ کچھ الجھا ہوا معلوم ہوتا ہے اور پروفیسر صاحب سے ملاقات کیے بغیر سلجھ نہیں سکتا۔" آفتاب نے جلدی جلدی کہا۔

"ہوں، ٹھیک ہے۔" شوکی نے کہا اور آگے بڑھ کر دروازے کی گھنٹی بجا دی۔ جلد ہی ملازم کی صورت نظر آئی:

"اوہو، آپ لوگ ہیں — آئیے، تشریف لائیے۔"

"پروفیسر صاحب ہیں؟"

"جی ہاں، بالکل ہیں اور اس وقت بالکل فارغ بھی ہیں۔" ملازم نے چہکتی آواز میں کہا۔

"اور ان کے اسسٹنٹ سارمن بھی ہیں؟"

"اسسٹنٹ سارمن، آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے شاید۔ ان کے اسسٹنٹ کا نام سارمن نہیں، عبدالقدوس ہے۔" اس نے کہا۔

اور انہیں یاد آگیا، برمن نے کہا تھا، شاید اس کے بھائی نے اپنا نام بھی تبدیل کر لیا ہو! چنانچہ شوکی نے فوراً کہا:

"ہاں واقعی، نام کے بارے میں مجھ سے بھول ہوئی۔ ہاں تو مسٹر عبدالقدوس بھی تشریف رکھتے ہیں؟"

"جی ہاں، وہ بھی موجود ہیں۔"

"بہت خوب۔" شوکی نے مطمئن ہو کر کہا اور چاروں اندر داخل ہوئے۔ ملازم نے انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھایا، پھر خود چلا گیا۔ جلد ہی قدموں کی چاپ سنائی دی اور پھر پروفیسر عقلان کی چہکتی آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی:

"بھئی شوکی برادران، یہ تم لوگ ہو۔ بہت خوشی ہوئی تمہیں دیکھ کر۔ چکر لگانے کا خیال بہت دنوں بعد آیا۔"

"جی بس کیا بتائیں، آپ بھی تو کئی ماہ کہیں باہر رہے ہیں۔" شوکی نے سرسری لہجے میں کہا۔

"ہاں، یہ بھی ٹھیک ہے۔" انہوں نے فوراً کہا۔

"ہم حیران ہوتے رہے کہ آپ کہاں چلے گئے ہیں اور یہی الجھن آج ہمیں آپ کے در پر لے آئی ہے۔" آفتاب نے جوش کے عالم میں کہا۔

"اوہو، تو تم لوگ یہ معلوم کرنے آئے ہو کہ میں کہاں گیا تھا۔" انہوں نے چونک کر کہا۔

"جی، جی ہاں، آپ تو جانتے ہی ہیں، ہم میں تجسس کا مادہ کس قدر زیادہ ہے۔ بس یہ مادہ چین نہیں لینے دیتا۔"

"لیکن شوکی، تمہیں شاید یہ سن کر افسوس ہو اور رنج بھی ہو کہ میں تمہیں اس سلسلے میں ایک لفظ بھی نہیں بتا سکتا۔" انہوں نے سرد آواز میں کہا — لہجے سے ساری شفقت، محبت اور مروت یک لخت اڑن چھو ہو گئی —

"ج ج، جی — کیا مطلب؟" شوکی ہکلایا۔

"کوئی اور بات کرو شوکی — میرے ساتھ شام کی چائے پیو — ادھر ادھر کی باتیں کرو — اس بات کو چھوڑ دو۔"

"جی بہتر — اگر آپ بتانا پسند نہیں کرتے تو نہ سہی — اور سنائیے، آج کل آپ کے اسسٹنٹ کون ہیں؟"

"کیا، کیوں — یہ کیوں پوچھا تم نے۔" وہ چونک کر بولے۔

"جی، بس ایسے ہی — اب آئے ہیں تو ان سے بھی مل لیں گے۔"

"ہاں ضرور، کیوں نہیں — ان کا نام عبدالقدوس ہے۔ وہ اس وقت تجربہ گاہ میں ہیں — چائے میں ابھی کچھ دیر ہے۔ میں بھی ایک کتاب کا باب چائے سے پہلے ختم کرنے کے موڈ میں ہوں، لہذا تم اتنی دیر میں ان سے مل آؤ، پھر ہم ایک ساتھ چائے پئیں گے۔"

"جی بہت بہت شکریہ۔" شوکی نے خوش ہو کر کہا۔

"رحیم، انہیں عبدالقدوس کے پاس چھوڑ آؤ۔" انہوں نے اٹھتے ہوئے ملازم کو آواز دی۔ رحیم فوراً دروازے پر نمودار ہوا اور ان سے بولا:

"آئیے جناب۔"

وہ اس کے پیچھے چلتے تجربہ گاہ میں داخل ہوئے اور اندر بیٹھے اسسٹنٹ پر نظر پڑتے ہی چونک اٹھے — وہ کسی صورت بھی غیر ملکی نظر نہیں آرہے تھے۔

"ہیلو سارمن صاحب!" شوکی نے سرسراتی آواز میں کہا — پروفیسر صاحب کے نائب نے چونک کر ان کی طرف دیکھا، پھر حیرت زدہ لہجے میں بولا:

"سارمن — کیا یہ آپ نے میرا نام لیا — معاف کیجیے، آپ بھول رہے ہیں۔ یا پھر آپ کو میرا نام معلوم ہی نہیں ہے — مجھے عبدالقدوس کہتے ہیں۔"

"اوہو اچھا — کمال ہے — ایک صاحب ہیں، ان کا نام برمن ہے۔ ان کا کہنا ہے، آپ ان کے گمشدہ بھائی ہیں اور آپ کا نام سارمن ہے۔ وہ آپ کو تلاش کرتے ہوئے یہاں تک پہنچ گئے ہیں، لیکن آپ نے انہیں پہچاننے سے ہی انکار کر دیا — آخر یہ کیا معاملہ ہے محترمی عبدالقدوس صاحب" شوکی رکے بغیر کہتا چلا گیا۔ عبدالقدوس کی حیرت کا کیا پوچھنا۔

"مم، میرا بھائی — اور یہ آپ نے کیا کہا، میں ان کا گمشدہ بھائی ہوں — اُف خدا، یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں" اس نے پھاڑ کھانے والے انداز میں کہا۔

"وہی، جو انہوں نے بتایا — وہ ایک غیر ملکی ہیں، لیکن آپ تو مجھے غیر ملکی نظر نہیں آتے۔ کیوں بھئی، تم تینوں کا کیا خیال ہے" شوکی ان کی طرف مڑتے ہوئے بولا۔۔

"بالکل نہیں، یہ تو سو فیصدی ملکی نظر آتے ہیں" آفتاب نے فوراً کہا۔

"آپ لوگوں کی باتیں میرے پلے نہیں پڑ رہی ہیں۔ ویسے میں آپ کو پہچانتا ہوں۔ آپ شوکی برادرز ہیں، لیکن شوکی برادرز ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ دوسروں کو بوکھلاہٹوں میں مبتلا کرتے پھریں۔ میں اسی وقت پروفیسر صاحب کو بلا رہا ہوں" یہ کہتے ہی اس نے گھنٹی کا ایک بٹن دبا دیا —

"ارے ارے، یہ آپ کیا کر رہے ہیں" شوکی نے گھبرا کر کہا —

"ہو سکتا ہے، آپ لوگ نقلی شوکی برادرز ہوں" عبدالقدوس نے انہیں گھورتے ہوئے کہا۔

"نقلی شوکی برادرز، یہ کیسے ہو سکتا ہے" اشفاق نے گھبرا خود کو ٹٹولا —

"کیوں، ہو کیوں نہیں سکتا — آج کل جعل سازی عام ہے — ہر چیز کی نقل تیار کر لی جاتی ہے"

"اور برمن، یعنی آپ کے اس بھائی کا کہنا یہ بھی ہے کہ آپ اور پروفیسر تقریباً چھ ماہ تک غائب رہے ہیں۔ کیا درست نہیں" شوکی نے جیسے اس کا جملہ سنا ہی نہیں —

"درست ہے یا غلط، میں تمہاری کسی بات کا جواب نہیں دوں گا جب تک مجھے یہ یقین نہ ہو جائے کہ آپ اصلی شوکی برادرز ہیں یا نقلی" اس نے تلملا کر کہا۔

"ہمارے کارڈ دیکھ سکتے ہیں آپ" اخلاق جھنا کر بولا۔

"کارڈ نقلی بھی بن سکتے ہیں"

"تب پھر ہم اپنی شناخت کس طرح کروائیں" اشفاق نے مایوسانہ انداز میں کہا۔

"یہ تو پروفیسر صاحب ہی بتائیں گے — ان کے آنے تک مہربانی فرما کر خاموش رہیں۔ میرے دماغ کی چولیں نہ ہلائیں"

اس نے سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

"اب ہمیں کیا معلوم تھا، آپ کے دماغ میں چولیں بھی ہیں" آفتاب نے جلدی سے کہا —

"اُف، خدا کے لیے خاموش رہیں — آتے ہی مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ کتنی عجیب و غریب باتیں کر رہے ہیں آپ لوگ — آج تک اتنی عجیب باتیں کسی نے نہیں کی ہوں گی میرے سامنے"

"پھر تو آپ کو ہمارا شکریہ ادا کرنا چاہیے"

"اُف اُف" اس نے سر پیٹ لیا — اسی وقت پروفیسر عقلان اندر داخل ہوئے — اور اپنے نائب کو سر پیٹتے دیکھ کر حیرت زدہ انداز میں چلائے :

"ارے ارے، یہ تم کیا کر رہے ہو قدوس ؟"

"سر پیٹنے کا شوق فرما رہے ہیں" آفتاب مسکرایا۔

"سر پیٹنے کا شوق" پروفیسر حیران ہو کر بولے۔

"پروفیسر صاحب، میں پاگل ہو جاؤں گا۔ ان لوگوں سے کہیں چپ رہیں"

"دیکھو بھئی شوکی، میں اپنے نائب کا پاگل ہو جانا پسند نہیں کرتا۔ اس لیے مہربانی فرما کر چپ ہو جاؤ" پروفیسر گھبرا کر بولے۔

"جج، جی بہتر — اب ہم ہرگز نہیں بولیں گے، جب تک کہ آپ بولنے کی اجازت نہ دے دیں۔ ویسے مجھے امید ہے۔ آپ کو ہمیں بولنے کی اجازت بہت جلد دینا پڑے گی، کیونکہ اس کے بغیر تو کام چلے گا ہی نہیں — دیکھیے نا، جب تک ہم آپس میں بات چیت نہیں کریں گے، الجھن کیسے دور ہو گی — اس طرح تو یہ الجھن بڑھتی ہی چلی جائے گی، بلکہ کئی الجھنوں کی صورت اختیار کر لے گی۔ کیا آپ یہ بات پسند کریں گے۔ میرا خیال ہے، ہرگز نہیں پسند کریں گے۔ کوئی شریف آدمی ....."

"اوہ، اوہ، خدا کے لیے، پروفیسر صاحب، خدا کے لیے" عبدالقدوس چیخ اٹھا —

"شوکی، چپ ہو جاؤ۔ پہلے مجھے قدوس صاحب سے بات کر لینے دو — بات کیا ہوئی آخر — میرے پاس سے تو تم بالکل پرسکون حالت میں اندر آئے تھے"

"ہم — ہم تو اب بھی بالکل پرسکون ہیں جناب عالی" اشفاق نے مسمسی صورت بنائی۔

"اچھا بس" پروفیسر عقلان چیخ کر بولے اور پھر عبدالقدوس کی طرف مڑے :

"ہاں بھئی، اب بتاؤ، کیا بات ہے ؟"

"جی، بات — وہ بات میں بتاؤں" اس نے بوکھلا کر کہا۔

"تو پھر اور کون بتائے گا۔ بات تو تمہیں ہی بتانا ہو گی۔ اگر شوکی وغیرہ سے پوچھی گئی تو تمہیں پھر ان کے بولنے پر اعتراض ہو گا" پروفیسر صاحب بولے۔

"ہاں، بات تو یہ بھی ٹھیک ہے — اچھا خیر، میں بتاتا ہوں۔ ان لوگوں کا خیال ہے کہ میرا نام سارمن ہے اور میں کسی غیر ملکی آدمی برمن کا بھائی ہوں، گم شدہ بھائی — برمن میری تلاش میں یہاں تک آ پہنچا، لیکن میں نے اسے پہچاننے سے انکار کر دیا، گویا اب یہ میرے بھائی کی طرف سے تفتیش کرتے پھر رہے ہیں۔ ان کا کہنا یہ بھی ہے کہ آپ اور میں چھ ماہ تک غیر حاضر رہے ہیں — اب آپ ہی بتایئے، میں انہیں کیا بتاؤں؟"

"مم — میں، یعنی کہ میں کیا بتاؤں" — پروفیسر عقلان بھی بوکھلا اٹھے —

"یہی کہ میں انہیں کیا جواب دوں، کیونکہ آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں عبدالقدوس ہوں۔ یہ میرا پیدائشی نام ہے اور میں اسی ملک میں پیدا ہوا ہوں۔ سائنس کی تعلیم حاصل کی اور پچھلے دنوں آپ کا اسسٹنٹ بن گیا۔ میں برمن نامی کسی آدمی کو نہیں جانتا۔ آپ اس کی تصدیق کرتے ہیں۔ ہاں تو ان حالات کی روشنی میں میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ لوگ اصلی شوکی برادرز نہیں ہیں۔ سو فی صد نقلی ہیں اور ہمیں ان کا کوئی بندوبست کرنا ہی ہوگا۔"

"کیا؟" پروفیسر عقلان چلا اٹھے۔ ان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ پھر حیرت سے پھیلی آنکھیں ان پر جم گئیں۔ یہاں تک کہ ان کی حیرت ہمارے جسموں میں سرسراتی محسوس ہونے لگی۔

"اف خدا، نقلی شوکی برادرز — میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ ان لوگوں کی آمد پر مجھے عجیب و غریب سا ایک احساس ضرور ہوا تھا، لیکن میں اس احساس کو کوئی معنی نہ پہنا سکا۔ سمجھ نہ سکا کہ میرا یہ احساس مجھ سے کیا کہہ رہا ہے یا مجھے کس بات سے خبردار کر رہا ہے۔ قدوس صاحب آپ نے کمال کر دیا، میں ابھی پولیس کو فون کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر ان کا ہاتھ فون کی طرف بڑھ گیا۔

"ارے ارے، پروفیسر صاحب، یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ بھلا ہمارے نقلی ہونے کا کیا کام۔ ہم بالکل اصلی ہیں، سیفد اصلی ہیں" — اخلاق چلا اٹھا۔

"خاموش رہو — اب اس بات کا فیصلہ پولیس کرے گی۔"

"پپ، پولیس" — عبدالقدوس نے کہا —

اتنی دیر میں پروفیسر صاحب فون پر نمبر گھما چکے تھے۔ سلسلہ فوراً ہی مل گیا اور وہ بولے:

"ہیلو انسپکٹر صاحب، یہ میں ہوں پروفیسر عقلان — یہاں چار نقلی لڑکے موجود ہیں اور کوئی چکر چلانے کے موڈ میں ہیں۔" ان الفاظ کے ساتھ ہی انہوں نے ریسیور رکھ دیا اور ہماری طرف مڑے۔

"اب بہت جلد دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا" — [illegible] کو یقین دلاتے ہیں کہ بالکل اصلی ہیں۔ ہم جیسے اصلی شوکی برادران تو آپ کو ڈھونڈے سے نہیں ملیں گے، بلکہ چراغ لے کر بھی ڈھونڈیں گے، تب بھی نہیں ملیں گے۔" آفتاب نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"ہمیں کیا ضرورت ہے، شوکی برادرز کو ڈھونڈنے کی — ان کے بغیر ہمارے کون سے کام اٹکے ہوئے ہیں۔" انہوں نے منہ بنایا۔

"تو آپ دونوں واقعی چھ ماہ تک کہیں باہر رہے ہیں۔ کیا آپ بتائیں گے کہ کہاں رہے ہیں؟"

"تمہارے فرشتوں کو بھی نہیں بتائیں گے۔" عبدالقدوس نے بھنا کر کہا۔

"اس لیے کہ ہم آپ کے خیال میں نقلی ہیں۔"

"نہیں، اگر تم لوگ اصلی ثابت ہو گئے، یہ بات تب بھی نہیں بتائی جا سکتی" — پروفیسر جلدی سے بولے۔

"تب پھر اصلی ثابت ہونے کا کیا فائدہ؟" شوکی نے منہ بنایا —

"اصلی ثابت نہ ہوئے تو سیدھے جیل چلے جاؤ گے۔" عبدالقدوس نے مسکرا کر کہا۔

"خدا کے لیے ہمیں ڈرایئے تو نہ۔"

"نقلی ہونا، اس لیے ڈر رہے ہو۔ اگر اصل ہوتے تو ہرگز نہ ڈرتے۔" عبدالقدوس بولا۔

"اب تو ہمیں بھی شبہ ہونے لگا ہے۔" آفتاب بڑبڑایا۔

"کس بات کا؟" پروفیسر چونک اٹھے۔

"کہ کہیں ہم نقلی ہی تو نہیں ہیں۔"

"دیکھا پروفیسر صاحب، میں نے ٹھیک کہا تھا نا، یہ لوگ نقلی ہیں۔"

"تم، قدوس تم — کمال کے آدمی ہو — میں اسی لیے تمہیں بہت پسند کرنے لگا ہوں۔ سازش کی بو بہت دور سے سونگھ لیتے ہو — بھئی واہ، مزا آ گیا۔"

"آپ کو ضرور آ گیا ہوگا — کم بخت ہمارے پاس تو پھٹکا بھی نہیں" — شوکی نے جھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"کیا چیز؟" پروفیسر عقلان حیران ہو کر بولے۔

"مم، مزا" —

"مم، مزا کیا" — پروفیسر عقلان کی آنکھیں مارے حیرت کے پھیل گئیں —

"پروفیسر صاحب، میرا خیال ہے، یہ لوگ ضرور بھاگ نکلنے کی فکر میں ہیں — ہمیں باتوں میں لگا کر بھاگ جانا چاہتے ہیں، تاکہ جیل جانے سے بچ جائیں۔ آیئے، ہم ان لوگوں کو ایک کمرے میں بند کر دیں" — ان الفاظ کے ساتھ ہی عبدالقدوس کے ہاتھ میں پستول نظر آیا —

"چلو، تم لوگ ہاتھ اوپر اٹھا دو۔"

"چلو بھئی، اٹھاؤ ہاتھ" — شوکی تھکی تھکی آواز میں بولا۔

"اور باہر نکلو اس کمرے سے" عبدالقدوس کے لہجے میں نفرت تھی۔

وہ باہر نکل آئے — بُری طرح پیچ و تاب کھا رہے تھے — انہیں کچھ دور برآمدے میں چلنا پڑا، پھر ایک کمرے میں دھکیل دیا گیا —

"کیس شروع ہوا نہیں اور دھکے کھانے کو ملنے لگے" آفتاب نے بُرا سا منہ بنایا۔

"سرخرو ہوتا ہے انسان ٹھوکریں کھانے کے بعد" عبدالقدوس نے گنگنانے کے انداز میں کہا۔ ساتھ ہی دروازہ بند ہو گیا — انہوں نے چٹخنی لگنے کی آواز سنی —

"لو بھئی اور کرو تفتیش" اشفاق جل کر بولا۔

"فکر کی کیا بات ہے — انسپکٹر صاحب کے آنے کی دیر ہے۔ ہم اصلی ثابت ہو جائیں گے" شوکی نے کہا۔

"لیکن کس طرح ہو جائیں گے۔ انسپکٹر بھی انہی کا ساتھ دے گا — ان کے خیال کی ہی تائید کرے گا"

"اللہ مالک ہے، وہی ہمیں اصلی ثابت کرے گا" اخلاق نے اوپر دیکھا، لیکن اوپر تو آسمان کی بجائے کمرے کی چھت تھی۔

جلد ہی دروازہ پھر کھلا — انہوں نے دیکھا، دروازے میں عبدالقدوس کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک طنزیہ مسکراہٹ تھی۔

"خیر تو ہے جناب، یہ طنز بھری مسکراہٹ کس خوشی میں آپ کے چہرے پر رینگ رہی ہے" آفتاب نے جلے کٹے لہجے میں کہا۔

"انسپکٹر صاحب تشریف لے آئے ہیں"

"تو پھر اس میں طنزیہ انداز اختیار کرنے کی ایسی کیا خاص ضرورت پڑ گئی آپ کو" اخلاق نے کہا۔

"تم لوگوں کے نقلی ثابت ہونے کا وقت آ گیا ہے۔ چلو باہر نکلو"

"لیکن آپ پروفیسر صاحب کے ساتھ چھ ماہ تک کہاں رہے ہیں"

"یہ بات تم لوگوں کو تو کیا، کسی کو بھی نہیں بتائی جا سکتی"

"اور یہ بات ہمیں اپنے مؤکل کو بتانی ہے۔ اس لیے کسی نہ کسی طرح معلوم کرنا ہو گی" اشفاق کے منہ سے نکل گیا۔

"کیا مطلب" عبدالقدوس چونکا — شوکی نے اشفاق کو گھور کر دیکھا۔

"کچھ نہیں جناب، آپ پہلے ہمیں انسپکٹر صاحب تک لے چلیے۔ جب تک ہم اصلی ثابت نہ ہو جائیں، آپ کو ہم سے کوئی بات نہیں کرنا چاہیے"

"ہاں ٹھیک ہے" اس نے کہا۔

اور وہ اس کے آگے چلتے اسی کمرے میں داخل ہوئے، جس میں اس سے ملاقات کی تھی — یہ کمرہ کم اور تجربہ گاہ زیادہ نظر آتی تھی۔ ہر طرف آلات کا جال پھیلا ہوا تھا، جوں ہی وہ اندر داخل ہوئے، ٹھٹک کر رک گئے۔

اندر جلالی نور تشریف فرما تھے۔

☆ ☆ ☆

"آیئے آیئے، رک کیوں گئے۔ ڈریئے نہیں — اگر آپ نقلی شوکی برادرز ہیں تو میں آپ لوگوں کو کچھ نہیں کہوں گا اور اگر بدقسمتی سے اصلی ہیں تو پھر ضرور بُری طرح پیش آؤں گا"

"کک، کیا مطلب — انسپکٹر صاحب، یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں" پروفیسر صاحب نے حیران ہو کر کہا۔

"بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں پروفیسر صاحب — اصلی شوکی برادرز جس قدر خطرناک ہیں، نقلی تو کسی صورت ہو ہی نہیں سکتے۔ نقلیوں کو تو آپ چٹکیوں میں اڑا سکتے ہیں، جب کہ اصلی شوکی برادرز سے پیچھا چھڑانا بہت مشکل ہے"

"تب تو مہربانی فرما کر جلد اس بات کی تصدیق کر لیجیے کہ اصلی ہیں یا نقلی" پروفیسر صاحب پریشان ہو کر بولے

"آپ کو اب فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں — میں انہیں دیکھ لوں گا"

"دیکھ تو آپ اس وقت بھی رہے ہیں جناب" شوکی نے جل بھن کر کہا۔

"بھئی، آواز تو بالکل شوکی کی ہے — اگر یہ لڑکا شوکی کی آواز کی نقل کر رہا ہے، تو شاید اس سے زیادہ کامیاب نقل کی ہی نہیں جا سکتی" جلالی نور نے کہا۔

"ہم ہم نقلی نہیں ہیں" شوکی تیز آواز میں بولا۔

"اچھا اچھا، نہیں ہوں گے۔ ابھی معلوم ہو جاتا ہے۔ چلو بھئی ان کی تلاشی لو" اس نے اپنے ماتحتوں سے کہا — چار کانسٹیبل ان کی طرف بڑھے اور جیبوں میں جو کچھ تھا، نکال لیا۔ جلالی نور نے ان چیزوں کا جائزہ لیا اور چند منٹ بعد سر اوپر اٹھایا۔

"ان چیزوں کے معائنے سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ لوگ اصلی ہیں" یہ بات اس نے خوشی سے بھرپور لہجے میں کہی۔

"اوہ" عبدالقدوس مایوسانہ انداز میں بولا۔

"لیکن آپ لوگ فکر نہ کریں، ہم انہیں نقلی بنا کر چھوڑیں گے۔ بس ذرا ان کے خلاف رپورٹ لکھوا دیں"

"جی ضرور کیوں نہیں — قابلِ اعتراض بات صرف ایک ہے۔ انہوں نے یہ بات کیوں پوچھی کہ میں اور میرے اسسٹنٹ چھ ماہ تک کہاں رہے۔ یہ اصلی ہوں یا نقلی، ان سے یہ ضرور پوچھا جائے کہ انہیں یہ بات پوچھنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی۔ کس کے اشارے پر پوچھی۔ یہ بہت اہم بات ہے انسپکٹر صاحب، بلکہ بہت خوف ناک بھی۔ اس قدر اہم اور خوف ناک کہ آپ سوچ بھی نہیں سکتے"

"جی کیا فرمایا، میں سوچ بھی نہیں سکتا" جلالی نور نے بوکھلا کر کہا۔

"ہاں، اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ سوچ بھی نہیں سکتے" عبدالقدوس نے پروفیسر کی تائید کی۔

"اوہ" جلالی نور کے لہجے میں مایوسی در آئی۔

"بس، آپ انہیں لے جایئے، میں تحریری رپورٹ آپ کو بھیج

دوں گا۔"

"ٹھیک ہے۔" جلالی نور خوش ہو کر بولا۔

"یہ کیا بات ہوئی — انسپکٹر صاحب کو تو یہاں صرف اس لیے بلوایا گیا تھا کہ ہمارے اصلی یا نقلی ہونے کا پتا چلایا جائے۔"

"نہیں شوکی، یہ ایک چال تھی — تم بالکل اصلی ہو — تم چاروں میں سے کوئی بھی نقلی نہیں ہے، لیکن تم نے جو سوال پوچھا تھا، وہ ایسا سوال ہے کہ کوئی بھی ہم سے نہیں پوچھ سکتا۔ تمہیں یہ بتانا ہوگا۔ یہ سوال تم نے کس کے کہنے پر پوچھا؟" اس مرتبہ پروفیسر عقلان حد درجے سنجیدہ نظر آئے۔

"تت، تت تو آپ ہمیں نقلی نہیں سمجھ رہے۔"

"نہیں، بالکل نہیں۔ یہ تو ایک بہانا تھا، انسپکٹر صاحب کو بلانے کا۔"

"تب پھر ہمیں ان کے سامنے بھیجنے کی ضرورت نہیں۔ اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ سوال کسی کو بھی آپ سے نہیں پوچھنا چاہیے اور یہ کوئی سنگین مسئلہ ہے تو آپ وضاحت کر دیں۔ اس کے بعد ہم بھی آپ کو سب کچھ بتا دیں گے۔ اگرچہ یہ مناسب نہیں ہوگا، کیونکہ ہم جس شخص کا کیس حل کریں، اس کے بارے میں کچھ بتانے کا حق نہیں رکھتے، لیکن اگر یہ معاملہ قومی اور ملکی معاملہ ہے، تب اس بات کا امکان ہے، وہ آدمی ملک کا کوئی دشمن نہ ہو اور ملک کے دشمن کے لیے ہم کوئی کام کسی قیمت پر نہیں کر سکتے۔" شوکی نے جذباتی آواز میں کہا۔

"وضاحت نہیں کی جا سکتی۔" پروفیسر عقلان نے نفی میں سر ہلایا۔

"تب ہمیں جو کچھ معلوم ہے، بتانے کی مہلت دی جائے۔"

"ٹھیک ہے، میرے خیال میں یہ بہتر رہے گا۔" پروفیسر عقلان بولے۔

"لیکن جناب، میں یہ بہتر سمجھتا ہوں کہ ان لوگوں کو تھانے لے جاؤں اور وہاں ان کا بیان قلم بند کر دوں۔" جلالی نور نے جلدی سے کہا۔

"نہیں بھئی، کوئی بات نہیں۔ ہم یہیں ان کی بات سن لیتے ہیں۔ لے جانے کا کیا ہے، وہ تو بعد میں بھی لے جا سکتے ہیں۔"

"چلیے جیسے آپ کی مرضی۔" اس نے مایوسانہ انداز میں کندھے اچکائے۔

اور شوکی نے انہیں برمن کی آمد اور کیس کے بارے میں بتا دیا۔ لیکن کچھ باتیں وہ گول بھی کر گیا—

"انسپکٹر صاحب، اس شخص کو فوراً گرفتار کیا جانا چاہیے۔" پروفیسر عقلان پرجوش انداز میں جلالی نور کی طرف مڑے۔

"کیوں شوکی، اس نے اپنا کوئی پتا نوٹ کرایا تھا۔"

"جی نہیں، کارگزاری کی رپورٹ لینے وہ کل آئے گا۔"

"اوہ، اس کا مطلب ہے، ہمیں کل تک انتظار کرنا ہوگا۔" جلالی نور نے مایوسانہ لہجے میں کہا۔

"اور انتظار بھی ہمارے دفتر میں — دوسرے یہ کہ اگر آپ نے ہمیں گرفتار کیا تو وہ شخص ہمارے پاس بھی نہیں پھٹکے گا۔"

"اوہ ہاں، یہ بات تو ٹھیک ہے، تو پھر ہم کل کیا کریں۔" جلالی نور بڑبڑایا—

"ہمارے دفتر کے آس پاس رہیں — جوں ہی وہ آئے گا، آفتاب کمرے سے نکل کر آپ لوگوں کو اشارا کر دے گا — اس وقت آپ لوگ آگے بڑھ کر اسے گرفتار کر سکتے ہیں۔"

"ہوں ٹھیک ہے، لیکن اگر تم لوگوں نے اسے فرار ہونے میں مدد دی تو اس کی جگہ ہم تم لوگوں کو گرفتار کر لیں گے۔" جلالی نور نے گویا دھمکی دی۔

"چلیے منظور ہے — اب آپ لوگ جا سکتے ہیں، کیونکہ ہو سکتا ہے، باہر اس کا کوئی ساتھی موجود ہو، ہم آپ کے ساتھ باہر نکلیں گے تو وہ ضرور شک میں مبتلا ہو جائے گا۔"

"اچھا۔" جلالی نور نے کہا اور اپنے ماتحتوں کو لے کر چلا گیا— اب وہ عبدالقدوس کی طرف مڑے۔

"پروفیسر صاحب، ہم ملک اور قوم کو کوئی نقصان پہنچتے نہیں دیکھ سکتے۔ اگر اس شخص کا ایسا کوئی ارادہ ہے تو وہ آپ سے پہلے ہمارا دشمن ہے اور ہم اس سے سمجھ لیں گے۔ آپ کو فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

"جہاں تک میرا خیال ہے۔ اپنے بھائی کی گم شدگی کی کہانی اس نے تم لوگوں کو یہاں بھیجنے کے لیے گھڑی تھی۔ وہ صرف یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ میں چھ ماہ تک کہاں رہا ہوں۔" پروفیسر بولے۔

"لیکن کیوں، وہ یہ بات کیوں معلوم کرنا چاہتا ہے۔"

"پپ، پتا نہیں — خیر اسے گرفتار کرنے کے بعد وجہ معلوم کر ہی لی جائے گی۔"

"گویا اس طرح ہم ایک اہم مجرم کو گرفتار کرائیں گے۔ اس طرح بھی ہم ملک اور قوم کے کام آئے۔" اشفاق نے خوش ہو کر کہا—

"اگر میں ہوشیار نہ ہوتا تو نہ جانے کیا ہو جاتا۔"

"جی ہاں، ہم یہ بھی سوچ رہے ہیں اور سوچ سوچ کر ہلکان ہو رہے ہیں۔" آفتاب جلدی سے بولا۔

"مجھے تو تم لوگ ذرا بھی ہلکان ہوتے دکھائی نہیں دے رہے۔" عبدالقدوس نے بُرا سا منہ بنایا۔

"بات دراصل یہ ہے کہ ہم ذرا خفیہ طور پر ہلکان ہوا کرتے ہیں، تاکہ دوسرے ہمارے بارے میں کوئی اندازہ نہ لگا سکیں۔"

"یہ کیا بات ہوئی؟" عبدالقدوس جھنا کر بولا۔

"کوئی بات نہیں بھئی — یہ لوگ بہت مخلص ہیں — اچھا شوکی، اب تم چلتے پھرتے نظر آؤ۔ دیکھیں کل کیا ہوتا ہے۔ وہ شخص آتا ہے یا نہیں — کہیں وہ ہوشیار نہ ہو جائے۔"

"آپ فکر نہ کریں پروفیسر صاحب، ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کریں گے کہ وہ ہوشیار نہ ہو جائے۔" آفتاب بولا — پروفیسر صاحب مسکرانے

لگے — عبدالقدوس کا منہ اتر بن گیا اور وہ باہر نکل آئے —

جوں ہی دفتر پہنچے، ٹھٹک کر رہ گئے۔ برمن کرسی پر بیٹھا دیوار کو گھور رہا تھا اور ارشد کی نظریں اس پر جمی تھیں۔ قدموں کی آہٹ سُن کر برمن چونک کر مڑا۔

"تو تم لوگ آ گئے، ہاں، لیکن آپ کو تو کل آنا تھا" شوکی نے بوکھلا کر کہا۔

"بھائی جان، مجھے پیشاب کی حاجت محسوس ہو رہی ہے۔ابھی آتا ہوں" آفتاب اندرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ شوکی نے اس کی طرف دیکھا تک نہیں — اس کی نظریں تو برمن پر جمی ہوئی تھیں۔

"ہاں، آنا تو کل ہی تھا، لیکن بھائی کی پریشانی نے مجھے گھر میں ٹکنے نہ دیا — میں نے سوچا، آپ لوگ معلومات حاصل کرنے پروفیسر ایم اے خان کے ہاں جا تو چکے ہی ہوں گے۔کیوں نہ میں یہاں پہنچ کر آپ کا انتظار کروں اور میں یہاں آ گیا۔آپ نے بُرا تو نہیں مانا"

"بس، سوچ رہے ہیں" شوکی نے گڑبڑا کر کہا۔

"کک، کیا سوچ رہے ہیں" اس نے بھی ہکلا کر کہا۔

"یہ کہ بُرا مانیں یا نہ مانیں"

"میں آپ کا مؤکل ہوں — آپ میری بے چینی کا اندازہ لگا ہی سکتے ہیں۔ جس شخص کا گم شدہ بھائی مل جائے، لیکن وہ اسے پہچاننے سے انکار کر دے، اس کی الجھنوں اور بے چینیوں کا عالم کیا ہوگا"

"ہاں، یہ تو خیر ٹھیک ہے" اشفاق نے تائید کی۔

"تو پھر، وہاں کیا رہا؟" اس نے بے تابانہ لہجے میں پوچھا۔

"جی بس، کیا بتائیں، وہاں کیا رہا" اخلاق بولا۔

"کک، کیا مطلب؟" اس نے چونک کر کہا۔

"آپ کے بھائی نے خود کو سارمن تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کا کہنا ہے کہ اس کا نام عبدالقدوس ہے اور یہ کہ وہ اسی ملک میں پیدا ہوا تھا — دوسرے یہ کہ عبدالقدوس اس کا بچپن کا نام ہے اور برمن نام کا کوئی آدمی اس کا بھائی نہیں ہے، نہ وہ کبھی گم ہوا تھا"

"تت، تو اس نے یہ کہا ہے"

"جی ہاں، کہا تو یہی ہے۔ اب آپ جو جی میں آئے سمجھ لیں"

"اور وہ پروفیسر سمیت چھ ماہ تک کہاں غائب رہا، یہ بات نہیں بتائی اس نے"

"ہاں، بتائی ہے، بتائی کیوں نہیں" شوکی نے کچھ سوچ کر کہا۔ اشفاق اور اخلاق اسے گھورنے لگے — اتنے میں آفتاب بھی آ گیا —

"کیا بتایا ہے انہوں نے؟"

"یہ کہ وہ دونوں واقعی چھ ماہ تک کسی دوسری جگہ موجود رہے ہیں" شوکی نے جلدی سے کہا۔

"کہاں؟" وہ فوراً بولا۔

"آپ یہ معلوم کرنے کے لیے اس قدر بے چین کیوں ہیں"

"میرا خیال ہے، انہی چھ ماہ کے دوران میرے بھائی کو عبدالقدوس بنایا گیا، ورنہ وہ پہلے سارمن تھا"

"یہ، یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں جناب، بھلا یہ کس طرح ممکن ہے۔ کیا مجھے برمن اور آپ کو شوکی بنایا جا سکتا ہے"

"ہاں، آج کی دنیا میں سب کچھ ہو سکتا ہے۔ آپ نہیں جانتے، سائنس نے کس قدر ترقی کر لی ہے"

"اف خدا، کیا آپ سچ کہہ رہے ہیں — کیا یہ واقعی ہو سکتا ہے"

"ہاں بالکل، یہ عین ممکن ہے — ترقی یافتہ ممالک میں لوگوں کی شخصیت بہت آسانی سے بدل دی جاتی ہے"

"لیکن ہمارا ملک تو ابھی اس حد تک ترقی یافتہ نہیں ہے" شوکی نے مایوسانہ انداز میں کندھے اچکائے۔

"اسی لیے تو پروفیسر ایم اے خان میرے بھائی کو لے کر کہیں گیا تھا"

"اوہ" وہ بولے۔

"مہربانی فرما کر جلدی سے بتا دیں، وہ کہاں گئے تھے؟"

"افسوس، ہم نہیں بتا سکتے، کیونکہ انہوں نے صرف اتنی سی بات بتائی ہے کہ وہ کسی دوسری جگہ رہے ہیں۔ وہ دوسری جگہ کہاں رہے؟ یہ بات انہوں نے نہیں بتائی"

"تم — تم جھوٹ کہہ رہے ہو"

"نہیں، ہم جھوٹ نہیں بولتے — ہمارے مذہب میں جھوٹ بولنا منع ہے" اشفاق بولا۔

"میں کہتا ہوں ....!" اس کے الفاظ درمیان میں رہ گئے۔اسی وقت انسپکٹر جلالی نور اور اس کے چند ماتحت کمرے میں داخل ہوئے۔ جلالی نور نے بارعب آواز میں کہا۔

"خبردار، ہاتھ اوپر اٹھا دو — اس دفتر کو چاروں طرف سے گھیر لیا گیا ہے"

شوکی، اشفاق اور اخلاق نے ہاتھ اوپر اٹھا دیے۔ارشد نے بھی ساتھ دیا، لیکن برمن اور آفتاب جوں کے توں بیٹھے رہے۔

"آفتاب بُری بات ہے۔ قانون کا احترام کرنا چاہیے — تم نے ہاتھ کیوں نہیں اٹھائے" شوکی نے بُرا مان کر کہا۔

"اس لیے کہ انکل جلالی نور ہم سے نہیں، برمن صاحب سے کہہ رہے ہیں — میں اندر پیشاب کرنے نہیں، انہیں فون کرنے گیا تھا"

"بھئی واہ، یہ تو تم نے بہت اچھا کیا" اخلاق چہک کر بولا۔ ساتھ ہی انہوں نے ہاتھ نیچے گرا دیے، لیکن برمن نے اب بھی ہاتھ اوپر نہ اٹھائے۔

"اے مسٹر، تم نے سنا نہیں"

"سن چکا ہوں، انسپکٹر صاحب، سن چکا ہوں" اس نے عجیب سے انداز میں کہا۔ ساتھ ہی اس کے ہاتھ میں ایک چمکتا ہوا خنجر نظر آیا۔ خنجر لہریے دار تھا۔

"خبردار، کوئی غلط حرکت نہ کرنا، ورنہ گولی تمہارے سینے کے پار ہو جائے گی" جلالی نور غرایا۔

"میں حرکت کب کر رہا ہوں، میں تو ساکت بیٹھا ہوں" وہ عجیب سے انداز میں مسکرایا۔

"خنجر گرادو"

"یہ میں نے گرانے کے لیے نہیں نکالا — پنڈلی کے ساتھ اسے اڑسا ہی ایسے کسی موقعے کے لیے گیا تھا" وہ بولا۔

"کک، کیا مطلب؟" شوکی نے چونک کر کہا۔

"تم لوگ میری زندگی میں مجھے ہاتھ نہیں لگا سکو گے۔ مجھے گرفتار نہیں کر سکو گے — ہمارا تجربہ کامیاب رہا — ہمیں جو کچھ معلوم کرنا تھا، کر چکے — یہ دیکھو، ہو ہو ہو — ہا ہا ہا — ہی ہی ہی"

اس کی بھونڈی آواز ہمارے کانوں سے ٹکرائی — ساتھ ہی خنجر کی نوک دل کے مقام پر رکھی نظر آئی — وہ یہ دیکھ کر بوکھلا اٹھے —

"ارے ارے، یہ کیا کر رہے ہو؟"

"مسٹر الٹانیو کا حکم یہی ہے"

"الٹانیو، کون الٹانیو؟"

شوکی کے ان الفاظ کے ساتھ ہی خون کا فوارہ اس کے سینے سے ابلا اور وہ کرسی سے نیچے گر کر تڑپنے لگا۔ وہ چاروں تھر تھر کانپنے لگے۔ جلالی نور اور اس کے ماتحتوں کے رنگ اڑ گئے۔ ارشد کے منہ سے تو ایک دلخراش چیخ نکل گئی، لیکن برمن آواز نکالے بغیر تڑپ رہا تھا۔ یہاں تک کہ اس کا جسم بے حس و حرکت ہو گیا — ساتھ ہی ان کے ابا جان اور امی جان کے دوڑتے قدموں کی آواز گونجی۔

"کیا ہوا شوکی، خیر تو ہے — یہ چیخ کس کی تھی؟" ان کی آواز کانوں سے ٹکرائی۔

"دفتر میں ایک لاش موجود ہے ابا جان، یہاں جلالی نور صاحب بھی موجود ہیں" یہ جملہ شوکی نے اپنی امی کے لیے بولا کہ کہیں وہ بھی دفتر میں نہ آ جائیں — ابا جان پریشان صورت لیے اندر داخل ہوئے —

"اف خدا، یہ کیا ہوا — اسے کس نے ہلاک کیا؟"

"اس نے خودکشی کی ہے ابا جان"

"ٹھہریے، پہلے تو فوٹوگرافرز وغیرہ کو فون کرنا ہوگا۔ بیرونی دروازہ بند کرو، ورنہ بھیڑ لگ جائے گی اور کام میں رکاوٹ پیدا ہوگی" یہ کہہ کر جلالی نور فون کرنے لگا — اس کے ایک ماتحت نے دروازہ بند کر دیا —

"اور اب میں اس کی تلاشی لوں گا" جلالی نور فون سے فارغ ہو کر بولا، پھر لاش پر جھک گیا اور جیبوں کی تلاشی لینے لگا۔ اس کی جیبوں سے عام استعمال کی چند چیزوں کے علاوہ ایک عجیب چیز بھی برآمد ہوئی۔ اسے ہتھیلی پر رکھتے ہوئے جلالی نور بول اٹھا:

"ارے، یہ کیا ہے؟"

انہوں نے دیکھا، اس کی ہتھیلی پر ایک ننھی سی شیشے کی بوتل موجود تھی، یعنی اس کے اندر خلا نہیں تھا اور اس کے اندر ایک شخص کا مجسمہ بنا ہوا تھا — بوتل کے اندر وہ آنکھیں جھپکتا نظر آ رہا تھا۔

"ارے باپ رے۔ کک، کیا یہ ننھا منا سا بونا، زندہ ہے" آفتاب بوکھلا اٹھا۔

"کیا بات کرتے ہو، بوتل بالکل ٹھوس ہے" جلالی نور نے منہ بنا کر کہا۔

"تب پھر یہ، آنکھیں کس طرح جھپک رہا ہے"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں — خیر، اس کا معائنہ ماہرین کریں گے۔ پہلے تو ہمیں لاش کا انتظام کرنا ہے" یہ کہہ کر اس نے بوتل جیب میں رکھ لی۔

"انکل، کیا یہ آپ ہمیں نہیں دکھائیں گے؟" شوکی بولا۔

"تم دیکھ کر کونسا تیر مار لوگے — یہ لو" اس نے جھنجلا کر کہا اور بوتل نکال کر اسے دے دی۔ شوکی نے اس کا جائزہ لیا۔ اور پھر اشفاق کی طرف بڑھا دی — انہوں نے بھی باری باری جائزہ لیا۔ آخر شوکی بولا:

"کیا خیال ہے؟"

"کم از کم یہ شیشے کی نہیں ہے"

"کیا مطلب؟" جلالی نور چونک کر بولا۔

"میرا بھی یہی خیال ہے، بوتل شیشے کی نہیں ہے"

"تو پھر کس چیز کی ہے؟" یہ کہتے ہوئے جلالی نور نے آفتاب کے ہاتھ سے بوتل جھپٹ لی۔ ایسے میں وہ اس کے ہاتھ سے نکل کر فرش پر گر گئی، لیکن اس کے ٹوٹنے کی آواز نہ سنائی دی، نہ ہی گرنے سے کوئی آواز پیدا ہوئی، بلکہ وہ فرش پر گر کر اچھلنے لگی۔ بالکل اسی طرح جیسے کوئی گیند اچھلتی ہے۔

"یہ — یہ تو ربڑ کی معلوم ہوتی ہے" جلالی نور نے بوکھلا کر کہا۔

"یا نائیلون کی ہوگی" آفتاب نے کہا۔

"سوال یہ ہے کہ یہ ہے کیا بلا؟" جلالی نور بولا۔

"شاید اس سوال کا جواب پروفیسر عقلان دے سکیں" آفتاب نے سوچ میں گم لہجے میں کہا۔

"اوہ ہاں، بالکل ٹھیک — اس معاملے کا تعلق ویسے بھی پروفیسر صاحب سے ہے — خیر، میں یہاں سے فارغ ہو کر انہی کے پاس جاؤں گا" یہ کہہ کر وہ بوتل دبوچنے کے لیے جھکا، لیکن وہ پھر دھک سے رہ گیا۔

"ارے، بوتل کہاں چلی گئی؟"

اس نے بوکھلا کر ادھر ادھر دیکھا — ہم نے بھی پورے کمرے پر نظر ڈالی — لیکن بوتل کہیں بھی نظر نہ آئی۔

"تم — تم میں سے بوتل کس نے اڑائی ہے؟" جلالی نور نے چلّا کر کہا۔

"کمال، کیا مطلب — ہم تو آپ کے سامنے کھڑے ہیں" شوکی نے بوکھلا کر کہا۔

"ہاں! لیکن تم بہت چالاک ہو — موقع پا کر بوتل غائب کر دی — خیر، کوئی بات نہیں — میں تم لوگوں کی تلاشی لوں گا"

"شوق سے لے لیجیے تلاشی" اشفاق بولا۔

"ان کی اچھی طرح تلاشی لو" جلالی نور نے اپنے ماتحتوں سے کہا۔

اس کے ماتحتوں نے جلدی جلدی ان کی جیبوں کی تلاشی لی — ارشد اور ان کے ابّا جان کو بھی نہ چھوڑا گیا، لیکن بوتل کسی کے پاس سے بھی برآمد نہ ہو سکی۔

"یہ — یہ کیسے ہو سکتا ہے — کمرے کا دروازہ بند ہے۔ اندرونی دروازہ بھی بند ہے — بوتل ہماری نظروں کے سامنے اچھل رہی تھی — پھر غائب کس طرح ہو گئی — اس پورے کمرے کو دیکھو"

پھر جوں ہی نظریں فرش پر پڑیں، ان میں سے کوئی بھی اپنے منہ سے نکلنے والی چیخیں نہ روک سکا —

☆ ☆ ☆

تھوڑی دیر پہلے برمن نے خنجر اپنے دل میں اتار لیا تھا — برمن ان کے سامنے کرسی سے گرا تھا — کچھ دیر تڑپا تھا اور پھر بے حس و حرکت ہو گیا تھا — اس کے بعد جلالی نور نے اس کی جیبوں کی تلاشی لی تھی — جیبوں میں سے عام استعمال کی چیزوں کے علاوہ وہ پُراسرار بوتل نکلی تھی — وہ اس بوتل کے چکر میں ایسے پڑے کہ لاش کی طرف دیکھنا تک بھول گئے — اب بھی انہوں نے بوتل کی تلاش میں فرش کی طرف دیکھا تھا اور ایک ہولناک اور روح فرسا منظر دیکھا۔

برمن کی لاش کی جگہ اب صرف کپڑے پڑے تھے۔ کمرے کا فرش گیلا ہو چکا تھا — یوں لگتا تھا جیسے بہت سا پانی فرش پر گرا دیا گیا ہو اور وہ قالین میں مل گیا ہو۔

"اُف خدا، لاش کہاں گئی؟" جلالی نور نے کانپ کر کہا۔

"شش شاید — پپ، پپ، پانی ....." شوکی جملہ مکمل نہ کر سکا۔

"پانی بن گئی، یہ کس طرح ہو سکتا ہے" ابّا جان بڑبڑائے۔

"سب کچھ ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔ برمن جب فرش پر گرا، اس وقت فرش بالکل خشک تھا۔ ہم نے اس کا خون بہتے دیکھا — لیکن فرش پر پانی نہیں تھا، اب پانی موجود ہے، لاش نہیں ہے"

"یا اللہ رحم، یہ کیا ہو رہا ہے" جلالی نور بڑبڑایا۔

"اور — اور وہ گیند بھی اس طرح غائب ہو گئی جیسے گدھے کے سر سے سینگ"

"دونوں باتیں ہی عجیب ترین ہیں — ہم نے آج تک نہ تو کسی لاش کو پانی بنتے دیکھا اور نہ ایسی بوتل دیکھی، جو غائب ہو جائے" اشفاق بولا۔

"کم از کم پہلی بات کی تائید میں نہیں کر سکتا، کیونکہ میں اپنی زندگی میں ایک شخص کو پانی بنتے دیکھ چکا ہوں" ان کے ابّا جان بول اٹھے اور وہ سب چونک کر ان کی طرف دیکھنے لگے۔

"جی کیا مطلب! آپ کسی آدمی کو پہلے بھی پانی بنتے دیکھ چکے ہیں؟"

"ہاں، اسے ایک ننھے منے سے سفید رنگ کے سانپ نے کاٹ لیا تھا۔ اس سانپ کے سر پر ایک ننھا منا سا تاج بھی تھا — اس کے کاٹتے ہی وہ آدمی گرا اور تڑپ کر ٹھنڈا ہو گیا — چند منٹ بعد جو میں نے اس کی لاش کی طرف دیکھا تو وہ پانی بن چکی تھی۔ بعد میں میں نے چند پیروں سے بات کی تو انہوں نے بتایا — وہ سفید سانپ دراصل سانپوں کا بادشاہ تھا، جسے بھی وہ کاٹ لیتا ہے، پانی بنا دیتا ہے"

"لیکن ابّا جان، یہ کہاں کا واقعہ ہے؟"

"افریقہ کے ایک جنگل کا — وہ کوئی شکاری تھا۔ میں ان دنوں ٹریننگ کے سلسلے میں افریقہ کے جنگل میں دن گزار رہا تھا" انہوں نے بتایا۔

"پھر اس سانپ کا کیا بنا تھا؟"

"وہ فوری طور پر غائب ہو گیا تھا"

"اوہ، لیکن یہ کیس سانپ کے کاٹے کا نہیں ہے" جلالی نور نے بُرا سا منہ بنایا۔

"میں نے صرف یہ کہا تھا کہ میں پہلے بھی ایک شخص کو پانی بنتے دیکھ چکا ہوں" ان کے ابّا جان نے جلالی نور سے بھی بُرا منہ بنایا۔

"پھر یہ شخص پانی کس طرح بن گیا؟" وہ بولا۔

"اس نے ایک خنجر سے خودکشی کی ہے — ہو سکتا ہے خنجر کی نوک پر اس جیسے کسی سانپ کا زہر لگا رکھا ہو" مشتاق احمد خان بولے۔

"اوہ" وہ دھک سے رہ گئے۔ اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی — جلالی نور کے اشارے پر ایک ماتحت نے دروازہ کھول دیا اور ماہرین اندر داخل ہوئے۔

"کہاں ہے جناب لاش؟"

"لاش تو ہوا ہو گئی" آفتاب بول اٹھا۔

"جی، ہوا ہو گئی، کیا مطلب؟" ایک ماہر نے چونک کر کہا۔

"بلکہ یہ کہنا چاہیے، پانی ہو گئی" اشفاق مسکرایا۔

"یہ ہم کس قسم کی باتیں سُن رہے ہیں" ماہر نے جلالی نور کی طرف الجھی ہوئی نظروں سے دیکھا۔

اور جلالی نور انہیں تفصیل بتانے لگا۔ آخر وہ لوگ لاش کے ٹکڑے، خون اور پانی سمیٹ کر رخصت ہو گئے ۔۔ ان سے اب دفتر میں نہیں ٹھہرا جا رہا تھا، لہذا اندر آ کر بیٹھ گئے۔

"سب سے زیادہ حیرت مجھے بوتل کی گم شدگی پر ہے۔ آخر وہ کہاں چلی گئی؟" مشتاق احمد خان بولے۔

"وہ میرے پاس ہے" بیگم مشتاق بولیں۔

"کیا؟" ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا ۔ اور آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں، کیونکہ وہ تو کمرے میں موجود ہی نہیں تھیں، پھر بھلا بوتل ان تک کس طرح پہنچ گئی تھی؟

○

"یہ ۔۔ یہ کس طرح ہو سکتا ہے امی جان" آفتاب بوکھلایا۔

"کیا کس طرح ہو سکتا ہے" وہ مسکرائیں۔

"یہ کہ بوتل آپ کے پاس ہے ۔۔ آپ ضرور مذاق کر رہی ہیں"

"میں تم سے کبھی مذاق نہیں کرتی ۔۔ ہاں، تمہارے ابا جان سے ضرور کبھی کبھار مذاق کر لیتی ہوں اور یہ بھی مجھ سے کرتے ہیں، کیوں جی، ٹھیک ہے نا؟"

"تم کہتی ہو تو ٹھیک ہی ہو گا" انہوں نے کندھے اچکائے۔

"بوتل کی بات درمیان میں رہ گئی" شوکی نے بے چین ہو کر کہا۔

"تم لوگ دراصل ابھی کچے جاسوس ہو اور جلالی نور تو شاید تم سے بھی کچا جاسوس ہے" انہوں نے شوخ لہجے میں کہا۔

"امی جان، کیا آپ یہ کہنا چاہتی ہیں کہ آپ پکی جاسوس ہیں" آفتاب نے بوکھلا کر کہا۔

"نہیں، مجھے جاسوس بننے کا کوئی شوق نہیں۔ یہ شوق تمہی کو مبارک ۔۔ بالکل سیدھی سی بات ہے، تم لوگ اسے نظر انداز کر گئے۔ دفتر سے ایک نالی اندرونی دروازے کے پاس سے نکل کر اندر آتی ہے۔ کمرے کی دھلائی وغیرہ کا پانی اس طرف سے نکلتا ہے۔ اس نالی میں لاش کا خون اور پانی بہہ کر آ گیا تھا ۔۔ بوتل بھی لڑھک کر نالی میں آ گری اور بہہ کر ادھر آ گئی۔ میں دیوار سے لگی اندر ہونے والی ساری باتیں سُن رہی تھی۔ ایسے میں میری نظر نالی میں بہتے خون آلود پانی اور اس پر تیرتی بوتل پر پڑی۔ اندر بوتل کی گم شدگی کی باتیں ہو رہی تھیں؛ چنانچہ میں نے ایک تنکے کی مدد سے اسے نالی سے نکالا اور پانی سے دھو ڈالا"

"اوہ ۔۔ اوہ" ان کے منہ سے نکلا۔

"لیکن امی جان، آپ نے بتایا کیوں نہیں اس وقت"

"کیا ضرورت تھی بتانے کی ۔۔ جلالی نور اس بوتل کے ذریعے رعب جھاڑتا پھرتا، لہذا میں نے سوچا، کیوں نہ اس بوتل کے ذریعے تم کوئی کام کر دکھاؤ"

"کام، کون سا کام؟" اخلاق نے حیران ہو کر کہا۔

"بھئی، اسے لے کر سیدھے پروفیسر عقلان کے پاس جاؤ"

"اوہ ہاں، آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں ۔۔ لائیے، بوتل مجھے دے دیں" شوکی پر جوش لہجے میں بولا۔

ان کی امی نے بوتل شوکی کی طرف بڑھا دی ۔۔

"تو پھر امی جان، ہم اسی وقت جا رہے ہیں، کہیں جلالی نور کو اس نالی کا خیال نہ آ جائے"

"ہاں، یہ بھی ٹھیک ہے۔ جلدی جاؤ" وہ بولیں۔

وہ چاروں باہر نکل کر ایک ٹیکسی میں بیٹھ گئے اور رُخ جنوبی سمت کی طرف ہوا ہی تھا کہ شوکی بول اٹھا:

"ذرا ٹھہریے جناب، ہم ایک بات تو بھول ہی رہے ہیں"

"جی کیا مطلب؟" ڈرائیور نے حیران ہو کر کہا۔

"ٹیکسی ایک طرف کر کے روک لیں ۔۔ ہم ایک مشورہ کرنا چاہتے ہیں" شوکی بولا۔

"کیسا مشورہ بھائی جان" اخلاق نے حیران ہو کر کہا۔

"ہم ایک بات بھول رہے ہیں ۔۔ پروفیسر عقلان سے تو ہم کسی وقت بھی مل سکتے ہیں، وہ کونسا بھاگے جا رہے ہیں"

"تو پھر بھاگا کون جا رہا ہے؟" اشفاق نے جلدی سے پوچھا۔

"گھوڑے شاہ" شوکی بولا۔

"گھوڑے شاہ" ان تینوں نے ایک ساتھ کہا۔

"گھوڑے شاہ" ڈرائیور نے چونک کر کہا۔

"کیوں جناب، آپ کیوں چونکے ۔۔ کیا آپ گھوڑے شاہ کے بارے میں کچھ جانتے ہیں"

"ہاں، ان دنوں اس درویش کا بہت چرچا ہے۔ پریشان لوگ ہر وقت اس کے گرد جمع رہتے ہیں"

انہیں یاد آ گیا، برمن نے گھوڑے شاہ کا نام لیا تھا۔ اسی کے کہنے پر وہ ان لوگوں کے پاس آیا تھا ۔۔ یہ بات کچھ کم عجیب نہیں تھی ۔۔ ایک درویش کو ان کے بارے میں کس طرح معلوم تھا۔

"کیا خیال ہے؟" شوکی بولا۔

"واقعی، پہلے اس سے ملنا ضروری ہے" آفتاب بولا۔

"تو پھر چلیے جناب، پہلے گھوڑے شاہ کے پاس ہی چلیے۔ ہم ان سے دو دو باتیں کرنا چاہتے ہیں"

"بہت بہتر" اس نے کہا اور ٹیکسی پھر چل پڑی۔ جلد ہی وہ

شہر سے باہر نکل آئے۔

"یہ کیا، آپ تو شہر سے باہر نکل آئے۔ کیا گھوڑے شاہ شہر میں نہیں رہتا۔" اشفاق چونک کر بولا۔

"جی نہیں، اس نے اپنا ڈیرا الگ تھلگ بنا رکھا ہے۔ وہ دیکھیے، سامنے ایک ٹیلا سا نظر آ رہا ہے اور اس ٹیلے پر ایک سبز جھنڈا لہرا رہا ہے۔ بس اسی ٹیلے کے دامن میں گھوڑے شاہ کا جھونپڑا ہے۔"

"اوہ!" ان کے منہ سے نکلا۔

ایک منٹ بعد وہ جھونپڑے کے سامنے اتر رہے تھے۔ یہاں اس وقت بھی پندرہ بیس آدمی جمع تھے، اگرچہ دن غروب ہونے کے قریب تھا۔

"ہمیں اس کے تنہا رہ جانے کا انتظار کرنا ہوگا۔" شوکی نے کہا۔

"ہاں بالکل۔" اخلاق بولا۔

اور وہ ایک طرف کھڑے ہو کر انتظار کرنے لگے۔ عین اسی وقت ایک ٹیکسی ان کے قریب آ کر رکی۔ اس میں سے ایک شخص اترا۔ اس کے چہرے پر فکرمندی اور قدرے بدحواسی کے آثار تھے۔ ٹیکسی سے اترتے ہی وہ آگے بڑھا اور جھونپڑے میں داخل ہو گیا۔

"بابا جی، میں لٹ گیا، میرا بھائی مارا گیا۔"

"کیا مطلب بیٹا؟" بابا جی کی آواز سنائی دی۔

"لوگ کہہ رہے ہیں، اس نے ایک خنجر اپنے دل میں اتار لیا۔"

"بھئی، آرام سے اور اطمینان سے پوری بات بتاؤ۔ اس طرح بھلا میں کیا کر سکتا ہوں۔" بابا جی نے قدرے جھنجلا کر کہا۔

"جی۔ جی ہاں، بات دراصل یہ ہے بابا جی، ہمارا تیسرا بھائی گم ہو گیا تھا۔ ہم دونوں اس کی تلاش میں نہ جانے کہاں کہاں گئے، کون کونسے ملک گئے۔ آخر وہ اسی ملک میں، بلکہ اسی شہر میں ہمیں مل گیا، لیکن اس نے میرے دوسرے بھائی کو پہچاننے سے انکار کر دیا۔ اب تو ہم بہت پریشان ہوئے، پھر ہم آپ کے پاس آئے۔ آپ کی شہرت سنی تھی۔ آپ نے ہمیں شوکی برادرز کے پاس جانے کا مشورہ دیا۔ میں تو اپنے بھائی کے ساتھ جا نہیں سکا۔ طبیعت اچانک خراب ہو گئی تھی، وہ اکیلا گیا۔ شوکی برادرز نے ہمارا کیس اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ لیکن اب معلوم ہوا ہے، ان کے دفتر میں میرے بھائی نے خودکشی کر لی ہے۔ آخر یہ سب کیا ہو رہا ہے بابا جی، ہم تو کہیں کے نہیں رہے۔"

"اوہ، بہت افسوس ہوا یہ سن کر۔ خیر، تم یہ راکھ کی چٹکی لو اور جا کر اپنے بھائی کے جسم پر اس جگہ مل دو، جہاں خنجر سے زخم لگا ہے، پھر دیکھنا خدا کیا کرتا ہے۔"

"تت، تو کیا۔ تو کیا میرا بھائی زندہ ہو جائے گا؟" اس کی کپکپاتی آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی۔

"بس جاؤ، جو کہا ہے کرو۔ یہاں بیٹھ کر ساری باتیں پوچھنے کی کوشش نہ کرو۔"

انہوں نے اس آدمی کو باہر نکل کر ٹیکسی میں بیٹھتے دیکھا۔ چہرے پر اب سکون کے آثار نظر آ رہے تھے۔ ان کے دیکھتے ہی دیکھتے ٹیکسی روانہ ہو گئی۔

"لو بھئی، برمن کا ایک اور بھائی نکل آیا، لیکن اس نے ہم سے تو اپنے بھائی کا ذکر نہیں کیا تھا۔" شوکی نے الجھن کے عالم میں کہا۔

"ضرورت نہیں سمجھی ہوگی۔"

ایک ایک کر کے سب لوگ رخصت ہو گئے اور جب ان کے علاوہ کوئی باقی نہ رہا تو وہ چاروں جھونپڑی میں داخل ہوئے۔ انہوں نے سفید داڑھی والے ایک بزرگ کو چوکڑی مار کر بیٹھے دیکھا — آنکھیں بند تھیں، قدموں کی آہٹ سنتے ہی بول اٹھا:

"اوہو، یہ تم ہو شوکی برادرز — اچھا ہوا، تم آ گئے۔ مجھے تم سے ضروری باتیں معلوم کرنا ہیں۔"

"جی، لیکن بابا جی، آپ کی آنکھیں تو بند ہیں، پھر آپ نے کیسے جان لیا کہ اندر داخل ہونے والے ہم ہیں؟" اشفاق نے بوکھلا کر کہا۔

"اس بات کو چھوڑو بچو، ہم دل کی آنکھوں سے دیکھنے کے عادی ہیں۔ بڑے بڑے آفیسر یہاں آتے ہیں اور ہم آنکھیں کھولے بغیر ان کے نام بتا دیتے ہیں، بلکہ یہ بھی بتا دیتے ہیں کہ وہ کیوں آئے ہیں — رہے تم، تمہارے بارے میں ابھی ابھی ایک شخص خبر دے گیا ہے، تمہارے دفتر میں اس کے بھائی نے خودکشی کر لی ہے۔ میں نے ہی اسے تمہارے پاس بھیجا تھا اور اب تم یہ معلوم کرنے آئے ہو کہ میں نے انہیں تمہارے پاس کیوں بھیجا تھا، تو اس کا جواب بالکل سیدھا اور صاف ہے، میں تم لوگوں کے بارے میں جانتا ہوں۔ میرا ہمزاد مجھے ہر قسم کی اطلاعات دیتا رہتا ہے۔ اس لیے میں نے برمن کو تمہارے پاس بھیجا تھا، لیکن افسوس اس نے خودکشی کر لی۔" وہ کہتا چلا گیا۔

"لیکن آپ نے اسے ہمارے پاس بھیجا کیوں تھا، جب کہ آپ اس کے لیے سب کچھ کر سکتے تھے۔"

"ہر شخص کا اپنا اپنا کام ہے اور اسے بس اپنا ہی کام کرنا چاہیے — جتنا میرا کام تھا، میں نے کر دیا تھا۔ اس کے بھائی کا پتا دراصل میں نے ہی اسے بتایا تھا، لیکن جب برمن جا کر بھائی سے ملا تو اس نے پہچاننے سے انکار کر دیا۔ اس نے آ کر یہ بات مجھے بتائی۔ میں سمجھ گیا کہ اس میں کوئی چکر ہے اور اس قسم کے چکروں سے تم بخوبی نبٹ لیتے ہو، لہٰذا میں نے اسے تمہارا نام بتا دیا۔ یہ ہے ساری بات۔ امید ہے تمہارا اطمینان ہو گیا ہوگا۔"

"آپ تو واقعی بہت پہنچے ہوئے ہیں، لیکن اب آپ نے برمن کے تیسرے بھائی کو راکھ کی چٹکی کس لیے دی ہے۔"

کیا اس چٹکی سے اس کا بھائی زندہ ہو جائے گا۔"

"اس کے زندہ ہونے کا اب کیا سوال — وہ بے چارہ تو یوں بھی پانی بن چکا ہے۔" بابا جی نے کہا۔

"اوہ، آپ کو یہ بھی معلوم ہے۔"

"مجھے کیا نہیں معلوم — بس اب تم لوگ جاؤ، میری عبادت کا وقت ہو گیا ہے۔" اس نے دایاں ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"آپ یہاں کب سے بیٹھتے ہیں؟"

"زیادہ دن نہیں ہوئے — میں ایک جگہ زیادہ دن نہیں ٹھہرتا، کیونکہ پھر لوگوں کا ہجوم بہت بڑھ جاتا ہے اور میں ہجوم سے بہت گھبراتا ہوں — میں نے کہا نا، اب تم جاؤ۔"

"جی بہتر — ہم جا رہے ہیں۔ کیا آپ ہم سے کچھ اور کہنا چاہتے ہیں۔" شوکی بولا۔

"کچھ اور کیا — بھلا میں تم سے اور کیا کہنا چاہوں گا — میں کچھ اور کہنے کی خواہش کیوں محسوس کرنے لگا — اتنا ضرور ہے کہ تم لوگ بہت اچھے ہو، بس اب جاؤ۔"

اور وہ چاروں باہر نکل آئے — ذہن الجھے ہوئے تھے۔

"کیا اس شخص کے پاس کوئی کالا علم ہے، یا یہ واقعی پہنچا ہوا ہے۔" اخلاق بڑبڑایا۔

"پپ، پتا نہیں — خیر آؤ، اب ذرا پروفیسر عقلان سے بات ہو جائے۔"

وہ ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ ٹیکسی چل پڑی۔

"کیا رہا؟" ٹیکسی ڈرائیور بولا۔

"بابا جی تو واقعی کمال کے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ آنکھیں بند کیے کیے آنے والے کا نام بتا دیتے ہیں۔" شوکی نے حیرت زدہ لہجے میں کہا۔

"یہی تو ان کا کمال ہے اور اسی لیے یہ بجلی ایسی تیزی سے مشہور ہو گئے ہیں، بہت بڑے بڑے لوگ ان کے پاس آتے ہیں۔ کوئی اولاد کی خواہش لے کر، تو کوئی کسی دشمن سے نجات حاصل کرنے کی نیت لے کر — تو آپ لوگ جس کام کے لیے آئے تھے، ہو گیا؟"

"ہم کسی کام سے نہیں، چند معلومات حاصل کرنے آئے تھے۔ شہر میں داخل ہوتے ہی کوئی پبلک فون بوتھ نظر آئے تو ذرا ٹیکسی روک دیجیے گا، میں چند ایک فون کروں گا۔ اس کے بعد آپ ہمیں پروفیسر عقلان کی تجربہ گاہ کی طرف لے جائیے گا۔"

"بہت بہتر۔" اس نے کہا۔

شہر میں داخل ہوتے ہی اس نے ٹیکسی ایک بوتھ کے سامنے روک دی — شوکی ان تینوں کو ٹیکسی میں ہی بیٹھے رہنے کا اشارا کرتے ہوئے نیچے اتر آیا — اس نے جلدی جلدی سب انسپکٹر کاشان کے نمبر ملائے — جوں ہی ان کی آواز سنائی دی، وہ بولا۔

"ہیلو انکل کاشان، سنائیے، کیسے مزاج ہیں؟"

"اف شوکی، یہ تم ہو — سارے شہر میں تمہارا دفتر یک لخت مشہور ہو گیا ہے۔" کاشان کی آواز کانپ رہی تھی۔

"جی، وہ کیسے؟"

"پانی بن کر بہہ جانے والی لاش کی وجہ سے۔" اس نے کہا۔

"اوہ ہاں — خیر، آپ بابا گھوڑے شاہ کے بارے میں کیا جانتے ہیں۔"

"میں ایسے پیروں اور فقیروں کو نہیں مانتا — یہ لوگ عام طور پر فراڈ ہوتے ہیں۔"

"یہ بزرگ شہر میں کب آئے تھے، اتنا تو معلوم ہوگا۔"

"معلوم کر کے بتا سکتا ہوں۔ چند منٹ انتظار کر سکو گے؟" سب انسپکٹر کاشان بولے۔

"ہاں، کیوں نہیں انکل — آپ فرمائیں تو گھنٹوں انتظار کر سکتا ہوں۔"

"نہیں خیر، گھنٹوں انتظار کرنے کی تو ضرورت نہیں پڑے گی۔" انکل کاشان ہنسے — تقریباً پانچ منٹ بعد ان کی آواز پھر سنائی دی۔

"ہیلو شوکی، بابا گھوڑے شاہ آج سے صرف پندرہ دن پہلے اس شہر میں آیا تھا — اس نے اپنا ڈیرا شہر سے باہر جمایا ہے۔ ضرورت مندوں کا اس کے گرد ہجوم رہتا ہے۔ اس نے اس قدر جلد شہرت حاصل کی ہے کہ حیرت ہوتی ہے اور کچھ؟"

"جی بس، شکریہ — اتنا ہی کافی ہے۔"

"اچھا خدا حافظ۔" کاشان نے کہا اور ریسیور رکھے جانے کی آواز سنائی دی۔ اب شوکی نے گھر کے نمبر ملائے۔ دوسرے ہی لمحے ارشد کی آواز سنائی دی:

"ہیلو ارشد، تم نے ابھی تک دفتر بند نہیں کیا؟"

"جی نہیں، میں آپ کا انتظار کر رہا ہوں۔"

"ہمارے آنے کے بعد کوئی نئی بات تو نہیں ہوئی۔"

"ایک صاحب آئے تھے۔ اپنا نام سردار علیم بتا رہے تھے۔ انہیں آپ سے کچھ کام تھا — کہہ گئے ہیں، اگر آپ لوگ ان کے گھر پہنچ سکیں تو بہت بہتر ہوگا — ایک بہت ہی اہم معاملہ آپ لوگوں کے سپرد کرنا چاہتے ہیں۔"

"اچھا، ان کا پتا کیا ہے؟"

"ایک سو نو، سرور روڈ۔"

"ٹھیک ہے، ہم ان سے مل لیں گے — اگر ان کا فون آئے تو بتا دینا — ایک گھنٹے بعد تم دفتر بند کر کے جا سکتے ہو۔"

"جی بہتر۔" اس کی آواز سنائی دی۔

شوکی ریسیور رکھ کر باہر نکلا اور ٹیکسی میں بیٹھتے ہوئے بولا۔

"سردار علیم صاحب نامی آدمی دفتر میں آئے تھے۔ کسی بہت ہی اہم کام کے سلسلے میں ملنا چاہتے ہیں — ان کا گھر یہاں سے زیادہ فاصلے پر نہیں ہے — کیا خیال ہے، پروفیسر عقلان کے ہاں جانے سے پہلے کیوں نہ ان سے مل لیا جائے — دیکھیں تو سہی، وہ کیا

کہتے ہیں "

"ٹھیک ہے، اس میں کوئی حرج نہیں" آفتاب بولا۔

سردار حلیم ایک چھوٹی سی کوٹھی میں رہتا تھا۔ دروازے کی گھنٹی کے جواب میں ننھی منی مونچھوں والے ایک ملازم نے دروازہ کھولا اور سوالیہ انداز میں ان کی طرف دیکھا۔

"سردار صاحب ہمارے دفتر آئے تھے۔ ہم اس وقت موجود نہیں تھے — وہ پیغام چھوڑ آئے تھے۔ ہمارا نام شوکی برادرز ہے"

"اچھا، میں انہیں اطلاع کرتا ہوں — آپ یہیں ٹھہریے" اس نے کہا اور چلا گیا۔

جلد ہی وہ واپس آیا اور انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھا کر پھر واپس چلا گیا۔ تین منٹ بعد ایک لمبا چوڑا آدمی اندر داخل ہوا۔

"مجھے سردار حلیم کہتے ہیں، تو آپ ہیں شوکی برادرز آپ لوگوں سے مل کر بہت خوشی ہوئی"

"خیال تو یہی ہے" آفتاب بول اٹھا۔

"خیال تو یہی ہے، کیا مطلب؟" سردار حلیم نے حیران ہو کر کہا۔

"یہ کہ ہم شوکی برادرز ہیں"

"اوہ، اچھا اچھا" سردار حلیم ہنسا، پھر بولا:

"میں ایک بہت بڑی الجھن میں مبتلا ہو گیا ہوں — اگر آپ مجھے اس الجھن سے نجات دلا دیں تو میں منہ مانگا معاوضہ دینے کے لیے آمادہ ہوں"

"الجھن بتائیے، اس کے بعد ہی کچھ کہا جا سکتا ہے" شوکی بولا۔

"مجھے ایک شخص کی طرف سے مسلسل دھمکیاں موصول ہو رہی ہیں — ان دھمکیوں نے میرا سکون لوٹ لیا ہے۔ آپ کا کام صرف اتنا ہوگا کہ دھمکی دینے والے کا سراغ لگا دیں، نبٹ میں اس سے خود لوں گا"

"خطوط ہوں گے آپ کے پاس"

"ہاں، میں نے ایک ایک خط سنبھال کر رکھا ہوا ہے" انہوں نے کہا۔

"اور کیا آپ نے پولیس میں رپورٹ درج کرائی ہے"

"نہیں، پولیس والے بہت پریشان کرتے ہیں — ہاں جب اس شخص کا نام مجھے معلوم ہو جائے گا، اس وقت میں ضرور پولیس کا تعاون حاصل کروں گا" وہ بولے۔

"آپ کام کیا کرتے ہیں؟"

"سرکاری ملازم ہوں — محکمہ داخلہ کے سیکرٹری کا پی اے" اس نے بتایا —

"ٹھیک ہے، وہ خطوط دکھائیے"

"ابھی لاتا ہوں" اس نے کہا اور اٹھ کر چلا گیا — تین منٹ بعد واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں چھ سات خط تھے — وہ اس نے ان کے سامنے ڈال دیے — انہوں نے خطوط کا مطالعہ کیا — تمام خطوط کا مضمون تقریباً ایک ہی تھا — پہلے خط کے الفاظ یہ تھے،

"ڈیئر سردار حلیم،

میں تمہارے ایک ایک جرم سے واقف ہوں اور ہر جرم کا ثبوت بھی میرے پاس موجود ہے۔ اگر میں یہ ثبوت پولیس کے حوالے کر دوں تو تم جیل کی سلاخوں کے پیچھے نظر آؤ، لہٰذا جیل کی سلاخوں کے پیچھے جانے سے بچنا چاہتے ہو تو میرا ایک بہت ہی معمولی سا مطالبہ مان لو — مطالبہ یہ ہے کہ مجھے فوری طور پر پچاس ہزار روپے کی ضرورت ہے۔ یہ رقم نقد کی صورت میں قابلِ قبول ہوگی۔ اگر تم نے خاموشی اختیار کی تو تمہاری طرف سے انکار سمجھا جائے گا اور اگر مطالبہ ماننے پر رضامند ہو تو اپنے گھر کی چھت پر ایک سیاہ جھنڈا تین دن کے اندر اندر لہرا دینا — میں سمجھ جاؤں گا — اس کے بعد میں تمہیں رقم کی ادائیگی کی تاریخ وقت اور جگہ کے بارے میں اطلاع دوں گا۔ فقط،

ایشیا کا جلاد"

"یہ — یہ ایشیا کا جلاد کیا بلا ہے؟"

"میں نہیں جانتا — میں نے یہ نام پہلی بار سنا ہے"

"اس شخص کے پاس آپ کے خلاف ثبوت کیا ہیں۔ کیا آپ کچھ جرائم کرتے رہے ہیں" شوکی نے پوچھا۔

"نہیں، میں نے اپنی زندگی میں کبھی کوئی جرم نہیں کیا۔ یہ شخص بلاوجہ خوف زدہ کر کے رقم بٹورنا چاہتا ہے، لیکن بھلا میں اتنی بڑی رقم کا بندوبست کس طرح کر سکتا ہوں۔ میں تو ایک تنخواہ دار ملازم ہوں — کوئی سرمایہ دار تو ہوں نہیں"

"اگر آپ نے کوئی جرم نہیں کیا تو پھر ڈرنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"نہ جانے کیوں، میں خوف محسوس کر رہا ہوں۔ یہ بات خود میری سمجھ میں بھی نہیں آئی"

"ٹھہریے، ذرا ہم باقی خطوط بھی پڑھ لیں" یہ کہہ کر انہوں نے ایک ایک کر کے تمام خطوط پڑھ ڈالے، لیکن سب کا مضمون ایک جیسا تھا — کسی خط میں بھی سردار حلیم کے جرائم کے ثبوت کا کوئی ذکر نہیں تھا۔

"میں نہیں سمجھتا، ان حالات میں آپ کو ڈرنے کی کوئی ضرورت ہے۔ ہاں، اس صورت میں ضرور ڈرنے کی ضرورت ہے، جب آپ نے کوئی جرم کیا ہو"

"نہیں، میرا ریکارڈ بے داغ ہے"

"پھر آپ بے فکر ہو جائیں" شوکی بولا۔

"لیکن میں آئے دن کی دھمکیوں سے بہت پریشان رہنے لگا ہوں۔ کیا خبر اس نے کچھ جعلی قسم کے ثبوت میرے خلاف

بنا لیے ہوں۔"

"خیر، اگر آپ ہماری خدمات حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔"

"تو پھر، اب معاوضے کی بات ہو جائے۔"

"معاوضے کی بات — جی، جی ہاں، آپ صرف پانچ ہزار روپے دے دیجیے گا۔"

"چلیے، مجھے منظور ہے۔" اس نے خوش ہو کر کہا۔

"یہ خطوط ہم اپنے پاس رکھیں گے — آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں۔"

"جی، ہرگز نہیں — بھلا مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے، لیکن میں چاہتا ہوں، آپ اس کیس پر فوری کام شروع کر دیں۔"

"آپ فکر نہ کریں، ہم کل تک اس کام پر لگ جائیں گے۔"

"بہت بہت شکریہ۔" اس نے کہا اور مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیے۔

وہ باہر نکل آئے۔ ٹیکسی میں بیٹھتے ہوئے شوکی بولا:

"لو بھئی، بیٹھے بٹھائے ایک کیس اور مل گیا۔"

"خیر بھائی جان، ہم اس کیس کے سلسلے میں یہ تو ہرگز نہیں کہہ سکتے کہ بیٹھے بٹھائے مل گیا، کیونکہ یہ ہمیں دفتر میں بیٹھے نہیں ملا، اس کے لیے یہاں آنا پڑا ہے۔" آفتاب نے اعتراض کیا۔

"چلو خیر، یوں ہی سہی — اب ہم لگے ہاتھوں پروفیسر عقلان سے مل آئیں۔ شاید وہ اس بوتل کے بارے میں کچھ بتا سکیں۔"

"بوتل کے بارے میں کچھ نہ کچھ تو میں بھی بتا سکتا ہوں۔" آفتاب نے فوراً کہا۔

"یہ بات ہے تو اب تک بتایا کیوں نہیں۔" اخلاق جل بھن کر بولا۔

"اب سن لیجیے، بوتل ہے بہت خوب صورت۔" آفتاب نے شوخ لہجے میں کہا اور اخلاق کا منہ اور بھی بن گیا۔ شوکی اور اشفاق مسکرانے لگے —

ٹیکسی اب پروفیسر عقلان کی تجربہ گاہ کی طرف اڑی جا رہی تھی۔

"تو کیا ہم برمن کے کیس پر کام نہیں کریں گے — آخر ہم نے اس سے پانچ ہزار روپے وصول کیے تھے۔"

"برمن اب اس دنیا میں نہیں رہا۔ پروفیسر صاحب کے بھائی خود کو اس کا بھائی تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں۔ ان حالات میں ہم حیران ہیں کہ کیا کریں اور کیا نہ کریں۔ اب ان کا ایک تیسرا بھائی پیدا ہو گیا ہے۔ اگر یہ ہمارے پاس آیا اور اس سلسلے میں تفتیش کرنے کا مطالبہ کیا تو ہم ضرور کام کریں گے، ورنہ اس کے بھائی کے پیسے اسے لوٹا دیں گے۔" شوکی جلدی جلدی بولا۔

"یہ اچھا خیال ہے۔"

"ہم پہنچ گئے جناب۔" ڈرائیور کی آواز نے انہیں چونکا دیا تو پروفیسر عقلان کی تجربہ گاہ کے سامنے کھڑے تھے — جلدی جلدی اترے اور اسے انتظار کرنے کا کہہ کر دروازے کی طرف بڑھے — شوکی نے گھنٹی بجائی اور انتظار کرنے لگے، لیکن ایک منٹ گزرنے پر بھی رحیم کی صورت نظر نہ آئی۔ آخر شوکی نے پھر گھنٹی بجائی اور اس مرتبہ تقریباً پندرہ سیکنڈ تک انگلی بٹن پر سے نہ ہٹائی، اس کے باوجود قدموں کی آواز سنائی نہ دی۔ تنگ آ کر اس نے دروازے پر دباؤ ڈالا تو وہ کھلتا چلا گیا —

"ارے یہ کیا — دروازہ تو کھلا ہے۔"

"کمال ہے، دروازہ کھلا ہے — گھنٹی کی آواز سن کر رحیم ادھر نہیں آیا، یہ معاملہ کیا ہے۔" اشفاق بڑبڑایا۔

"آؤ دیکھیں، کیا چکر ہے۔"

چاروں اندر داخل ہو گئے۔ اندر ویرانی کا راج تھا۔ دور دور تک کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ جلدی جلدی قدم اٹھاتے اس کمرے کی طرف بڑھے، جس میں پروفیسر سے ملاقات ہوئی تھی — کمرہ خالی پڑا تھا — اب انہوں نے اس کمرے کی طرف قدم اٹھائے، جس میں عبدالقدوس سے ملاقات ہوئی تھی — عبدالقدوس بھی کمرے میں نظر نہ آیا —

"حیرت ہے، یہ لوگ آخر کہاں چلے گئے۔" اخلاق بڑبڑایا۔

"یہ دروازہ اب بند نظر آ رہا ہے، جب کہ پہلی مرتبہ میں نے اسے کھلا دیکھا تھا۔" اچانک آفتاب بولا۔ وہ اس کی طرف مڑے — آفتاب کمرے کی دائیں دیوار میں بنے دروازے کی طرف اشارا کر رہا تھا — دروازے کی طرف بڑھے۔ ہاتھ کا دباؤ ڈال کر دیکھا تو دروازہ بند ملا — دروازے میں قفل لگا ہوا تھا۔

"ٹھہرو، میں اسے کھولنے کی کوشش کرتا ہوں۔" شوکی نے پر جوش آواز میں کہا اور جیب سے چابیوں کا گچھا نکالا — اسی وقت ایک آواز نے انہیں اچھل پڑنے پر مجبور کر دیا۔

"یہ تالا ان چابیوں سے نہیں کھلے گا — یہ رہی میرے پاس اس کی چابی۔"

☆ ☆ ☆

وہ بوکھلا کر مڑے — اور یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ ایک لمبے سے قد کا پتلے دبلے جسم والا آدمی کھڑا مسکرا رہا تھا — اس کی ایک انگلی سے چابیوں کا ایک گچھا لٹک رہا تھا — اس کے چہرے کے خدوخال چینیوں اور جاپانیوں جیسے تھے۔ آنکھوں میں سانپ کی سی چمک تھی۔

"آ — آپ — یعنی کہ آپ — کک، کک، کون ہیں؟" شوکی نے گڑبڑا کر کہا۔

"اوہ پپ، پروفیسر — صاحب — کہاں گئے؟"

"بھئی چابی لے لو اور کھول کر دیکھ لو — تمہیں اپنے ہر سوال کا جواب مل جائے گا" یہ کہہ کر اس نے چابیوں کا گچھا ان کی طرف اچھال دیا — آفتاب نے فوراً اسے کیچ کر لیا — غیر ملکی کی آواز بہت نرم تھی —

"ت، تو کیا ہم واقعی اسے کھول ڈالیں" شوکی نے ڈرے ڈرے انداز میں پوچھا۔ وہ اس قدر نرم لہجے میں گفتگو کر رہا تھا، پھر بھی نہ جانے کیوں انہیں ڈر محسوس ہو رہا تھا —

"ہاں بالکل، تم شوکی برادرز ہو، یہی بات ہے نا"

"ہاں، بالکل ٹھیک — کیسے تو ہم بھی آپ کا نام بتا دیں" شوکی بولا — اشفاق، اخلاق اور آفتاب نے اسے گھور کر دیکھا۔

"نہیں بھئی، تم میرا نام نہیں بتا سکو گے" وہ مسکرایا: "چلو کھولو دروازہ"

"بہت بہتر — کھولے دیتا ہوں" شوکی نے کہا اور تالے کے سوراخ میں چابی داخل کر کے گھمائی — کلک کی آواز کے ساتھ تالا کھل گیا — جوں ہی دروازہ کھلا، وہ بوکھلا اٹھے — کمرے کے اندر پروفیسر عقلان، ان کے نائب عبدالقدوس اور ملازم رحیم ایک میز کے گرد کرسیوں پر بیٹھے لڈو کھیل رہے تھے — یہ عجیب منظر دیکھ کر ان کی آنکھیں حیرت کی زیادتی سے پھیل گئیں —

"یہ — یہ ہم کیا دیکھ رہے ہیں؟"

"بھئی تمہاری نظریں کمزور تو ہیں نہیں — یہ لوگ لڈو کھیل رہے ہیں"

"پروفیسر عقلان اور لڈو کھیل رہے ہیں، یہ کیسے ممکن ہے"

"میں نے چاہا تھا کہ لوگ بند کمرے میں بیٹھ کر اطمینان سے لڈو کھیلیں، کوئی شور شرابا نہ کریں — انہوں نے میری ہدایات پر عمل کیا — اب اگر میں چاہوں کہ تم لوگ بھی لڈو کھیلنے میں ان کا ساتھ دو تو تم بھی یہی کرو گے" اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"یہ، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"یہ میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ تم تو ابھی بالکل بچے ہو۔ میں نے تو بڑے بڑوں کو ناکوں چنے چبوا دیے ہیں"

"آپ — آپ ہیں کون۔ اپنا تعارف بھی تو کروائیے" اخلاق نے تھرتھر کانپتی آواز میں کہا۔

"تمہارے اس بھائی نے دعویٰ تو کیا ہے، میرا نام بتانے کا" اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"ہاں، میں آپ کا نام بتا سکتا ہوں۔ یہ ذرا بھی مشکل نہیں" شوکی نے منہ بنا کر کہا۔

"چلو تو ذرا ہو جائے امتحان" وہ ہنسا۔

"لیکن اس سے پہلے میں پروفیسر صاحب سے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں"

"ضرور، ضرور، مجھے کوئی اعتراض نہیں" اس نے فوراً کہا۔

شوکی اندر داخل ہوا اور پروفیسر عقلان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا:

"پروفیسر صاحب، یہ سب کیا ہے، آپ لڈو کھیل رہے ہیں؟"

"جاؤ جاؤ، اپنا کام کرو۔ بہت مزا آ رہا ہے — اتنا مزا تو زندگی میں کبھی آیا ہی نہیں" انہوں نے ہاتھ اس طرح ہلائے، جیسے مکھیاں اڑانا چاہتے ہوں۔

"عبدالقدوس صاحب، کچھ آپ ہی فرمائیے"

"کیا فرماؤں، دیکھ نہیں رہے، ہم لڈو کھیل رہے ہیں، کیوں پریشان کرنے آ گئے ہیں" عبدالقدوس نے جل کر کہا۔

"بھائی رحیم، یہ کیا ہو رہا ہے"

"تمہارا دماغ چل گیا ہے کیا؟ آنکھوں سے دیکھ رہے ہو، اور پھر بھی کہہ رہے ہو، کیا ہو رہا ہے" رحیم تن کر بولا۔

"اچھا تو پھر کھیلیے لڈو" شوکی نے مایوسانہ لہجے میں کہا اور واپس مڑا — غیر ملکی کے چہرے پر طنز بھری مسکراہٹ ناچ رہی تھی:

"کیوں ہو گئی ناکامی" وہ ہنسا۔

"ہاں ہو گئی — میں سمجھ نہیں سکا — یہ بات کس طرح ممکن ہے کہ اتنے سمجھ دار اور پڑھے لکھے لوگ بیٹھے لڈو کھیل رہے ہیں" شوکی نے حیران ہو کر کہا۔

"ٹھہرو، ابھی سمجھاتا ہوں — اے تم میرے قریب آؤ"

اس نے اخلاق کی طرف دیکھا۔

"قریب آؤں، لیکن کیوں؟"

"بس آ جاؤ قریب، تمہاری الجھنیں دور کرنا چاہتا ہوں"

اخلاق نے ان کی طرف دیکھا اور پھر جیسے نہ چاہتے ہوئے اس کی طرف بڑھنے لگا۔

"اس لیے تمہاری طرف آ رہا ہوں کہ تم مجھے بزدل نہ خیال کرو"

"اگر نہ آنا چاہتے، تو بھی آنا پڑتا" اس نے کہا۔

اتنے میں اخلاق اس کے نزدیک پہنچ گیا۔

"ہاتھ ملاؤ، اسی خوشی میں" یہ کہہ کر اس نے دوستانہ انداز میں ہاتھ آگے بڑھا دیا — اخلاق نے بھی ہاتھ اٹھایا — جوں ہی اس نے غیر ملکی سے مصافحہ کیا، اس کے بازو کو ایک جھٹکا لگا — یہ جھٹکا انتہائی عجیب تھا — زور بہت کم لگایا گیا تھا، لیکن اخلاق کو اپنے جسم کی ساری جان نکلتی محسوس ہوئی۔ رنگ اڑ گیا۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ اسے یوں لگا، جیسے وہ اب گرا کہ اب گرا، لیکن وہ گرنے سے بچ گیا۔ اس کے کانوں میں سائیں سائیں کی آوازیں گونجنے لگیں — پھر غیر ملکی کی آواز ابھری:

"اب جاؤ اور پروفیسر عقلان کے ساتھ لڈو میں شریک ہو جاؤ۔ پروفیسر! اسے بھی ساتھ کھلاؤ۔"

"لیکن جناب! ہمیں نئے سرے سے کھیلنا ہوگا۔"

"کوئی بات نہیں، پھر کیا ہوا؟" اس نے کہا۔

"جج جی! اچھا۔"

ادھر اخلاق ایک ایک قدم اٹھاتا پروفیسر کی طرف بڑھ رہا تھا۔

"اخلاق، یہ کیا کر رہے ہو۔ ہرگز لڈو کھیلنے کے لیے نہ بیٹھنا۔" شوکی چلایا۔

"مم، مجھے نہ روکیں بھائی جان — مم، میں لڈو کھیلوں گا۔" اخلاق تھرتھر کانپتی آواز میں بولا۔

"کیا کہا، لڈو کھیلو گے۔ دماغ تو نہیں چل گیا۔ ہم یہاں لڈو کھیلنے نہیں آئے۔" ان الفاظ کے ساتھ ہی شوکی کو بوتل یاد آ گئی، لیکن اب وہ بوتل کے بارے میں پروفیسر عقلان سے کچھ نہیں پوچھ سکتا تھا، کیونکہ پروفیسر تو لڈو کھیل رہے تھے۔

"اگر یہ کھیل میں شریک نہ ہوا تو اسے مجھ سے ایک بار پھر مصافحہ کرنا ہوگا۔" غیر ملکی ہنسا۔

"نن، نہیں — مم، میں کھیلوں گا۔" اخلاق نے جلدی سے کہا اور ایک خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"دیکھا تم نے۔" غیر ملکی بولا۔

"ہاں، مجھے لڈو کھیلنے پر مجبور کر کے دکھاؤ تو مانوں۔" شوکی نے جھلا کر کہا۔

"تو پھر آؤ، تم بھی ہاتھ ملاؤ۔"

"بھائی جان، اس سے ہاتھ نہ ملایئے گا، ورنہ میری طرح لڈو کھیلنے پر مجبور ہو جائیں گے۔" اخلاق نے بلند آواز میں کہا۔

"کیا بکواس ہے، بھلا میں کس طرح مجبور ہو جاؤں گا، بلکہ مجھے تو حیرت ہے کہ تم کیسے مجبور ہو گئے ہو۔"

"مم، میں نہیں جانتا۔" اس نے زور سے سر ہلایا۔

"کیا یہ ہپناٹزم کی کوئی قسم ہے۔" شوکی نے غیر ملکی کو گھورا۔

"نہیں، میرے اس فن سے ہپناٹزم کا دور کا بھی واسطہ نہیں۔ لیکن اس سے پہلے کہ میں تمہیں لڈو کھیلنے پر مجبور کروں — تمہیں میرا نام بتانا ہوگا۔ ذرا دیکھوں تو سہی، تم کس حد تک عقل مند ہو۔"

"تو پھر سنو، تمہارا نام الٹا نو ہے۔" شوکی بولا۔ اشفاق، آفتاب اور غیر ملکی حیران رہ گئے۔

○

"بہت خوب، خوب اندازہ لگایا تم نے — آصف اور آفتاب کی یاد تازہ ہو گئی۔"

"یہ — یہ کون لوگ ہیں؟" شوکی حیران ہو کر بولا۔

"انسپکٹر کامران مرزا کے بچے — تمہارے ہی ملک کے ہیں — بہت تیز طرار ہیں اور یہی کیا، محمود، فاروق اور فرزانہ بھی ہیں۔"

"اور یہ کن کے بچے ہیں؟"

"انسپکٹر جمشید کے۔"

"ہم، ہم نے ان کے نام سنے تو ہیں — تو کیا آپ نے ان لوگوں کو دیکھا ہے۔" اشفاق پرجوش لہجے میں بولا۔

"صرف دیکھا ہی نہیں — ان لوگوں سے کئی بار ٹکر بھی ہو چکی ہے — وہ بہت بہادر ہیں، بہت دلیر۔ تم لوگ شاید ذہین تو ہو گے، لیکن ان کی بہادری اور دلیری کو نہیں پہنچ سکتے۔"

"یہ تو خیر بالکل ٹھیک ہے، کیونکہ بہادر اور دلیر تو ہم سرے سے ہیں ہی نہیں۔" شوکی نے مایوسانہ لہجے میں کہا۔

"بلکہ ہم تو بہت بزدل ہیں۔"

"ہاں، میں نے بھی یہی محسوس کیا ہے۔"

"لیکن جناب الٹا نو، آخر آپ کون ہیں اور یہ چکر کیا ہے۔"

"چکر بہت گہرا ہے۔ اس طرح تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گا۔ سمجھ میں آنے کا بس ایک ہی طریقہ ہے۔"

"اور وہ کیا؟"

"مجھ سے باری باری ہاتھ ملاؤ۔"

"ایسا ہرگز نہ کرنا بھائی جان، جیسے بھی ہو یہاں سے نکل جایئے۔" اخلاق چلا اٹھا۔

"اور کیا بھاگ اٹھنے میں تم بھی ہمارا ساتھ دو گے۔" شوکی بولا۔

"افسوس نہیں، میں اس وقت بھاگنے کے قابل نہیں ہوں۔ میری تو جان نکلی جا رہی ہے، آپ اس سے ہاتھ ہرگز نہ ملایئے گا۔"

"بھئی ہاتھ تو ملانا ہوگا۔" الٹا نو نے کہا۔

"واہ، اچھی زبردستی ہے، نہیں ملاتے ہاتھ۔ تم کون ہوتے ہو ہاتھ ملانے والے۔ آؤ بھئی، یہاں سے چلیں۔" آفتاب نے جلدی جلدی کہا۔

"اور کیا اپنے بھائی کو یہیں چھوڑ جاؤ گے۔" الٹا نو نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"اوہ۔" وہ چکرا کر رہ گئے۔

"میری فکر نہ کریں، بس یہاں سے بھاگنے کی کوشش کریں۔" اخلاق نے چیخ کر کہا۔

"نن، نہیں اخلاق، یہ نہیں ہو سکتا — ہم تمہارے بغیر نہیں جائیں گے۔ امی جان نے اگر پوچھ لیا، اخلاق کو کہاں چھوڑ آئے ہو تو کیا جواب دیں گے ہم۔" شوکی نے جذباتی آواز میں کہا۔

"بالکل ٹھیک، ہم تمہیں ساتھ لیے بغیر نہیں جائیں گے۔"

"بہت خوب، اب تو تم دلیروں جیسی باتیں کر رہے ہو۔ تو پھر آؤ، ملاؤ ہاتھ۔"

"سوری جناب، ہم ہاتھ کس خوشی میں ملائیں۔ ہمیں کیا ضرورت ہے ہاتھ ملانے کی۔" اشفاق نے بُرا سا منہ بنایا۔

"اس کے بغیر کام نہیں چلے گا۔" یہ کہہ کر القانیو نے ایک چھلانگ لگائی اور ان کے سروں پر پہنچ گیا۔ اس کی پھرتی نے انہیں چکرا کر رکھ دیا۔ تینوں ادھر ادھر بھاگ نکلے۔

"اسے ادھر ادھر بھاگ بھاگ کر تھکا مارو۔" شوکی نے غرا کر کہا۔

"ہاں ضرور، کیوں نہیں۔ تھکا مارو مجھے۔ میں بھی کیا یاد کروں گا۔" القانیو ہنسا اور ان کی طرف لپکا۔ انہوں نے اسے پھر اپنے سر پر پایا۔ ساتھ ہی اشفاق کا کندھا اس کے ہاتھ میں آ گیا۔ اشفاق کو یوں لگا جیسے کسی زنبور کے ذریعے کندھے کو پکڑ لیا گیا ہو۔ ساتھ ہی اس کا دایاں ہاتھ القانیو کے دائیں ہاتھ میں آ گیا اور پھر اسی قسم کا ایک جھٹکا اشفاق کو لگا۔ شوکی اور آفتاب نے اس کا رنگ بالکل زرد پڑتے دیکھا اور کانپ کر رہ گئے۔

"بھیا جان، یہ ہم کس مصیبت میں پھنس گئے۔"

"کوئی لمبی چوڑی مصیبت جان پڑتی ہے۔ اللہ اپنا رحم فرمائے۔" شوکی بولا۔

"جاؤ، اپنے بھائی کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ جاؤ اور لڈو شروع کر دو۔"

"جی جی، اچھا چچا۔" اشفاق ہکلایا اور لڑکھڑاتے قدموں سے لڈو کی میز کی طرف بڑھا۔ شوکی اور آفتاب پریشان نظروں سے دیکھتے رہے۔

"میں نے کہا تھا نا، بھاگ جائیں، لیکن آپ نے میری بات نہیں مانی۔" اخلاق نے جھنجلائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"افسوس، یہ بات تو ہم تمہاری اب بھی نہیں مانیں گے۔" شوکی نے مایوسانہ لہجے میں کہا۔

"تب آپ دونوں بھی ہمارے ساتھ لڈو کھیلتے نظر آئیں گے۔ عقل مندی کا تقاضا یہ ہے کہ دوڑ لگا جائیں۔"

"نہیں، ہم یہ نہیں کریں گے۔" شوکی نے کہا۔

اتنے میں القانیو آفتاب کے سر پر پہنچ چکا تھا۔

"ہم آپ سے ہاتھ نہیں ملائیں گے جناب، آپ کو بھگا بھگا کر تھکا ماریں گے۔" آفتاب نے غصیلے لہجے میں کہا۔

"نہیں بھئی، ایسا نہ کرنا، ورنہ تھک جاؤ گے۔" اس نے مذاق اُڑانے والے لہجے میں کہا۔

اچانک آفتاب نے دوڑ لگا دی۔ شوکی جوں کا توں وہیں کھڑا رہا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا، القانیو کیا کرتا ہے۔ القانیو آفتاب کو بھاگتے دیکھ کر اطمینان سے کھڑا رہا، پھر اچانک اس نے اپنی جگہ سے چھلانگ لگائی اور دو تین چھلانگوں میں ہی آفتاب کے عین سر پر پہنچ گیا۔ دوسرے ہی لمحے آفتاب دھڑام سے منہ کے بل گرا۔ اب جو اس نے سر اٹھایا تو ناک سے خون بہہ رہا تھا۔

"اُف آفتاب، یہ کیا ہوا؟"

"کچھ، کوئی بات نہیں بھائی جان، اس بار ہمارا واسطہ کسی بہت ہی ستم ظریف شخص سے پڑ گیا ہے۔ اللہ مالک ہے۔" اس نے سرد آہ بھری۔ اتنی دیر میں القانیو جھک کر اسے اٹھا چکا تھا اور دوسرے ہی لمحے اس سے ہاتھ ملا رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد آفتاب بھی ان کے ساتھ بیٹھا نظر آیا۔

"اور اب مسٹر شوکی، تمہارا کیا پروگرام ہے؟" اس کے لہجے میں گہرا طنز تھا۔

"پہلے آپ اپنا پروگرام بتائیں۔"

"میرا پروگرام تو ذرا لمبا ہے، تم اپنے بارے میں بتاؤ۔"

"پپ، پتا نہیں، ہمارا کیا پروگرام ہے۔"

"اچھا تو مجھ سے سنو۔ تم یہاں اس ننھی سی بوتل کے بارے میں معلومات حاصل کرنے آئے تھے۔ لاؤ، وہ بوتل مجھے دے دو۔ بچوں کو اسے جیب میں نہیں رکھنا چاہیے۔"

"تب پھر کیا کرنا چاہیے؟" شوکی نے معصومانہ انداز میں پوچھا۔

"جس کی وہ ہے، اسے لوٹا دینی چاہیے۔"

"لیکن وہ تو پانی بن کر بہہ چکا ہے۔"

"تو کیا ہوا۔ اسے یہ میں نے ہی دی تھی۔" القانیو نے مسکرا کر کہا۔

"تو وہ آپ کے اشارے پر ہم سے آ کر ملا تھا۔" شوکی نے پرجوش لہجے میں کہا۔

"اوہو، تم یہ بات بھی بھانپ چکے ہو۔" القانیو چونکا۔

"نہ صرف یہ، بلکہ یہ بھی کہ بابا گھوڑے شاہ بھی آپ ہی ہیں۔"

"کیا؟" اشفاق، اخلاق اور آفتاب چلا اُٹھے۔

القانیو کے منہ پر ایک شریر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

☆ ☆ ☆

"تم واقعی ذہین ہو اور رہ رہ کر مجھے انسپکٹر کامران مرزا کے بچے یاد دلا رہے ہو، لیکن افسوس، میں اتنا وقت نہیں دے سکتا۔ وقت بہت کم ہے اور مجھے یہاں سے رخصت بھی ہونا ہے، لہٰذا اب تم بھی شرافت سے ہاتھ ملا لو۔ بھاگ دوڑ کے نتیجے میں کیا بیٹھو گے، جیسے تمہارا یہ بھائی کیا بیٹھا ہے۔ ویسے یہ ہے بہت پیارا بچہ، کیا نام ہے اس کا؟"

"آفتاب۔" شوکی نے کہا۔

"اوہو، یہ تو انسپکٹر کامران مرزا کے بیٹے کا ہم نام بھی ہے۔ اسی بات پہ ہاتھ ملاؤ۔" اس نے جلدی سے کہا۔

"ہرگز نہیں ملاؤں گا۔ میں تم سے باقاعدہ دو دو ہاتھ کروں گا۔" شوکی نے جھنا کر کہا۔ اب اسے اس عجیب آدمی

پر بہت غصہ آ رہا تھا۔

"اچھا یہ بات ہے، تو پھر آؤ" الٹانیو بولا اور شوکی کے بالکل سامنے آکھڑا ہوا۔

شوکی کو اور تو کچھ نہ سوجھا۔ اچانک اس کی طرف دوڑ لگا دی اور سر کی ٹکر اس کے پیٹ پر دے ماری، لیکن اگر شوکی کا یہ خیال تھا کہ اس کے سر کی ٹکر لگنے سے وہ دوسری طرف الٹ جائے گا تو اس کا یہ خیال غلط نکلا، وہ تو لڑکھڑایا بھی نہیں تھا۔ دوسرے ہی لمحے شوکی کی ٹھوڑی پر ایک ہلکا سا مکا لگا، لیکن اس ہلکے سے مکے نے ہی اسے ہلا کر رکھ دیا۔ وہ کمر کے بل گرا۔ الٹانیو اس پر جھکا اور دایاں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ دوسرے ہی لمحے شوکی کی آنکھوں کے آگے تارے سے ناچ گئے۔ اسے اپنا سر گھومتا محسوس ہوا۔

"چلو مسٹر شوکی، اب تم بھی لڈو کھیلو۔ میں یہاں ذرا اپنا کام مکمل کر لوں۔ تمہاری وجہ سے میرا نصف گھنٹا ضائع ہو گیا" یہ کہہ کر اس نے شوکی کی جیب سے بوتل نکال لی، پھر اسے کمرے کی طرف دھکا دیا۔ ساتھ ہی کمرے کا دروازہ بند ہو گیا۔ انہوں نے الٹانیو کے قدموں کی آواز سنی۔

"اف خدا، یہ۔۔۔ یہ کیا ہو رہا ہے" شوکی نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"کچھ سمجھ میں نہیں آیا، یہ شخص چاہتا کیا ہے" پروفیسر عقلان نے الجھن کے عالم میں کہا۔

"سوال تو یہ ہے جناب، آپ لوگ آخر لڈو کیوں کھیل رہے ہیں"

"بے بسی کے احساس سے نجات حاصل کرنے کے لیے۔۔۔ ہم اس کے آگے بالکل بے بس ہیں" عبدالقدوس نے کہا۔

"آپ نے پولیس کو فون کیوں نہیں کیا" اشتاق نے پوچھا۔

"ہمیں نہیں معلوم وہ کب اندر داخل ہوا اور کیسے ہوا۔۔۔ جونہی میں نے اسے دیکھا، ایک عجیب سے خطرے کا احساس جاگ اٹھا۔ میں نے فوراً پولیس کو فون کرنے کے لیے ریسیور اٹھایا، لیکن نمبر ڈائل ہی نہ ہو سکے۔۔۔ اسی وقت اس نے کہا، فضول کوشش کر رہے ہو پروفیسر، میں تار پہلے ہی کاٹ چکا ہوں۔ اب تم ہی بتاؤ، میں فون کیسے کر دیتا"

"آخر یہ شخص چاہتا کیا ہے؟" آفتاب چیخ اٹھا۔

"اس نے اب تک مجھ سے صرف ایک سوال کیا ہے اور میں اس کا جواب نہیں دے سکا۔۔۔ اور وہ کیا چاہتا ہے، یہ میرے فرشتوں کو بھی نہیں معلوم"

"اور اس نے کیا سوال کیا تھا؟"

"یہ کہ میں اور میرا نائب چھ ماہ تک کہاں غائب رہے ہیں"

"تو آپ نے انہیں یہ بات نہیں بتائی" شوکی جلدی سے بولا۔

"نہیں، اس لیے کہ میں بتا ہی نہیں سکتا" پروفیسر عقلان بولے۔

"بتا کیوں نہیں سکتے"

"اس لیے کہ خود مجھے بھی نہیں معلوم اور نہ عبدالقدوس کو معلوم ہے کہ ہم دونوں چھ ماہ تک کہاں رہے ہیں" انہوں نے عجیب بات کہی۔

"جی کیا مطلب، یہ کس طرح ممکن ہے کہ آپ کو بھی یہ بات معلوم نہ ہو" آفتاب نے حیرت کی زیادتی سے آنکھیں پھیلائیں۔

"پتا نہیں، یہ کس طرح ممکن ہے، لیکن بات ہے یہی" پروفیسر بولے۔

اسی وقت دروازہ زور دار آواز کے ساتھ کھلا۔

"تم جھوٹے ہو پروفیسر، تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ چھ ماہ تک تم اور تمہارا اسسٹنٹ کہاں رہے، لیکن تم بتا نہیں رہے۔ اور بند کمرے میں اپنے ساتھیوں کو یہ الفاظ بھی مجھے سنانے کے لیے کہہ رہے تھے، لیکن پروفیسر سن لو، ہم تمہارے جسم کا ایک ایک ریشہ گرا دیں گے اور ان ریشوں سے یہ بات پوچھ کر رہیں گے کہ تم چھ ماہ تک کہاں رہے ہو"

اس مرتبہ الٹانیو کی آواز میں انہیں پھنیر سانپ ایسی پھنکار محسوس ہوئی۔ انہیں اپنے رونگٹے کھڑے ہوتے محسوس ہوئے۔۔۔ الٹانیو کے چہرے پر نظریں گئیں تو کانپ ہی اٹھے۔ اس کا چہرہ لال بھبوکا ہو رہا تھا اور آنکھیں انگارے نظر آ رہی تھیں۔۔۔

⊙

چند لمحے تک الٹانیو انہیں گھورتا رہا، پھر زور دار آواز سے دروازہ بند کر دیا۔۔۔ کمرے میں کافی دیر تک موت کی سی خاموشی چھائی رہی، پھر شوکی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا:

"پروفیسر صاحب، آپ چھ ماہ تک کہاں رہے ہیں؟"

"پتا نہیں" پروفیسر نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری، جو انہیں تر نہ کر سکی، کیونکہ وہ بھی خشک ہو چکی تھی۔

"کیا آپ لوگوں کو اندازہ نہیں تھا کہ کوئی آپ سے یہ سوال بھی کر سکتا تھا؟"

"نہیں، ہم لوگوں کا خیال تھا، جو کچھ ہوا ہے، انتہائی خاموشی سے ہوا ہے۔ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہو سکی، لیکن شاید یہ ہماری خوش فہمی تھی۔ کم از کم کچھ لوگوں کو یہ بات ضرور معلوم ہو چکی ہے کہ ہم چھ ماہ تک غیر حاضر رہے ہیں"

"آخر آپ کہاں رہے ہیں اور وہاں کیا کرتے رہے ہیں۔ یہ الٹانیو غیر ملکی شخص ہے، تو کیا کوئی دشمن ملک یہ جاننے کی کوشش کر رہا ہے کہ آپ لوگ چھ ماہ تک کہاں رہے ہیں"

"شاید، شاید یہی بات ہے"

"پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ آپ لوگوں کو معلوم نہ ہو کہ آپ کہاں رہے؟"

"یہ بھلا کیوں ممکن نہیں، جب کہ ہمیں یہیں سے مکمل طور پر بے ہوش کرکے لے جایا گیا تھا، بلکہ بے ہوش کرنے سے پہلے کچھ بھی نہیں بتایا گیا۔ ہوش آنے پر ہی ہمیں معلوم ہوا تھا کہ ہم اپنے گھر میں نہیں ہیں۔"

"پھر آپ نے خود کو کہاں پایا؟"

"ہم اس عمارت کی وضاحت نہیں کر سکتے — ہم نے اپنی زندگی میں اس جیسی عمارت کبھی نہیں دیکھی اور نہ شاید آئندہ زندگی میں کبھی دیکھیں۔"

"اور آپ لوگوں کو اس طرح لے جانے والے کون تھے؟"

"ہماری ہی حکومت کے آدمی تھے اور کون ہوتے۔" انہوں نے کہا۔

"لیکن انہیں اس طرح لے جانے کی کیا ضرورت تھی؟" شوکی نے حیران ہو کر کہا۔

"ضرورت کیوں نہیں تھی — اب دیکھو نا، کچھ لوگ ہم سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ ہم اتنا عرصہ کہاں غائب رہے، لیکن ہمارے فرشتوں کو بھی نہیں معلوم، کیا یہ محفوظ ترین طریقہ نہیں۔"

"لیکن اب یہ لوگ آپ لوگوں کے جسموں کا ایک ایک ریشہ جو گرا ئیں گے۔" شوکی نے افسوس زدہ لہجے میں کہا۔

"پروا نہیں، اللہ مالک ہے۔ ملک اور قوم کے لیے پہلے کیا لوگ جانیں قربان کرتے نہیں آئے۔" عبدالقدوس نے کہا۔

"لیکن اب یہ شخص کیا کر رہا ہے یہاں؟"

"پتا نہیں، شاید کاغذات کی مدد سے یہ جاننے کی کوشش کر رہا ہے کہ ہم کہاں گئے تھے اور کیا کرتے رہے ہیں، لیکن وہ اس طرح کچھ بھی معلوم نہیں کر سکے گا۔"

"اور آپ نے یہ نہیں بتایا، وہاں کرتے کیا رہے ہیں؟"

"افسوس، ہمیں یہ بھی نہیں معلوم کہ ہم وہاں کیا کرتے رہے ہیں۔" پروفیسر عقلان بولے۔

"جی جی کیا مطلب، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"ہو سکتا ہے، بالکل ہو سکتا ہے۔ ہم سے وہاں عجیب و غریب کام لیا گیا، لیکن ہم اس کام کی نوعیت کا اندازہ اب تک نہیں لگا سکے۔"

"یہ بات ہماری سمجھ میں اب تک نہیں آئی۔ جب کہ آپ لوگ کام کرتے رہے ہیں، پھر اس کی نوعیت آپ لوگوں کی سمجھ میں کیوں نہیں آئی۔"

"بس نہیں آئی۔ انہوں نے کام حصوں میں تقسیم کرکے کرایا۔"

"ہوں، وہاں اور بھی بہت سے لوگ رہے ہوں گے۔"

"ہاں، بے شمار — لیکن ہم کسی کو بھی نہیں پہچان سکتے تھے۔ کیونکہ سب کے چہروں پر ایسے نقاب منڈھ دیے گئے تھے، جنہیں اتارا بھی نہیں جا سکتا تھا اور یہ نقاب بس اس دن اتارے گئے جس دن ہمیں واپس بھیجا گیا۔"

"انتہائی پُراسرار — تو کیا آپ یہ سب باتیں التانیو کو بتا چکے ہیں؟"

"ہاں، لیکن اس کی ان معلومات سے ذرا بھی تسلی نہیں ہوئی۔" پروفیسر عقلان نے مایوسانہ لہجے میں کہا۔

"لیکن تجربہ گاہ کی حفاظت کے لیے یہاں محافظ بھی تو موجود تھے۔ ہم نے پچھلی مرتبہ انہیں دیکھا تھا۔"

"محافظ موجود ہیں، لیکن اب بے ہوش پڑے ہیں۔ اس نے انہیں بھی باندھ کر ایک کمرے میں ڈال دیا ہے۔"

"اور اس نے یہ سارا کام تنہا ہی کیا ہے؟" اخلاق کے لہجے میں حیرت تھی۔

"ہاں، عجیب آدمی ہے، بلکہ عجیب ترین۔" عبدالقدوس بڑبڑایا۔

"چھ ماہ کے لیے آپ غائب رہے۔ اس دوران رحیم صاحب تو یہیں موجود رہے ہوں گے۔" شوکی نے کچھ سوچ کر پوچھا۔

"ہاں بالکل، یہیں موجود تھا یہ، لیکن ہمیں لے جانے والوں نے اسے بالکل خاموشی اختیار کرنے کی ہدایات دی تھیں۔ یہ بھی ملک اور قوم کا وفادار ہے، لہذا خاموش ہی رہا۔"

"حیرت ہے، اس قدر احتیاطی تدابیر کے باوجود یہ خبر کیسے اڑ گئی کہ آپ لوگ چھ ماہ تک غائب رہے ہیں؟"

"یہ غلطی انعام فیاضی سے ہوئی۔" پروفیسر بولے۔

"انعام فیاضی، ارے ہاں یاد آیا — عینک والے[1] معاملے میں پہلے انہی سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ نظر نہیں آئے۔" شوکی نے حیران ہو کر کہا۔

"چند دنوں عینک والا چکر چلا تھا — ان دنوں عبدالقدوس صاحب دوسرے ملک گئے ہوئے تھے۔ یہ انعام فیاضی سے زیادہ تجربہ کار ہیں۔ چھ ماہ کے لیے جب ہمیں جانا پڑا تو میں عبدالقدوس کو ساتھ لے گیا۔ شاید انعام فیاضی کو یہ برا لگا۔ ایسے میں دشمن ملک کے کسی ایجنٹ نے انعام فیاضی سے ملاقات کی اور باتوں باتوں میں یہ بات معلوم کر لی کہ میں اور عبدالقدوس کسی نامعلوم مقام پر ہیں۔ بعد میں اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا، جب ہم واپس آئے تو اس نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا، لہذا اسے یہاں سے فارغ کر دیا گیا۔ ملکی معاملات میں ذاتی باتیں نہیں چلتیں۔"

"جی ہاں، یہ تو ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس ایجنٹ نے یہ خبر اپنے ملک کو دی اور وہ اس کھوج میں لگ گیا کہ آپ لوگ کہاں ہیں، لیکن جان نہ سکے۔ یہاں تک کہ آپ واپس آ گئے۔ اب انہوں نے اپنی کوشش اور تیز کر دی۔ شاید التانیو اسی ملک کا کوئی اہم آدمی ہے۔ اسے اس مہم پر بھیجا گیا ——

---

[1] انسانی دھواں پڑھیے

اس نے یہاں آ کر ایک پیر کا بھیس بدلا اور اس طرح بڑے بڑے آفیسروں کو اپنے جال میں پھانس کر معلومات حاصل کیں، لیکن اس طرح بھی وہ یہ بات نہ جان سکا کہ آپ لوگ چھ ماہ تک کہاں رہے ہیں۔ آخر اس نے یہ کام ہمارے ذریعے سے نکالنا چاہا۔ ہمارے پاس اپنے آدمی برمن کو ایک فرضی کہانی کے ساتھ بھیجا۔ ہم آپ کے پاس آئے اور اس طرح برمن کو خودکشی کرنا پڑی — اس کی جیب سے ایک بوتل نکلی — ننھی سی ایک بوتل جو شاید نائیلون کی ہے۔ اس میں ایک آدمی کی تصویر بھی موجود ہے جو پلکیں جھپکتی رہتی ہے۔ ہم اس بوتل کی حقیقت معلوم کرنے کے لیے نکلے اور پھنس گئے۔ سوال یہ ہے کہ اب ہم اس شخص کے جال سے کس طرح نکلیں۔ اس نے تو ذہنی اور جسمانی لحاظ سے ہمیں بالکل مفلوج کر دیا ہے" شوکی جلدی جلدی کہتا چلا گیا۔

"میں نے اپنی زندگی میں اس قدر عجیب آدمی پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ خدا جانے اس نے چوکیداروں پر کس طرح قابو پایا۔ پھر فون کے تار کاٹے اور اس کے بعد تجربہ گاہ میں داخل ہو کر ہم دونوں کو بے بس کر کے کمرے میں بند کر دیا۔ اس کے بعد تم آ گئے اور تمہیں بھی تگنی کا ناچ نچا ڈالا" پروفیسر عقلان نے الجھی ہوئی آواز میں کہا۔

"جہاں تک میرا خیال ہے، وہ تگنی کا نہیں چوگنی کا ناچ تھا" آفتاب بڑبڑایا۔

"تم لوگ میرے جال سے نہیں نکل سکو گے بچو" التائیو کی آواز کانوں سے ٹکرائی تو انہوں نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا — وہ دروازہ کھولے کھڑا مسکرا رہا تھا۔

"پھر ہمیں کیا کرنا چاہیے؟" اخلاق نے پوچھا۔

"میری ہدایات پر عمل، اسی میں تمہاری بھلائی ہے"

"تو پھر مہربانی فرما کر اپنی ہدایات دے دیجیے — ہم ان پر بہت احتیاط سے عمل کریں گے" آفتاب نے فوراً کہا۔

"تم چاروں اس کمرے میں جوں کے توں بیٹھے رہو — لڈو سے دل بہلاتے رہو۔ میں ذرا ان دونوں حضرات کو تجربہ گاہ تک لے جا رہا ہوں۔ وہاں ان سے کچھ سوالات کروں گا"

"تو جناب، آپ وہ سوالات یہیں کر لیجیے نا — اکیلے میں ہمارا جی گھبرائے گا" آفتاب نے واقعی گھبرا کر کہا۔

"نہیں گھبرائے گا — لڈو کی طرف متوجہ رہنا — چلیے پروفیسر صاحبان"

"کوئی فائدہ نہیں مسٹر التائیو، آپ ہم سے کوئی اور بات معلوم نہیں کر سکیں گے۔ جو کچھ ہم بتا سکتے تھے، بتا چکے ہیں۔ جس بہترین دماغ کے مالک نے یہ کام ہم سے لیا ہے۔ اسے شاید پہلے ہی اندازہ تھا کہ ہم لوگوں سے یہ بات معلوم کرنے کی کوشش کی جائے گی، لہذا اس نے ہر وہ طریقہ اختیار کیا، جس سے معاملہ ہر ممکن حد تک راز رہ سکے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم آپ کی کچھ بھی مدد نہیں کر سکتے"

"خیر، دیکھا جائے گا — میں بھی اپنے کام کا ماہر ہوں۔ آئیے میرے ساتھ" التائیو نے بے فکری کے انداز میں کہا۔

"جیسے آپ کی مرضی" پروفیسر عقلان نے کندھے اچکائے اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ عبدالقدوس نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ ان کے کمرے سے نکلتے ہی التائیو نے دروازہ بند کر دیا — وہ ان کے قدموں کی دور ہوتی آواز سنتے رہے۔

"نہ جانے اب یہ عجیب شخص کس لیے ان دونوں کو لے گیا ہے۔ ویسے اس شخص کا بھی جواب نہیں، جس نے یہ سارا کام لیا ہے — اس نے تمام سائنس دانوں سے کام بھی لے لیا اور انہیں اس بات کی ہوا بھی نہ لگنے دی کہ وہ کیا کام لے رہا ہے اور مزے کی بات یہ کہ سائنس دان حضرات ایک دوسرے کو دیکھ بھی نہ سکے"

"واقعی اس کے دماغ کی داد دینا پڑتی ہے۔ التائیو سر ٹپک کر رہ جائے گا، لیکن کچھ بھی معلوم نہیں کر سکے گا" اشفاق خوش ہو کر بولا —

"سوال یہ ہے کہ ہم کیا کریں، کیا واقعی لڈو شروع کر دیں"

"نہیں، ہمارے مذہب میں ایسی چیزوں کی کوئی گنجائش نہیں — یہ وقت ضائع کرنے کے برابر ہے۔ التائیو تو جب ہمیں اس کمرے سے نکالے گا، نکالے گا، کیوں نہ ہم اس سے پہلے ہی یہاں سے نکلنے کی کوشش کریں" اخلاق نے تجویز پیش کی —

"ہاں، بات تو ٹھیک ہے — آؤ، اسی خیال کے مطابق کمرے کا جائزہ لیں"

وہ اٹھے — جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا — نہ جانے اس جھٹکے میں ایسی کیا بات تھی کہ وہ بالکل بے کار ہو کر رہ گئے تھے۔ اتنی دیر گزرنے پر بھی جھٹکے کا اثر باقی تھا۔ کمرے کا بس وہی ایک دروازہ تھا — اس میں کھڑکیاں ضرور تھیں، لیکن ان میں موٹی موٹی سلاخیں لگی تھیں۔ اور وہ اتنے طاقت ور نہیں تھے کہ انہیں ہاتھوں سے اکھاڑ ڈالتے — دو روشندان تھے جو بہت اونچے تھے۔ کمرے میں ایسی کوئی چیز نہیں تھی، جس کے سہارے ان میں سے کوئی روشندان تک پہنچ جاتا اور اگر کسی صورت پہنچ بھی جاتا تو دوسری طرف اتنی اونچائی سے چھلانگ نہیں لگائی جا سکتی تھی۔ اس طرح چھلانگ لگانے والے کی ہڈی پسلی ایک ہو جاتی، وہ اس قابل نہیں تھے، لہذا پھر کرسیوں پر بیٹھ گئے اور اللہ کا ذکر شروع کر دیا۔

تقریباً دو گھنٹے گزر گئے، لیکن التائیو کی واپسی نہ ہوئی۔ نہ کوئی آواز سنائی دی — اب تو ان پر گھبراہٹ طاری ہو گئی۔

"کہیں التائیو یہاں سے رخصت تو نہیں ہو گیا"

"ایسا ہی معلوم ہوتا ہے"

"اب تو ہمیں کچھ نہ کچھ کرنا ہی ہوگا، ورنہ اس کمرے میں بھوکے پیاسے مر جائیں گے۔ آؤ، اس دروازے پر زور آزمائی کریں۔" شوکی نے فکرمند لہجے میں کہا اور چاروں دروازے پر پل پڑے، لیکن دروازہ ٹس سے مس نہ ہوا۔

"ہم، ہم اسے نہیں توڑ سکیں گے۔ یہ بہت مضبوط ہے۔" اشفاق نے ہانپتے ہوئے کہا۔

"تب پھر کیا کیا جائے؟" اخلاق نے ڈوبتی آواز نکالی۔

"ہمیں کسی نہ کسی طرح اس روشندان تک پہنچنا ہی ہوگا۔" شوکی بولا۔

"ہوا میں اڑ کر ہی پہنچ سکتے ہیں۔" آفتاب نے بُرا سا منہ بنایا۔

"بڑی غلطی ہم سے یہ ہوئی کہ یہاں آنے سے پہلے انکل کاشان کو بتا کر نہیں آئے۔" اخلاق نے کہا۔

"کسے معلوم تھا کہ یہاں یہ حالات پیش آئیں گے۔ ہم تو صرف وہ بوتل پروفیسر صاحب کو دکھانے کے لیے آئے تھے۔" اشفاق نے سرد آہ بھری۔

"اور دوسری غلطی یہ ہوئی کہ ارشد کو ایک گھنٹے بعد چھٹی کرنے کے لیے کہہ آئے۔ وہ ایک گھنٹے بعد دفتر بند کرکے گھر چلا گیا ہوگا، ورنہ وہ ضرور ہمیں فون کرکے ہماری خیریت معلوم کرتا۔"

"اب کیا ہوسکتا ہے۔ ان باتوں پر افسوس کرنے سے تو دروازہ کھل نہیں جائے گا۔"

وقت گزرتا چلا گیا۔ مارے فکر اور گھبراہٹ کے ان کے سانس سینوں میں اٹکنے لگے۔ جسم پر پسینہ آنے لگا، پھر بھوک کے احساس نے اور بھی پریشان کر دیا۔ آنتیں قل ھواللہ پڑھنے لگیں۔ مایوسی نے انہیں پوری طرح گھیرے میں لے لیا۔ ایسے میں اخلاق بولا:

"لگ، کیا ہم اس کمرے سے نہیں نکل سکیں گے۔ یہیں بھوکے پیاسے مر جائیں گے۔"

"ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔" شوکی بولا۔

"الٹانیو نے رخصت ہوتے وقت بہت سنگدلی کا ثبوت دیا ہے۔" آفتاب نے تلملاتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ہمیں خدا کی ذات سے ناامید نہیں ہونا چاہیے۔ خدا کی ذات وہ ذات ہے جو پتھر کے کیڑے کو بھی رزق دیتی ہے اور اپنے بندے کو مچھلی کے پیٹ میں بھی زندہ رکھتی ہے۔" اشفاق نے درد بھرے لہجے میں کہا۔

اور وہ اس کی بات میں ڈوب کر رہ گئے۔ شرمندگی کے احساس نے ان کے سر جھکا دیے۔ ایسے میں دوڑتے قدموں کی آواز سنائی دی اور وہ اچھل کر کھڑے ہوگئے۔ نہ جانے اس وقت اچھل کر کھڑے ہونے کی طاقت کہاں سے آگئی تھی۔

☆ ☆ ☆

دروازہ کھلتے ہی انہوں نے سب انسپکٹر کاشان، مشتاق احمد خان اور ارشد کے چہرے دیکھے۔ ان کے پیچھے چند کانسٹیبل بھی تھے۔

"خدا کا شکر ہے آپ لوگ پہنچے تو، ورنہ ہم تو سمجھے تھے، یہ کمرہ ہمارا مقبرہ ہی بن کر رہے گا۔"

"یہ کارنامہ آپ کے والد صاحب کا ہے۔ جب آپ لوگ بہت دیر تک گھر نہ پہنچے تو انہوں نے ارشد کو ساتھ لیا اور میرے پاس آئے اور اس طرح ہم یہاں تک پہنچے۔ فون کرکے پہلے ہی دیکھ چکے تھے۔" سب انسپکٹر کاشان نے جلدی جلدی بتایا۔

"پروفیسر عقلان، ان کے نائب اور چوکیدار بھی ادھر ادھر کہیں بند ہوں گے۔"

"ابھی دیکھ لیتے ہیں، فکر نہ کرو۔" کاشان نے کہا۔

ایک ایک بند کمرے کو کھول کر دیکھا گیا۔ آخر ایک کمرے میں دونوں مسلح چوکیدار بندھے مل گئے۔ ان کی سنگینیں لگی رائفلیں بھی ان کے پاس پڑی تھیں۔ انہیں کھولا گیا، پھر پروفیسر عقلان، ان کے نائب اور ملازم رحیم کو تلاش کیا گیا۔ ایک اور کمرے سے رحیم بھی مل گیا۔ اس کے بعد انہوں نے پوری تجربہ گاہ اور رہائشی حصہ دیکھ ڈالا، لیکن پروفیسر اور ان کے نائب کہیں بھی نہ ملے۔ وہ چکرا کر رہ گئے۔

"تت، تت، تو کیا الٹانیو انہیں اغوا کرکے لے گیا ہے؟" شوکی بوکھلا اٹھا۔

"ال، ال، الٹانیو۔" مشتاق احمد خان بُری طرح ہکلائے۔

"جی ہاں الٹانیو، کیا آپ اسے جانتے ہیں؟"

"ہم، میں نے اس شخص کا نام سُن رکھا ہے۔ یہ ہمارے ایک دشمن ملک کا جاسوس ہے اور خاص مہمات کے سلسلے میں اسے بھیجا جاتا ہے۔ تت، تو کیا، وہ یہاں تھا؟" انہوں نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"جی، جی ہاں۔ ہماری تو اس سے جھڑپ بھی ہوئی تھی۔"

"تمہاری جھڑپ اور اس سے۔ نہیں نہیں، وہ تم سے مذاق کر رہا ہوگا۔ تم اس سے جھڑپ کس طرح مول لے سکتے ہو۔ وہ تو تمہیں چٹکیوں میں اُڑا دے۔" مشتاق احمد خان بولے۔

"یہ، یہ بات بالکل ٹھیک ہے ابا جان۔ اڑا تو اس نے ہمیں واقعی چٹکیوں میں دیا تھا۔"

"انکل کاشان، آپ کیوں چپ ہیں۔ شاید آپ نے الٹانیو کا کبھی نام نہیں سُنا۔"

"جی جی نہیں، اتفاق نہیں ہوا۔"

"مہربانی فرما کر فوراً اہم مقامات کی ناکہ بندی کرائیے، ورنہ پروفیسر عقلان جیسے آدمی سے ملک محروم ہو جائے گا۔" مشتاق احمد خان نے جلدی جلدی کہا۔

"اوہ ہاں، لیکن یہاں کا فون بے کار ہے۔ خیر میں ابھی فون کر کے آتا ہوں۔ اتنی دیر تک آپ لوگ ذرا اور جائزہ لے لیجیے، آیا اغوا کنندہ صرف انہیں لے گیا ہے یا کچھ اور چیزیں بھی۔ کہیں یہ کسی ایجاد کی چوری کا معاملہ نہ ہو۔"

وہ جان بوجھ کر خاموش ہو گئے۔ چھ ماہ تک غائب رہنے والی بات ہر کسی سے نہیں کی جا سکتی تھی۔ یہ کوئی بہت ہی خفیہ اور اہم معاملہ نظر آ رہا تھا۔

سب انسپکٹر کاشان چلے گئے۔ انہوں نے تجربہ گاہ کا بغور جائزہ لینا شروع کیا، لیکن کچھ اندازہ نہ لگا سکے کہ کوئی چیز کم ہے یا نہیں۔ اندازہ لگا بھی کس طرح سکتے تھے۔ یہ اندازہ تو صرف پروفیسر عقلان یا ان کے نائب لگا سکتے تھے۔ انہیں تو معلوم ہی نہیں تھا، وہاں کیا کچھ موجود تھا اور اب کیا موجود نہیں۔ ایسے میں مشتاق احمد خان بولے:

"شوکی، تم لوگ کچھ چھپا رہے ہو۔"

یہ بات انہوں نے دبی آواز میں کہی، تاکہ رحیم اور ملازم نہ سن لیں۔

"آپ کا خیال ٹھیک ہے ابا جان، لیکن بہتر یہی ہے کہ ہم آپ کو بھی نہ بتائیں کہ کیا چھپا رہے ہیں۔"

"اچھا، میں نہیں پوچھتا۔" انہوں نے سمجھ جانے والے انداز میں کہا۔

آدھ گھنٹے بعد انسپکٹر کاشان کی واپسی ہوئی۔ وہ ماہرین کو بھی فون کر آئے تھے۔

"میرا خیال ہے انکل، اب ہمارا یہاں کوئی کام نہیں۔ کیا ہم جا سکتے ہیں۔"

"ہاں ضرور تم لوگوں کے بیانات لینا ہوں گے۔ وہ صبح لے لیے جائیں گے۔ پروفیسر عقلان کا اغوا اتنا معمولی نہیں۔ ملک میں کھلبلی مچ کر رہے گی۔"

اور وہ باہر نکل آئے۔ انہوں نے اپنے والد کو گھر چھوڑا اور خود ایک بار پھر روانہ ہونے لگے تو مشتاق احمد خان بولے:

"اب کہاں کا ارادہ ہے، وہ بھی اتنی رات گئے۔"

"اتنی رات گئے کی فکر نہ کریں۔ معاملہ حد درجے سنگین ہے۔ ہم کچھ بھی نہیں بتا سکتے۔"

"اچھا خیر۔" انہوں نے کہا اور گھر کا دروازہ بند کر لیا۔

انہوں نے آئی جی افزار عالم صاحب کی کوٹھی کے سامنے ٹیکسی رکوائی اور اسے انتظار کرنے کی ہدایت کرتے ہوئے دروازے پر آئے۔ دروازے پر زیرو کا بلب روشن تھا۔ اس کی روشنی میں شوکی نے گھنٹی کے بٹن پر انگلی رکھ دی اور ہلکا سا دباؤ ڈالا۔ ایک منٹ انتظار کرنے کے بعد اس نے ذرا زور سے اور زیادہ وقفے تک گھنٹی بجائی۔ آخر دروازہ کھلا اور پٹھان چوکیدار نے انہیں چندھیائی ہوئی آنکھوں سے دیکھا، پھر غصے کے عالم میں بولا:

"کیا بات ہے، تم کو نیند نہیں آتی۔"

"آتی ہے، ہم نے تو اسے بڑی مشکل سے بھگایا ہے۔" آفتاب نے کہا۔

"تو دوسروں کی نیند کیوں خراب کرتے پھر رہے ہو۔"

"مجبوری ہے۔ آپ ہمیں نہیں جانتے، کیونکہ ہم آئی جی صاحب کی کوٹھی تک پہلی مرتبہ آئے ہیں۔ اس سے پہلے ان سے ہمیشہ دفتر میں جا کر ملاقات کی، لیکن آج مجبوراً غلط وقت پر آنا پڑا اور وہ بھی ان کے گھر۔ ہم شوکی برادرز ہیں۔ مہربانی فرما کر انہیں اطلاع دے دیں۔"

"لیکن وہ سو چکے ہیں۔"

"ہم جو بات انہیں بتانے آئے ہیں، وہ سونے سے کہیں زیادہ اہم ہے۔"

"وہ مجھ پر بگڑیں گے کہ کیوں جگایا۔" اس نے کہا۔

"لیکن جب آپ انہیں بتائیں گے کہ شوکی برادرز کسی خاص کام سے آئے ہیں تو ان کا غصہ صابن کے جھاگ کی طرح بیٹھ جائے گا اور وہ ہمیں فوراً اندر بلا لیں گے۔"

"ہو سکتا ہے، ایسا ہی ہو، کیونکہ میں نہیں جانتا، آپ لوگوں کے تعلقات صاحب سے کس قسم کے ہیں، لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ پہلے ڈانٹ ضرور کھانا پڑے گی۔"

"جس سلسلے میں ہم آئے ہیں، اس کے لیے ایک ڈانٹ تو کیا، ہم سو ڈانٹیں بھی کھانے کے لیے تیار ہیں۔ آپ پٹھان ہو کر ایک ڈانٹ سے ڈر رہے ہیں۔" آفتاب نے جھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"اب مجھے کیا معلوم، آپ کس سلسلے میں آئے ہیں۔"

"وہ ہم صرف آئی جی صاحب کو بتا سکتے ہیں۔"

"اچھا بابا، میں انہیں جگاتا ہوں، خدا خیر کرے۔" اس نے بھی تنگ آ کر کہا اور اندر چلا گیا۔ وہ دروازے پر ہی کھڑے رہ گئے۔ اسی وقت ٹیکسی ڈرائیور کی آواز سنائی دی:

"ابھی تو آپ لوگ دروازے پر ہی کھڑے ہیں۔ اندر کب جائیں گے اور لوٹیں گے کب؟"

"اچھا تو آپ جائیے۔ کتنا بل بنا آپ کا؟" شوکی نے فوراً کہا۔

"ستائیس روپے نوے پیسے۔"

"آفتاب، ان کا بل ادا کر دو، ہمیں یہاں دیر لگ جائے گی۔"

"لیکن بھائی جان، واپسی پر ہمیں کوئی ٹیکسی نہیں مل سکے گی۔" آفتاب نے فکر مندانہ لہجے میں کہا۔

"کوئی بات نہیں، ہم پیدل چلے جائیں گے۔"

اور آفتاب نے بل ادا کر دیا۔ اسی وقت چوکیدار واپس آتا نظر آیا۔

"کمال ہے، انہوں نے تو ذرا بھی برا نہیں مانا۔ آپ لوگوں کو

فوراً اندر پہنچانے کا حکم دیا ہے" اس نے خوش ہو کر کہا۔

"چلیے شکر ہے، آپ ڈانٹ سے بال بال بچے"

"بال بال بچے، کیا مطلب؟" چوکیدار نے حیران ہو کر کہا۔

"آپ بال بال بچے کا مطلب نہیں سمجھتے، حیرت ہے"

آفتاب نے حیران ہو کر کہا ــــ اور وہ تینوں مسکرانے لگے۔

اس کے پیچھے چلتے چاروں آئی جی صاحب کے سونے کے کمرے میں داخل ہوئے ــــ ان کی بیگم بھی اٹھ کر بیٹھ چکی تھیں۔

"آؤ شوکی، میں جانتا ہوں، کوئی بہت ہی خاص معاملہ ہوگا، ورنہ تم مجھے کبھی بے آرام نہ کرتے" انہوں نے نرم گرم آواز میں کہا۔

"ج، جی ہاں ــ میرا خیال تو یہی ہے، لیکن ہو سکتا ہے، جس معاملے کو ہم بہت اہم خیال کر رہے ہوں، وہ آپ کے نزدیک بالکل بھی اہم ثابت نہ ہو" شوکی بولا۔

"خیر بیٹھو۔ اور اطمینان سے بتاؤ، بات کیا ہے؟"

وہ بیٹھ گئے اور شوکی نے با ادب انداز میں کہا:

"بات یہ ہے جناب عالی، کہ پروفیسر عقلان اور ان کے نائب کو اغوا کر لیا گیا ہے"

"اوہ" وہ اچھل پڑے ــــ چہرے پر حیرت کے آثار پھیل گئے۔

"اور مزے کی بات یہ ہے کہ ان کے اغوا میں ایک شخص الٹانیو کا ہاتھ ہے"

"کیا؟" انوار عالم اچھل پڑے۔ آنکھوں میں خوف دوڑ گیا ــ

"تت، تت، تو ــ تو آپ الٹانیو کو جانتے ہیں؟"

"ذاتی طور پر نہیں جانتا ــ سرکاری احکامات کے لحاظ سے ضرور واقف ہوں ــ یہ شخص بہت ہی خطرناک ہے۔ دشمن ملک کا جاسوس ہے۔ ہمارے ملک میں جب بھی آتا ہے، ملک کو کوئی نقصان پہنچانے کی غرض سے آتا ہے۔ حیرت ہے، اسے پروفیسر عقلان کو اغوا کرنے کی کیا ضرورت پیش آگئی"

"کیا یہ بات آپ کے علم میں نہیں کہ پروفیسر عقلان اور ان کے نائب عبدالقدوس چھ ماہ تک غائب رہے ہیں؟"

"اوہ، اوہ، تو تمہیں یہ بات بھی معلوم ہو گئی"

"الٹانیو سے ہماری جھڑپ ہو چکی ہے" شوکی بولا۔

"نن، نہیں" آئی جی صاحب ہکلا اٹھے، پھر جلدی سے بولے:

"مجھے پوری تفصیل سناؤ شوکی ــ تم تو میرے ہوش اڑائے دے رہے ہو"

شوکی نے انہیں ساری تفصیل سنا دی۔ آخر میں بولا:

"اب آپ بتائیں، یہ چھ ماہ تک غائب رہنے کا کیا معاملہ ہے"

"یہ معاملہ میرے ذہن میں صاف نہیں۔ انتہائی خفیہ طور پر اوپر سے یہ ہدایات ملی تھیں کہ پروفیسر عقلان اور ان کے نائب خفیہ طور پر کسی جگہ بھیجے جا رہے ہیں ــ ان کی واپسی تک ان کی عدم موجودگی کو چھپایا جائے اور اس غیر حاضری کو چھپانے کا یہ طریقہ ہے کہ ان کے میک اپ میں کوئی شخص وہاں وقت گزارے! چنانچہ محکمہ سراغرسانی کے دو ذہین آدمیوں کو یہ ذمہ داری سونپی گئی۔ انہوں نے پروفیسر اور ان کے نائب کا میک اپ کیا ــ چھ ماہ تک وہ ان کی کوٹھی میں رہے۔ یہاں تک کہ ان کی واپسی ہو گئی اور وہ دونوں میک اپ ختم کر کے تجربہ گاہ سے نکل آئے"

"لیکن سر، پروفیسر صاحب اور ان کے نائب کی روانگی کس طرح ہوئی تھی؟"

"بہت ہی عجیب انداز میں ــــ نہ تو وہ کسی ہوائی جہاز سے گئے، نہ کسی ٹرین سے ــــ اپنی کار میں بیٹھ کر روانہ ہوئے اور شہر سے باہر جانے والی سڑک پر چلے گئے اور چھ ماہ بعد اسی سڑک سے واپس آگئے"

"حیرت ہے، اچھا یہ بتائیے، آپ کو کس کے ذریعے یہ اطلاع ملی تھی کہ وہ چھ ماہ کے لیے کہیں جا رہے ہیں؟"

"گورنر صاحب کے سیکرٹری کی طرف سے"

"کیا آپ ان سے رابطہ قائم کر کے یہ معلوم کر سکتے ہیں۔ کہ انہیں کس نے یہ بات بتائی تھی"

"اسی وقت معلوم کر دوں" آئی جی صاحب نے حیران ہو کر کہا۔

"جی ہاں، آپ سوچ ہی سکتے ہیں، یہ معاملہ کس حد تک اہم ہو سکتا ہے"

"ہوں اچھا، میں کوشش کرتا ہوں"

یہ کہہ کر وہ فون پر جٹ گئے۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد سلسلہ ملا اور وہ بولے:

"ہیلو نیازی صاحب، انوار عالم عرض کر رہا ہوں ــ بے وقت تکلیف دے رہا ہوں ــ امید ہے، معاف فرمائیں گے ــ معاملہ بہت سنگین ہے ــ پروفیسر عقلان کو الٹانیو نے اغوا کر لیا ہے۔ میں آپ سے صرف یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کو کن ذرائع سے یہ اطلاع ملی تھی کہ وہ چھ ماہ کے لیے غیر حاضر رہیں گے" یہاں تک کہہ کر وہ دوسری طرف کی بات سننے لگے، پھر بولے:

"جی، جی بہتر ــ خدا حافظ" اور انہوں نے ریسیور رکھ دیا۔

ان کی نظریں چاروں پر جم کر رہ گئیں ــــ وہ بوکھلا اٹھے۔

"کیا کوئی بری خبر سنی ہے سر" شوکی بولا۔

"نہیں، گورنر صاحب کے سیکرٹری کو براہ راست صدر صاحب نے فون کیا تھا اور انہوں نے مجھے ــــ اب کیا کہتے ہو؟"

"صدر صاحب سے یہ سوال کیا جانا چاہیے کہ پروفیسر عقلان کے غیر حاضر ہونے کا کیا معاملہ ہے۔ اسی صورت میں کچھ کیا جا سکے گا"

"لیکن اس وقت انہیں فون کرنا مناسب نہیں ہوگا"

"یہ مسئلہ قوم اور ملک کا مسئلہ ہے اور قوم کے محافظ کو جگایا

جانا بالکل بھی غیر مناسب نہیں" شوکی نے کہا۔

"ہوں، تم ٹھیک کہتے ہو۔ خیر میں کوشش کرتا ہوں"

اور وہ کوشش کرنے لگے۔ آدھ گھنٹے بعد انھوں نے تھکے تھکے انداز میں ریسیور رکھتے ہوئے کہا:

"صدر صاحب کا حکم ہے کہ اس معاملے میں مکمل طور پر خاموشی اختیار کی جائے اور کوئی عملی قدم نہ اٹھایا جائے۔ یہاں تک کہ پروفیسر عقلان کو تلاش کرنے کی کوشش بھی نہ کی جائے"

"یہ، یہ آپ کیا فرما رہے ہیں" شوکی دھک سے رہ گیا۔ اس کے بھائیوں کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔

☆ ☆ ☆

کمرے میں چند لمحوں کے لیے موت کی خاموشی طاری ہو گئی۔ آخر آئی جی صاحب کی آواز ابھری:

"سنو شوکی، ہم صدر صاحب پر زور نہیں ڈال سکتے کہ وہ ہمیں اصل بات بتا دیں۔ اگر ان کا حکم یہ ہے کہ ہم اس معاملے میں کچھ بھی نہ کریں تو ہمیں یہی کرنا ہوگا۔ ہم حکم کی تعمیل کرنے پر مجبور ہیں، لہٰذا تم لوگ بھی آرام کرو"

"آ۔ آ۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ اچھا جناب، بہت بہت شکریہ۔ ہم نے آپ کو بہت تکلیف دی"

"نہیں، تکلیف کیسی۔ بلکہ تکلیف تو تم نے خود کو دی۔ نہ جانے کب سے بھٹکتے پھر رہے ہو۔ قوم اور ملک کے ہمدرد ہوں تو تم جیسے۔ بس اب جاؤ"

وہ اٹھے، السلام علیکم کہا اور باہر نکل آئے۔ سڑک سنسان تھی اور ان کی ٹیکسی جا چکی تھی۔ چوکیدار نے دروازہ بند کرنے سے پہلے پوچھا:

"لیکن اب تم لوگ جاؤ گے کیسے؟"

"پپ، پیدل" شوکی بولا۔

"پپ، پیدل" چوکیدار نے حیران ہو کر کہا۔

"ہاں، اور کیا اور کیسے جا سکتے ہیں"

"میرے پاس ایک سائیکل ہے، وہ لے جاؤ"

"ایک سائیکل، لیکن ہم چاروں اس پر کس طرح جا سکتے ہیں" آفتاب نے بوکھلا کر کہا۔

"چار لڑکے ایک سائیکل پر جا سکتے ہیں۔ خاص طور پر رات کے وقت تو بہت آسانی سے جا سکتے ہیں"

"جی شکریہ۔ اس سے بہتر ہے، ہم پیدل ہی جائیں" آفتاب نے بُرا سا منہ بنایا اور وہ سڑک پر لمبے لمبے ڈگ بھرنے لگے۔

"یہ کیا ہوا؟" اشفاق کے لہجے میں حد درجے مایوسی تھی۔

"وہی ہوا، جو خدا کو منظور تھا"

"آخر صدر صاحب نے پروفیسر عقلان کو تلاش کرنے سے کیوں روک دیا"

"کوئی تو بات ہوگی۔ ہو سکتا ہے، وہ خفیہ طور پر انہیں تلاش کرانا چاہتے ہوں اور اس سلسلے میں کچھ خاص لوگوں کی ڈیوٹی لگائی جائے" اخلاق نے خیال ظاہر کیا۔

"ہاں، یہ عین ممکن ہے" آفتاب بولا۔

"لیکن ہماری الجھنیں کس طرح دور ہو سکیں گی" شوکی نے الجھن کے عالم میں کہا۔

"پتا نہیں، انہی سے پوچھیے" آفتاب نے کہا۔

"کن سے؟" شوکی بے خیالی کے عالم میں بولا۔

"الجھنوں سے، اور کن سے؟" اس نے کندھے اچکائے۔

"گویا برمن کے کیس سے ہم فارغ ہو گئے" اشفاق نے تھکی تھکی آواز میں کہا۔

"ہاں، لیکن خیر، ہمارے پاس ابھی ایک کیس موجود ہے اور وہ ہے، سردار حلیم کا کیس۔ صبح سے اس پر کام کریں گے"

"میں اس معاملے پر بھی غور کرتا رہا ہوں۔ دھمکی دینے والا آدمی بھی عجیب ہے اور اس کا نام اس کی دھمکی سے بھی زیادہ عجیب ہے۔ ایشیا کا جلاد، بھئی واہ، آخر یہ کیا نام ہوا؟"

"ہوگا فرضی نام" اخلاق نے منہ بنایا۔

"جہاں تک میں سمجھتا ہوں۔ سردار حلیم نے کچھ جرم ضرور کیے ہیں، ورنہ اتنے دھڑلے سے یہ شخص دھمکیاں نہیں دے سکتا تھا"

"تب پھر، ہمیں حالات جاننے کے لیے سردار حلیم کو بھی ٹٹولنا ہوگا اور اگر اس نے واقعی کچھ جرم کیے ہیں تو ہم اس کا کیس حل کرنے سے انکار کر دیں گے" شوکی نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"گویا گھر آئے پانچ ہزار روپے واپس کر دیں گے" آفتاب نے بُرا سا منہ بنایا۔

"ابھی وہ گھر نہیں گئے۔ میری جیب میں ہی ہیں" شوکی بولا۔

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ہمارے ہاتھ میں آ گئے تو گویا ہمارے گھر میں آ گئے"

"لیکن ہم ایک مجرم کا کیس حل نہیں کر سکتے" شوکی بھنا اٹھا۔

"کیوں نہ پہلے اس بات کا فیصلہ کر لیا جائے کہ وہ مجرم ہے یا نہیں" اشفاق نے جلدی سے کہا۔

"اور یہ فیصلہ ہم کس طرح کر سکتے ہیں" اخلاق نے اشفاق کو گھورا۔

"اسی وقت سردار حلیم کے ہاں چلے چلتے ہیں اور کسی طرح اس کے گھر میں گھس کر اس کے کاغذات اور چیزوں کا جائزہ لے لیتے ہیں۔ کیا خبر ہمیں کامیابی ہو ہی جائے"

"لیکن یہ طریقہ تو غیر قانونی ہوگا"

"نہیں، وہ ہمارا موکل ہے۔ اس کیس پر کام کرنے کی

اجازت اس نے ہمیں دی ہے اور یہ بھی کیس پر کام کرنا ہی ہے۔"

"خیر، چلے چلتے ہیں۔ دیکھا جائے گا۔ الثانیو نے اس قدر پریشان کر دیا ہے کہ اب نیند تو آنے کی نہیں۔"

"ٹھیک ہے۔"

اور وہ پیدل ہی سردار علیم کی کوٹھی کی طرف روانہ ہو گئے۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد پہنچے اور یہ دیکھ کر ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ دروازہ کھلا تھا؛ تاہم دروازے کے دوسری طرف کوئی بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔

"لو بھئی، بن گیا کام — اب ہم بہت آسانی سے اندر کا جائزہ لے سکتے ہیں۔" شوکی خوش ہو کر بولا۔

وہ دبے پاؤں اندر داخل ہوئے — برآمدہ عبور کیا تو ایک کمرے میں روشنی نظر آئی — خود بخود ان کے قدم اس کمرے کے دروازے کی طرف اٹھ گئے۔ کمرے کا دروازہ بند تھا؛ البتہ کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں اور ان کھڑکیوں سے باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں —

"ان تمام انتظامات کے لیے، میں شکر گزار ہوں سردار علیم — لیکن تم نے ایک بہت بڑی غلطی کی — دھمکی آمیز خطوط تمہیں شوکی برادرز کے حوالے نہیں کرنا چاہئیں تھے۔ تمہیں چاہیے تھا، خطوط بس انہیں دکھا دیتے اور اس کے بعد انہیں جلا کر دیتے۔ دراصل میں تو اسے پس اکھانا چاہتا تھا۔ اب ان خطوط کی مدد سے وہ تمہیں مجرم ثابت کر دیں گے!"

اس آواز نے ان کے کان پوری طرح کھڑے کر دیے، کیونکہ یہ آواز الثانیو کے سوا کسی کی نہیں تھی۔

○

"اوہ — سر، یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔" سردار علیم کی تھرتھر کانپتی آواز سنائی دی۔

"ہاں، وہ بہت چالاک ہیں۔ اب تم جلد از جلد ان کا کانٹا نکالنے کی کوشش کرنا۔ میں نہیں چاہتا، اس ملک میں تم جیسا ہمارا آدمی گرفتار کر لیا جائے۔ تم ان کا بندوبست کر لو گے نا؟" الثانیو کہہ رہا تھا۔

"ج، جی ہاں، بالکل۔" وہ بولا۔

"اور اب ہم چلیں گے۔ امید ہے، فرار کے انتظامات میں تمہاری طرف سے کوئی کمی نہیں رہ گئی ہو گی۔"

"بالکل نہیں سر — آپ پورے اطمینان سے یہاں سے نکل جائیں گے۔" سردار علیم بولا۔

عین اسی وقت انہیں پیچھے سے کسی نے زوردار دھکا دیا۔ وہ منہ کے بل گرے۔ بوکھلا کر مڑے تو سروں پر چار غنڈا صورت آدمی کھڑے نظر آئے۔

"تو تم لوگ یہاں کھڑے اندر ہونے والی گفتگو سن رہے تھے؟" ان میں سے ایک نے بلند آواز میں کہا۔

"کیا بات ہے جا کے؟" اندر سے سردار علیم نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"باہر چار لڑکے موجود ہیں — یہ کھڑکی سے کان لگائے اندر کی گفتگو سن رہے تھے۔"

"اوہ، انہیں اندر لے آؤ جا کے۔" سردار علیم کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔

انہوں نے انہیں بازوؤں سے تھام لیا اور دروازے کو دھکیل کر اندر داخل ہو گئے — ان پر نظر پڑتے ہی الثانیو اور سردار علیم چونک اٹھے۔

"اوہو، یہ تم لوگ ہو۔" الثانیو مسکرایا۔

"ج، جی ہاں — خیال تو یہی ہے کہ یہ ہم لوگ ہیں۔" آفتاب ہکلا کر بولا۔

"کیا مطلب، خیال تو یہی ہے۔" الثانیو نے حیران ہو کر کہا۔

"حیرت ہے، یہ ادھر کیسے آ گئے؟"

"تمہارے بارے میں تحقیقات کرنے۔ آیا تم نے واقعی جرائم کیے ہیں یا نہیں۔ کیوں یہی بات ہے نا؟" الثانیو ان کی طرف مڑا۔

"ہاں، یہی بات ہے۔" غوکی نے منہ بنایا۔

"اب، اب میں کیا کروں۔"

"یہ تو اور بھی اچھی بات ہے کہ یہ لوگ خود ہی یہاں آ گئے۔ تمہیں تکلیف نہیں کرنا ہو گی۔ اپنے آدمیوں کو حکم دو، فی الحال انہیں کسی کمرے میں بند کر دیں۔ ہمارے جانے کے بعد ان سے نمٹتے رہنا۔"

"تت تو، آپ کی ہدایت یہ ہے کہ انہیں ختم کر دیا جائے۔"

"ہاں، کیونکہ انہیں چھوڑا گیا تو تم نہیں بچ سکو گے اور تمہارا نقصان مجھے پسند نہیں۔ لیکن بھئی تم کانپ کیوں رہے ہو۔ اتنے تو منجھے ہوئے آدمی موجود ہیں تمہارے پاس۔"

"بب، بات دراصل یہ ہے سر کہ میں نے ایسا کام کبھی نہیں کیا۔"

"تو اب کر لینا نا، اسی طرح تو تمہیں تجربہ ہو گا۔ اگر نہیں کرو گے تو یہ چارلس تمہیں پھانسی کے تختے پر لے جائیں گے۔"

"ہاں، یہ بھی ٹھیک ہے۔" اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری —

"بس اب انہیں کسی کمرے میں بند کرا دو، تاکہ ہم اطمینان سے رخصت ہو سکیں۔"

"لے جاؤ بھئی انہیں۔" سردار علیم نے بمشکل کہا۔

"لے جانے سے پہلے یہ بتا دیجیے — پروفیسر شعلان اور عبدالصمد کہاں ہیں؟"

"یہیں ہیں اور اب ہمارے ساتھ جا رہے ہیں۔" الثانیو مسکرایا۔

"انہیں اغوا کرنے کی آپ کو ایسی کیا خاص ضرورت پڑ گئی ؟"
"بہت ہی خاص ، اتنی کہ بتا نہیں سکتا" اس نے ہنس کر کہا۔
"ہمیں ہلاک کروا کے آپ کو کیا ملے گا۔ میں آپ کو اس سے بہتر ترکیب بتا سکتا ہوں" شوکی نے کچھ سوچ کر کہا ۔۔۔
"اس سے بہتر ترکیب ، کیا مطلب ؟" الٹانیو چونکا۔
"آپ اپنے اس ساتھی کو بھی اپنے ساتھ لے جائیے" یعنی سردار علیم صاحب کو ۔۔۔ اس طرح ہمیں ہلاک کرنے کی ضرورت نہیں رہ جائے گی "
"لیکن سردار علیم یہاں جو فرائض انجام دے رہے ہیں۔ وہ کون انجام دے گا" الٹانیو نے طنز بھرے لہجے میں کہا ۔
"اچھا ، چلیے جیسے آپ کی مرضی" شوکی نے مایوسانہ انداز میں کندھے اچکائے۔

چاروں غنڈے ان کی طرف بڑھے اور بازوؤں سے پکڑ کر انہیں کمرے سے لے چلے۔ ان کے دل بیٹھے جا رہے تھے۔ وہ سوچ رہے تھے ۔۔۔ کاش ، ہم اس وقت سردار علیم کی طرف آنے کا پروگرام نہ بناتے ، کیونکہ یہ پروگرام تو موت کا پروگرام بن گیا تھا۔

برآمدے میں چند قدم چلنے کے بعد ایک کمرے میں انہیں دھکیل کر دروازہ بند کر دیا گیا ۔

انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا ، جیسے کہہ رہے ہوں ، کیوں بھئی اب کیا کیا جائے ۔ تجربہ گاہ میں جانے کے بارے میں تو معلوم تھا اور وہ سب انسپکٹر کاشان کو لے کر وہاں پہنچ گیا تھا ، لیکن ان کے سردار علیم کے ہاں آنے کے بارے میں تو کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا اور ۔۔۔۔۔۔

اگر کوئی سوچ بھی لیتا تو بھی کیا فرق پڑتا۔ سردار علیم صاف کہہ دیتا کہ جی ہاں آئے ضرور تھے ، لیکن اسی وقت چلے گئے تھے۔ جلد ہی انہوں نے باہر ایک گاڑی کے سٹارٹ ہونے کی آواز سنی ؛ گویا الٹانیو پروفیسر عقلان کو لے کر جا رہا تھا اور وہ کمرے میں بند تھے ، بالکل بے بس ۔۔۔ انہیں جانے سے نہیں روک سکتے تھے۔ کچھ بھی تو نہیں کر سکتے تھے ۔ انہیں اپنی بے بسی پر رونا آ گیا۔

ایسے میں شوکی بولا :
"انسان کتنا بے بس ہے مالک ، کتنا مجبور ہے"

گاڑی کی رفتار مدھم ہوتے ہوتے بالکل ختم ہو گئی۔ انہوں نے خالی خالی نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور سر جھکا لیے۔ انہیں اپنے دل بیٹھتے محسوس ہوئے۔ ٹھیک ایک گھنٹے بعد کمرے کا دروازہ کھلا اور وہی چاروں غنڈے اندر داخل ہوئے ۔

"مسٹر الٹانیو دونوں قیدیوں کو لے کر سمندر کے ذریعے کسی نامعلوم مقام کی طرف روانہ ہو گئے ہیں" ایک نے گویا انہیں اطلاع دی ۔
"اوہ" ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا ۔
"اور اب تم چاروں کو روانہ ہونا ہے" دوسرا بولا۔
"کک ، کیا مطلب ؟" آفتاب نے چونک کر کہا۔
"ہم نے تمہیں بھی سمندر کے راستے ہی دوسری دنیا کی طرف روانہ کرنے کا پروگرام بنایا ہے ۔ امید ہے ، تمہیں یہ پروگرام پسند آئے گا۔"
"تت ، تم ۔۔۔ تت تم کرنا کیا چاہتے ہو"
"تمہیں سمندر میں دھکا دیں گے" ایک نے کہا۔ ساتھ ہی سردار علیم اندر داخل ہوا۔

وہ خزاں کے پتے کی طرح کانپنے لگے ۔ انہیں اس طرح کانپتے دیکھ کر جاکا بے رحمی سے ہنسا ۔

"ٹھیک ہے جاکے ، لیکن جو کچھ کرنا ہے ، جلدی کرو کہیں کوئی نیا گل نہ کھل جائے" سردار علیم کافی پریشان نظر آ رہا تھا۔
"جی بہتر ۔۔۔ ابھی لیجیے"
"یا اللہ ، ہم پر رحم فرما ۔۔۔ ہماری مغفرت فرما ۔ ہمیں قبر اور دوزخ کے عذاب سے محفوظ فرما" اشفاق نے تھر تھر کانپتی آواز میں کہا ۔
"یہ تم کس قسم کی دعائیں مانگ رہے ہو" اخلاق چلا اٹھا ۔
"کک ، کیوں ۔۔۔ میں کوئی غلط دعائیں مانگ بیٹھا ہوں" اس نے حیران ہو کر کہا۔
"بھئی ، یہ دعا کیوں نہ مانگی جائے کہ یا اللہ ہمیں ان کے شر سے محفوظ فرما"
"اوہ ہاں ، بالکل مانگی جا سکتی ہے ۔ کیوں نہیں مانگی جا سکتی" اشفاق خوش ہو کر بولا ۔
"تو پھر مانگو نا" شوکی جھلا اٹھا۔
"تم ، کیا تم رحم نہیں کر سکتے" آفتاب بولا ۔
"تم پر رحم کر کے خود پھانسی پر چڑھ جائیں" سردار علیم چمک کر بولا ۔
"ہاں ، بہتر تو یہی ہے" شوکی نے فوراً کہا۔
"کیا مطلب ، کیا بہتر ہے ؟"
"چار آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتارنے سے کیا یہ بہتر نہیں کہ ایک آدمی پھانسی کے تختے پر چڑھ جائے"
"بکو مت ، پھانسی کا خیال ہی رونگٹے کھڑے کر دینے کے لیے کافی ہے"
"اور آپ لوگ جو ہمیں پانی میں پھانسی دے رہے ہو" اشفاق تلملا کر بولا۔
"مجبوری ہے اور ہم کر ہی کیا سکتے ہیں" سردار علیم نے کندھے اچکائے ۔
"اچھا ، جیسے تمہاری مرضی ، لیکن اتنا سن لو ، اس دنیا میں آدمی جو کرتا ہے ۔ ویسا ہی بھرتا ہے ۔ تم بھی نہیں بچو گے" یہ کہتے ہوئے شوکی نے جیب میں ہاتھ ڈال دیا ۔

"کیا پستول نکالنے کا ارادہ ہے؟" جاکے نے مذاق اُڑانے والے لہجے میں کہا۔

"نہیں، ہم تم پر کیا پستول نکالیں گے۔ پستول ہمیں چلانا ہی کب آتا ہے۔ میں تو آنکھوں کے آنسو صاف کرنے کے لیے رومال نکال رہا ہوں۔"

ان الفاظ کے ساتھ ہی شوکی کے ہاتھ میں رومال نظر آیا۔

اسی وقت چاروں غنڈے ان کی طرف بڑھے۔

"اپنے ہاتھ کمر کی طرف کر لو۔"

انہوں نے لرزتے کانپتے ہاتھ کمر کے پیچھے کر لیے۔ ان غنڈوں کے مقابلے میں وہ کچھ بھی تو نہیں کر سکتے تھے۔ ہاتھ پیر چلانے کا بھی کوئی فائدہ نہیں تھا، لہٰذا چپ چاپ ہاتھ اور پیر بندھوا لیے۔ انہوں نے اسی پر بس نہیں کی۔ ان کے منہ رومال ٹھونس کر اوپر سے باندھ دیے گئے۔ اب تو انہیں موت سامنے نظر آنے لگی، لیکن اب بھی اندھیروں میں ڈوبتے ذہنوں کے ساتھ وہ سوچ رہے تھے، شاید کوئی مدد آ جائے— شاید انسپکٹر کامران رحمت کا فرشتہ بن کر نمودار ہو جائیں— شاید ان کے والد کو کسی طرح خبر ہو جائے اور وہ یہاں پہنچ جائیں، لیکن ان کے مارے کے سارے شاید دھرے رہ گئے۔

غنڈے انہیں کندھوں پر لادنے لگے۔

☆ ☆ ☆

انسپکٹر کامران مرزا کے فون کی گھنٹی بجی اور پھر بجتی ہی چلی گئی۔ یہاں تک کہ وہ جاگ گئے۔ لیٹے لیٹے ہی ریسیور اٹھایا اور نیند میں ڈوبی آواز میں بولے:

"ہیلو، کامران مرزا بول رہا ہوں۔"

یہ جملہ کہنے کے فوراً بعد وہ اچھل کر سیدھے ہو گئے— کیونکہ دوسری طرف ان کے ملک کے نائب صدر موجود تھے۔ وہ کہہ رہے تھے:

"مجھے افسوس ہے کامران مرزا، آپ کی نیند خراب کر رہا ہوں، لیکن معاملہ ایسا ہی ہے کہ میں صبح کا انتظار نہیں کر سکتا تھا۔"

"فرمائیے سر، میرے تو دن اور رات قوم اور ملک کے لیے وقف ہیں۔" وہ بولے۔

"فوری طور پر میرے پاس چلے آئیں۔ میں بے چینی سے آپ کا انتظار کر رہا ہوں۔"

"جی بہت بہتر— میں پہنچ رہا ہوں۔" دوسری طرف سے ریسیور رکھے جانے کے بعد وہ بھی اٹھ کھڑے ہوئے اور شہناز بیگم کو ہلاتے ہوئے بولے:

"بیگم، میں نائب صدر کے پاس جا رہا ہوں۔ انہوں نے اسی وقت بلایا ہے، ان تینوں کو بتا دینا۔"

"جی اچھا۔" وہ بولیں اور دروازہ اندر سے بند کرنے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

جوں ہی انسپکٹر کامران مرزا کمرے سے نکلے، انہوں نے آفتاب، آصف اور فرحت کو صحن میں تیار کھڑے پایا—

"خیر تو ہے، تم کہاں کے لیے تیار کھڑے ہو؟" ان کے لہجے میں حیرت در آئی۔

"آپ کے ساتھ جانے کے لیے۔" آفتاب مسکرایا۔

"تمہیں کس طرح پتا چلا کہ میں کہیں جا رہا ہوں۔" وہ بولے۔

"فون کی گھنٹی کی آواز نے ہمیں بتایا ہے۔" فرحت گنگنائی۔

"لیکن تمہیں یہ سن کر مایوسی ہوگی کہ میں تمہیں ساتھ نہیں لے جا سکتا، کیونکہ بلاوا نائب صدر صاحب کی طرف سے ہے۔ کوئی بہت ہی اہم معاملہ ہے۔ دوسرے یہ کہ انہوں نے صرف مجھے بلایا ہے۔" وہ جلدی جلدی بولے۔

"معاف کیجیے گا ابا جان، کیا انہوں نے خاص طور پر یہ کہا تھا کہ ہم تینوں کو ساتھ نہ لایا جائے۔"

"نہیں خیر، انہوں نے یہ تو نہیں کہا تھا۔" وہ تقریباً جھلا کر بولے۔

"اور کیا انہوں نے یہ کہا تھا کہ صرف اور صرف آپ آئیے، کسی اور کو ساتھ نہ لائیں۔"

"نہیں، انہوں نے یہ بھی نہیں کہا تھا۔" وہ بے چارگی کے عالم میں بولے۔

"تب پھر ہمیں ساتھ لے چلنے میں کوئی حرج نہیں۔ نائب صدر صاحب اعتراض نہیں کریں گے اور اگر وہ خاص بات ہماری موجودگی میں بتانا پسند نہیں کریں گے تو ہم الگ کمرے میں بیٹھ جائیں گے۔" فرحت نے جلدی جلدی کہا۔

"اچھا بابا، چلو۔" وہ تلملا کر بولے اور تینوں مسکراتے ہوئے ان کے پیچھے چلے۔

"امی جان، آپ اکیلی ڈریں گی تو نہیں۔" آفتاب ان کی طرف مڑا۔

"ڈر کس بات کا؟" وہ بولیں۔

"بعض لوگ بغیر کسی بات کے بھی ڈرتے رہتے ہیں، بلکہ ڈرنے میں وہ دوسروں کو بہت پیچھے چھوڑ جاتے ہیں یا یوں کہہ لیں ڈرنے کے معاملے میں کوئی دوسرا ان کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتا۔" وہ کہتا چلا گیا۔

"مجھے ڈر ہے، کہیں تم جیپ میں سوار ہونے سے نہ رہ جاؤ۔" فرحت جھنجلا اٹھی۔

"تمہیں شہر کے اندیشے میں دبلا ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہاں اپنی فکر شوق سے کر سکتی ہو۔" آفتاب جل کر بولا۔

"تم دونوں کھڑے بحث کرتے رہو، میں انکل کے ساتھ چلا۔"

آصف نے کہا اور جلدی سے دروازہ عبور کر گیا۔

"بڑے آئے اکیلے جانے والے۔" فرحت بولی۔

تینوں جب جیپ کے قریب پہنچے تو وہ بیرونی دروازے سے نکل رہی تھی۔ چلتی جیپ میں سوار ہونے کے لیے انہیں دوڑ لگانا پڑی — دوسرے ہی لمحے جیپ سڑک پر اڑی جا رہی تھی۔ سڑک سنسان تھی۔ اس لیے اس قدر تیز رفتاری خطرناک نہیں تھی۔

"آخر معاملہ کیا ہے ابا جان؟" آفتاب بے چین ہو کر بولا۔

"ابھی تک مجھے کچھ بھی معلوم نہیں۔ نائب صدر صاحب سے مل کر ہی کچھ معلوم ہو سکے گا۔"

"کیا وہ بہت پریشان تھے؟" فرحت نے پوچھا۔

"ہاں، آواز سے پریشانی تو ٹپک رہی تھی۔"

"خدا اپنا رحم فرمائے — رات کے وقت آواز سے پریشانی ٹپکنا کچھ اچھا نہیں ہوتا۔" آفتاب بڑبڑایا۔

"کیا مطلب؟" فرحت چونک کر بولی۔

"کس بات کا مطلب پوچھ رہی ہو۔ پریشانی کا یا ٹپکنے کا؟" آفتاب نے حیران ہو کر کہا۔

"تمہارے سر کا۔" وہ جھنا کر بولی۔

"میرے سر کی کیا بات ہے۔ دنیا کے لیے ایک عجوبہ چیز ہے۔ وہ وہ معلومات بھری ہیں اس میں کہ کیا کسی انسائیکلوپیڈیا میں ملیں گی۔ تم اسے چلتا پھرتا عالمی معلومات کا خزانہ کہہ سکتی ہو۔"

"تمہارے سر سے تعارف حاصل ہو گیا — بہت بہت شکریہ۔ سنبھال کر رکھنا اپنے اتنے قیمتی سر کو — کہیں غیر ملکی جاسوسوں کی کوئی پوری ٹیم اسے اڑانے پر نہ تل جائے۔"

"ارے باپ رے، اگر کوئی بین الاقوامی مجرم اس مہم پر نکل کھڑا ہوا تو کیا ہو گا۔" آصف کانپ کر بولا۔

"کس مہم پر؟" آفتاب نے جھنا کر کہا۔

"اسی تمہارے سر کی مہم پر۔"

"ہو گا کیا، میرے سر کے ساتھ تمہارے سر بھی جائیں گے کام سے۔" اس نے آصف کو گھورا۔

"دیکھو بھئی، ہم اس وقت جیپ میں سفر کر رہے ہیں۔ لڑ نہ پڑنا۔" انسپکٹر کامران مرزا مسکرائے۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے ......"

عین اسی وقت انسپکٹر کامران مرزا نے بریک لگائے۔ انہیں ایک زوردار جھٹکا لگا۔ وہ بوکھلا کر رہ گئے۔

"خیر تو ہے انکل؟"

"نظر تو آ رہی ہے — سڑک بند کر دی گئی ہے۔ بڑے بڑے پتھر رکھے ہیں اس پر۔" وہ بڑبڑائے۔ پھر اچانک جیپ کو بیک گیئر میں ڈال کر پیچھے لے جانے لگے۔

"یہ کیا، آپ تو پیچھے ہٹ رہے ہیں۔"

"دیکھو بھئی، اس وقت دشمنوں سے الجھنا مناسب نہیں۔ پہلے نائب صدر صاحب سے ملنا ضروری ہے۔ ہو سکتا ہے، یہ رکاوٹ اس لیے کھڑی کی گئی ہو کہ ہم ان تک دیر سے پہنچیں۔" وہ بولے۔

"اوہ، لیکن آپ تو واپس جا رہے ہیں۔" آصف نے کہا۔

"میں ایک اور سڑک سے جانے کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔"

"خیر سوچ لیجیے — سوچنے میں حرج ہی کیا ہے۔" آفتاب بولا۔

جلد ہی وہ دوسری سڑک پر جا رہے تھے۔

"اور اگر انہوں نے اس سڑک پر بھی رکاوٹ کھڑی کر رکھی ہو۔" فرحت نے پریشان ہو کر کہا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ تو یہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ ہم ان سے الجھے بغیر پیچھے ہٹ جائیں گے، کیونکہ ہماری طبیعت اور اصول کے خلاف ہے۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"اب تو میں بھی یہ محسوس کر رہا ہوں کہ معاملہ بہت سنگین ہے۔" آفتاب بولا۔

"خدا کا شکر ہے۔ تم بھی یہ بات محسوس کر رہے ہو۔ میری کتنی زبردست خواہش تھی کہ تم بھی کبھی اس قسم کی بات محسوس کرو۔" آصف نے مذاق اڑانے والے لہجے میں کہا۔

"کیا مطلب، میں سمجھا نہیں۔ تم کیا کہنا چاہتے ہو۔"

"ابھی ابھی تو اپنے سر کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملاتے جا رہے تھے اور اب ایک معمولی سی بات نہیں سمجھ سکے۔ لاحول ولا قوۃ۔" آصف نے برا سا منہ بنایا۔

"وہ تعریف تو فرضی تھی۔ تم اتنا بھی نہیں جانتے۔" فرحت نے آصف کو گھورا۔

"کتنا؟" آصف فوراً بولا۔

"بھئی، آج کل لوگ صرف فرضی تعریف کرتے ہیں۔ کوئی چیز یا شخص تعریف کے قابل ہو نہ ہو، بس تعریفیں کیے جاتے ہیں۔ اسی طرح بڑے افسروں کو خوش کرنے کے لیے چھوٹے افسر بے جا تعریفوں کے پل باندھتے رہتے ہیں۔ یہ بناوٹ کی دنیا ہے، خالص بناوٹ کی۔" فرحت روانی کے عالم میں کہتی چلی گئی۔

"لیجیے، اب بناوٹ بھی خالص ہونے لگی، اف اللہ۔" آفتاب نے گھبرا کر کہا۔

لیکن یہ اف اللہ اس جھٹکے کی وجہ سے نکلا تھا جو انہیں لگا تھا —

"اب کیا ہوا ابا جان؟"

"معلوم ہوتا ہے، نائب صدر صاحب کی طرف جانے والے تمام راستوں کی ناکہ بندی کی گئی ہے۔ یہاں بھی پتھر موجود ہیں۔"

"یہ لوگ تو واقعی ہمارے راستے کا پتھر ثابت ہو رہے ہیں۔ اب تو ان کا بندوبست کرنا ہی ہو گا۔" فرحت بڑبڑائی۔

"یہی تو مشکل ہے۔ ہم مدد نہیں منگا سکتے۔ نائب صدر صاحب نے جس انداز میں فون کیا، اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ

اس معاملے میں کسی اور کو شریک نہیں کرنا چاہتے۔ بس صرف مجھ سے بات کرنا چاہتے ہیں — ہاں، یہ ہو سکتا ہے، وہ تم لوگوں کی موجودگی پر اعتراض نہ کریں"۔

"پھر اب کیا کیا جائے؟"

"اگر میں ان لوگوں سے الجھا، تو وقت ضائع ہو گا۔ ادھر نائب صدر صاحب بے چینی سے میرا انتظار کر رہے ہیں۔ کیا کیا جائے"۔

"ان لوگوں سے الجھنے کے لیے ہمیں چھوڑ جائیں اور آپ ان کی طرف چل پڑیں"، آصف بولا۔

"لیکن کیسے چل پڑوں، جب کہ راستے بند ہیں"۔

"تب پھر پہلے نائب صدر سے مشورہ کر لیں"۔

"ہاں، یہ ٹھیک رہے گا"۔ یہ کہہ کر انہوں نے جیپ ایک بار پھر ریورس گیئر میں ڈال دی اور اس جگہ سے دور ہوتے چلے گئے، پھر جیپ کو سڑک کے کنارے روکتے ہوئے اس میں لگے فون پر رابطہ قائم کرنے لگے۔ آخر چند منٹ بعد سلسلہ مل گیا —

"ہیلو سر، یہ میں ہوں کامران مرزا"۔

"یہ کیا کامران مرزا۔ تم ابھی فون ہی کر رہے ہو۔ اس وقت تک تو میرے خیال کے مطابق آپ کو میرے پاس پہنچ جانا چاہیے تھا"۔

"جی، جی ہاں — آپ کا خیال ٹھیک ہے، لیکن الجھن یہ ہے کہ آپ تک آنے کے تمام راستوں پر رکاوٹیں کھڑی کر دی گئی ہیں۔ رکاوٹیں دور کرنے کے چکر میں پڑا تو لیٹ ہو جاؤں گا — ان حالات میں آپ سے مشورہ کرنا ضروری تھا — اس لیے فون کرنا پڑا — اس وقت تک میں دو سڑکیں آزما چکا ہوں"۔

"اف خدا، یہ میں کیا سن رہا ہوں"۔ انہوں نے کانپ کر کہا۔

"جی بس، یہی وجہ ہے کہ میں اب تک پہنچ نہیں سکا"۔

"خیر پولیس کی مدد حاصل کر لی جائے۔ میں آپ کا انتظار کروں گا"۔ انہوں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

ایک دوسری ترکیب ہے۔ جس پر عمل کرنے کی صورت میں وقت ضائع نہیں ہو گا"۔ انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"اور وہ کیا؟" نائب صدر بولے۔

"یہ کہ آپ فون پر ساری بات بتا دیں"۔

"نہیں بھئی، میں اسے مناسب نہیں سمجھتا — فون پر ہونے والی گفتگو بہت آسانی سے سنی جا سکتی ہے۔ جن لوگوں کو یہ تک معلوم ہے کہ میں آپ کو بلانے والا ہوں۔ انہوں نے صرف سڑکوں پر ہی رکاوٹیں کھڑی نہیں کی ہوں گی، فون بھی ٹیپ کیے ہوں گے۔ میں تو حیران اس بات پر ہوں کہ یہ ہو کیا رہا ہے"۔

"تب پھر آپ کی ترکیب پر ہی عمل کیا جائے گا۔ مطمئن رہیے"۔

اب انہوں نے کچھ دوسرے لوگوں کو فون کیے۔ انہیں ہدایات دیں اور اسی جگہ رک کر انتظار کرنے لگے۔ آخر آدھ گھنٹے بعد شاہد کا فون ملا۔

"رکاوٹیں دور کر دی گئی ہیں اور پوری سڑک پر پولیس کا قبضہ ہے۔ اب آپ بلا کھٹکے آ سکتے ہیں"۔

"پہلے مجھے تفصیل سناؤ — کیا کچھ لوگوں نے مقابلہ کیا تھا"۔

"جی نہیں، آس پاس کوئی بھی موجود نہیں تھا"۔ اس نے بتایا۔

"تب وہ لوگ پولیس کی بھاری تعداد دیکھ کر رفوچکر ہو گئے ہوں گے"۔ انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"جی ہاں، ایسی ہی بات نظر آتی ہے"۔

"چلو خیر، ہم آ رہے ہیں"۔

اس بار وہ کسی خطرے کا سامنا کیے بغیر ایوانِ صدر تک پہنچ گئے۔

"کیا ہم بلا وجہ ڈرتے رہے ابا جان"۔ آفتاب بولا۔

"نہیں بھئی، دشمن سڑک کے دونوں طرف موجود تھا، لیکن جب اس نے پولیس کو دیکھا تو محسوس کر لیا، ہم ان کی امیدوں پر پورے نہیں اترے۔ انہوں نے تو سوچا تھا، سڑک پر رکاوٹ دیکھ کر ہم اندھا دھند جیپ سے اتر پڑیں گے اور اس طرح ان کی زد پر آ جائیں گے — مجھے اگر ان سے الجھے بغیر نائب صدر صاحب تک جانے کی جلدی نہ ہوتی تو شاید کرتا بھی یہی"۔

"چلیے خدا کا شکر ہے"۔

نائب صدر طوسی بہادر صاحب نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ان کے چہرے پر فکرمندی کے آثار صاف نظر آ رہے تھے۔

"معلوم ہوتا ہے، کوئی بڑی گڑبڑ ہو گئی ہے"۔ انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"ہو سکتا ہے، ایسی ہی بات ہو — خیر آؤ، بیٹھ کر بات کریں گے"۔ وہ بولے۔

ایک شاہانہ کمرے میں صوفوں پر بیٹھنے کے بعد انسپکٹر کامران مرزا نے کہا:

"پہلے تو میں اس بات کی معافی چاہوں گا کہ ان تینوں کو بھی ساتھ لے آیا ہوں"۔

"اس میں معافی چاہنے کی کیا بات ہے۔ میں تو خود فون پر کہنا بھول گیا تھا کہ انہیں ضرور ساتھ لائیے گا۔ سچ تو یہ ہے کامران مرزا، آپ ان کے بغیر کچھ ادھورے ادھورے لگتے ہیں"۔

"خیر سر، ایسی تو کوئی بات نہیں۔ کیونکہ ہم ان کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں"۔ آفتاب نے شرما کر کہا۔

"خیر جناب، معاملہ کیا ہے۔ ہم بہت پریشان ہیں"۔

"معاملہ عجیب و غریب ہے۔ ملک کے شمالی حصے میں ہمارے بہت اہم سائنس دان پروفیسر عقلان خان رہتے ہیں۔ وہیں ان کی تجربہ گاہ ہے۔ انہیں تجربہ گاہ سے ابھی تھوڑی دیر پہلے اغوا کر لیا گیا ہے اور اغوا کرنے والے کا نام الٹیغو بتایا جاتا ہے"۔

"کیا؟" وہ اچھل پڑے۔

☆ ☆ ☆

چند لمحوں کے لیے موت کی خاموشی طاری ہو گئی۔ آخر انسپکٹر کامران مرزا بولے:

"الٹانیو اور ہمارے ملک میں — تب یہ کوئی بڑا معاملہ ہے۔"

"یہ تو اس سے بھی ظاہر ہے کہ پروفیسر عقلان کو اغوا کیا گیا ہے۔"

"کیا آپ کچھ اور تفصیل نہیں بتائیں گے؟"

"ہاں، کیوں نہیں — صدرِ مملکت نے مجھ سے فون پر تفصیلی بات کی ہے اور انہوں نے ہی ہدایات دی تھیں کہ اس معاملے میں آپ سے بات کی جائے۔"

"میں شکر گزار ہوں — مہربانی فرما کر تفصیل بتائیے۔"

"تفصیل حد درجے عجیب و غریب ہے۔ ہمارے ملک کے تمام بڑے سائنس دان سات ماہ پہلے ایک نامعلوم منزل کی طرف روانہ کیے گئے تھے۔ وہ وہاں چھ ماہ تک رہے۔ یہ اس قدر خفیہ طور پر ہوا کہ ان کی جگہ ان کے میک اپ میں دوسرے آدمی ان کی جگہوں پر رہے۔ اس طرح کسی کو کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ گھر کے لوگوں کو ساری بات بتا دی گئی تھی، ورنہ وہ لوگ تو بھانپ ہی سکتے تھے کہ ان کے عزیز کی جگہ نقلی آدمی موجود ہے — چھ ماہ بعد سائنس دان واپس آ گئے اور ابھی انہیں واپس آئے ایک ماہ بھی نہیں ہوا کہ ہم نے پروفیسر عقلان کے اغوا کی خبر سن لی۔ اغوا بھی عجیب و غریب حالات میں ہوا۔ الٹانیو وہاں ایک پیر فقیر کے بھیس میں موجود رہا۔ اس نے اپنے شعبدوں سے بڑے بڑے افسروں کو دام میں پھانسا، لیکن یہ بات معلوم نہ کر سکا کہ پروفیسر عقلان چھ ماہ تک کہاں رہے اور کیا کرتے رہے۔ آخر وہ پروفیسر کو اغوا کر کے لے گیا۔ اس سلسلے میں وہاں کے چار لڑکوں کا نام بھی لیا جا رہا ہے۔ انہیں درمیان میں ڈال کر الٹانیو نے اپنا کام نکالا۔"

"کیا مطلب؟ کیا وہ الٹانیو کے ساتھ ملے ہوئے تھے؟" آصف نے حیران ہو کر کہا۔

"نہیں، وہ محب وطن ہیں۔ ان کے ذریعے تو دھوکے سے اس نے صرف یہ معلوم کرنے کی کوشش کی تھی کہ پروفیسر کہاں غائب رہا اور کیوں، لیکن وہ یہ بات معلوم نہ کر سکا اور اب وہ پروفیسر سمیت غائب ہیں۔"

"اوہ۔" ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا، پھر انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"اب آپ کیا چاہتے ہیں — کیا ہم پروفیسر عقلان کی تلاش میں نکل کھڑے ہوں۔"

"نہیں، یہ وقت ضائع کرنے والی بات ہوگی۔ اس حصے کا محکمہ سراغرسانی ان کی تلاش کے سلسلے میں ہاتھ پاؤں مار ہی رہا ہے۔ آپ کو تو اس لیے تکلیف دی گئی ہے کہ سائنس دانوں کی اس مہم میں ہمارے پروفیسر غوری بھی تھے۔"

"ارے۔" وہ چونک کر بولے۔

"میں سوچ رہا ہوں، کہیں انہیں بھی اغوا کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔"

"ہم اسی وقت ان کی تجربہ گاہ پہنچ جاتے ہیں، لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ سائنس دان آخر کس مہم پر روانہ ہوئے تھے اور چھ ماہ تک وہ وہاں کیا کرتے رہے؟"

"میں نے صدر صاحب سے یہ سوال پوچھا تھا۔ انہوں نے صرف اتنا بتایا کہ ہمارے بہت ہی قریبی دوست ملک کے صدر مسٹر مین بھنڈارا صاحب کی خواہش پر ایسا کیا گیا تھا۔ تفصیلات تو انہیں بھی معلوم نہیں ہیں۔"

"جی، کیا مطلب، یعنی ہمارے صدرِ مملکت کو بھی معلوم نہیں کہ ہمارے ملک کے سائنس دان کہاں گئے اور کیوں گئے تھے۔" انسپکٹر کامران مرزا حیرت زدہ رہ گئے۔

"ہاں، انہیں بھی معلوم نہیں ہے اور یہی اس معاملے کا سب سے عجیب پہلو ہے۔"

"لیکن وہ دوست ملک کے صدر صاحب سے معلوم تو کر سکتے ہیں؟"

"ضرور کر سکتے ہیں، لیکن مسٹر مین بھنڈارا کچھ بتانے کے لیے تیار نہیں — ان کا کہنا ہے، اس طرح معاملہ راز نہیں رہے گا۔"

"کیا؟" وہ دھک سے رہ گئے۔

"ہاں، اب آپ سوچ ہی سکتے ہیں کہ حالات کس قدر سنگین ہیں۔"

"حد درجے — ہمیں پہلی فرصت میں پروفیسر غوری کو ہوشیار ہو جانے کے لیے فون کرنا چاہیے تھا۔" انسپکٹر کامران مرزا بے چین ہو کر بولے۔

"یہ کام میں کر چکا ہوں۔" طوسی بہادر بولے۔

"تب پھر ہم ان کے پاس چلتے ہیں اور دیکھتے ہیں، اس سلسلے میں کیا کیا جا سکتا ہے۔"

"ٹھیک ہے، میں نے یہ سب باتیں فون پر اس لیے نہیں بتائیں کہ فون کی گفتگو سنی جا سکتی تھی۔"

"آپ نے اچھا ہی کیا۔ اب ہمیں اجازت دیجیے۔"

"ٹھیک ہے، خدا حافظ۔"

وہ پروفیسر غوری کی طرف روانہ ہوئے۔ چاروں چپ چپ تھے۔ معاملہ انتہائی پراسرار نظر آ رہا تھا — پروفیسر غوری کی تجربہ

گاہ انہیں تاریکی میں ڈوبی ملی۔ دھک دھک کرتے دلوں کے ساتھ وہ آگے بڑھے۔ تمام دروازے کھلے پڑے تھے۔ روشنی کی گئی اور پھر یہ بات جاننے میں انہیں دیر نہ لگی کہ پروفیسر غوری کو بھی اغوا کیا جا چکا ہے۔ ان کے محافظ اور دوسرے لوگ مکمل طور پر بے ہوش پڑے تھے۔ انسپکٹر کامران مرزا نے فوراً ماہرین کو فون کیے۔ آدھ گھنٹے بعد پوری تجربہ گاہ میں چہل پہل نظر آ رہی تھی۔ بے ہوش لوگ ہوش میں آ چکے تھے۔ ان لوگوں کو انسپکٹر کامران مرزا ایک الگ کمرے میں لے گئے۔

"آپ لوگ اغوا کی تفصیلات بتائیے۔"

"جی تفصیلات — افسوس، ہم تو کچھ بھی بتانے کے قابل نہیں۔"

"کیا مطلب؟" وہ چونک کر بولے۔

"مطلب یہ کہ ہم اپنی اپنی ڈیوٹی انجام دے رہے تھے کہ ایک تیز گیس نتھنوں میں گھسی اور ہم بے ہوش ہو گئے۔ ہم میں سے کسی کو کچھ بھی معلوم نہیں کہ اغوا کرنے والا کون تھا۔ وہ کس طرح اندر داخل ہوا۔"

"اوہ۔" انسپکٹر کامران مرزا مایوس ہو کر اس کمرے سے نکل آئے۔

"کم از کم یہ کام الٹانو کا نہیں ہو سکتا — کیوں کہ جس وقت پروفیسر غوری کو اغوا کیا گیا، اس سے کچھ ہی دیر پہلے پروفیسر عقلان کو اغوا کیا گیا تھا اور اتنی سی دیر میں الٹانو کسی بھی طرح یہاں نہیں پہنچ سکتا تھا — لہٰذا یہ کام کسی اور کا ہے۔" انہوں نے کہا اور ایک بار پھر فون پر جٹ گئے — انہوں نے اپنے آدمیوں کو چاروں طرف پھیل جانے کی ہدایات دیں — ٹھیک ایک گھنٹے بعد انہیں اطلاع ملی کہ ایک سفید وین کو ساحلِ سمندر کی طرف جاتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔ اس کا رخ بے آباد ساحل کی طرف تھا؛ چنانچہ انہوں نے پھر فون پر ہدایات دیں — اور جیپ میں بیٹھ کر سمندر کی طرف روانہ ہو گئے۔ ان کی جیپ اڑی جا رہی تھی — ایسے میں انہوں نے کہا:

"دشمنوں نے اس بار بہت کاری وار کیا ہے اور میں ملک کے مغربی حصے کے لیے فکرمند ہوں۔ مجھ سے بڑی غلطی ہوئی۔ انسپکٹر جمشید کو فون کے ذریعے خبردار کیا جا سکتا تھا — مگر نہیں، صدر صاحب نے پہلے ہی اس خطرے کو بھانپ لیا تھا، لہٰذا انہوں نے انسپکٹر جمشید اور پروفیسر داؤد صاحب کو خبردار کر دیا ہوگا۔"

"گویا وہ لوگ بھی اس وقت میدان میں ہوں گے۔" آصف پرجوش لہجے میں بولا۔

"ہاں یقیناً۔" انہوں نے کہا۔

"کیا قدرت ایک بار پھر ہمیں ایک جگہ جمع کرنے پر تلی ہے۔" آفتاب نے حیرت زدہ لہجے میں کہا۔

"لیجیے، اب قدرت بھی کسی بات پر تلنے لگی۔" فرحت نے منہ بنایا —

"خیر، میں موقع ملتے ہی فون کروں گا۔"

"آپ کے خیال میں پروفیسر غوری کو اگر الٹانو نے اغوا نہیں کیا، تو پھر کس نے کیا ہے؟"

"کچھ کہہ نہیں سکتا — یہ تو ہو نہیں سکتا کہ الٹانو خود تو شمالی حصے کی طرف چلا گیا ہو اور ادھر اس نے اپنے کسی ماتحت کو بھیج دیا ہو۔"

"اور میں تو حیران ہوں کہ ہمارے سائنس دانوں کو دوست ملک کے صدر نے کہاں بلایا تھا اور کیوں بلایا تھا — چھ ماہ تک وہ کیا کرتے رہے — چھ ماہ کوئی تھوڑا سا عرصہ نہیں ہے۔ حیرت تو یہ ہے کہ ان کی غیر حاضری بالکل پوشیدہ رہی۔"

"لیکن اس کے باوجود الٹانو جیسے لوگوں سے چھپی نہ رہ سکی۔ اور وہ لوگ یہ جاننے کے لیے نکل کھڑے ہوئے کہ انہیں چھ ماہ تک کہاں رکھا گیا اور کیا کرتے رہے۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں صرف یہی بات جاننے کے لیے انہیں اغوا کیا گیا ہے۔"

"خدا خیر کرے — کہیں پروفیسر داؤد بھی اغوا نہ کر لیے گئے ہوں۔"

ویران ساحل پر ایک طاقت ور لانچ تیار کھڑی تھی — انہوں نے جیپ کو ساحل پر ہی چھوڑا اور لانچ میں روانہ ہو گئے۔

"پوری رفتار پر چلو — ہم سے پہلے کتنی لانچیں روانہ ہو چکی ہیں؟" انہوں نے پوچھا۔

"چھ لانچیں — وہ ایک گھنٹے کے اندر اندر دو سو کلومیٹر مربع سمندر کو چھان ماریں گی۔"

"لیکن ہو سکتا ہے، دشمن اس سے پہلے ہی دو سو کلومیٹر مربع سے باہر نکل جائے۔"

"امکان میں جو کچھ ہے، اس پر عمل شروع کیا جا چکا ہے۔"

"اور وہ ....."

اسی وقت انہوں نے سروں پر ہیلی کاپٹر کی آواز سنی — انہوں نے چونک کر اوپر دیکھا —

"میں یہی کہنے والا تھا کہ ہیلی کاپٹر اب تک کیوں نہیں پہنچا۔ لیکن پائلٹ ہماری اور دشمن کی لانچ میں فرق کیسے کر سکے گا؟"

"اس کی تدبیر کر لی گئی ہے۔ لانچ پر گہرے نیلے رنگ کا جھنڈا دیکھ رہے ہیں آپ — ہماری ساتوں لانچوں پر جھنڈے لہرا رہے ہیں — جھنڈے کے بغیر جوں ہی کوئی لانچ نظر آئے گی، پائلٹ ہمیں اشارہ دے گا اور ہم ساتوں لانچوں کے ذریعے اسے گھیرے میں لے لیں گے، آپ فکر نہ کریں، وہ بچ کر نہیں جا سکتے۔"

"ٹھیک ہے، اب مجھے کچھ اطمینان ہوا۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔ وہ سمندر میں آگے ہی آگے بڑھتے رہے۔ آخر پینتالیس منٹ بعد ہیلی کاپٹر کی طرف سے اشارے موصول ہونا شروع ہوئے۔

"وہ مارا — اس نے جھنڈے کے بغیر لانچ دیکھ لی ہے اور

سمت بتا رہا ہے۔ اب ہم اسے گھیرے میں لیں گے"

"لیکن بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔ وہ جو کوئی بھی ہے، بہت خطرناک ہے"

"آپ فکر نہ کریں"

"دوسرے یہ کہ اس کے ساتھ لانچ پر پروفیسر غوری بھی ہیں، لہٰذا ہم اس پر فائرنگ نہیں کر سکتے۔ یہ بات اسے بھی معلوم ہے اور وہ اس چیز کو ڈھال بنا سکتا ہے" انسپکٹر کامران مرزا نے فکرمندانہ لہجے میں کہا۔

"اوہ۔ اس پہلو کی طرف ہم توجہ نہیں دے سکے، پھر اب کیا ہوگا" ڈرائیور بوکھلا کر بولا۔

"خیر دیکھا جائے گا، پہلے اسے گھیرے میں تو لیا جائے"

پندرہ منٹ بعد وائرلیس پر اشارے شروع ہوئے اور آخر ڈرائیور نے کہا:۔

"اب وہ ہمارے گھیرے میں ہے۔ آپ دوربین کے ذریعے اسے دیکھ سکتے ہیں۔ ہم نے احتیاطاً گھیرا بہت بڑا رکھا ہے، تاکہ اگر اس کی طرف سے کوئی کارروائی ہو تو ہم محفوظ رہیں، لیکن اس نے گھیرے کے باوجود آہستہ ہونے کی کوشش نہیں کی۔ اس طرح اس سے آگے والی ہماری لانچیں خطرے میں ہیں۔ اب آپ فرمائیں، کیا کیا جائے" ڈرائیور کی آواز میں لرزش تھی۔

"دوربین مجھے دے دیں" انہوں نے کہا اور دوربین لے کر آنکھوں سے لگالی۔

"اگر ہم اس سمت میں آگے بڑھتے رہے تو اپنے ملک کی سمندری حدود سے بہت دور نکل جائیں گے۔ اس طرح اور بھی خطرے کی زد میں ہوں گے، لہٰذا اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ گھیرے کو تنگ سے تنگ تر کر دیا جائے۔ اس کے بعد میں اسے رکنے کا حکم دوں گا۔ اگر نہ رکا تو ہمیں اس کے خلاف محاذ کھولنا پڑے گا"

"تو پھر میں گھیرے کو تنگ کرنے کی ہدایات دیتا ہوں" ڈرائیور نے کہا اور وائرلیس پر جھک گیا۔

پندرہ منٹ بعد گھیرا تنگ ہو گیا اور دشمن لانچ انہیں صاف نظر آنے لگی۔

"تمہیں چاروں طرف سے گھیر لیا گیا ہے، لہٰذا بہتر یہی ہے کہ لانچ روک لو اور تمام لوگ عرشے پر ہاتھ اٹھا کر کھڑے ہو جائیں" انہوں نے بلند آواز میں کہا۔

"اور تمہارے لیے بہتر یہ ہے کامران مرزا کہ میرا راستہ چھوڑ دو، ورنہ ان ساتوں لانچوں کے پرخچے اڑ جائیں گے اور تم کہیں کے نہیں رہو گے" ایک جانی پہچانی سی آواز سنائی دی۔

"ارے، یہ کس کی آواز ہے بھلا" آفتاب چونک کر بولا۔

"وہ آواز کو کسی قدر بدل کر بول رہا ہے، تاہم مجھے یقین ہے، یہ آواز الشانو کی کسی صورت نہیں ہو سکتی" آصف نے کہا۔

"ہاں، میرا بھی یہی خیال ہے، لیکن فی الحال تم لوگ خاموش رہو۔ مجھے اس سے بات کرنے دو"

"جی بہتر" آفتاب نے فوراً کہا۔

"ہم ختم تو ہو سکتے ہیں، تمہیں جانے کی اجازت نہیں دے سکتے۔ خاص طور پر اس صورت میں کہ تم پروفیسر غوری کو اغوا کر کے لیے جا رہے ہو" انسپکٹر کامران مرزا پرجوش لہجے میں بولے۔

"پروفیسر غوری کچھ عرصہ بعد تم لوگوں میں واپس پہنچ جائیں گے۔ یہ میرا وعدہ ہے"

"کس کا وعدہ، کیا نام ہے تمہارا؟" آفتاب پھر بول پڑا۔

"اوہو، تو بچوں کو بھی ساتھ لے آئے کامران مرزا۔ ان سے مل کر خوشی ہوئی"

"لیکن ابھی ملے کہاں ہیں جناب، لانچ روک لیجیے، تاکہ مل لیں، پھر آپ یہ جملہ بڑی خوشی سے کہہ سکتے ہیں" آفتاب نے برا سا منہ بنایا۔

"میں سمجھا، باتوں باتوں میں تم لوگ نزدیک ہوتے جا رہے ہو۔ یہ خطرناک ہے۔ کامران مرزا، یہ بہت خطرناک ہے۔ اپنی لانچوں کو ایک طرف ہٹا لو۔ ورنہ..."

ان الفاظ کے ساتھ ہی ان کی سب سے اگلی لانچ میں ایک دھماکا ہوا اور اس کے پرخچے اڑ گئے۔ وہ تھرا اٹھے۔ پروفیسر غوری کی وجہ سے وہ فائرنگ کرنے سے مجبور تھے اور ان کی اسی مجبوری سے دشمن فائدہ اٹھا رہا تھا۔

"یہ۔ یہ تم نے اچھا نہیں کیا دوست" انسپکٹر کامران مرزا غرائے۔

"میں نے پہلے ہی خبردار کر دیا تھا۔ اگلی لانچ بالکل رک گئی تھی، اس لیے یہ قدم اٹھانا پڑا"

"اب معاملہ بہت سنگین ہو گیا ہے۔ میں رہ نہیں سکتا" انسپکٹر کامران مرزا نے دبی آواز میں کہا۔

"جی کیا مطلب، رہ نہیں سکتے۔ کس بات سے نہیں رہ سکتے"

"اس بات سے" انہوں نے کہا اور پانی میں چھلانگ لگا دی۔

"ارے ارے، یہ آپ کیا کر رہے ہیں" آفتاب بوکھلا اٹھا۔ لیکن اتنی دیر میں انسپکٹر کامران مرزا گہرائی میں جا چکے تھے۔ وہ سطح سمندر کو بغور دیکھتے رہے، لیکن انہیں آس پاس کہیں بھی ابھرتے نظر نہ آئے۔

"وہ اندر ہی اندر دشمن کی لانچ کی طرف جائیں گے۔ دشمن بھی ان کی یہ حرکت دیکھ چکا ہے، لہٰذا وہ شدید خطرے میں ہیں۔ ایسے میں میں اس لانچ پر کھڑا نہیں رہ سکتا" آفتاب نے پرجوش انداز میں کہا اور اس نے بھی پانی میں چھلانگ لگا دی۔

"آؤ آؤ، میں تمہیں دیکھ لوں گا" دشمن نے چہک کر کہا۔

وہ عرشے پر کھڑا انہیں ایک سایا سا نظر آ رہا تھا۔ چہرے کے نقوش تو بالکل نظر نہیں آ رہے تھے۔

"اب ہم کیا کریں فرحت؟" آصف بولا۔

"اگر ہم نے بھی چھلانگیں نہ لگائیں تو آفتاب بزدلی کا طعنہ دے گا اور اس طعنے کو برداشت کرنا آسان کام نہیں ہوگا۔ اس سے آسان کام تو یہ ہے کہ ہم بھی کود پڑیں۔" فرحت نے جلدی جلدی کہا۔

"یہ۔۔۔ یہ آپ لوگ کیا کر رہے ہیں۔۔۔ یہ تو موت کے منہ میں جانے کے برابر ہے۔" ڈرائیور نے بوکھلا کر کہا۔

"ہاں، اور موت کے منہ میں جانے کے برابر ہم پہلے بھی کئی کام کر چکے ہیں۔" آصف نے کہا اور چھلانگ لگا دی۔

"رہ گئی میں۔۔۔ تو جناب پائلٹ، میں یہاں رہ کر کیا کروں گی۔ جہاں باقی ساتھی گئے ہیں، وہیں میں جاتی ہوں۔"

"آپ لوگ کمال کے ہیں۔" اس نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔

"اب آپ جو بھی کہہ لیں۔" فرحت نے کہا اور سمندر میں کود گئی۔

اتنے میں انسپکٹر کامران مرزا نے عین دشمن لانچ کے آگے سر ابھارا، پھر تیزی سے تیر کر اس کے پہلو میں آ گئے؛ ورنہ لانچ سے ٹکرا جانا لازمی تھا۔ ایک بار پھر انہوں نے سر ابھارا اور لانچ کے کنارے پر ہاتھ ڈال دیا۔ دوسرے ہی لمحے ان کے ہاتھ پر کوئی نوکیلی چیز لگی۔۔۔ انہیں یوں لگا جیسے سارے جسم سے جان نکل گئی ہو۔۔۔

"ہم تیار ہیں کامران مرزا، پوری طرح تیار۔" دشمن نے طنزیہ لہجے میں کہا اور انسپکٹر کامران مرزا نے دوسرا ہاتھ بھی کنارے پر جما دیا، کیونکہ پہلا ہاتھ بے جان ہو کر رہ گیا تھا۔۔۔ یہ اور بات ہے کہ انہوں نے اسے کنارے سے اب بھی نہیں ہٹایا تھا۔ اچانک وہی نوکیلی چیز ان کے دوسرے ہاتھ میں پیوست ہو گئی اور ان کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا؛ تاہم لانچ کا کنارا انہوں نے اب بھی نہ چھوڑا اور دونوں ہاتھوں پر ایک کر لانچ میں سوار ہونا چاہا، لیکن ان کے سر پر کوئی بھاری چیز دے ماری گئی۔ وہ یک دم نیچے جھک گئے۔۔۔ ہاتھ اب بھی کنارے پر جمے تھے۔ ایسے میں گولی چلنے کا دھماکا ہوا اور لانچ کو ایک جھٹکا لگا۔

"یہ۔۔۔ کیا ہوا؟" دشمن نے چلا کر کہا۔

"پچھلی لانچوں میں سے ایک نے گولی چلائی ہے۔ ہماری لانچ میں سوراخ ہو گیا ہے۔"

"اوہو، یہ جرأت۔۔۔ ان لوگوں کو معلوم ہے، پروفیسر غوری اس لانچ پر موجود ہیں، پھر بھی انہوں نے فائر جھونک دیا۔ اڑا دو اس لانچ کو بھی۔"

"جی بہتر، لیکن سر ہمیں اپنی بھی فکر کرنی چاہیے۔ لانچ زیادہ دیر تک پانی کی سطح پر نہیں رہے گی۔"

"پہلے اس لانچ کو اڑا دو، پھر اپنا بچاؤ کرنا۔" دشمن نے غرا کر کہا۔

"او کے سر۔"

اس کے ان الفاظ کے ساتھ ہی پہلے جیسا ایک دھماکا ہوا۔ لیکن کسی لانچ کے پرخچے اڑنے کی آواز نہ گونج سکی۔

"یہ کیا ہوا، کیا تمہارا نشانہ چوک گیا۔"

"نہیں سر، فائر کرنے کے فوراً بعد لانچ دور ہونے لگ گئی تھی۔۔۔ سوراخ ہو جانے کی وجہ سے ہماری لانچ کی رفتار اب وہ نہیں رہی۔"

"گویا اب ہم ان لانچوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ افسوس، خیر، لانچ کو اپنے جزیرے کی طرف لے چلو اور ان میں سے کوئی لانچ راستے میں آئے، اسے اڑا دو۔"

"او کے سر۔"

اس دوران انسپکٹر کامران مرزا برابر اوپر چڑھنے کی کوشش میں مصروف رہے تھے، لیکن ان کی ہر کوشش ناکام بنا دی گئی۔۔۔ اتنے میں آفتاب، آصف اور فرحت بھی نزدیک پہنچ گئے۔

"ہم آ گئے ہیں ابا جان، کیا حکم ہے؟"

"اس لانچ میں معرکہ ہو جائے اور دشمن سے ٹکرا جاؤ۔" وہ چلا کر بولے۔

"بہت بہتر ابا جان۔" آفتاب نے کہا اور تینوں پچھلے حصے کی طرف بڑھے۔ جوں ہی انہوں نے ہاتھ لانچ کے کنارے پر جمائے، چپو کی قسم کا ایک ہتھیار ان کے سروں کی طرف بڑھا۔ انہوں نے فوراً ہاتھ ہٹا لیے اور ڈبکی لگا گئے اور اس کے ساتھ ہی لانچ ڈوبنے لگی۔

"یہ۔۔۔ یہ ڈوب رہی ہے سر۔" ڈرائیور چلایا۔

"تو تم لوگ بھی چھلانگیں لگا جاؤ۔ یاد رہے، ہمیں جزیرے کی طرف تیرنا ہے۔ پروفیسر غوری کو میں خود وہاں تک لے آؤں گا۔"

"او کے سر۔"

لانچ پر سے چھلانگیں لگا دی گئیں۔ اب انسپکٹر کامران مرزا نے بھی لانچ کو چھوڑ دیا۔۔۔ وہ تیزی سے نیچے جا رہی تھی۔۔۔ آفتاب، آصف اور فرحت بھی اس کے پاس سے ہٹ کر اس سمت میں چلے، جس سمت میں دشمن اور اس کے ساتھی جاتے نظر آئے تھے۔ ان کی ساتھی لانچیں اب ایک قطار میں ان کے پیچھے چلی آ رہی تھیں۔۔۔ اس حد تک انہیں کامیابی ضرور ہو چکی تھی کہ انہوں نے دشمنوں کی لانچ تباہ کر دی تھی اور پھر انہیں ایک گنجان درختوں میں گھرا جزیرہ نظر آنے لگا۔ دشمنوں پر اب بھی فائرنگ نہیں کی جا سکتی تھی۔ پروفیسر غوری ان کے ساتھ تھے۔ انہوں نے دشمن اور ان کے ساتھیوں کو جزیرے میں داخل ہوتے دیکھا۔ انسپکٹر کامران مرزا زخمی ہاتھوں کی وجہ سے تیزی سے نہیں تیر سکتے تھے، لہذا

آفتاب، آصف اور فرحت ان سے آگے نکل گئے اور عین اسی وقت جزیرے پر پہنچے جب دشمن پروفیسر غوری سمیت درختوں کے جھنڈ میں داخل ہو چکے تھے۔

"ٹھہر جاؤ، جلدی نہ کرو ۔۔۔ وہ لوگ اندر پہنچتے ہی پوزیشنیں لے چکے ہوں گے۔ مشکل یہ ہے کہ ہم ان پر فائرنگ نہیں کر سکتے اور وہ ہمیں بغیر کسی ہچکچاہٹ کے نشانہ بنا سکتے ہیں۔"

انسپکٹر کامران مرزا کی آواز نے انہیں رکنے پر مجبور کر دیا۔ اتنے میں وہ بھی کنارے پر پہنچ گئے اور انہوں نے انہیں سہارا دے کر اوپر کھینچ لیا۔ ان کے ہاتھ دیکھ کر وہ کانپ اٹھے۔ ان میں جگہ جگہ سے خون رس رہا تھا۔

"اس نے کیلوں والا جوتا پہن رکھا تھا۔" انسپکٹر کامران مرزا مسکرائے۔

"اوہ!" وہ کانپ کر رہ گئے۔

"آؤ، ہم درختوں کی اوٹ لے کر آگے بڑھ سکتے ہیں، لیکن نہیں، پہلے میں لانچوں کو ہدایات دے دوں۔" یہ کہہ کر وہ پھر سمندر کی طرف مڑے اور بلند آواز میں بولے:

"جزیرے کو چاروں طرف سے گھیر لو ۔۔۔ کوئی آدمی فرار نہ ہونے پائے۔"

"آپ فکر نہ کریں سر!" ڈرائیور کی آواز سنائی دی۔ شاید وہ انچارج تھا۔

اب وہ گھنے درختوں کی اوٹ لے کر آگے بڑھ سکتے تھے۔ جزیرہ بہت بڑا تھا اور دشمن ان کی نظروں سے اوجھل ہو چکے تھے، لہٰذا وہ آگے بڑھنے کے سوا کر ہی کیا سکتے تھے۔

"ابا جان، کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ آگے بڑھنے سے پہلے ہم آپ کے ہاتھوں پر رومال باندھ دیں۔ آپ کا خون برابر رس رہا ہے۔"

"نہیں، اس طرح وقت ضائع ہوگا۔ یہ جزیرہ پہلے سے دشمن کے قبضے میں ہے۔ میں انہیں اور مہلت نہیں دے سکتا۔"

"لیکن ہم ان کے خلاف کیا قدم اٹھا سکتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ آپ کے پاس ایک پستول ہوگا، لیکن وہ بھی بھیگ کر ناکارہ ہو گیا ہوگا۔"

"نہیں بھئی، میرے پاس ناکارہ پستول بھی نہیں ہے۔ ساتھ لینے کی مہلت ہی کب ملی تھی، لیکن فکر کی ضرورت نہیں۔ بڑھتے چلو ۔۔۔"

انہوں نے آگے بڑھنا جاری رکھا اور پھر وہ جزیرے کے عین درمیان میں پہنچ گئے ۔۔۔ انہوں نے دیکھا، وہاں ایک کھلا اور ہموار سا میدان تھا۔ اس میدان کے بیچوں بیچ پروفیسر غوری کھڑے تھے۔ ان کے ہاتھ کمر پر بندھے ہوئے تھے اور دونوں پیروں میں بھی رسی تھی۔ وہ سیدھے کھڑے تھے۔

"پروفیسر صاحب، کیا وہ لوگ آپ کو چھوڑ کر چلے گئے؟" آصف بول اٹھا۔

انہوں نے خالی خولی نظروں سے ان کی طرف دیکھا، جیسے الفاظ ان کی سمجھ میں ہی نہ آئے ہوں۔ ان کی آنکھوں میں دیکھ کر انسپکٹر کامران مرزا چونک اٹھے۔

"اوہو، انہیں تو کوئی نشہ آور دوا دی گئی ہے ۔۔۔ ان پر اس دوا کا اثر ہے، لہٰذا یہ اپنے ہوش و حواس میں نہیں اور نہ ہماری کسی بات کا جواب دے سکتے ہیں۔"

"تمہارا خیال ٹھیک ہے انسپکٹر کامران مرزا، یہ کوئی جواب نہیں دے سکتے۔ اس حالت میں بھی تم انہیں نہیں لے جا سکو گے۔ انہیں ہمارے ساتھ ہی جانا ہوگا ۔۔۔ رہ گئے تم، تو یہ تمہاری موت تھی جو تمہیں یہاں کھینچ لائی ہے۔ ان چھ لانچوں کی بھول میں نہ رہنا ۔۔۔ ایک بحری جہاز یہاں سے نزدیک ہی لنگر انداز ہے۔ اسے اشارا مل چکا ہے اور وہ جزیرے کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اب نہ تم لوگ بچ سکو گے اور نہ تمہاری لانچیں ۔۔۔ وہ ایک بہترین جنگی جہاز ہے اور ہر قسم کے اسلحے سے لیس ۔۔۔ اب اگر تم واپس جانے کی درخواست بھی کرو، تو میں منظور نہیں کروں گا۔ کیونکہ اس کا وقت گزر چکا ہے۔ واپسی کا وقت تو اس وقت تک تھا، جب تک کہ ہماری لانچ نہیں ڈوبی تھی۔"

یہ الفاظ سنسنی خیز تھے اور بولنے والا اس بار اپنی اصلی آواز میں بولا تھا ۔۔۔ انہوں نے اس آواز کو بالکل صاف پہچان لیا۔ وہ حیرت زدہ رہ گئے اور بوکھلا کر آواز کی سمت میں دیکھا، لیکن وہ انہیں کہیں بھی نظر نہ آیا۔ پروفیسر غوری ابھی تک بت بنا کھڑا تھا ۔۔۔ ایسے میں ان کے کانوں میں جنگی بگل کی آواز آنے لگی۔

وہ بوکھلا کر مڑے۔ سمندر میں کچھ ہی فاصلے پر ایک جنگی جہاز جزیرے کی طرف بڑھتا نظر آیا اور انہوں نے جان لیا کہ ان کے دشمن نے جو کچھ کہا تھا، غلط نہیں تھا۔

وہ واقعی شدید خطرے میں گھر چکے تھے ۔۔۔

☆ ☆ ☆

"ہمیں اپنی لانچوں کو بچانا ہوگا ۔۔۔ آؤ جلدی کرو۔" یہ کہتے ہی انسپکٹر کامران مرزا نے ساحل کی طرف دوڑ لگا دی۔ آفتاب، آصف اور فرحت نے ان کا ساتھ دیا ۔۔۔ الجھن بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ پروفیسر غوری کو آزاد کرانے نکلے تھے اور اب انہیں جزیرے میں کھڑا چھوڑ کر ساحل کی طرف بھاگ رہے تھے۔ جلد ہی انہوں نے لانچوں کے انچارج کو دیکھ لیا۔ وہ جہاز کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ جزیرے کی طرف مڑا اور انہیں دیکھتے ہی بولا:

"سر، ہم مارے گئے۔ جنگی جہاز ہر قسم کے اسلحے سے لیس ہے۔ آپ کیا حکم دیتے ہیں؟"

"آپ باقی لانچوں سمیت بھاگ نکلیں ۔۔۔" انسپکٹر کامران مرزا

ساحل کے نزدیک پہنچتے ہوئے بولے۔

"جی، کیا فرمایا۔ بھاگ نکلیں؟ اور آپ ....."

"ہماری فکر نہ کریں۔ جزیرے پر پروفیسر غوری دشمنوں کے ساتھ موجود ہیں۔ ہم انہیں دیکھ چکے ہیں، لہٰذا ہم انہیں ساتھ لیے بغیر کس طرح آ سکتے ہیں"

"آپ اتنی بڑی طاقت سے تنہا کس طرح نمٹیں گے۔ میں دیکھ رہا ہوں، آپ کے پاس تو ہتھیار بھی نہیں ہیں" انچارج کے لہجے میں بلا کی حیرت اور خوف تھا۔

"ہاں، یہ ٹھیک ہے۔ خیر آپ ہمیں چار پستول اور کچھ گولیاں دے دیں۔ باقی رہا یہ سوال کہ ہم اتنی بڑی طاقت سے کس طرح نمٹیں گے، تو یہ بعد کی بات ہے۔ اس سلسلے میں ابھی ہم نے کچھ بھی نہیں سوچا۔ آپ لانچوں کو خطرے میں نہ ڈالیں۔ ابھی وقت ہے، آسانی سے نکل سکتے ہیں۔ بس اب جائیے۔"

"تت۔ تو۔ کیا۔ آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہم بھی جنگی جہاز لے کر ان کے مقابلے میں آ جائیں" انچارج نے پستول ان کی طرف پھینکتے ہوئے کہا۔

"نہیں، آپ جا کر مدد لانے کی کوشش نہیں کریں گے۔ میں اپنے ملک کو جنگ کی آگ میں جھونکنا پسند نہیں کروں گا۔ اس سے یہ کہیں بہتر ہے کہ اپنی جانوں کو خطرے میں ڈال کر پروفیسر غوری کو چھڑانے کی کوشش کروں"

"جو حکم، کیا آپ اپنی مدد کے لیے لانچوں پر سے کچھ آدمی بھی لینا پسند نہیں کریں گے۔ میں آپ کو کم از کم پانچ آدمی تو دے ہی سکتا ہوں"

"نہیں، اس کی بھی ضرورت نہیں۔ جہاز لمحہ بہ لمحہ نزدیک ہوتا جا رہا ہے، آپ دیر نہ کریں"

"اوکے سر" اس کے ساتھ ہی انچارج لانچ کے اندرونی حصے میں چلا گیا۔ جلد ہی بگل کی آواز بلند ہوئی۔ یہ آواز عجیب سی تھی۔ اس سے رنج اور غم ٹپک رہا تھا۔ فوراً ہی انہوں نے لانچ کو جزیرے کے دوسری طرف جاتے دیکھا۔ انہیں دو اور لانچیں نظر آ رہی تھیں۔ وہ بھی اسی طرف کا رخ کرتی نظر آئیں۔

"اب آؤ اس طرف، جہاں ہم نے پروفیسر غوری کو دیکھا تھا جب تک جزیرے پر دشمن اور اس کے ساتھی موجود ہیں، جنگی جہاز ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا"

وہ مڑے اور تقریباً دوڑتے ہوئے وہاں پہنچے، لیکن اب یہاں پروفیسر غوری موجود نہیں تھے۔

"ہیلو مسٹر سلاٹر۔ یہ پروفیسر غوری کہاں چلے گئے؟" انسپکٹر کامران مرزا بلند آواز میں بولے۔

سلاٹر کی طرف سے کوئی جواب موصول نہ ہوا۔ چند سیکنڈ تک وہ سن گن لیتے رہے۔ آخر محتاط انداز میں آگے بڑھے۔

"انکل، کیا خبر وہ لوگ درختوں پر موجود ہوں"

"ہاں، ہو سکتا ہے، لیکن ہم کب تک ان کے ظاہر ہونے کا انتظار کرتے رہیں گے۔ کہیں سلاٹر کوئی چال نہ چل جائے۔ ہم آگے بڑھے بغیر نہیں رہ سکتے" انہوں نے جلدی جلدی کہا۔ درختوں کی اوٹ لیتے وہ بہت دور نکل آئے، لیکن سلاٹر اور اس کے ساتھیوں کے آثار انہیں کہیں بھی نظر نہیں آئے۔ ایسے میں فرحت نے چونک کر کہا:

"اف انکل، کہیں وہ جہاز کا رخ تو نہیں کر چکے"

"اوہ، یہ عین ممکن ہے" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"اور یہ اس طرح ہوا کہ ادھر تو ہم نے ساحل کا رخ کیا، ادھر انہوں نے قدرے چکر کاٹ کر اسی طرف کا رخ کیا۔ ہم لانچوں کو فرار کا حکم دے کر ادھر واپس آ گئے اور وہ لوگ جہاز پر سوار ہو گئے" آصف بولا۔

"ارے باپ رے، اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ سلاٹر پروفیسر صاحب کو اغوا کرنے میں کامیاب ہو گیا" فرحت نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"نہیں، یہ کس طرح ہو سکتا ہے" انسپکٹر کامران مرزا چلائے۔ اور جہاز کی طرف دوڑ لگا دی۔

چاروں دوڑتے ہوئے جب ساحل پر پہنچے تو جہاز دور ہوتا نظر آیا۔ انہوں نے عرشے پر سلاٹر کو کھڑے دیکھا۔ انسپکٹر کامران مرزا کو

اور تو کچھ نہ سوجھا، اس کا نشانہ لے کر فائر کر دیا۔ سلاٹر اپنی جگہ جوں کا توں کھڑا رہا۔ اس نے گولی سے بچنے کی ذرا بھی کوشش نہیں کی۔ انہوں نے دیکھا، گولی اس کے عین سینے پر لگی تھی۔ لیکن اس کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکی۔ ساتھ ہی سلاٹر کا قہقہہ فضا میں گونج اٹھا۔

"بس انسپکٹر کامران مرزا، تم ہار گئے۔ میں تمہارے ملک کے ایک بڑے سائنس دان کو تمہاری آنکھوں کے سامنے لیے جا رہا ہوں اور تم کچھ نہیں کر سکتے۔ سوائے بے بسی سے ہاتھ ملنے کے۔ خیر، تم آزادانہ ہاتھ مل سکتے ہو۔ جزیرے پر کوئی تمہیں دیکھنے والا نہیں" اس کا لہجہ حد درجے توہین آمیز تھا۔

انسپکٹر کامران مرزا کا چہرہ سرخ ہو گیا؛ تاہم انہوں نے فوراً غصے پر قابو پا لیا اور پرسکون آواز میں بولے:

"ٹھیک ہے مسٹر سلاٹر، اس وقت کی بازی تمہارے ہاتھ ہے لیکن تمہیں اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہونے دوں گا" وہ بولے۔

"مقصد، کامران مرزا تم کس مقصد کی بات کر رہے ہو" سلاٹر ہنسا۔

"پروفیسر غوری کے اغوا کے پیچھے تمہارا جو بھی مقصد ہے" وہ بولے۔

"تمہارے فرشتے بھی اس بات کی تہہ تک نہیں پہنچ سکتے کہ پروفیسر غوری کو کیوں اغوا کیا گیا ہے" سلاٹر بلند آواز میں بولا۔

"کم از کم میں یہ ضرور بتا سکتا ہوں کہ جس مقصد کے تحت پروفیسر عقلان کو اغوا کیا گیا ہے، اسی کے تحت پروفیسر غوری اغوا کیے جا رہے ہیں"

"لیکن اس نتیجے سے تم کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکتے"

"خیر، دیکھا جائے گا"

"میرا ایک مشورہ ہے کامران مرزا"

"چلو میں تمہارا مشورہ سنے لیتا ہوں" انسپکٹر کامران مرزا مسکرائے۔

"اپنے پستولوں میں ایک ایک گولی بچا لینا۔ جزیرے میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے سے بچ جاؤ گے"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ خودکشی کر لینا"

"لیکن خودکشی تو ہمارے مذہب میں حرام ہے۔ سلاٹر، حالات کچھ بھی ہوں، خودکشی نہیں کر سکتے" انہوں نے منہ بنایا۔

"تو کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ مدد آ جائے گی۔ میں نے تمہیں لانچ ڈرائیور کو حکم دیتے صرف سنا تھا۔ وہ مدد لے کر واپس نہیں آئے گا"

"ہاں ٹھیک ہے، لیکن تمہیں فکر میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہم ہاتھ پاؤں ابھی ہلا لیں گے"

"کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ تیر کر اپنے ملک کے ساحل تک پہنچ جاؤ گے۔ لیکن یہ فاصلہ اتنا کم نہیں، اچھا ٹاٹا" یہ کہتے ہوئے اس نے ہاتھ ہلا دیا۔ آخری مرتبہ انہوں نے سلاٹر کو صحرا میں بنائے گئے خفیہ فوجی اڈے پر دیکھا تھا اور وہیں سے یہ فرار ہو گیا تھا۔ اس بار اچانک نمودار ہوا تھا اور اچانک ہی ان کے ہاتھ سے نکلا جا رہا تھا۔ آفتاب، آصف اور فرحت کی آنکھیں ان پر جم گئیں۔

"ابا جان، اب کیا ہوگا؟" آفتاب نے حسرت زدہ لہجے میں کہا۔

"جہاز کے نظروں سے اوجھل ہونے تک ہم کچھ نہیں کریں گے" وہ بولے۔

"لیکن اس کے بعد بھی ہم کیا کر سکیں گے؟"

"پتا نہیں، میں پہلے سے کوئی بات کہنے کا قائل نہیں۔ یہ بات تم بھی جانتے ہو"

"ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے اس جزیرے کا انتخاب سلاٹر نے پہلے ہی کر لیا تھا"

"ہاں، وہ ہر قسم کے حالات کا سامنا کرنے کے لیے تیار تھا۔ جب کہ ہمیں تو اپنے ملک میں اس کی موجودگی کی خبر تک نہیں ملی۔ خیر، کوئی بات نہیں۔ زندگی میں ہونے والی ناکامیاں ہی ہمیں کامیابیوں تک پہنچاتی ہیں"

پانچ منٹ بعد جہاز نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

"تو بھئی تیار ہو جاؤ" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"جی، کس بات کے لیے تیار ہو جائیں"

"سمندر میں کود پڑنے کے لیے"

"تت تو کیا ہم تیر کر اپنے ملک کے ساحل تک جائیں گے" آصف نے بوکھلا کر کہا۔

"کیا احمقانہ بات ہے۔ بھلا ہم ایسا کیوں کرنے لگے" فرحت نے برا سا منہ بنایا۔

"کیا مطلب، کیسا کیوں کرنے لگے" آصف حیران ہو کر بولا۔

"ہم اپنے ملک کیوں جانے لگے۔ ہم تو اس جنگی جہاز کی طرف جائیں گے"

"دماغ تو نہیں چل گیا۔ حالات بھی ایسے ہی ہیں۔ ان حالات تمہارا دماغ نہیں تو کیا ہاتھ اور پیر چلیں گے" آصف بولا۔

"کیوں انکل، کیا میرا دماغ چل گیا ہے"

"نہیں تو، چل تو ان دونوں کا گیا ہے۔ بھلا ہم پروفیسر غوری کو سلاٹر کے قبضے میں چھوڑ کر اپنے ملک کے ساحل کی طرف جا سکتے ہیں، ہرگز نہیں"

"تت تو پھر" آفتاب نے ہکلا کر کہا۔

"پھر کیا، آؤ ابھی جہاز دور نہیں گیا۔ ہم سمندر کے پانی کے نیچے رہتے ہوئے اس تک پہنچ جائیں گے اور پھر جہاز پر چڑھنا ذرا بھی مشکل نہیں ہوگا"

"اور پھر جہاز پر موجود پوری فوج کا مقابلہ کرنا تو بالکل بھی مشکل نہیں ہوگا" آفتاب نے جھلا کر کہا۔

"اگر مشکل ہے تو کیا ہوا۔ ہم کر ہی کیا سکتے ہیں ــــ اب بسم اللہ کرو"

"بسم اللہ کرنے سے پہلے ہماری بات بھی سن لو"

ان کے پیچھے سے ایک آواز آئی۔ وہ بوکھلا کر مڑے، کیونکہ ان کے خیال میں تو جزیرے پر ان کے علاوہ کوئی شخص نہیں تھا۔

○

انہوں نے دیکھا، پانچ لمبے تڑنگے غنڈہ صورت آدمی ان کے سامنے کھڑے تھے۔ ہاتھوں میں ننگے خنجر تھے۔ چہروں پر سفاک مسکراہٹیں تھیں، آنکھوں سے طنز جھانک رہا تھا۔ شکل صورت سے غیر ملکی لگتے تھے، لیکن شاید ان کے ملک کی زبان بھی آسانی سے بول سکتے تھے۔

"تم کون ہو دوستو؟" انسپکٹر کامران مرزا فکر مندانہ لہجے میں بولے۔

"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ مسٹر سلاٹر کا خیال تھا، تم لوگ کہیں سمندر میں کود کر جہاز کا پیچھا کرنے کی کوشش نہ کرو، لہذا

انہوں نے ہمیں جزیرے پر ہی چھپے رہنے کی ہدایات دے دی تھیں، تاکہ تمہارا ایسا ارادہ دیکھ کر ہم راستے میں آ جائیں۔ جوں جوں وقت گزرتا جا رہا ہے۔ جہاز تم لوگوں سے دور ہوتا جا رہا ہے — واضح ہو کہ ہم خنجر پھینکنے میں بڑی مہارت رکھتے ہیں۔ ادھر تم نے ساحل کی طرف منہ کیے، ادھر تمہاری کمروں میں خنجر پیوست ہوئے — اب جزیرے کی طرف قدم اٹھاؤ، ہم اطمینان سے بیٹھ کر باتیں کریں گے۔"

"بہت اچھا دوستو، یہ بھی سہی۔" انسپکٹر کامران مرزا نے سرد آہ بھری۔

"ابا جان، کیا آپ مایوس ہو گئے۔"

"نہیں بھئی، مایوس ہونے کی کیا بات ہے۔ مایوسی تو گناہ ہے۔" انہوں نے کہا اور جزیرے کی طرف قدم اٹھانے لگے۔ تینوں نے ان کا ساتھ دیا۔

"بس تم پانچ ہی ہو، یا تمہارے ساتھ اور لوگ بھی ہیں۔"

"جزیرے پر ہم پانچ ہی ہیں، لیکن تم فکر نہ کرو۔ ہم تمہارے لیے بہت کافی ہیں۔" ان میں سے ایک نے کہا۔

"اچھا، اگر تم کہتے ہو تو نہیں کرتے فکر۔" آفتاب نے کہا۔

"انسپکٹر کامران مرزا، تمہارا یہ بیٹا تو عقل سے کچھ پیدل لگتا ہے۔"

"نہیں بھئی، میرے پاس موٹر سائیکل ہے۔" آفتاب بولا۔

"اوہو، اچھا۔"

ان الفاظ کے ساتھ ہی انسپکٹر کامران مرزا ریت پر دھڑام سے گرے اور انہوں نے ریت دونوں ہاتھوں سے اپنے پیچھے اچھال دی۔ ہوا کا رخ بھی ساحل کی طرف تھا۔ ریت سیدھی ان کی آنکھوں کی طرف گئی اور ساتھ ہی آفتاب، آصف اور فرحت لوٹ لگا گئے۔

"تم تینوں انہیں سنبھالو، میں جہاز کی طرف جاتا ہوں۔ دیر کرنا کسی طرح بھی مناسب نہیں۔"

"جی جی — انہیں سنبھالیں، لیکن یہ تو بہت وزنی ہیں ابا جان۔" آفتاب نے بوکھلا کر کہا — اتنی دیر میں وہ لڑھکتے ہوئے دور جا چکے تھے۔

"فضول باتیں کرنے کا وقت نہیں یہ — تم اتنا بھی نہیں جانتے۔" یہ کہتے ہی انہوں نے ساحل کی طرف دوڑ لگا دی۔

"جانتا تو خیر میں اس سے کہیں زیادہ ہوں۔" آفتاب بڑبڑایا۔ انہوں نے دیکھا، پانچوں دشمن آنکھیں ملنے کے بعد ان کی تلاش میں نظریں دوڑا رہے تھے — خنجر اب بھی ان کے ہاتھوں میں تھے۔ ایسے میں آفتاب نے پستول جیب سے نکال لیا اور ایک ہوائی فائر ان کی طرف کر دیا۔

"ہیلو دوستو، ہماری طرف بڑھنا اب موت کو دعوت دینا ہوگا — اگر تم موت کو دعوت دینے کے اتنے ہی شوقین ہو تو بڑھے چلے آؤ۔"

"کیوں نہ ہم ان کا کام تمام کر کے ابا جان کے پیچھے چل دیں۔ وہ ابھی زیادہ دور نہیں گئے ہوں گے۔"

"کیا باتیں کرتے ہو، زیادہ دور نہیں گئے ہوں گے — وہ انتہائی تیز رفتاری سے کام لے رہے ہوں گے اور ہم ان کی تیز رفتاری کا ساتھ نہیں دے سکتے اور اب تو وہ ہم سے پہلے بھاگ چکے ہیں۔"

"پھر ان کا کیا کریں۔ کیا اچار ڈالیں۔" فرحت نے کہا۔

"پوچھ لیتے ہیں ان سے — کیوں بھئی، اب کیا پروگرام ہے۔" یہ کہہ کر جو انہوں نے ان کی طرف دیکھا تو پانچوں سامنے کہیں بھی نظر نہ آئے۔ اپنی نوک جھوک میں انہوں نے انہیں درختوں کے پیچھے پناہ لینے کا موقع فراہم کر دیا تھا۔

"ہائیں، یہ کہاں چل دیے۔" آفتاب نے بوکھلا کر کہا۔

"جدھر کسی کے سینگ سمائے، چل دیے ہوں گے۔" فرحت نے برا سا منہ بنایا۔

"وہ انسان تھے۔ گائے بھینسیں یا گدھے نہیں تھے، جن کے سینگ کہیں سماتے۔"

"تم تو اس طرح کہہ رہے ہو، جیسے گدھوں کے بھی سینگ ہوتے ہیں۔" آصف حیران ہو کر بولا۔

"ارے ہاں، یہ تو میں بھول ہی گیا۔ گدھے کے سر سے تو سینگ ویسے ہی غائب ہیں — خیر کوئی بات نہیں، تلاش کر دیں گے انہیں بھی۔"

"کیا تلاش کر دیں گے، کن کی بات کر رہے ہو۔ دماغ تو ٹھیک ہے۔" آصف نے بوکھلا کر کہا۔

"ہم، میں گدھوں کی بات کر رہا ہوں — ان کے سینگ تلاش۔"

"ختم کرو بھائی، وہ لوگ ضرور ہمیں گھیرنے کی کوشش میں ہوں گے۔ جونہی ہم انہیں نظر آئے، وہ خنجر ہم پر پھینک ماریں گے اور کیا خبر، ان کے پاس پستول بھی ہوں۔"

"ارے باپ رے — پھر تو ہماری خیر نہیں۔" ان الفاظ کے ساتھ ہی ان پر گولیوں کی باڑھ ماری گئی — گولیاں ان کے دائیں بائیں سے گزر گئیں —

"لو بھئی، ان کے پاس تو واقعی پستول موجود ہیں۔ اب تو ہمیں سنجیدہ ہونا ہی پڑے گا۔" آفتاب بولا۔

"نہیں نہیں، اب بھی کیوں ہوتے ہو۔" فرحت جل کر بولی۔

"ہو جاتا ہوں بھئی، ہمارا حرج ہی کیا ہے۔"

ایک بار پھر گولیاں چلائی گئیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے وہ پانچوں صرف اندازے سے گولیاں چلا رہے تھے۔ ابھی تک وہ ان کا نشانہ نہیں لے سکے تھے۔

تینوں اپنے اپنے پستول ہاتھ میں پہلے ہی لے چکے تھے۔ انہوں نے بھی اس سمت میں فائر جھونک دیے۔ فوراً ہی گولیوں کا جواب گولیوں سے دیا گیا۔ یہ بھلا کب رکنے والے تھے۔ انہوں

لے بھی اندھا دھند فائرنگ کا سلسلہ شروع کر دیا۔ تڑاتڑ گولیاں چلنے لگیں۔

"یہ — یہ آخر ہم کیا کر رہے ہیں" فرحت نے فکر مند ہو کر کہا۔

"دیکھ نہیں رہیں، گولیاں چلا رہے ہیں۔ تمہیں اتنا بھی معلوم نہیں؛ حالانکہ خود بھی گولیاں چلا رہی ہو"

"ہاں، چلا تو رہی ہوں" اس نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔

"خیر تو ہے، تم تو کچھ زیادہ ہی سنجیدہ ہوگئیں" آصف نے چونک کر کہا۔

"ہم نے اس پر غور نہیں کیا کہ ہمارے دشمن آخر چاہتے ہیں" فرحت بڑبڑائی۔

"یہ بھی کوئی بات ہے غور کرنے کی — غور کرنے کی اور تھوڑی باتیں ہیں — بھئی وہ پروفیسر کو اغوا کرنا چاہتے ہیں"

"تت، تم کیا کہنا چاہتی ہو فرحت؟" آصف نے اسے گھورا۔

"یہ کہ دشمن ہمارے ساتھ کوئی چال چل رہا ہے اور ہم بڑی آسانی سے اس کی چال میں آتے جا رہے ہیں"

"تمہارے خیال میں وہ کیا چال ہو سکتی ہے" آصف الجھ کر بولا۔

"سنو، سلاٹر پروفیسر غوری کو ساتھ لے گیا اور اپنے پانچ ساتھیوں کو یہاں چھوڑ گیا، تاکہ ہم جہاز کا پیچھا نہ کریں۔ آخر اسے ایسا کرنے کی کیا ضرورت تھی — ہم چار آدمی ایک جنگی جہاز کا کیا بگاڑ سکتے تھے، کچھ بھی نہیں — ہم شاید اس کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتے تھے" فرحت روانی کے عالم میں کہتی چلی گئی۔

"جہاز کا بال، کیا کہہ رہی ہو؟" آفتاب بوکھلا اٹھا، لیکن فرحت نے جیسے سنا ہی نہیں۔

"تب پھر سلاٹر نے جزیرے پر اپنے آدمی کیوں چھوڑے"

"بس اسی لیے کہ ہم جہاز کا رخ نہ کر سکیں" فرحت نے بے چینی کے عالم میں کہا۔

"تت، تو کیا ہمارے جہاز کا رخ کرنے میں اسے کوئی خطرہ تھا:"

"ہاں، ضرور کوئی بات ہے، ورنہ اسے یہ پانچ آدمی جزیرے پر چھوڑنے کی ضرورت نہیں تھی"

"اور وہ بات کیا ہے؟" اب آصف بھی بے چین نظر آنے لگا —

"پپ، پتا نہیں، میں غور کر رہی ہوں، تم بھی غور کرو"

"گولیوں کی چھاؤں میں غور کرنے کی بات کر رہی ہو" آفتاب کے لہجے میں حیرت تھی —

"ہاں، اور کیا؟"

عین اسی وقت ان پر پھر گولیاں برسائی گئیں۔ انہوں نے بھی جواب میں فائر کیے اور اسی وقت انہیں معلوم ہوا، ان کے پاس گولیاں بھی ختم ہو چکی تھیں۔ وہ دھک سے رہ گئے۔ خالی پستول کے ٹرچ ٹرچ کرنے کی آوازیں گونج کر رہ گئیں اور ادھر پانچوں دشمن سامنے آگئے، لیکن وہ اب بھی درختوں کے پیچھے تھے —

"اب کیا کرو گے دوستو" ان میں سے ایک نے کہا۔

"کرنا کرانا کیا ہے — تم لوگوں کی ایک نہیں چلنے دیں گے" آصف جھنجھلا کر بولا۔

"ایک نہیں چلنے دیں گے۔ کیا نہیں چلنے دیں گے"

"بھئی چال اور کیا"

"چلو سامنے آ جاؤ، نہیں چلتے ہم چال وال" دوسرا بولا۔

"اپنے پستول پھینک دو، بلکہ دور پھینک دو، پھر ہم سامنے آ جاتے ہیں" آصف کچھ سوچ کر بولا۔

"ارے بس، اتنی سی شرط — یہ لو، غور سے دیکھتے رہو — پانچ پستول فضا سے ہوتے ہوئے دور جا کر گریں گے" اس کے ان الفاظ کے ساتھ ہی پستول واقعی دور جا گرے۔

"لو، اب تو سامنے آجاؤ"

"ہم اتنے احمق نہیں، جتنے تم سمجھ رہے ہو"

"کک، کیا مطلب؟"

"اپنے خنجر بھی پھینک دو، پھر سامنے آئیں گے"

"اچھا، یہ لو — خنجر بھی پھینک دیے" تیسری آواز سنائی دی اور انہوں نے خنجر بھی دور جاتے دیکھے۔

"چلو اب سامنے آجاؤ" ایک نے کہا۔

"ہاں، تم نے ہماری ہر شرط پوری کر دی۔ اب ہمیں بھی اپنا وعدہ پورا کرنا ہوگا — سوال یہ ہے کہ تم ہمیں سامنے بلا کر کیا ہمارا اچار ڈالنا چاہتے ہو"

"ہم نے تم لوگوں کے بارے میں سلاٹر سے بہت کچھ سنا ہے۔ ہم تم سے باقاعدہ دو دو ہاتھ کرنا چاہتے ہیں"

"باقاعدہ دو دو ہاتھ — یہ کس قسم کے ہوتے ہیں" آفتاب کے لہجے میں حیرت تھی۔

"تم باقاعدہ دو دو ہاتھ کرنے کا مطلب بھی نہیں سمجھتے" بھنائی ہوئی آواز سنائی دی۔

"چلو بھئی، ان بے چاروں کی خواہش پوری کر ہی دیں یہ بھی کیا یاد کریں گے — مجھے ان پر ویسے بھی ترس آ رہا ہے"

"کیا کہا، ترس آ رہا ہے، دشمنوں پر ترس آ رہا ہے — ان لوگوں پر ترس آ رہا ہے، جنہوں نے ہمارے ملک کے مشہور و معروف سائنس دان کو اغوا کر لیا ہے، بلکہ ایک سائنس دان کو نہیں — دو سائنس دانوں کو اور ابھی ہمیں یہ معلوم نہیں کہ پروفیسر داؤد کا کیا بنا ہوگا۔ آثار بہت خطرناک ہیں۔ پروفیسر عقلان کو اغوا کرنے کے لیے انا نیو میدان میں نکلا، ادھر سلاٹر پہنچ گیا

تت — تت — تو پروفیسر داؤد کی طرف ...." آفتاب بوکھلائے

ہوئے لہجے میں کہتا جا رہا تھا کہ ان میں سے ایک بولا:

"یہ — تم کیا باتیں لے بیٹھے — ہمارے پاس وقت بہت کم ہے، جلدی سامنے آؤ۔"

"کیا کہا، وقت بہت کم ہے۔ کیوں، تمہارے پاس وقت کی کیا کمی پڑ گئی۔ ساری رات پڑی ہے دو دو ہاتھ کرنے کے لیے۔ خیر یہ لو، تم بھی کیا یاد کرو گے — لیکن کہیں تم نے اپنے پاس کوئی ہتھیار بچا نہ لیا ہو۔"

"آؤ کر پہلے تلاشی لے لو۔"

"ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔" یہ کہتے ہوئے آفتاب ان کے سامنے آ گیا۔ آصف اور فرحت نے بھی اس کا ساتھ دیا — تینوں کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے ہو گئے، پھر ایک ساتھ قدم اٹھانے لگے۔

"چلو بھئی، پہلے تلاشی دو۔"

"تو تمہیں ہماری بات پر یقین نہیں آیا۔"

"بے چارے یقین نے آنے کی کوشش تو بہت کی، لیکن ہم بھی ایک ہی کائیاں ہیں، اسے اپنے پاس پھٹکنے کی اجازت نہیں دی۔"

"ہوں، خیر لے لو تلاشی۔" ان میں سے ایک نے بھنّا کر کہا —

تینوں نے جلدی جلدی ان کی جیبوں کو ٹٹولا اور جب یقین ہو گیا کہ ان کے پاس واقعی کوئی ہتھیار نہیں ہے تو چند قدم پیچھے ہٹ آئے۔ پھر آصف نے پوچھا:

"آخر تم ہم سے دو دو ہاتھ کیوں کرنا چاہتے ہو؟"

"یہ دیکھنے کے لیے کہ مسٹر سلاٹر کہاں تک ٹھیک کہتے ہیں۔"

"جہاں تک نظر جاتی ہے، وہاں تک تو ضرور ہی ٹھیک کہتے ہیں، گویا تم لوگ ہم سے دست بدست جنگ لڑنا چاہتے ہو؟"

"ہاں بالکل یہی بات ہے — سلاٹر نے کہا تھا، اگر ہم نے دست بدست جنگ میں تم لوگوں کو شکست دے دی اور تمہیں ان کے سامنے پیش کر دیا تو ایک بڑے انعام کے حق دار ہوں گے۔ ہم بس وہ انعام حاصل کرنا چاہتے ہیں۔"

"لل، لیکن، تم ہمیں ان کے سامنے پیش کس طرح کرو گے۔ وہ تو پروفیسر عزری کو لے کر جنگی جہاز پر جا چکے ہیں۔" فرحت نے بغور ان کی طرف دیکھا۔

"اس بات کو چھوڑو — کوئی نہ کوئی بندوبست ہو ہی جائے گا۔"

"تب پھر پہلے بندوبست کر لو، پھر دو دو ہاتھ کیے بغیر ہی تمہارے ساتھ چلے چلتے ہیں۔ تم اپنے سلاٹر سے جا کر جو جی میں آئے کہہ لینا۔"

"نہیں بھئی، یوں مزا نہیں آئے گا۔ جھوٹا انعام لینا ہمیں پسند نہیں۔" ایک نے کہا۔

"پھر تو مجبوری ہے، آیئے لڑ لیں۔" آفتاب نے تنگ آ کر کہا۔

"لیکن مشکل ایک ہے — ہم پانچ ہیں اور تم تین — تین کا پانچ سے کیا مقابلہ۔"

"تین پانچ نہ کریں — ہم تم لوگوں کا تیا پانچا کر دیں گے۔" آفتاب نے بھنّا کر کہا۔

"دیکھا جائے گا۔ ہم میں سے دو صرف لڑائی دیکھیں گے — تین تمہارے مقابلے پر آ رہے ہیں، تاکہ مسٹر سلاٹر کوئی اعتراض نہ کر سکیں۔" ان الفاظ کے ساتھ ہی ان میں سے تین نے ان پر چھلانگیں لگا دیں۔ انہیں یوں لگا، گویا وہ ہوا میں اڑتے ہوئے ان کی طرف آئے ہوں۔

تینوں بوکھلا کر پیچھے ہٹے —

☆ ☆ ☆

ساحل پر پہنچتے ہی انسپکٹر کامران مرزا نے چھلانگ لگا دی اور بلا کی رفتار سے اس سمت میں تیرنے لگے، جس سمت میں جہاز گیا تھا۔ ان پر بس ایک ہی دھن سوار تھی، کسی طرح جہاز پر پہنچ جائیں اور پروفیسر عزری کو چھڑا لائیں — نہ جانے وہ پروفیسر صاحب کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہتے تھے۔ انہیں پروفیسر عقلان کا خیال بھی آ رہا تھا، جنہیں اتانیو اڑا لے گیا تھا اور اس بات پر بھی حیرت تھی کہ چھ ماہ تک ان کے ملک کے بڑے بڑے سائنس دان آخر کہاں رہے۔ دوست ملک کے صدر عین بونڈارا نے انہیں کس جگہ جمع کیا تھا اور کیوں۔ یہ سب باتیں ان کے دماغ میں کھلبلی مچانے کے لیے کافی تھیں اور ایسی حالت میں وہ بلا کی رفتار سے پانی پر تیر رہے تھے۔ طوفانی موجیں ان کے جسم سے آ آ کر ٹکرا رہی تھیں۔ ان کی رفتار کو کم کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ مگر انہوں نے بھلا ہمت ہارنا کب سیکھا تھا۔ آخر مسلسل ایک گھنٹے تک تیراکی کرنے کے بعد جہاز انہیں نظر آ گیا۔ ان پر اور بھی جوش طاری ہو گیا اور اب وہ صرف سر باہر رکھ کر تیرنے لگے۔ اس جگہ سمندر اب پرسکون سا تھا، مدوجزر نہیں تھا — موجوں کا آ کر ٹکرانا بند ہو گیا تھا — چاند کی روشنی میں یوں بھی ان کے دیکھ لیے جانے کا امکان بہت ہی کم تھا۔ ہاں، اگر وہ کسی لانچ پر آئے ہوتے تو ضرور دیکھ لیے جاتے۔ رفتہ رفتہ وہ جہاز کے نزدیک ہونے لگے۔ اب انہوں نے پانی کے نیچے تیرنا شروع کیا۔ بس سانس لینے کے لیے "وقتاً فوقتاً" تھوڑا سا منہ باہر نکال لیتے۔ آخر ان کا ہاتھ جہاز کو چھونے لگا۔ اب انہوں نے تیرتے ہوئے سیڑھی کی تلاش شروع کی، پھر لوہے کی سیڑھی سے ان کے ہاتھ ٹکرا گئے — بس پھر کیا تھا، وہ اوپر چڑھنے لگے۔ ان کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ وہ کسی عام جہاز پر نہیں، ایک جنگی جہاز پر چڑھ

رہے تھے، جس پر ہر قسم کا سامانِ جنگ موجود تھا اور انہیں کسی وقت بھی نشانہ بنایا جا سکتا تھا۔ ایک بار انہیں دیکھ لیا جاتا، پھر ان کا خاتمہ دشمنوں کے لیے بہت آسان ہوتا۔ یہی سوچتے ہوئے وہ اوپر چڑھ رہے تھے اور پھر وہ عرشے تک پہنچ گئے۔ انہوں نے سر تھوڑا سا ابھار کر دیکھا، لیکن عرشے پر کوئی بھی نظر نہیں آیا۔ انہیں بہت حیرت ہوئی۔ آواز پیدا کیے بغیر وہ آگے بڑھنے لگے۔ جہاز میں ایک طرف انہیں روشنی نظر آ رہی تھی۔ ابھی تک کوئی بھی شخص نظر نہیں آ رہا تھا۔ ان کی حیرت میں لمحہ بہ لمحہ اضافہ بھی ہوتا جا رہا تھا، کیونکہ یہ جنگی جہاز تھا اور جنگی جہاز پر پوری فوج موجود ہوتی ہے، لیکن اس فوج کے انہیں کوئی آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔

روشنی جہاز کے ایک کمرے میں ہو رہی تھی۔ کمرے کے دروازے بند تھے۔ انہوں نے پہلے تو دروازے سے کان لگا کر اندر کی آوازیں سننے کی کوشش کی، لیکن جب کچھ سنائی نہ دیا تو کھڑکیوں کو آزمایا۔ آخر تنگ آ کر وہاں سے ہٹ آئے اور انجن روم کی طرف چل پڑے — انجن روم کا دروازہ کھلا تھا اور اس میں دو آدمی آلات کے سامنے کھڑے نظر آئے۔ دونوں باتیں کر رہے تھے۔ انہوں نے ان کی باتوں پر کان لگا دیے۔ ان میں سے ایک کہہ رہا تھا:

"میری سمجھ میں تو یہ آدمی آیا نہیں، نہ جانے چاہتا کیا ہے۔ آخر کسی فوجی کے بغیر جنگی جہاز کی کیا ضرورت تھی"

ان کے کان کھڑے ہو گئے، تو جہاز پر کوئی فوجی نہیں تھا۔ سلاٹر خود موجود تھا اور اس کے چند ساتھی، لیکن یہ خبر سن کر انہیں کچھ زیادہ اطمینان نہیں ہوا، کیونکہ سلاٹر تنہا کچھ کم خطرناک نہیں تھا۔ اس سے نبٹنا اتنا آسان نہیں تھا۔ انہوں نے سنا، دوسرا کہہ رہا تھا:

"تمہاری ہی کیا، یہ تو کسی کی سمجھ میں بھی نہیں آیا۔ اس کی باتیں تو بس ملک کے صدر کی سمجھ میں آتی ہیں۔ یہ ان سے جو چاہتا ہے، کرا لیتا ہے۔ ایک طرح سے ملک میں زیادہ تر حکم اسی کا چلتا ہے" اچانک وہ بولتے بولتے خاموش ہو گیا۔ اس کے چہرے پر حیرت اور خوف کے آثار نمودار ہو گئے۔ دوسرے نے اس کی بدلتی حالت کو بھانپ لیا، فوراً بولا:

"کیا بات ہے لانبر، خیر تو ہے"

"مم، میں کسی کی موجودگی ....."

اس کے ان الفاظ کے ساتھ اس کی گردن سے کوئی چیز آ لگی اور ایک سرد آواز گونجی:

"خبردار، حرکت کی تو گولی گردن کے پار ہو گی۔ دونوں ہاتھ اوپر اٹھا دو"

چند سیکنڈ کے لیے وہ ساکت رہ گئے۔ آواز کچھ اس قدر خوف ناک تھی کہ انہیں اپنے رونگٹے کھڑے ہوتے محسوس ہوئے۔ پھر ان کے ہاتھ مشینی انداز میں اٹھتے چلے گئے۔

"شکریہ، اب جہاز کا رخ اسی جزیرے کی طرف موڑ دو جس جزیرے سے تم لوگوں نے یہ سفر شروع کیا تھا، یعنی جہاں سے سلاٹر جہاز میں سوار ہوا تھا"

"تت، تم کون ہو؟"

"مجھے انسپکٹر کامران مرزا کہتے ہیں، شاید تم نے میرا نام سنا ہو گا۔ اگر نہیں تو بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اصل چیز تو وہ ہے جو اس وقت تمہاری گدی کو چھو رہی ہے، یعنی پستول کی نال"

"ٹھیک ہے — ہم سیدھے سادے آدمی ہیں۔ ان بل چھل کو کیا جانیں، حکم کی تعمیل کرنا پڑتی ہے۔ سلاٹر کا حکم ملا تھا، ہم نے عمل شروع کر دیا — اب تم گردن پر پستول رکھ کر جہاز کا رخ تبدیل کرانا چاہتے ہو تو ہم یہ بھی کریں گے"

"اسی میں تمہاری بہتری ہے، چلو آہستہ آہستہ رخ تبدیل کرو — اس طرح کہ اندر موجود سلاٹر کو احساس بھی نہ ہو" انہوں نے کہا۔

"اچھا، لیکن اس کام کے لیے مجھے ہاتھ نیچے کرنا ہوں گے" دوسرا بولا۔

"ٹھیک ہے، تم ہاتھ نیچے کر لو — اگر تم نے کوئی غلط حرکت کی تو تمہارے ساتھی کی لاش تمہارے سامنے ہو گی"

"کک، کوئی غلط حرکت نہ کرنا لانبر — ہم بہت پرانے دوست ہیں" پہلے نے گھبرا کر کہا۔

"تم فکر نہ کرو رابن، مجھے تمہاری دوستی سے زیادہ عزیز اور کچھ نہیں" لانبر نے کہا۔

اور وہ جہاز کا رخ تبدیل کرتا چلا گیا۔ انسپکٹر کامران مرزا نے سمت بتانے والی سوئی پر نظر رکھی۔ اس کا رخ بتدریج تبدیل ہوتا چلا گیا — آخر لانبر نے کہا:

"اب ہمارا رخ پھر جزیرے کی طرف ہے"

"شکریہ، تم نے میری ہدایات پر عمل کیا۔ میں بھی تم دونوں کو جان سے نہیں ماروں گا۔ تم دونوں زندہ سلامت رہو گے، لیکن اس وقت تھوڑی سی تکلیف دینے پر مجبور ہوں"

"جی کیا مطلب؟" وہ چونک کر ایک ساتھ بولے۔

"مطلب یہ....." ان کے ان الفاظ کے ساتھ ہی پہلے رابن کے سر پر اور پھر لانبر کے سر پر بجلی ایسی تیزی سے پستول کا دستہ لگا۔ وہ گھٹی گھٹی سی چیخوں کے ساتھ بےہوش ہو گئے۔ انسپکٹر کامران مرزا نے انہیں باندھنے کے لیے رسی کی تلاش میں نظریں دوڑائیں۔ ایک کھونٹی سے انہیں مچھلیاں پکڑنے کی ڈوری لٹکی نظر آئی — شاید دونوں ڈرائیور مچھلیاں پکڑتے رہتے تھے۔ انہوں نے اسی کو غنیمت جانا اور دونوں کو جلدی جلدی باندھ ڈالا — سمت بتانے والی سوئی پر نظر ڈالتے ہوئے وہ باہر نکل آئے اور پھر روشن کمرے تک پہنچے — انگلی سے دستک دی۔ دوسرے

تک انھیں سلاٹر کی آواز سنائی دی:

"کیا بات ہے لاتیر؟"

"سر، جلدی دروازہ کھولیے۔" انھوں نے لاتیر کی آواز کی نقل کرنے کی کوشش کی۔

"کیا ہوا، خیر تو ہے جیرات، دروازہ کھول دو۔" قدموں کی آواز سنائی دی، جوں ہی دروازہ کھلا۔ انسپکٹر کامران مرزا نے جیرات کا ہاتھ پکڑ کر باہر کی طرف جھٹکا دے مارا۔ وہ گویا ہوا میں اڑتا باہر جا گرا۔ اس کے گرنے سے ایک دھماکا سا ہوا۔

"ارے، یہ جیرات کہاں چلا گیا؟" سلاٹر کے منہ سے نکلا۔

انسپکٹر کامران مرزا دروازے پر نمودار نہیں ہوئے تھے۔ انھوں نے یہ کام ایک طرف رہ کر کیا تھا، لہٰذا وہاں سے ہٹ کر تیزی سے جیرات کی طرف آئے۔ وہ اٹھنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ انھوں نے فوراً اس کے سر پر ایک زوردار ٹھوکر رسید کی۔ اس نے زوردار چیخ ماری اور دوسری طرف الٹ گیا۔ فوراً ہی انھوں نے اپنے پیچھے دوڑتے قدموں کی آواز سنی۔ وہ مڑے۔ اس وقت سلاٹر ان کے نزدیک پہنچ چکا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر ٹھٹک گئے۔ انسپکٹر کامران مرزا نے دیکھا، سلاٹر کے پیچھے اس کے تین آدمی اور کھڑے تھے۔ تینوں ہی لمبے تڑنگے اور مضبوط جسم کے مالک نظر آ رہے تھے۔ ان کی آنکھیں گویا آگ اگل رہی تھیں۔ جب کہ چاند کی روشنی میں سلاٹر کی سبز آنکھیں مسکرا رہی تھیں۔ اس نے اپنی آنکھیں ان کی آنکھوں پر جمانے کی کوشش کی، لیکن وہ تو اس کے اس حربے سے بخوبی واقف تھے، لہٰذا اس کے سر کے اوپر دیکھنے لگے۔ ایسے میں سلاٹر نے کہا۔

"تو تم جیل تک آ ہی پہنچے۔"

"ہاں، کیا کرتا۔ مجبوری تھی۔"

"اور تم نے میرے ساتھی جیرات کو بھی ڈھیر کر دیا۔ جیرات جو بہترین لڑاکا ہے، لیکن خیر وہ لاتیر کے دھوکے میں مارا گیا۔ یہ تینوں تم سے اس کا حساب لیں گے۔ چلو بچو، شکار خود ہی چل کر تمھارے پاس آ گیا ہے۔ چلو پکڑ لو اسے۔ یہ پروفیسر حمدی کو ہم سے چھیننے کے لیے آیا ہے، لیکن اسے تو بھی یہاں سے بچ کر جانا نصیب نہ ہو، پھر میں تمھارا کمال مانوں گا۔"

سلاٹر کے ان الفاظ کے ساتھ ہی وہ تینوں ان پر جھپٹ پڑے۔ انسپکٹر کامران مرزا پہلے ہی تیار تھے، فوراً جھکائی دے کر ان کے وار بچا گئے۔ وہ آپس میں ٹکرائے اور پھر بری طرح جھنجھلا کر ان کی طرف تین طرف سے بڑھے۔ سامنے سے آنے والے نے ان کی ٹھوڑی پر وار کیا۔ اس کے مکے کو کٹے پر روکتے ہوئے انھوں نے بائیں ہاتھ کا مکا اس کی پسلیوں میں دے مارا۔ ساتھ ہی پیچھے کی طرف سے آنے والا اچھل کر ان کی گردن سے لٹک گیا۔ اتنے میں بائیں طرف سے آنے والا وار کر چکا تھا۔ انھوں نے فوراً اپنا رخ تبدیل کر لیا اور اس کا مکا خود اسی کے ساتھی کی کن پٹی پر لگا، جو انسپکٹر کامران مرزا کی گردن سے چمٹا ہوا تھا۔ اس موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انھوں نے دائیں ہاتھ کی ہڈی سے بائیں طرف والے کی گردن پر وار کیا۔ یہ وار بہت کاری تھا۔ مقابل کے حلق سے ایک لرزہ خیز چیخ نکلی اور وہ گردن کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر بیٹھتا چلا گیا، پھر کمر کے بل ڈھلک گیا۔ اتنی دیر میں سامنے والا سنبھل چکا تھا۔ یہ لڑائی انتہائی خاموشی سے جاری تھی۔ لڑنے والے آپس میں کچھ نہیں کہہ رہے تھے۔ ادھر سلاٹر تماشائی بنا کھڑا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک ایسے بچے کی چمک تھی جو اپنا پسندیدہ کھیل دیکھ رہا ہو۔

سامنے والا ابھی سنبھل کر ان کی طرف بڑھا ہی تھا کہ وہ تیزی سے چکر کاٹنے لگے، کیونکہ پیچھے والے کا دباؤ گردن پر بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ ان کے چکرانے میں اس قدر تیزی آئی کہ پیچھے چمٹے ہوئے دشمن کا جسم بھی فرشے کے متوازی ہو گیا اور پھر یک لخت وہ رک گئے۔ دشمن کو اس قدر زوردار جھٹکا لگا کہ اس کے ہاتھ گردن سے الگ ہو گئے اور وہ گویا اڑتا ہوا سمندر میں جا گرا۔ اس کی گونج دار چیخ کافی طویل تھی۔ اب ان کے مقابلے میں صرف ایک رہ گیا تھا، لیکن اپنے دو ساتھیوں کا انجام دیکھ کر اس کے چہرے پر خوف کے آثار نظر آنے لگے تھے۔

تاہم اس نے پیچھے ہٹنے کی کوشش نہیں کی۔ اپنی جگہ سے اچھلا اور ان پر حملہ آور ہوا، لیکن شاید اس کے حواس جواب دے چکے تھے۔ انسپکٹر کامران مرزا نہایت پرسکون انداز میں ایک قدم پیچھے ہٹے اور اس کے دونوں ہاتھوں کو ایک ہاتھ کے ذریعے روکتے ہوئے بائیں ہاتھ کا مکا اس کی ٹھوڑی پر دے مارا۔ پہلے بھی اس کی ٹھوڑی پر ہی مکا لگا تھا۔ اسی جگہ پھر جو لگا، تو یک دم نیچے بیٹھ گیا، لیکن ایسے میں بھی وہ ہاتھ دکھا گیا۔ بیٹھتے ہی ان کی ٹانگیں پکڑ کر گھسیٹ لیں۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ گھسیٹ نہ سکا اور ان کا دوہتڑ اس کی کمر پر لگا۔ یہ کچھ اس قسم کا تھا کہ وہ دھپ سے فرشے کے ساتھ چپک گیا۔ لگے ہاتھوں انھوں نے اس کی پسلیوں میں ایک ٹھوکر بھی رسید کر دی۔

انھوں نے دوسرے کی طرف دیکھا تو وہ بھی بے حس و حرکت نظر آیا۔ شاید بے ہوش ہو گیا تھا یا پھر گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی اور وہ دوسری دنیا کو سدھار گیا تھا۔

"یہ تو گئے کام سے مسٹر سلاٹر۔"

"کوئی بات نہیں، ابھی میں جو موجود ہوں۔"

"ہاں، کیوں نہیں۔۔۔ لیکن اس سے پہلے کہ ہم دو دو

ہاتھ کریں، پہلے یہ بتادو، یہ سب چکر کیا ہے؟"

"چکر صرف اتنا ہے کہ تمہارے ملک کے مشہور ترین سائنس دان چھ ماہ تک کہیں غائب رہے ہیں۔ ہم نہیں جانتے، وہ کہاں رہے ہیں اور کیا کرتے رہے ہیں۔ بس ہم صرف یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں اور ان سے معلوم کرکے رہیں گے۔ مسٹر اتانیو، اس وقت تک پروفیسر عقلان پر ہاتھ صاف کرچکے ہوں گے۔ میں پروفیسر غوری کو لے جا رہا ہوں اور۔۔۔" یہ کہتے کہتے وہ رک گیا۔

"کیوں، رک کیوں گئے مسٹر سلاٹر۔۔۔ پروفیسر داؤد کے لیے کیا ارادہ کیا گیا ہے؟"

"یہ بعد میں بتاؤں گا، پہلے دو دو ہاتھ ہو جائیں۔ ویسے یہ لڑائی بھی خوب رہے گی۔ اس لڑائی کو دیکھنے والا کوئی نہیں ہوگا۔ ہم دونوں اپنے دلوں کی بھڑاس اچھی طرح نکال سکیں گے۔ کیوں کیا خیال ہے؟" اس نے شوخ آواز میں کہا۔

"کیوں، کوئی دیکھنے والا کیوں نہیں ہوگا۔ پروفیسر غوری کہاں ہیں، انہیں لے آؤ۔ وہ یہ لڑائی دیکھیں گے۔ دوسرے تمہارا ایک ساتھی ابھی مرا نہیں۔ صرف زخمی اور بے ہوش ہے۔ وہ کسی وقت بھی ہوش میں آکر تماشائی کا کردار ادا کرسکتا ہے۔" انسپکٹر کامران مرزا طنزیہ لہجے میں بولے۔

"انہیں یہاں تک لانے میں وقت ضائع ہوگا۔ وہ آرام کر رہے ہیں۔۔۔ یوں بھی وہ بس قابل نہیں کہ لڑائی سے لطف اندوز ہوسکیں۔ انہیں تو احساس ہی نہیں ہوسکے گا کہ یہ ہو کیا رہا ہے۔۔۔ باقی رہا یہ ساتھی، یہ بھی بے ہوش ہے۔۔۔ خیر ہمیں کسی کو لڑائی دکھانے کی کیا ضرورت ہے۔۔۔ انجن روم میں دو ڈرائیور موجود ہیں۔۔۔ حیرت ہے، وہ ابھی تک اس گڑبڑ کی وجہ جاننے کے لیے نکلے کیوں نہیں۔"

"وہ بے چارے بھی نکلنے کے قابل نہیں رہے، کیونکہ میں انہیں بھی باندھ چکا ہوں۔" انسپکٹر کامران مرزا مسکرائے۔

"اوہ۔۔۔" سلاٹر نے تلملاتے ہوئے انداز میں کہا اور پھر ایک ایک قدم اٹھاتا انسپکٹر کامران مرزا کی طرف بڑھنے لگا۔ نزدیک آتے ہی اس نے دونوں ہاتھ آگے بڑھا دیے اور انگلیاں پھیلا لیں۔۔۔

"آؤ کامران مرزا، میری انگلیوں میں انگلیاں ڈال دو۔ ابھی معلوم ہو جاتا ہے، کون کتنے پانی میں ہے؟"

"اچھا یونہی سہی۔"

انہوں نے بھی دونوں ہاتھ بڑھا دیے۔ دونوں نے انگلیوں میں انگلیاں پھنسائیں اور زور آزمائی کرنے لگے۔ سلاٹر انگلیوں کے ذریعے ان کی انگلیوں کو گویا پیس ڈالنے کے چکر میں تھا۔ اسی لیے وہ برابر ان کی انگلیاں دباتے چلا جا رہا تھا اور انہیں یوں محسوس ہو رہا تھا، جیسے لوہے کے دو شکنجوں میں ہاتھ دے دیے ہوں۔۔۔ اچانک سلاٹر نے انہیں ایک جھٹکا دیا۔

انگلیاں چھوٹ گئیں اور انسپکٹر کامران مرزا عرشے کی ریلنگ کی طرف لڑکھڑاتے چلے گئے۔ وہ خود کو کسی طرح بھی روک نہیں پا رہے تھے۔۔۔ یہاں تک کہ ریلنگ سے جا ٹکرائے۔۔۔ ساتھ ہی سلاٹر بجلی کی سی تیزی سے ان کی طرف آیا اور ان کی دونوں ٹانگیں پکڑ کر انہیں سمندر کی طرف الٹا دیا۔۔۔ اب ان کے دونوں ہاتھ نیچے جھول رہے تھے۔۔۔ دھڑ ریلنگ کے ساتھ لگا ہوا تھا اور دونوں ٹانگیں سلاٹر کے مضبوط ہاتھوں میں تھیں۔۔۔

☆ ☆ ☆

ان کے حملے میں وحشیانہ پن تھا، لیکن آفتاب، آصف اور فرحت پرسکون رہ کر لڑنا پسند کرتے تھے۔ پہلی بار ضرور وہ بوکھلا کر پیچھے ہٹے، لیکن پھر انہوں نے اپنی بوکھلاہٹ پر قابو پا لیا۔ اب ان کے مقابلے میں تین دشمن تھے۔ یعنی ایک کے مقابلے میں ایک۔۔۔ وہ غنڈے لمبے تڑنگے اور ان کے مقابلے میں بہت طاقت ور تھے اور اگر وہ عام بچے ہوتے تو پہلے ہی بلے میں انہیں چٹکیوں میں مسل دیتے، لیکن انسپکٹر کامران مرزا کی صحبت نے انہیں عام نہیں رہنے دیا تھا۔۔۔ آصف نے پیچھے ہٹنے کے فوراً بعد دائیں طرف چھلانگ لگائی۔ اس کا مقابل چونکہ میں آگے نکل گیا۔۔۔ آصف کو پہلے ہی یہی امید تھی۔۔۔ اس نے رخ تبدیل کیے بغیر دائیں ہاتھ کی ہڈی اس کی ہنسلی کی ہڈی پر ماری اور یہ بالکل نشانے پر لگی۔۔۔ دشمن دھپ سے گرا۔ آصف نے موقع دینا مناسب نہ سمجھا، فوراً اس کی کمر پر چھلانگ لگا دی۔ دشمن نے پلٹا کھایا اور آصف دھڑام سے گرا، لیکن اس سے پہلے کہ دشمن اٹھ کر اس پر چھا جاتا، وہ بلا کی رفتار سے اٹھا اور اس کی ٹانگ پکڑ کر دائرے میں دوڑنے لگا۔ نتیجہ یہ کہ دشمن کا جسم بھی چکر کاٹ رہا تھا۔ یہ منظر آفتاب اور فرحت نے بھی دیکھا۔

"یہ کیا کر رہے ہو۔۔۔ کھیل کود کا یہی موقع ملا ہے۔" آفتاب نے برا سا منہ بنایا۔

"یہ کھیل کود ضرور ہے، لیکن ہے ذرا خونی کھیل کود۔" آصف مسکرا کر بولا۔

اس دوران آفتاب اور اس کے مقابل میں بے تحاشا مکوں کا تبادلہ ہوچکا تھا۔۔۔ آفتاب نے اس کا پہلا مکا اپنی کلائی پر روکا۔۔۔ اسے کلائی ٹوٹتی محسوس ہوئی؛ تاہم اس نے تکلیف کو پی لیا اور دوسرے ہاتھ کی دو انگلیاں اس کے چہرے پر دے ماریں، لیکن وہ اپنی آنکھوں کو بچا گیا اور یک لخت نیچے بیٹھ گیا۔ نیچے بیٹھتے ہی اس نے آفتاب کی دونوں ٹانگیں پکڑ کر گھسیٹ لیں۔۔۔ آفتاب دھڑام سے گرا اور گرتے ہی اپنے پاؤں اس کے منہ پر دے مارے۔ اسے شاید آفتاب کی طرف سے اس کی امید نہیں تھی، لہٰذا دونوں پاؤں نہایت اطمینان سے اپنے چہرے پر وصول کرلیے اور دوسری طرف الٹ گیا۔ آفتاب اٹھا اور اس کے سینے پر چڑھ دوڑا، لیکن فوراً ہی اس کی دونوں ٹانگیں اس کی گردن سے

پسٹ گئیں۔ آفتاب کا دم گھٹنے لگا' پھر دونوں ٹانگوں نے اسے اچھال دیا۔ وہ گرا اور دشمن سے بچنے کے لیے لڑھکتا چلا گیا۔

"کہاں بھاگے جا رہے ہو بچو" دشمن ہنسا۔

"بھاگ نہیں لڑھک رہا ہوں۔ تم اتنا بھی نہیں جانتے۔ خیر آؤ' بتا دوں گا" آفتاب نے تلملائے ہوئے لہجے میں کہا۔ لڑھکنا بند کرکے اس نے تیزی سے ایک چکر کاٹا اور دشمن کی پشت پر پہنچتے ہی دوڑ کر ایک ٹکر اس کی کمر پر مارنا چاہی' لیکن دشمن اس وقت تک اپنا رخ اس کی طرف کر چکا تھا' لہٰذا سر اس کے پیٹ پر لگا اور وہ زور سے گرا۔ آفتاب اس کے اٹھنے کا انتظار کرنے لگا' لیکن اس کا جسم تو بے حس ہو چکا تھا' لہٰذا اس نے ہاتھ جھاڑتے ہوئے کہا:

"لو بھئی' یہ تو ہو گیا فارغ" یہ کہہ کر وہ ان دونوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔

فرحت کے مقابلے میں جو شخص آگے بڑھا تھا' بہت ڈیل ڈول والا تھا اور فرحت اس کے سامنے بالکل ننھی سی لگ رہی تھی۔ پہلی مرتبہ جب وہ ٹانگیں پھیلائے فخر اور غرور کے عالم میں بے احتیاطی سے آگے بڑھا۔ خاص طور پر یہ خیال کرتے ہوئے کہ یہ ننھی سی بچی کیا میرا مقابلہ کرے گی اور کتنی دیر مقابلے پر ٹکے گی' تو فرحت یک لخت جھکی اور اس کی ٹانگوں کے نیچے سے نکل گئی۔ کمر پر پہنچتے ہی اس نے اس کے سر کے لمبے بال دونوں ہاتھوں میں پکڑ لیے اور ان کے ساتھ جھول گئی۔ دشمن نے جو بالوں کو گرفت میں پایا تو اسے عجیب سوجھی۔ لگا چکر کاٹنے۔ فرحت اس کے گرد جھولنے لگی۔

"اب تم کیا کر رہی ہو؟" آصف نے حیران ہو کر کہا۔

"دیکھ نہیں رہے' جھولا جھول رہی ہوں"

"یہ جھولا جھولنے کا کون سا طریقہ ہے" آصف نے منہ بنایا' پھر خوف زدہ انداز میں چیخ اٹھا۔

"فرحت ہوشیار' یہ چالاک دشمن برابر ایک درخت کی طرف بڑھ رہا ہے' گویا تم اچانک درخت سے ٹکرانے والی ہو"

"اوہ" فرحت کے منہ سے نکلا۔ اس نے فوراً بالوں پر سے ایک ہاتھ ہٹا لیا اور اس کی گردن سے چمٹا دیا' پھر دوسرے ہاتھ سے بھی بال چھوڑ دیے اور دونوں بازو گردن کے گرد جکڑتے ہوئے جسم کو اس کے جسم کے نزدیک کرنے کی کوشش کی' لیکن اب بھی دشمن تیزی سے گھوم رہا تھا اور فرحت کا دھڑ درخت سے ٹکرا سکتا تھا' لہٰذا خطرے کا احساس کرتے ہوئے اس نے اچانک اس کی گردن پر سے بازو ہٹا لیے۔ نتیجہ یہ کہ دور تک لڑھکتی چلی گئی۔ دشمن اس کی طرف لپکا' لیکن نزدیک نہیں پہنچا تھا کہ فرحت چھلانگ لگا کر اٹھ کھڑی ہوئی اور دوڑنے لگی۔ دشمن نے پیچھا کیا' اس نے رفتار بڑھا دی۔ وہ بھی اور تیز دوڑنے لگا' لیکن فرحت کے نزدیک نہ ہو سکا؛ تاہم اس نے بھی دوڑنا بند نہ کیا۔ یہاں تک کہ اس کا سانس پھول گیا۔ بری طرح ہانپنے لگا۔ درمیانی فاصلہ بڑھتا چلا گیا۔ فرحت نے فاصلہ بڑھتے دیکھا تو رک گئی اور طنزیہ انداز میں بولی:

"آؤ نا چچا' کیا تھک گئے"

"چچا' یہ کیا کہا فرحت" آفتاب نے حیران ہو کر کہا۔

"بھئی' تم انکل کہہ لو' مجھے کوئی اعتراض نہیں"

دشمن بھناتے ہوئے انداز میں اس کے نزدیک پہنچ گیا۔ اس بار فرحت نے بھاگنے کی کوشش نہیں کی۔ پرسکون انداز میں کھڑی رہی۔ جوں ہی دشمن نے اس پر چھلانگ لگائی۔ وہ نیچے بیٹھتے ہوئے جھکائی دے گئی۔ دشمن دھپ سے گرا' پھر اٹھا' چھلانگ لگائی اور پھر گرا۔ اس بار جو گرا تو درخت سے سر ٹکرا گیا۔ اس کے منہ سے ایک بھیانک چیخ نکلی اور بے حس ہو گیا۔

آصف بھی اس وقت تک دشمن کو چکر دے دے کر بے دم کر چکا تھا۔ لہٰذا تینوں ان سے ہٹ کر باقی دو کے سامنے آکھڑے ہوئے۔

"اب تم دونوں کا کیا پروگرام ہے؟"

"ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ تم یہ مقابلہ جیت جاؤ گے۔ اب اگر ہم دونوں تم سے لڑتے ہیں تو یہ بھی نااتفاقی ہو گی' لہٰذا ہم تمہاری جیت کو تسلیم کرتے ہیں۔ اب تم ہمارے ساتھ چلو" ان میں سے ایک نے کہا۔

"کہاں چلیں؟" آصف حیران ہو کر بولا۔

"مسٹر سلاٹر کے پاس"

"ہمیں بھلا اس کے پاس جانے کی کیا ضرورت ہے؟"

"اس کی ہدایات یہی ہیں کہ ہم تم لوگوں کو ان تک پہنچا دیں" وہ بولا۔

"ہوں گی اس کی ہدایات' ہماری یہ ہدایات نہیں۔ اس وقت فاتح ہم ہیں۔ تمہیں ہماری ہدایات پر عمل کرنا چاہیے۔ اپنے ان تینوں ساتھیوں کو باندھ دو"

"دماغ تو نہیں چل گیا" ان میں سے ایک نے جھنجلا کر کہا۔

"اس میں دماغ چل جانے والی کونسی بات ہے" آصف بولا۔

"ٹھہرو' تم یوں نہیں مانو گے' ابھی بتاتے ہیں"

یہ کہہ کر وہ دونوں ان پر جھپٹ پڑے۔ وہ ایک بار پھر ادھر ادھر ہو گئے۔ دشمنوں کے یہ دونوں ساتھی شاید ان کے لڑنے کا انداز بھانپ چکے تھے' لہٰذا سنبھل کر ان پر حملہ آور ہوئے۔ آفتاب پر ایک نے بہت خوف ناک انداز میں حملہ کیا۔ وہ بلا کی رفتار سے دوڑتا ہوا آیا اور نیچے جھک کر اسے کندھوں پر اٹھا لیا' پھر دوڑتا چلا گیا۔

"یہ۔ یہ کیا کر رہا ہے؟" فرحت ہکلائی۔

"بس۔ سیر کرا رہا ہے آفتاب کو" آصف خوش ہو کر بولا۔

اتنی دیر میں دوسرا آصف پر حملہ کرنے کے لیے جھپٹ چکا

تھا — فرحت نے اچانک اپنی ایک ٹانگ آگے بڑھا دی اور وہ منہ کے بل گرا۔ بس پھر کیا تھا، دونوں مل کر اسے چھاپ بیٹھے —

ادھر اچانک دشمن نے آفتاب کو زمین پر پٹخ دیا۔ اس کی آنکھوں کے آگے تارے ناچ گئے — بہت زبردست چوٹ آئی تھی — جیسے تیسے کر کے وہ اٹھا، لیکن اسی وقت ایک گھونسا اس کے سر پر لگا۔ وہ گرا، لیکن گرتے ہی دونوں ٹانگیں اپنی طرف آتے ہوئے دشمن پر بلا کی تیزی سے دے ماریں۔ دشمن نے یہ وار سینے پر وصول کیا اور بھینسے کی طرح ڈکرایا — قدموں پر کھڑا نہ رہ سکا اور گر گیا — اب آفتاب اٹھا اور اس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ دونوں مٹھیوں میں ریت بھر کر اس کی دونوں آنکھوں میں جھونک دی۔

"تمہاری آنکھوں کو اس کی بہت ضرورت ہے میاں!" اس نے مسکرا کر کہا اور آصف اور فرحت کی طرف پلٹا — دونوں مل کر پانچویں کو بالکل بے دم کر چکے تھے۔

"اب ہمیں جلد از جلد انہیں باندھ دینا چاہیے!" آصف بولا۔

"لیکن باندھیں کس طرح، ہمارے پاس رسیاں کہاں ہیں!" فرحت نے کہا —

"رسیاں ان کی جیبوں میں سے مل جائیں گی — آخر ہمیں بھی تو باندھ کر ہی لے جاتے!" آفتاب نے خیال ظاہر کیا۔

آفتاب کا خیال ٹھیک ہی نکلا — ریشم کی باریک ڈوری کا ایک لچھا مل گیا اور وہ جلدی جلدی انہیں باندھنے لگے۔

"اور جلدی کرو!" فرحت نے کسی قدر فکرمند ہو کر کہا۔

"کیا تم انکل کے لیے فکرمند ہو؟" آصف نے اس کی طرف دیکھا۔

"نہیں بھئی، میں ایک بہت اہم بات سوچ رہی ہوں — تمہارے ذہنوں کو بھی اس طرف متوجہ ہو جانا چاہیے تھا — مگر شاید تم بھوسہ کھاتے رہتے ہو — بھئی، آخر یہ ہمیں کس طرح لے جاتے۔ ہمیں لے جانے کے لیے کسی لانچ وغیرہ کی ضرورت تو پڑتی ہی آخر ——!"

"ہوں، بات تو ٹھیک ہے — تو کیا تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ ہمیں لینے کے لیے کوئی لانچ آنے والی ہے!"

"ہاں، کیا تم دونوں آج عقل سے پیدل ہو!"

"نن، نہیں تو — ہم تو گھر سے جیپ پر نکلے تھے!" آفتاب پھاڑ کھانے والے لہجے میں بولا۔

عین اسی وقت انہوں نے ایک لانچ کی آواز سنی۔ چونک کر نظریں اٹھائیں۔ لیکن ساحل تو دور تھا۔

"چلو ساحل کی طرف چل پڑیں!"

"لیکن اس طرح چل پڑنا خطرناک ہوگا۔ ہمیں چاہیے، درختوں کی اوٹ لے کر چلیں اور یہاں سے قدرے ہٹ کر بھی!" فرحت نے کہا۔

انہوں نے اس کی تجویز سے اتفاق کیا اور چل پڑے۔ پانچوں دشمنوں کو جوں کا توں چھوڑنا پڑا اور وہ کر ہی کیا سکتے تھے۔ یہی بہت تھا کہ انہیں باندھ تو دیا تھا — اسی وقت لانچ کا ہارن بجایا گیا — شاید لانچ پر سوار دشمن اپنے ساتھیوں کو ساحل پر پہنچنے کا اشارہ کر رہے تھے۔

"جب یہ لوگ ساحل پر نہیں پہنچیں گے، تو وہ صورت حال معلوم کرنے کے لیے جزیرے پر اتریں گے، بس وہ وقت ہمارے لیے خطرناک ہوگا!" آصف نے جلدی جلدی کہا۔

"پتا نہیں، ہوگا یا نہیں — اس وقت کیا کہا جا سکتا ہے!" آفتاب بول اٹھا۔

دو بار اور ہارن بجایا گیا، پھر انہوں نے ساحل پر کچھ لوگوں کو چھلانگیں لگاتے دیکھا — وہ ساکت کھڑے ہو گئے۔ ان لوگوں کو کچھ ہی فاصلے سے گزرنا تھا اور انہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ درختوں کی اوٹ سے پوری احتیاط سے دیکھتے ہوئے انہوں نے اپنا بچاؤ اس طرح کیا کہ جونہی وہ لوگ دائیں طرف سے ان درختوں کے پاس سے گزرے، وہ درختوں کے دوسری طرف ہو گئے اور جب وہ کچھ آگے نکل گئے تو وہ ساحل کی طرف بڑھتے چلے گئے۔

"اب ہمیں دوڑ لگا دینی چاہیے!" فرحت بولی۔

"ہاں، تاکہ وہ لوگ ہمارے قدموں کی آہٹ سن کر ہمارے پیچھے بھاگ کھڑے ہوں اور لانچ تک پہنچنے سے پہلے ہی ہمیں پکڑ لیں۔ بھئی، جواب نہیں اس ترکیب کا!" آفتاب طنز بھرے لہجے میں بولا۔

"اگر تم اس سے بہتر تجویز پیش کر سکو تو میں غور سے سننے کے لیے تیار ہوں!" فرحت نے خوش دلی سے کہا۔

"ہاں، کیوں نہیں — ہمیں رفتار ضرور بڑھا دینی چاہیے، لیکن بھاگنے سے پرہیز کرنا ہی مناسب ہوگا!"

"چلو یونہی سہی!"

وہ تیز تیز چلنے لگے — ایسے میں آصف کو ایک پستول نظر آیا۔ شاید یہ پھینکے گئے پستولوں میں سے ایک تھا — اس نے جلدی سے اسے اٹھا لیا اور آگے بڑھتے چلے گئے — اب لانچ انہیں صاف نظر آنے لگی تھی اور ساحل پر درخت نہیں تھے؛ چنانچہ انہیں درختوں سے ہٹ کر آگے آنا پڑا۔ لانچ میں کم از کم ایک آدمی تو ضرور ہی موجود ملنا چاہیے تھا — دور سے دیکھنے پر کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ آخر وہ لانچ تک پہنچ گئے۔ ڈرائیور کی سیٹ پر ایک شخص بیٹھا تھا۔ اس نے اپنا سر سٹیرنگ پر ٹکا رکھا تھا — شاید وہ اونگھ رہا تھا — تینوں اس کے عین پیچھے کھڑے ہو گئے۔

"ہیلو مسٹر!" آصف نرم گرم آواز میں بولا۔

وہ اچھل کر مڑا — اور آنکھوں میں حیرت دوڑ گئی۔ بچوں کو دیکھ کر خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں محسوس کی تھی۔

• کیا بات ہے، کون ہو تم ؟"

• ہم — ہم اس جزیرے کے باشندے ہیں — ذرا ہمیں اس لانچ کی سیر تو کرادیں " آفتاب نے درخواست کی۔

• اس جزیرے کے باشندے " اس نے بوکھلا کر کہا۔ لیکن اس جزیرے پر تو کوئی آبادی ہے ہی نہیں "

• اوہ اچھا، تو پھر ہم کسی اور جزیرے کی آبادی ہوں گے۔ ویسے تمہاری اطلاع کے لیے عرض کر دیں کہ دنیا کے تین چوتھائی حصے میں پانی ہے اور ایک چوتھائی حصے میں خشکی ہے، گویا ہم سبھی جزیروں پر رہتے ہیں "

• میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا "

• تو سیر کرادیں نا — سمجھ میں آجائے گا " آفتاب چہک کر بولا۔

• سیر کرادوں، سمجھ میں آجائے گا۔ یہ کیا بات ہوئی "

اسی وقت دوڑتے قدموں کی آواز سنائی دی —

• اوہو، وہ لوگ آگئے۔ اب وقت نہیں رہا باتیں کرنے کا " ان الفاظ کے ساتھ ہی آصف نے پستول نکال کر اس کی گدی پر رکھ دیا اور بولا :

• سنو میاں، اگر خوشی سے سیر نہیں کرا سکتے تو زبردستی کریں گے، چلو لانچ کو سمندر میں لے چلو "

اس نے مڑ کر پستول کو دیکھا، رنگ اڑتا نظر آیا، پھر لانچ کا انجن جاگ اٹھا اور وہ تیر کی طرح سمندر میں بڑھی — ایسے میں جزیرے کی طرف سے چیخ و پکار کی آوازیں آنے لگیں۔

• رک جاؤ سانبو، تم ہمیں چھوڑ کر کہاں بھاگے جا رہے ہو۔ ہم کس طرح واپس جائیں گے — تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا — رک جاؤ، رک جاؤ — مسٹر سلاٹر کو جب پتا چلے گا کہ تم ہمیں جزیرے میں چھوڑ آئے ہو تو وہ بہت بری طرح پیش آئیں گے اور اس وقت تم پچھتاؤ گے "

یہ سب باتیں ڈرائیور سانبو کو خود بھی معلوم تھیں، لیکن وہ بے چارہ کر ہی کیا سکتا تھا — انھوں نے ساحل کی طرف دیکھا اور جب یہ محسوس کر لیا کہ پستول یا رائفل کی گولی اب ان تک نہیں پہنچ سکتی، تو آفتاب اور فرحت کنارے پر آ کر کھڑے ہو گئے اور ساحل پر بیٹھے چلاتے دشمنوں کو ہاتھ ہلا ہلا کر الوداع کہنے لگے۔ ساحل ان کی نظروں سے دور ہوتے ہوتے اوجھل ہو گیا تو دونوں آصف کے پاس پہنچ گئے۔

• تم ہم لوگوں کو کہاں لے جانے والے تھے " آصف بولا۔

• ایک اور جزیرے پر — وہ جزیرہ بہت بڑا ہے اور اس وقت مسٹر سلاٹر کے قبضے میں ہے، وہیں آپ لوگوں کو پہنچانا ہے " اس نے بتایا۔

• لیکن اب نہ پہنچانا اور نہ شاید سلاٹر وہاں پہنچ سکے گا۔ تم ہمارے دارالحکومت کی طرف چل سکتے ہو "

• ہاں شاید "

• تو پھر لانچ کا رخ اس طرف موڑ دو، جوں ہی ہم ساحل پر پہنچے، تمہیں واپس آنے کی اجازت ہوگی۔ یہ ہمارا وعدہ ہے اور ہم اپنے وعدے سے کبھی نہیں پھرتے "

• بہت بہتر " اس نے کہا اور لانچ گھما دی۔ تینوں اسے بغور دیکھ رہے تھے۔ اچانک آصف بولا :

• ایک بات اچھی طرح یاد رکھنا دوست " لہجہ عجیب سا تھا۔

• جی، کون سی بات ؟" وہ ہکلایا۔

• اگر تم نے ہمیں دھوکا دینے کی کوشش کی اور ہمارے ملک کے دارالحکومت کے ساحل تک پہنچانے کی بجائے سلاٹر کے جزیرے تک پہنچا دیا تو ہمارا چاہے کچھ بھی انجام ہو — لانچ پر سے اترنے سے پہلے ہم تمہیں ہر حالت میں موت کے گھاٹ اتار دیں گے "

" م، میں، نہیں — میں تم لوگوں کو دھوکا نہیں دوں گا " اس نے کانپ کر کہا۔

• لیکن میرا خیال ہے، تم لانچ کو ساحل کی طرف نہیں لے جا رہے "

• ہاں، تم ٹھیک کہتے ہو، میں رخ تبدیل کر رہا ہوں اور تم پوری طرح بے فکر ہو جاؤ : اب یہ لانچ تمہارے ملک تک پہنچے گی "

• ہمیں بے فکر ہونے کی ضرورت نہیں، ہاں لانچ کا رخ درست سمت میں کر کے تم ضرور بے فکر ہو سکتے ہو " آفتاب نے مسکرا کر کہا۔

• اور ہاں، کیا تم سیدھے اسی جزیرے سے آ رہے ہو؟

• نہیں، کئی لانچیں اس جزیرے کے آس پاس بیکار چکر لگا رہی ہیں — وائرلیس پر جہاں ہی کسی لانچ کو حکم ملتا ہے، وہ لانچ حرکت میں آجاتی ہے "

• تم نے اس جزیرے پر کسی قیدی کو تو آتے نہیں دیکھا "

• نہیں : البتہ اس جزیرے پر ہل چل بہت ہے۔ قدم قدم پر پہرہ ہے۔ ایک ایک درخت پر پہرے دار موجود ہے۔ سنا ہے جزیرے کے بیچوں بیچ سلاٹر نے اپنا کیمپ لگا رکھا ہے "

• اوہ " ان کے منہ سے نکلا۔

• اور تم ہمیں اس جزیرے تک لے جا سکتے ہو؟ " فرحت نے سوالیہ لہجے میں پوچھا۔

• بالکل لے جا سکتا ہوں " اس نے خوش ہو کر کہا۔

• خیر، اتنا خوش ہونے کی ضرورت نہیں : فی الحال ہم اپنے ساحل کی طرف ہی جانا پسند کریں گے۔ ہاں، یہ ہو سکتا ہے کہ فوج لے کر اس جزیرے پر حملہ آور ہوں " آفتاب نے جلدی جلدی کہا۔ لانچ چلتی رہی — اچانک وائرلیس پر اشارہ موصول ہونے لگا۔ ڈرائیور نے بے چینی کی حالت میں ان کی طرف دیکھا —

☆ ☆ ☆

"کیا خیال ہے کامران مرزا، تمہیں سمندر میں نہ پھینک دوں؟" سلاٹر طنزیہ لہجے میں ہنسا۔

"ضرور، کیوں نہیں۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔ وہ بدستور ادھر ادھر ہاتھ پاؤں مار رہے تھے، تاکہ کسی چیز کو مضبوطی سے پکڑ سکیں۔

"لیکن میں اتنا بے وقوف نہیں کامران مرزا کہ تمہیں سمندر میں پھینک دوں، کیونکہ جانتا ہوں، تم سمندر سے پھر جہاز پر چڑھ آؤ گے۔"

"اگر اس وقت آفتاب یہاں ہوتا تو یہ ضرور کہتا، تو پھر کتنے بے وقوف ہیں، لیکن میں یہ نہیں کہوں گا، کیونکہ جانتا ہوں سلاٹر دنیا کے ذہین اور خطرناک ترین آدمیوں میں سے ایک ہے۔"

ان الفاظ کے ساتھ ہی ان کا ایک ہاتھ ایک کڑے سے ٹکرایا۔ انہوں نے کڑا مضبوطی سے تھام لیا، پھر دوسرا ہاتھ بھی اس پر جما دیا۔ اب اگر سلاٹر ان کی ٹانگیں چھوڑ بھی دیتا تو بھی وہ نیچے گرنے سے بچ سکتے تھے۔ دوسرے یہ کہ انہیں زور لگانے کے لیے ایک سہارا مل گیا تھا۔ اگر کڑا ان کے ہاتھ نہ آتا تو کچھ بھی کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ کڑا ہاتھوں میں پکڑتے ہی ایک زور دار جھٹکا ٹانگوں کو دیا۔ سلاٹر کو شاید ایک فیصد بھی امید نہیں تھی کہ ان کی طرف سے کوئی جھٹکا بھی مارا جا سکتا ہے، لہٰذا وہ الٹ پڑا، لیکن الٹتے الٹتے بھی اس نے ان کی ٹانگوں کو مضبوطی سے پکڑے رکھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ انسپکٹر کامران مرزا اس سمیت نیچے آ رہے۔ اب کڑا ان کے ہاتھوں میں تھا۔ وہ کڑے کے سہارے لٹکے ہوئے تھے اور سلاٹر ان کی ٹانگوں کو پکڑے لٹکا ہوا تھا۔

"کیا خیال ہے سلاٹر، ہم سمندر میں نہ کود پڑیں۔ پانی میں آسانی سے لڑ سکیں گے۔" انسپکٹر کامران مرزا نے تجویز پیش کی۔

"میں اتنی تکلیف میں نہیں ہوں، جتنی تکلیف میں تم ہو۔ میرے وزن کی وجہ سے تم سخت مشکل میں ہو۔ تم نے شاید کوئی کڑا پکڑ لیا ہے۔ اب اس کڑے کو پکڑے رہنا تمہارے لیے مصیبت بنا ہوا ہے، اسی لیے کہہ رہے ہو کہ سمندر میں کود پڑیں، لیکن بھلا مجھے کیا ضرورت کہ اپنے کپڑے خراب کر دوں۔"

انسپکٹر کامران مرزا واقعی اس وقت مصیبت میں تھے! تاہم وہ کڑے کو ہاتھ سے چھوڑ کر کسی وقت بھی اس مصیبت سے نجات حاصل کر سکتے تھے۔ انہوں نے چند لمحے کے لیے سوچا اور پھر ٹانگوں کو ایک جھٹکا مارا، لیکن اب سلاٹر ہوشیار تھا۔ ٹانگیں اس کے ہاتھ سے نہ نکلیں۔ اس نے ہنس کر کہا:

"مشکل ہے کامران مرزا، میرے ہاتھ شکنجوں کی طرح مضبوط ہیں۔"

"اچھا تو پھر یہ لو۔"

یہ کہتے ہی انسپکٹر کامران مرزا نے کڑا چھوڑ دیا۔ دونوں ایک زور دار چھپاکے کے ساتھ پانی میں گرے۔ اب سلاٹر ان کی ٹانگیں پکڑے نہیں رہ سکتا تھا، کیونکہ تیرنے کا بھی مسئلہ تھا۔ تیرنے کے ساتھ لڑنا بھی تھا، لہٰذا اس نے فوراً ٹانگیں چھوڑ دیں۔ ادھر انسپکٹر کامران مرزا سنبھل چکے تھے۔ دونوں تیرتے ہوئے ایک دوسرے کے سامنے آ گئے۔ ان کے سروں پر چاند چمک رہا تھا۔ شاید چاند کی اکیس یا بائیس تاریخ تھی، اس لیے مد جزر نہ ہونے کے برابر تھا۔ جہاز ان کے قریب سے گزر چکا تھا اور اب دونوں سمندر میں تھے۔ وقت کے دو عجیب آدمی سمندر میں ایک دوسرے کے مقابل تھے۔ سلاٹر نے اچانک غوطہ لگایا اور آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ انسپکٹر کامران مرزا اس کی چال کو سمجھ گئے۔ انہوں نے اس جگہ سے ہٹ جانا چاہا، لیکن اسی وقت سلاٹر نے پانی کے اندر ان کی ٹانگ پکڑ کر کھینچ لی۔ وہ بھی پانی کے نیچے چلے گئے۔ سلاٹر نیچے ہی نیچے جا رہا تھا۔ کافی گہرائی میں لے جا کر اس نے ان کی ٹانگ چھوڑ دی۔ وہ تیزی سے اوپر آئے۔ سلاٹر سطح پر تیرتا نظر آیا۔

"اس طرح کوئی فائدہ نہیں ہو گا سلاٹر۔ میں سانس روکنے میں تم سے کم ثابت نہیں ہوں گا۔ آؤ، انصاف کے ساتھ دو دو ہاتھ کر لیں۔"

"تو پھر کیوں نہ جہاز پر چڑھ کر فیصلہ کر لیا جائے۔" سلاٹر بولا۔

"مجھے اس طرح بھی کوئی اعتراض نہیں۔" وہ بولے۔

"یہ میں اس لیے بھی کہہ رہا ہوں کہ جہاز ہماری پہنچ سے نہ نکل جائے۔ اس طرح ہم دونوں ہی نقصان میں رہیں گے۔ جہاز ہم میں سے ایک کے تو کام آ ہی سکے گا۔"

"ٹھیک ہے، آؤ چلیں۔" انہوں نے حامی بھری۔

دونوں ساتھ ساتھ تیرنے لگے۔ اچانک سلاٹر نے ایک بھرپور مکا ان کے منہ پر دے مارا۔ مکا ان کی بائیں آنکھ پر لگا۔ ان کے منہ سے ایک ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ ایسے میں اگر وہ اوسان خطا ہو جانے دیتے تو ان کا ڈوب جانا یقینی تھا، کیونکہ مکے نے انہیں کچھ دیر کے لیے تو بے کار کر ہی دیا تھا۔ وہ تیزی سے پانی میں چلے گئے اور پھر کچھ فاصلے پر ابھرے۔ سطح پر آنے اور حواس جمع کرنے کے بعد انہوں نے جہاز کی سمت میں دیکھا۔ سلاٹر کچھ ہی فاصلے پر تیر رہا تھا۔

"تو تم دھوکے باز بھی ہو۔" انسپکٹر کامران مرزا غرائے۔

"میں اپنے دشمن کو ہر طرح زیر کرنا پسند کرتا ہوں۔" وہ ہنسا۔

انسپکٹر کامران مرزا کو اس پر بے تحاشا غصہ آ رہا تھا۔ انہوں نے تیرنے کی رفتار تیز کر دی اور جلد ہی اس کے پیچھے پہنچ گئے۔

ہاتھ بڑھا کر اس کے بال پکڑ لیے اور پانی میں غوطہ دیا، لیکن بال چھوڑے نہیں۔ کچھ وقت پانی میں گزر گیا تو سلاٹر زور سے تڑپا اور بال ان کے ہاتھ سے نکل گئے۔

"تو یہ تم نے بدلہ لیا ہے" سلاٹر نے شوخ آواز میں کہا۔

"ہاں، میں دھوکے بازوں سے اسی طرح بدلہ لیا کرتا ہوں"

"اب میری طرف سے ہوشیار رہنا، میں بھی کوئی رعایت نہیں کروں گا" سلاٹر بولا۔

"اس وقت تک تو جیسے رعایت پر رعایت کرتے ہی چلے آ رہے ہو" انھوں نے جل بھن کر کہا۔

اب دونوں قدرے فاصلے پر تیر رہے تھے۔ جہاز کافی دور جاچکا تھا۔ تیرنے کی رفتار میں کافی تیزی آ چکی تھی اور یہ تیزی جہاز پر پہلے پہنچنے کے سلسلے میں آئی تھی، کیونکہ جو پہلے پہنچ جاتا، پلّہ اسی کا بھاری رہتا۔ سلاٹر اتنا انصاف پسند اور بااصول نہیں تھا کہ اگر وہ پہلے پہنچ جاتا تو انہیں بھی پوری طرح چڑھنے کا موقع دیتا اور پھر مقابلہ شروع کرتا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اس سے پہلے پہنچ جانا چاہتے تھے۔ سلاٹر بھی اس بات کو سمجھتا تھا۔ وہ بھی سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے تھا۔ دونوں پوری کوشش کے باوجود ابھی تک ایک دوسرے سے آگے نہیں نکل سکے تھے۔ ساتھ ساتھ تیر رہے تھے۔

"مسٹر سلاٹر، جہاز پر پروفیسر غوری نظر نہیں آئے" اچانک انسپکٹر کامران مرزا کو خیال آیا۔

"تو پھر اس میں میرا کیا قصور؟" سلاٹر بولا۔

"وہ کہاں ہیں؟" انھوں نے پوچھا۔

"جہاں انہیں ہونا چاہیے" اس نے کہا۔

"میں سمجھا، تم بتانا نہیں چاہتے"

"یہی سمجھ لو" اس نے لاپروائی سے کہا۔

دونوں تیرنے کی رفتار پر پوری طرح توجہ دے رہے تھے اور ابھی تک کسی کو پیچھے نہیں چھوڑ سکے تھے۔ آخر وہ ایک ہی وقت میں جہاز تک پہنچے اور سیڑھی پر بھی دونوں کا ہاتھ ایک ساتھ پڑا۔ ساتھ ہی سلاٹر نے بائیں کہنی ان کی پسلیوں میں ماری۔ اس قسم کی حرکت سلاٹر پہلے بھی کر چکا تھا۔ وہ پوری طرح ہوشیار تھے۔ یکدم ایک ہاتھ سے سیڑھی پکڑے پکڑے باقی سارے دھڑ سے دوسری طرف لٹک گئے۔ سلاٹر کا وار خالی گیا۔ موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انھوں نے دایاں پاؤں سلاٹر کے پیٹ میں دیا۔ انہیں یوں لگا، جیسے لوہے پر پاؤں دے مارا ہو۔ اسی وقت انہیں یاد آیا، سلاٹر پر گولی نے اثر نہیں کیا تھا۔ وہ ضرور بلٹ پروف لباس پہنے ہوئے تھا؛ تاہم اس دھکے سے سلاٹر سنبھل نہ سکا کیونکہ کہنی مارنے کے سلسلے میں اپنا توازن بگاڑ چکا تھا۔ دوسرے ہی لمحے وہ پانی میں گرا۔ جتنی دیر میں وہ پھر سیڑھی کو پکڑتا، انسپکٹر کامران مرزا کئی ڈنڈے چڑھ چکے تھے۔ اب وہ اس کے ہاتھ نہیں آ سکتے تھے۔ جب وہ عرشے پر پہنچے، سلاٹر ان سے چند فٹ کے فاصلے پر تھا۔ انہیں اپنی طرف مڑتے دیکھ کر وہ رک گیا۔

"کیوں مسٹر سلاٹر، رک کیوں گئے" انسپکٹر کامران مسکرائے۔

"میں تم سے خوف زدہ ہرگز نہیں کامران مرزا، لو میں آ رہا ہوں تم سے جو ہوتا ہے، کر گزرو" سلاٹر نے قدرے جھنجلا کر کہا۔ ایسے میں اس نے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کی کوشش کی۔ وہ یہی بھول گئے۔ انہیں ایک زوردار جھٹکا لگا۔ پیچھے کی طرف لڑکھڑائے۔ سنبھلے تو سلاٹر ان کے سر پر کھڑا تھا اور اس کا پاؤں ان کے سر کا رخ کر چکا تھا۔ وہ بلا کی رفتار سے جھکائی دے گئے۔ سلاٹر کا پاؤں عرشے پر ٹھک کی آواز کے ساتھ لگا۔ دوسرے ہی لمحے اس کے سینے سے دو پاؤں اس زور سے ٹکرائے کہ وہ اچھل کر ریلنگ پر گرا۔ اس کے پاؤں اوپر اٹھ گئے۔ دھڑ کا وزن پاؤں کی نسبت زیادہ تھا، لہٰذا سر کے بل سمندر کی طرف چلا۔

"اب میں تمہیں موقع ہرگز نہیں دوں گا مسٹر سلاٹر۔ تم نہ صرف دنیا کے خطرناک ترین آدمیوں میں سے ایک ہو، بلکہ دھوکے باز اور مکار ترین آدمیوں میں سے بھی ایک ہو"

یہ کہہ کر انھوں نے سطح سمندر کی طرف دیکھا، لیکن سلاٹر انہیں کہیں بھی نظر نہ آیا۔ شاید وہ سینے کی چوٹ کو برداشت نہیں کر سکا تھا، ورنہ وہ جہاز کا رخ کیے بغیر نہیں رہ سکتا تھا، پھر بھی انسپکٹر کامران مرزا اس کے ابھرنے کا انتظار کرتے رہے، لیکن وہ دور دور تک نظر نہ آیا۔

"مسٹر سلاٹر، تم کہاں ہو" انسپکٹر کامران مرزا نے بلند آواز میں اسے پکارا، لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ آخر تھک کر وہ انجن روم کی طرف آئے۔ دونوں ڈاکو بے ہوش پڑے تھے۔ جہاز درست سمت میں جا رہا تھا، وہ پھر عرشے پر آ گئے اور چاروں طرف کا ایک چکر لگایا۔ سلاٹر کے دور دور تک آثار نہیں تھے۔ ایسے میں انہیں پروفیسر غوری کا اور زخمیوں کا خیال آیا۔ سلاٹر کے دو زخمی ساتھی تقریباً ہوش میں آ چکے تھے۔ انہیں باندھنا ضروری تھا۔ انجن روم میں بچ جانے والی ڈوری سے انھوں نے ان دونوں کو بھی باندھ دیا اور اس کمرے کی طرف بڑھے، جس میں سلاٹر اپنے ساتھیوں سمیت بیٹھا تھا۔ یہ کمرہ اب خالی پڑا تھا؛ البتہ اس کمرے میں سیڑھیاں نچلی منزل میں جا رہی تھیں۔ وہ سیڑھیاں اترنے لگے۔ نچلی منزل میں اسلحے کا ذخیرہ تھا؛ البتہ پروفیسر غوری یہاں کہیں بھی نہیں تھے۔ انھوں نے بے چینی کے عالم میں جہاز کے ایک ایک حصے کو دیکھ ڈالا۔ آخر تنگ آ کر زخمیوں کے پاس آئے۔

"کیوں حضرات، پروفیسر غوری کہاں ہیں؟"

"وہ۔۔۔ وہ یہاں کہاں؟" اس نے حیران ہو کر کہا۔

"کیا مطلب! کیا وہ جہاز پر نہیں تھے؟"

"ہاں، جزیرے سے انھیں جہاز پر ضرور سوار کیا گیا تھا، لیکن مسٹر سلاٹر کا کہنا تھا کہ آپ جہاز پر ضرور آئیں گے، لہٰذا انھیں جہاز پر رکھنے میں خطرہ تھا۔ انھوں نے وائرلیس کے ذریعے ایک لانچ کو بلایا اور پروفیسر عزری کو اس لانچ کے ذریعے بھیج دیا۔" اس نے جلدی جلدی بتایا۔

"اوہ، لیکن کہاں بھیج دیا؟"

"ایک جزیرے پر۔ وہ جزیرہ اس وقت پوری طرح مسٹر سلاٹر کے قبضے میں ہے۔ اف خدا، وہ بہت بڑا اور خوفناک جزیرہ ہے۔ اس کے چپے چپے پر سلاٹر کے آدمی موجود ہیں۔ تم اسے موت کا جزیرہ کہہ سکتے ہو۔"

"مجھے کیا ضرورت ہے اسے موت کا جزیرہ کہنے کی۔ تم شوق سے کہتے رہو۔ ہاں تو وہ جزیرہ ہے کس طرف؟"

"جہاز اسی کی سمت میں جا رہا ہے۔" جبرت نے کہا۔

"نہیں، اب اس سمت میں نہیں جا رہا۔ میں نے اس کا رخ پہلے جزیرے کی طرف کرا دیا ہے۔ ٹھہرو، میں پہلے ڈوائیٹلف سے بات کر لوں۔" یہ کہہ کر وہ انجن روم میں آ گئے۔

"ہیلو مسٹر فاضر۔ ہم جزیرے تک کتنی دیر میں پہنچ جائیں گے؟"

"جی بس، پہنچنے ہی والے ہیں۔"

"ویری گڈ۔" یہ کہہ کر وہ پھر عرشے کی طرف آئے اور ساحل کی تلاش میں نظریں دوڑانے لگے۔ آدھ گھنٹے بعد انھیں ساحل نظر آنے لگا۔ انھوں نے نظریں ساحل پر جما دیں۔ جلد ہی انھیں ساحل پر کچھ لوگ کھڑے نظر آنے لگے۔ وہ بہت بے چینی سے ہاتھ ہلا رہے تھے۔ جلد ہی وہ ذرا واضح طور پر انھیں دیکھنے کے قابل ہو گئے۔ دوسرے ہی لمحے وہ چونک اٹھے۔

"اوہو، یہ آفتاب، آصف اور فرحت تو نہیں ہیں۔ تت۔ تو کیا ان لوگوں نے شکست کھائی۔" وہ بڑبڑائے۔

اس خیال سے ہی ان کا دل بیٹھنے لگا۔ وہ سوچنے لگے: نہ جانے تینوں کس حالت میں ہوں گے۔ پھر ان کا خون کھولنے لگا۔ ان کا ہاتھ جیب میں رینگ گیا، لیکن سمندری پانی نے پستول تو بیکار کر دیا تھا۔ وہ تیزی سے جبرت پر جھکے اور اس کے ہولسٹر سے پستول نکال لیا۔

"ہم، میں ان لوگوں کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" انھوں نے غرّاتی ہوئی آواز میں کہا، پھر چونک کر بولے:

"مگر نہیں، پہلے معلوم تو کر لینا چاہیے، وہ کس حال میں ہیں۔" ان کا انداز خود سے باتیں کرنے کا تھا۔ وہ جلدی سے انجن روم میں آئے اور ایک ڈرائیور کے ہاتھ کھول دیے۔

"لنگر ڈال دو۔ بالکل ساحل کے قریب نہیں جانا ہے۔"

"بہت اچھا۔" اس نے کہا اور اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

جہاز رک گیا تو انھوں نے پھر اس کے ہاتھ باندھ دیے اور عرشے پر آ گئے۔ اب کنارے پر کھڑے لوگ صاف نظر آ رہے تھے اور ان کے چہروں پر حیرت کے آثار تھے۔

"آپ۔ آپ نے جہاز کیوں روک لیا؟ اسے آگے لے آئیے تا کہ ہم اس میں سوار ہو سکیں۔" ساحل پر کھڑے لوگوں میں سے ایک نے کہا۔

"پہلے یہ بتاؤ، وہ تینوں بچے کہاں ہیں، جو جزیرے میں رہ گئے تھے؟"

"ہم کچھ نہیں جانتے۔ یہاں کچھ زخمی لوگ موجود ہیں۔ ہاں ہم نے تینوں بچوں کو ایک لانچ میں فرار ہوتے ضرور دیکھا ہے۔ وہ لانچ اسی سمت میں گئی تھی، جس طرف سے آپ آئے ہیں۔"

"لیکن ہم نے تو کسی لانچ کو نہیں دیکھا۔"

"بھلا میں کیا بتا سکتا ہوں۔"

"اچھا خیر، تو وہ اسی طرف گئے تھے، جس طرف سے جہاز آیا ہے۔"

"ہاں، وہ تو اب تک سلاٹر کے جزیرے تک پہنچ بھی چکے ہوں گے۔"

"اوہ، گویا مجھے وہاں جانا ہوگا۔" کامران مرزا بڑبڑائے۔ یہ کہہ کر وہ مڑے۔

"لیکن یہیں کی تو مسٹر سلاٹر تک پہنچنا ہے۔ ہمیں بھی لے چلیے۔"

"میں سلاٹر کا ساتھی نہیں، اس کا دشمن ہوں اور وہ میرا دشمن ہے، لہٰذا میں تم لوگوں کو جہاز پر سوار کر کے مصیبت میں مبتلا نہیں ہو سکتا۔ سلاٹر خود ہی تمھارے لیے کوئی بندوبست کر دے گا۔" یہ کہہ کر وہ ڈرائیور کے پاس آئے، اس کے ہاتھ کھولے اور بولے:

"چلو بھئی، سلاٹر کے جزیرے کی طرف چلو۔"

"مگر یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"میں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ میرے بچے اور پروفیسر داؤد خطرے میں ہیں۔ اب چاہے کچھ بھی ہو، مجھے وہاں جانا ہی ہوگا۔"

"ٹھیک ہے، میں جہاز کا رخ ابھی تبدیل کرتا ہوں۔"

"لیکن اتنا سوچ لینا، اگر تم نے جہاز کو کسی اور طرف موڑا یا کوئی اور چالاکی کی تو پچھتاؤ گے۔"

"مجھے ایسا کرنے کی کیا ضرورت ہے۔" ڈرائیور نے کہا۔

جہاز واپس مڑنے لگا۔ ساحل پر کھڑے لوگ شور مچانے لگے۔ ہاتھ ہلانے لگے۔ احتجاج کرنے لگے، لیکن ان لوگوں کو ساتھ لینا ظاہر ہے پریشانی میں اضافہ کرنے والی بات تھی۔ اس لیے انھوں نے کوئی توجہ نہیں دی۔ ساحل سے دور ہونے کے بعد وہ انجن روم میں آ گئے۔

"مسٹر واٹیر، ہم اس جزیرے تک کتنی دیر میں پہنچ جائیں گے۔"

"تقریباً ایک گھنٹے بعد۔"

"کیا اس سے جلد نہیں پہنچ سکتے؟"

"اگر میرے ہاتھ کھلے چھوڑ دیے جائیں تو اس سے جلدی بھی پہنچ سکتے ہیں۔"

"شکریہ واٹیر، میں خطرہ مول نہیں لے سکتا، کیا خبر تم کوئی چال چل جاؤ، جب کہ میرا جزیرے تک پہنچنا بہت ضروری ہے۔"

"جیسے آپ کی مرضی — میں تو آپ کو کچھ بھی نہیں کہ رہا۔" اس نے لاپرواہ لہجے میں کہا اور وہ بھانپ گئے کہ واٹیر ضرور کوئی چال چلنے کے موڈ میں تھا — وہ دل ہی دل میں مسکرائے اور پھر کچھ سوچ کر اسلحے والے حصے میں آئے۔ انہوں نے خود کو ہر قسم کے اسلحے سے لیس کیا — عرشے پر موجود اسلحے کو بچا کر رکھ لیا — وہ اس کی مدد سے اس جزیرے کی حیثیت سے بچا سکتے تھے، لیکن پھر ان کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے۔ ان کے خیال میں تو آفتاب، آصف اور فرحت کے ساتھ پروفیسر صاحب بھی جزیرے پر تھے۔ ان حالات میں وہ جزیرے کی حیثیت سے ٹکر لیں، کوئی چیز بھی نہیں بچا سکتے تھے۔

پینتالیس منٹ بعد جزیرے کے آثار نظر آنے لگے۔ ان کا دل دھک دھک کرنے لگا اور پھر انہیں ایک خیال سوجھا — شوکی اور سلاٹر کے ذریعے ساتھیوں کو جن کا تعلق چھوڑ کر ان کی نظر بچاتے ہوئے وہ جہاز سے نیچے اتر گئے اور پھر انہوں نے سیڑھی چھوڑ دی — پانی میں تیرنے لگے۔

یہ سفر بھی عجیب سفر تھا — جب سے شروع ہوا تھا، ہنگامے ہی ہنگامے جنم لے رہے تھے — جہاز کو پیچھے چھوڑتے ہوئے وہ اس سے پہلے جزیرے تک پہنچ جانا چاہتے تھے —

☆ ☆ ☆

"خیر تو ہے، تم کچھ پریشان ہو گئے۔ وائرلیس پر کس کا پیغام ہو سکتا ہے؟"

"شاید مسٹر سلاٹر کا — یا ان کے کسی ماتحت کا۔" وہ بڑبڑایا۔

"تو تم پیغام سن لو — لیکن اسے یہ نہ بتانا کہ کن حالات کا شکار ہو، بلکہ یہی کہنا کہ تم قیدی بچوں کو لے کر جزیرے کی طرف آ رہے ہو۔"

"جی بہتر۔" یہ کہ کر اس نے وائرلیس کا بٹن دبا دیا اور بولا:

"ہیلو سر! تھیر ناتھن بول رہا ہوں۔"

"تم کہاں ہو — اب تک پہنچے کیوں نہیں —"

"ان — ان لوگوں کو پکڑنے میں دیر لگ گئی تھی سر، لیکن ہم پہنچ رہے ہیں۔"

"بہت خوب، جلدی پہنچو — اگر مسٹر سلاٹر تمہارے پہنچنے سے پہلے یہاں آ گئے تو مصیبت آ جائے گی — وہ ہر حال میں ان لوگوں کو جزیرے پر قیدیوں کی صورت میں دیکھنا چاہتے ہیں۔"

"آپ فکر نہ کریں سر، میں پوری رفتار سے آ رہا ہوں۔"

"ٹھیک ہے، ارے یہ کیا؟" اس کی چونکی ہوئی آواز سنائی دی —

"کیا ہوا سر؟"

"کک، کچھ نہیں — سنو، تم جزیرے کے نزدیک پہنچ کر آس پاس چکر لگانا شروع کر دینا — جب تک ہدایات نہ ملیں جزیرے کا رخ نہ کرنا۔"

"جی کیا مطلب؟" اس نے چونک کر کہا۔

"تمہیں مطلب سے کیا مطلب — اپنے کام سے کام رکھو۔ اور ہدایات پر عمل کرنا ہی تمہارا کام ہے۔" ان الفاظ کے ساتھ ہی سلسلہ ختم ہو گیا اور وہ ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔

"پہلے تو وہ حضرت کہ رہے تھے کہ فوراً جزیرے پر پہنچو، لیکن بعد میں ہدایات کا رخ موڑ دیا۔" آصف نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

"ہدایات کا رخ — تب ہدایات کے رخ بھی ہونے لگے — کمال ہے۔" آفتاب بولا۔

"ہو سکتا ہے، جزیرے کے آس پاس کوئی خطرہ نظر آیا ہو۔"

"تم یہ کیوں بھولتے ہو، انکل بھی اسی سمت میں گئے ہیں۔" فرحت جل بھن کر بولی۔

"میں کیوں بھولنے لگا یہ بات — میرا دماغ نہیں چل گیا کہ ایسی بات بھول جاتا۔" آصف نے بھی حملہ کر دیا۔

"لیجیے، یہ عجیب ہوا بات کا — کیا خیال ہے، کیوں نہ ہم اپنے ساحل کو بھول کر جزیرے کی طرف چل پڑیں۔ انکل وہاں دشمنوں کے مقابلے پر بالکل تنہا ہیں۔" آصف نے تجویز پیش کی۔

"لیکن اگر ہم اسے لے کر وہاں جائیں گے تو کیا یہ زیادہ بہتر نہیں ہوگا، جب کہ یہ جزیرہ موت کا جزیرہ بنا ہوا ہے۔" فرحت نے کہا۔

"اچھا، جیسے تم سب کی مرضی۔" آفتاب نے کندھے اچکائے۔ ایک گھنٹے کے سفر کے بعد انہوں نے دور تک ساحل کے آثار دیکھے، وہ چونکے بغیر نہ رہ سکے۔

"اب کیا ہوا؟" آصف بے چین ہو کر بولا۔

"ہمیں اب تک ساحل پر پہنچ جانا چاہیے تھا۔ شاید میں راستہ بھول گیا ہوں۔" اس نے کانپتی آواز میں کہا۔

"راستہ بھول گئے ہو یا کوئی چال چلنے کے موڈ میں ہو؟" آفتاب نے بھنا کر کہا —

"چاروں طرف سمندر ہی سمندر ہے — دور دور تک نہ کوئی

جہاز ہے، نہ کشتی، نہ کسی جزیرے کے آثار ہیں، نہ ہی کسی ساحل کے قریب ہیں۔۔۔ ان حالات میں بھلا کیا کوئی چال چلوں گا" اس نے بے چارگی کے عالم میں کہا۔۔۔

"تب پھر یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ تم راستہ بھول گئے ہو"

"یہ عین ممکن ہے، کیونکہ مجھے تمہارے ملک کے دارالحکومت کی بالکل درست سمت معلوم نہیں تھی۔۔۔ اندازے سے روانہ ہوا تھا؛ تاہم میں ایک بات یقینی طور پر کہہ سکتا ہوں"

"خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تم کم ازکم ایک بات تو یقینی طور پر کہہ سکتے ہو۔۔۔ اگر یہ بھی نہ کہہ سکتے تو ہم کیا کر لیتے" آفتاب نے جلے کٹے لہجے میں کہا۔

"بھئی، سن تو لو پہلے" فرحت نے اسے گھورا۔

"میں یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ یہ سمندری حدود ہیں تمہارے ملک کی ہی، لہٰذا سمندر میں بھٹکنے سے کیا یہ بہتر نہیں کہ ہم اسی سمت میں چلتے جائیں۔۔۔ اس طرح ہو سکتا ہے، ہم دارالحکومت تک نہ پہنچیں، لیکن کسی دوسرے شہر تک تو پہنچ ہی جائیں گے"

"تب تو سارا معاملہ گڑبڑ ہو گیا" آفتاب بوکھلا اٹھا۔

"کک، کیا مطلب؟" ڈرائیور بھی گھبرا گیا۔

"ہم نے تو سوچا تھا کہ شہر پہنچ کر مدد لے آئیں گے اور موت کے جزیرے پر حملہ آور ہوں گے، لیکن اس طرح تو بہت دیر ہو جائے گی۔۔۔ پہلے ہم اس شہر میں پہنچیں گے، وہاں سے اپنے شہر اور اپنے شہر سے مدد لے کر جزیرے تک۔۔۔ اتنی دیر میں تو نہ جانے وہاں کیا کچھ ہو جائے"

"ہاں، یہ تو ٹھیک ہے۔۔۔ لیکن سمندر میں بھٹکتے رہنا اس سے بھی زیادہ خطرناک ہوگا۔ لانچ کا پٹرول ختم ہو جائے گا اور پھر ہم اسے صرف کشتی کے طور پر استعمال کر سکیں گے، لیکن ایک کشتی سمندر میں بالکل غیر محفوظ ہوتی ہے؛ گویا ہم چاروں کی زندگیاں خطرے میں ہوں گی۔ اب جیسے آپ کہتے ہیں، کروں گا" اس نے جلدی جلدی بتایا۔

"کیا آپ دارالحکومت کا راستہ تلاش نہیں کر سکتے؟"

"بہت مشکل ہے، بلکہ تقریباً ناممکن ہے"

"تب تو مجبوری ہے۔۔۔ چلیے پھر۔۔۔ دیکھا جائے گا" آصف نے مایوسانہ انداز میں کندھے اچکائے۔

وہ چلتے رہے، پھر اچانک ساحل نظر آنے لگا اور ان کے چہروں پر قدرے رونق دوڑ گئی، کیونکہ سمندر سے خشکی بہرحال بہتر تھی۔۔۔ جوں جوں وہ نزدیک ہوتے گئے، ان کی بے چینی بڑھتی گئی۔۔۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا، ورنہ اڑ کر [illegible] تر اور وہاں سے اپنے شہر۔

اچانک وہ ٹھٹک کر رہ گئے۔ رات کی تاریکی میں ساحل پر انہیں کچھ سائے نظر آئے۔۔۔ سائے ادھر ادھر حرکت کر رہے تھے۔ ساحل پر ایک بڑی لانچ بھی موجود تھی۔۔۔

"یہ۔۔۔ یہ تو سمگلر لگتے ہیں" آصف نے پریشان ہو کر کہا۔

"ہاں، آپ کا خیال ٹھیک ہے، اب کیا کریں" ڈرائیور نے بھی فکرمندانہ لہجے میں کہا۔

"چلے چلیں ساحل کی طرف ہی، دیکھا جائے گا۔ سمگلروں سے بھی ملاقات سہی"

"لیکن ان لوگوں سے ملاقات ذرا مہنگی پڑتی ہے" ڈرائیور نے کہا۔

"کوئی بات نہیں، ہم بھی سستی چیزیں خریدنا پسند نہیں کرتے" آفتاب بول اٹھا۔

جھلائی ہوئی نظروں سے آفتاب کی طرف دیکھتے ہوئے ڈرائیور نے لانچ کا رخ ساحل کی طرف ہی رہنے دیا۔ انہیں یوں لگا، جیسے وہ دل ہی دل میں کہہ رہا ہو:

"جہنم میں جاؤ"

اب ساحل پر موجود لوگوں نے بھی ان کی لانچ کی آواز سن لی۔۔۔ وہ سیدھے کھڑے ہو گئے اور ساحل کی طرف بڑھتی لانچ کی طرف دیکھنے لگے۔۔۔ رفتہ رفتہ لانچ ساحل سے آ لگی۔ وہ چھلانگیں مار کر اترے۔ ساحل پر کھڑے لوگوں کا جائزہ لیا۔ یہ تعداد میں پانچ تھے۔۔۔ ان کے نزدیک ہی گیلی ریت پر لکڑی کی ایک بڑی سی پیٹی موجود تھی۔۔۔ اس پیٹی کو دیکھا تو ان کا رہا سہا شبہ بھی دور ہو گیا اور یقین ہو گیا کہ یہ لوگ سمگلر ہی ہیں۔

"ہیلو دوستو، ہم سمندر میں راستہ بھول گئے ہیں، ہمیں ملک کے مشرقی حصے کے دارالحکومت پہنچنا تھا۔ کیا آپ لوگ بتا سکتے ہیں، ہم کس حد تک غلط آ گئے ہیں اور کیا یہ ہمارا ہی ملک ہے" یہ کہہ کر اس نے اپنے ملک کا نام بتایا۔

"یہ ملک کا شمالی حصہ ہے اور آپ لوگ کافی غلط آ گئے ہیں۔ ہم لوگ سمندری راستہ آپ کو نہیں بتا سکتے"

"ہاں، یہ تو خیر ٹھیک ہے۔۔۔ ہم بھی اب سمندر کے ذریعے نہیں جائیں گے، بلکہ ادھر سے ہی اپنے شہر پہنچیں گے۔ مسٹر ڈرائیور لانچ کو باندھ دو۔ اس کا بھی کوئی بندوبست کر لیا جائے گا"

"اچھی بات ہے" اس نے کہا اور ایک کھونٹے سے لانچ کا رسہ باندھ دیا۔

"کیا آپ ہمیں مشرقی دارالحکومت تک پہنچنے کا راستہ بھی نہیں بتا سکتے۔ ہم یہاں سے کہاں جائیں؟" آصف نے پوچھا۔

"یہاں سے شہر، شہر سے ہر جگہ جانے والی بسیں اور گاڑیاں مل جاتی ہیں"

"اور شہر یہاں سے کتنی دور ہے؟" فرحت بولی۔

"تقریباً پانچ کلومیٹر"

"اور یہاں کوئی ٹیکسی وغیرہ بھی نظر نہیں آ رہی۔ آخر ہم شہر تک کس طرح پہنچیں؟"

"بھلا ہم کیا بتا سکتے ہیں۔۔۔ یہ آپ کا مسئلہ ہے۔۔۔ ویسے بھی

پانچ کلومیٹر کوئی اتنا زیادہ فاصلہ نہیں ہے — آپ کو پیدل ہی جانا ہوگا۔ اس طرف کسی ٹیکسی کے آنے کی امید نہ رکھیے گا۔" ان میں سے ایک نے کہا۔ یہ پڑھا لکھا اور مہذب لباس میں تھا۔

"کیوں جناب، کیا ٹیکسی ڈرائیور اس طرف آتے ہوئے ڈرتے ہیں؟" آفتاب نے مایوسانہ لہجے میں کہا۔

"ہاں!" اس کے منہ سے نکل گیا۔

"لیکن کیوں ڈرتے ہیں۔ یہ بھی بتایئے نا!" آصف بھنّا اٹھا۔

"آپ پتا نہیں — تم لوگ تو وکیلوں کی طرح سوالات کر رہے ہو — ہم کسی عدالت میں نہیں، ساحلِ سمندر پر کھڑے ہیں۔" اس نے بُرا سا منہ بنایا۔

"اچھا جناب، ناراض کیوں ہوتے ہیں — آپ کے شہر میں اتفاق سے مہمان بن گئے ہیں۔ مہربانی فرما کر راستہ بتا دیں، ہم پیدل مارچ ہی کر لیتے ہیں۔" فرحت نے درخواست کرنے کا انداز اختیار کیا —

"اس طرف چلے جایئے، ناک کی سیدھ میں۔"

"آؤ بھئی ڈرائیور صاحب، ناک کی سیدھ میں چلیں۔" آفتاب بولا۔

"ایک منٹ" آصف بول اٹھا اور پھر پڑھے لکھے آدمی کی طرف متوجہ ہوا —

"لیکن جناب، آپ یہاں کیا کر رہے ہیں۔ یہاں ہم ایک وین بھی تو دیکھ رہے ہیں۔ کیا آپ اس وین کو یہیں چھوڑ کر لانچ پر کہیں جا رہے ہیں یا پھر آپ میں سے کچھ لانچ پر اور کچھ اس وین کے ذریعے شہر جائیں گے — اگر بات یہی ہے تو ہمیں بھی لے جا سکتے ہیں۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔"

"نہیں، ہم سب لانچ پر جا رہے ہیں۔ شکار کھیلنے نکلے ہیں۔ رات بھر شکار کھیلیں گے اور صبح لوٹیں گے، اس وقت ہم وین کے ذریعے شہر جائیں گے۔" اب اس کا لہجہ اکتایا ہوا تھا۔

"ہوں، اور اس پیٹی میں کیا ہے؟"

"شکار کا سامان، جالی وغیرہ — اب میں تم لوگوں کے سوالات سے تنگ آ گیا ہوں۔ میں کوئی تمہارا ملازم نہیں ہوں، لہٰذا اپنا راستہ لو۔" اس نے جھنجلائی ہوئی آواز میں کہا۔

"چلو بھئی، ٹھیک تو کہہ رہے ہیں یہ صاحب، اگر ہم اپنا راستہ نہیں لیں گے تو شہر کس طرح پہنچیں گے۔" آفتاب نے گھبرا کر کہا۔

"ہاں ٹھیک ہے، چلو۔" آصف بولا۔

چاروں نے شہر کی طرف منہ کیے اور قدم اٹھا دیے۔ اچانک آصف ٹھٹک کر رکا — اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اس نے ڈرے ڈرے انداز میں کہا —

"نن، نہیں — ہم اس طرح نہیں جائیں گے۔"

"اس طرح نہیں جائیں گے، کیا مطلب — تو پھر کس طرح جائیں گے۔" فرحت کے لہجے میں بلا کی حیرت تھی۔

آصف کوئی جواب دیے بغیر پڑھے لکھے آدمی کی طرف مڑا۔

"آپ نے سنا جناب، میں نے کیا کہا۔"

"تم لوگ تو مجھے کچھ سرپھرے سے لگتے ہو۔" اس نے تلملاتے ہوئے انداز میں کہا۔

"ہاں، بلکہ سرپھرے سے نہیں، پورے سرپھرے ہیں۔" آفتاب نے اصرار کیا۔

"میری بلا سے، تم کوئی بھی ہو، کچھ بھی ہو — جاتے ہو یا نہیں جاتے، مجھے کیا، چلو بھئی، اپنا کام کرو۔" اس نے اپنے چاروں ساتھیوں سے کہا۔ فوراً اس کے ساتھی حرکت میں آ گئے اور پیٹی کی طرف بڑھے۔

"میری ایک تجویز ہے جناب!" آصف نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"کیسی تجویز؟" اس نے پھاڑ کھانے والے انداز میں کہا۔

"آپ یہ پیٹی کھول کر دکھا دیں — اس صورت میں ہم یہاں سے فوراً رفوچکر ہو جائیں گے — رفوچکر کا مطلب سمجھتے ہیں آپ؟"

"پیٹی کھول کر دکھا دوں، لیکن کس لیے؟" وہ حیران رہ گیا۔

"ہمارا خیال ہے، بلکہ نیک خیال ہے کہ آپ لوگ دراصل سمگلر ہیں اور اس پیٹی میں شکار کا سامان نہیں، سمگلنگ کا مال ہے۔"

"اگر ہم سمگلر ہیں بھی اور اس پیٹی میں سمگلنگ کا مال ہے تو بھی تم کوئی خدائی فوج دار ہو؟" وہ جھنجلا کر بولا۔

"ہیں آپ کچھ بھی سمجھ لیں، کچھ بھی کہہ لیں، اس کی پروا نہیں کریں گے۔ بس آپ پیٹی کھول کر دکھا دیں۔" آصف بولا۔

"دیکھو بھئی، بہت ہو چکی — اب تم چلتے پھرتے نظر آؤ۔ اس پیٹی میں سمگلنگ ومگلنگ کا مال نہیں ہے۔" وہ بھنّا کر بولا۔

"نہیں جاتے — اب تو ہم پیٹی کھلوا کر دیکھیں گے۔"

"آصف، تمہیں کیا ہو گیا ہے — ہمیں کیا پڑی ہے، دوسروں کے پھڈے میں ٹانگ اڑانے کی۔ ہم اس وقت ویسے بھی بہت جلدی میں ہیں۔ ہمیں مدد لے کر ابا جان تک پہنچنا ہے۔ دیر ہونے کی صورت میں کہیں ہمیں خطرناک صورتِ حال کا سامنا نہ کرنا پڑ جائے اور تم ان لوگوں سے الجھنے پر گویا ادھار کھائے بیٹھے ہو۔"

"الجھنے پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں، بھئی واہ۔" فرحت نے لطف لیا۔

"یہ محاورات سے لطف اندوز ہونے کا وقت نہیں۔" آفتاب نے بھنّا کر کہا۔

"تب پھر تمہیں کیا ضرورت تھی استعمال کرنے کی۔" فرحت نے اسے گھورا —

"اُف خدا، تم لوگ تو سرپھرے بھی نہیں، پاگل لگتے ہو۔" اس نے دونوں مٹھیاں پوری طاقت سے بھینچ لیں اور ہوا میں لہرائیں۔

"دیکھیے جناب' ملکہ معاف کیجیے — آپ تو گرگٹ کی طرح رنگ بدل رہے ہیں۔ ہمارے بارے میں اتنی جلد جلد رائے تو نہ بدلیے کہ خود ہم اپنے بارے میں شک میں مبتلا ہو جائیں اور سوچنے لگیں کہ آخر ہم ہیں کیا" آفتاب نے بڑے بڑے منہ بنائے۔

"چلے جاؤ" اس نے چیخ کر کہا— جاؤ اتنا لمبا کر دیا کہ وہ سہم کر رہ گئے۔

"اف خدا' ہم نے اتنا لمبا جاؤ کبھی نہیں سنا— آؤ بھئی' اب چل ہی دیں" آفتاب نے آصف کا بازو پکڑ کر کھینچا۔ آصف نے اپنے بازو کو زوردار جھٹکا مارا اور چیخ کر بولا۔

"تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا"

آفتاب کئی قدم لڑکھڑا گیا اور پھر گر ہی گیا' لیکن پھر اٹھتے ہی اس نے دونوں مٹھیوں میں ریت بھرتے ہوئے ان لوگوں کی طرف اچھال دی — ریت سیدھی ان کی آنکھوں کی طرف گئی۔

"ارے ارے' یہ کیا؟"

"ریت کی شرارت— آصف' تم سے میں بعد میں سمجھوں گا— یعنی اس جھٹکے کا بدلہ ضرور لوں گا"

"ابھی لے لو" یہ کہہ کر آصف نے بھی ریت مٹھیوں میں بھر لی اور ان کی طرف اچھال دی— ہوا کا رخ پہلے ہی دیکھ چکا تھا—

اب فرحت بھی نہ رہ سکی— سمجھ گئی کہ آصف اس پیٹی کو کھول کر دیکھے بغیر نہیں رہے گا— اس نے بھی آؤ دیکھا نہ تاؤ' ریت اچھال دی— لانچ کا ڈرائیور حیرت کا بت بنا یہ ساری کارروائی ایک تماشائی کی حیثیت سے دیکھ رہا تھا' پھر جیسے اسے بھی ہوش آ گیا۔ وہ پڑھے لکھے آدمی کی طرف بڑھا۔ وہ ابھی آنکھیں مل رہا تھا کہ اس نے اس کے سر کے بالوں سے پکڑ کر گھما ڈالا۔ اس کے منہ سے چیخیں نکلنے لگیں۔ اس دوران آفتاب' آصف اور فرحت باقی چار پر پل پڑے تھے— آنکھوں میں ریت کی وجہ سے وہ بخوبی مقابلہ کرنے کے قابل نہیں رہ گئے تھے۔ لیکن پھر بھی موم کے بنے ہوئے تو نہیں تھے۔ ہاتھ پیر تو خوب چلا سکتے تھے— یہ ہاتھ پیر اندھا دھند اور سوچے سمجھے بغیر چلائے گئے تھے' لہذا کئی لگے تو انہوں نے وصول کر لیے۔ جب تک وہ دیکھنے کے قابل ہوئے' ان کی اچھی بھلی چٹنی بن چکی تھی' لیکن جوں ہی دیکھنے کے قابل ہوئے' وہ شیر ہو گئے اور جھپٹ جھپٹ کر ان پر حملے کرنے لگے۔ لانچ ڈرائیور نے ان کا خوب ساتھ دیا اور پڑھے لکھے آدمی کو بے دم کرنے کے بعد چوتھے آدمی کی طرف بڑھا' جو آفتاب' آصف اور فرحت کے لیے پریشانی کا باعث بنا ہوا تھا— اب ایک ایک کے مقابلے میں ایک ایک تھا۔ انہیں پہلے کی نسبت آسانی ہو گئی۔

ایسے میں آصف کے مقابل نے اسے دونوں ہاتھوں میں اٹھا کر پھینک مارا— وہ دور تک لڑھکتا چلا گیا— دشمن پھر دوڑ کر اس کی طرف آیا— وہ چاہتا تھا' اسے سنبھلنے کا موقع نہ دے۔ یہ دیکھ کر آصف نے لڑھکنا جاری رکھا اور رفتار تیز کر دی— یوں بھی وہ قدرے ڈھلوان جگہ پر تھا— لڑھکنا آسان تھا اور رفتار خود بخود تیز ہو گئی تھی' پھر ایک جگہ ایک جھاڑی نے اس کے لڑھکنے کا سلسلہ روک دیا۔ اب اسے اٹھنا پڑا— اتنے میں دشمن نزدیک آ گیا— وہ جھپٹا' جیسے اب آصف پر چھا جائے گا' پھر اسے گریبان سے پکڑنے کے لیے یک دم جھکا۔ آصف یک لخت ایک طرف سرک گیا— اس کے ہاتھ ریت سے ٹکرائے۔ فوراً ہی اس کی کمر پر ایک زوردار ٹھوکر لگی۔ چونکہ جھکا ہوا تھا' لہذا منہ کے بل گرا۔ بس پھر کیا تھا' آصف نے موقع دیے بغیر پے در پے ٹھوکریں مارنے لگا۔

آفتاب کے مقابلے میں بہت خونخوار قسم کا آدمی تھا۔ ایک بار جو اس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر جھٹکا دیا تو اسے رات کے وقت تارے نظر آ گئے۔ جھنجھلا کر مڑا اور اس کی طرف دوڑ پڑا۔ خیال یہ تھا کہ سر کی ٹکر دے ماروں گا' لیکن وہ بھی کم تیز طرار نہیں تھا۔ جھکائی دے کر ایک طرف ہو گیا اور آفتاب آگے نکل گیا—

"کہاں بھاگے جا رہے ہو' میں یہ رہا" دشمن نے مذاق اڑانے والے لہجے میں کہا— آفتاب خود کو پرسکون رکھتے ہوئے رکا' مڑا اور بولا:

"ذرا پیٹی کی طرف جا رہا تھا' پیارے دشمن— اگر تمہیں یہ پسند نہیں تو تمہاری طرف کا رخ کر لیتا ہوں"

یہ کہہ کر اس نے ایک چھلانگ لگائی' لیکن اس بار اس نے چال چلی تھی— چھلانگ اس نے درمیان میں ہی روک لی۔ ادھر دشمن اس کی چھلانگ کے دھکے سے بچنے کے لیے اپنی جگہ سے حرکت کر چکا تھا' لہذا اس کا رخ کر کے آفتاب نے چھلانگ لگائی اور یہ چھلانگ بہت کارگر رہی— اب اس نے دشمن کو موقع دینا مناسب نہ سمجھا اور تابڑ توڑ مکے اس کی ناک پر دے مارے۔ یہاں تک کہ وہ لمبا لیٹ گیا۔

ادھر فرحت بھاگ بھاگ کر اپنے دشمن کو بے دم کر چکی تھی— آصف اس کی مدد کو آگے بڑھا اور بڑھا کے دشمن کی ٹانگوں میں ٹانگ اڑا دی۔ وہ منہ کے بل گرا۔ دونوں اس کی کمر پر سوار ہو گئے۔ اتنی دیر میں لانچ ڈرائیور دشمن کو ڈھیر کر چکا تھا۔

اب ہم نہایت اطمینان اور سکون سے پیٹی کا جائزہ لے سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے' اس میں بہت ہی قیمتی مال ہے" آفتاب نے خوش ہو کر کہا۔

"کتنا قیمتی' یہ بھی تو اندازہ لگاؤ" فرحت نے اس کی طرف دیکھا۔

"میرا خیال ہے' اس میں ہیرے ہیں" آفتاب نے پرجوش آواز میں کہا۔

"لیکن میرا خیال ہے کہ اس میں ہیروں سے بھی زیادہ قیمتی

مال ہے۔" آصف نے کہا۔
"ہیروں سے زیادہ قیمتی، وہ تو پھر یورینیم دھات ہو سکتی ہے۔"
فرحت حیران ہو کر بولی۔
"یورینیم دھات، جس سے ایٹم بم بنتے ہیں۔"
"ہاں، وہ دنیا کی قیمتی ترین دھات ہے، لیکن صرف یورینیم کہنا درست نہیں۔ یورینیم ۲۳۵ وہ دھات ہے، جس سے ایٹم بم بنتا ہے۔"
"لیکن تم یہ کس طرح کہہ سکتے ہو کہ اس میں یورینیم ہے۔"
لانچ ڈرائیور نے تھر تھر کانپتی آواز میں کہا۔
"میں نے یہ کب کہا۔ میں نے تو یہ کہا تھا کہ اس میں ہیروں سے بھی زیادہ قیمتی مال ہے۔ اس سے فرحت نے یہ نتیجہ نکال لیا کہ اس میں یورینیم ہے۔"
"اگ، اگر۔ اگر اس میں یورینیم نکل آیا، تت، تو......"
ڈرائیور کھوئے کھوئے لہجے میں بولا۔
"تت، تو۔ کیا۔ تمہیں کیا ہوا ڈرائیور صاحب۔" آفتاب نے طنزیہ لہجے میں کہا۔
"کک، کچھ نہیں۔"
"اوہ بھئی، پیٹی کھول کر دیکھیں۔ اب یہ شکاری یا سمگلر لوگ ہمیں نہیں روک سکتے۔ ڈرائیور صاحب، ذرا ان پر نظر رکھنا۔ کہیں ان میں سے کوئی حرکت میں آ کر پھر گڑبڑ نہ کر دے۔"
"ٹھیک ہے، تم فکر نہ کرو۔ ان میں سے کوئی بھی حرکت نہیں کر سکے گا۔"
"بہت بہت شکریہ۔ تم نے ہماری بہت مدد کی۔ تمہیں عزت طور پر تمہارے ملک روانہ کر دیا جائے گا۔ بشرطیکہ تم ہمارے ملک کے خلاف کسی بھی سازش میں آئندہ شرکت نہ کرنے کا وعدہ کرو۔"
"یہ وعدہ میں اسی وقت کرتا ہوں۔" اس نے مسکرا کر کہا۔
"شکریہ۔" آصف بولا، پھر تینوں پیٹی کی طرف بڑھے۔
انہوں نے ہاتھوں کی مدد سے پیٹی کا ڈھکنا اٹھانے کی کوشش کی۔ لیکن اس پر کیلیں جڑی ہوئی تھیں۔ انہوں نے اپنی جیبوں کی تلاشی لی اور آفتاب کی جیب میں سے ایک چاقو نکل آیا۔ آفتاب نے اسے کھولا اور اس کی مدد سے پیٹی کا ڈھکنا کھولنے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا ہی تھا کہ ایک آواز نے انہیں چونکا دیا۔
"خبردار، ہاتھ اوپر اٹھا دو۔"

☆ ☆ ☆

پانی سے سر ابھار کر انہوں نے جزیرے کا جائزہ لیا۔ ہر طرف مکمل طور پر سکون تھا۔ کہیں کسی ہل چل کے آثار نہیں تھے۔ آخر وہ پیٹ کے بل رینگتے ہوئے جزیرے میں داخل ہوئے۔ جہاز ان سے کافی پیچھے چلا آ رہا تھا اور ٹھیک جزیرے کے رخ پر آ رہا تھا۔ ایک درخت کی اوٹ لے کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ ہر طرف کا جائزہ لیا۔ دیکھا بھالا اور پھر یہ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکے کہ جزیرے پر آس پاس کوئی نہیں ہے۔ سلاٹر اور اس کے ساتھی اگر جزیرے پر موجود ہوتے تو ساحل کی طرف ان میں سے کچھ لوگوں کا موجود ہونا ضروری تھا۔ اب وہ تیزی سے آگے بڑھے، کیونکہ اگر جزیرے پر کوئی نہیں تھا تو ان کی واپسی خطرے میں پڑ سکتی تھی۔ جہاز عین جزیرے تک آ جاتا تو پھنس کر رہ جاتا، اسے گہرے پانی میں ہی روکنا ضروری تھا۔ کافی آگے تک جا کر وہ لوٹ آئے اور پانی میں چھلانگ لگا دی۔ اب وہ جہاز کی طرف تیر رہے تھے۔
جہاز پر چڑھ کر انہوں نے لانبر کو کھولا اور اس سے بولے:
"لانبر، اسی جگہ لنگر ڈال دو، ورنہ جہاز پھنس جائے گا۔"
"بہت بہتر۔" اس نے کہا اور لنگر ڈالنے لگا۔ چند منٹ بعد وہ پھر اسے باندھ رہے تھے۔
"یہ کیا، اب پھر کیوں مجھے باندھ رہے ہیں؟"
"میں ذرا جزیرے کا جائزہ لے آؤں، پھر آ کر تمہیں کھول دوں گا۔" وہ بولے۔
رابن وغیرہ کی رسیوں کا جائزہ لے کر اطمینان کرنے کے بعد وہ پھر نیچے اترے۔ جزیرے پر پہنچے اور تمام جزیرے میں دوڑتے پھرے۔ جزیرے پر جگہ جگہ استعمال کی چیزیں بکھری پڑی تھیں لیکن کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے ابھی ابھی سب لوگ جزیرہ چھوڑ کر چلے گئے ہوں۔
"اس کا مطلب ہے، سلاٹر مجھ سے پہلے یہاں پہنچ گیا تھا اور اس نے مجھ سے بھڑنے کی بجائے پروفیسر عوزی کو لے کر فرار ہونا بہتر خیال کیا۔ اُف خدا، اب میں اسے کہاں ڈھونڈوں گا۔ کیسے پروفیسر صاحب تک پہنچوں گا اور پروفیسر صاحب تک ہی نہیں۔ آفتاب، آصف اور فرحت تک بھی۔ وہ بھی تو سلاٹر کے قیدی بن گئے ہیں۔" وہ بڑبڑائے۔ پھر جزیرے پر بکھری چیزوں کا جائزہ لیتے رہے۔ ان چیزوں میں کوئی کام کی چیز نہ مل سکی۔ آخر مایوس ہو کر جہاز کی طرف آئے۔ لانبر کے ہاتھ کھولے اور کہا:
"لانبر، کیا تم جہاز کو میرے ملک کے مشرقی ساحل پر پہنچا سکتے ہو؟"
"جی ہاں، کیوں نہیں۔ میں نے جہاز رانی کرتے عمر گزاری ہے۔"
"تو پھر چلو۔ اور یاد رکھو، تمہاری زندگی اسی وقت تک محفوظ ہے، جب تک کہ تم مجھے دھوکا نہ دو۔"
"ٹھیک ہے۔ میں دھوکا نہیں دوں گا۔"
"دوسرے یہ کہ جس قدر تیز چل سکتے ہو چلو۔ تمہارے خیال میں ہم کتنی دیر میں پہنچ سکیں گے۔"
"تین گھنٹے تو لگ ہی جائیں گے۔"

"خیر چلو، اب اس کے سوا کیا ہی کیا جا سکتا ہے۔"

"تت، تو کیا، جزیرے پر کوئی نہیں ہے؟" اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

"نہیں، جزیرہ سنسان پڑا ہے۔"

"کمال ہے۔" وہ بولا اور لنگر اٹھانے لگا۔ جلد ہی جہاز واپس جا رہا تھا۔ انسپکٹر کامران مرزا کافی حد تک فکر مند نظر آ رہے تھے اور گہری سوچ میں گم تھے ۔۔۔ اپنے ساحل پر پہنچنے تک وہ سوچ میں گم ہی رہے ۔۔۔ جہاز سے ایک کشتی اتار دی گئی اور وہ اس میں بیٹھ کر ساحل تک پہنچے ۔۔۔ لانچر کو ایک مرتبہ پھر پوری احتیاط سے باندھ چکے تھے ۔۔۔ ساحل پر موجود پولیس کو جہاز کے بارے میں ہدایات دے کر اور ان سے ایک جیپ حاصل کر کے وہ نائب صدر کی طرف روانہ ہوئے ۔۔۔ اس وقت رات کے دو بج رہے تھے ۔۔۔ دو بجے طوسی بہادر کو جگایا گیا، لیکن جب انہیں معلوم ہوا کہ جگانے والے کا نام انسپکٹر کامران مرزا ہے تو ان کی ساری ناگواری کافور ہو گئی ۔۔۔ جلد ہی وہ آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ انسپکٹر کامران مرزا کی ردی حالت دیکھ کر طوسی بہادر بھونچکے رہ گئے۔

"یہ کیا حالت بنا رکھی ہے کامران مرزا؟"

ان کا لباس مٹی اور کیچڑ میں لت پت اور جسم کی حالت بہت خستہ تھی، لیکن انہیں شاید ان باتوں کی ذرا بھی پروا نہیں تھی ۔۔۔ انہوں نے جلدی جلدی سارے حالات کہہ سنائے۔ طوسی بہادر سکتے میں آ گئے، آخر بولے:

"پھر اب تم کیا چاہتے ہو؟"

"میں اس پورے کیس کی چابی سے بات کرنا چاہتا ہوں۔" وہ بولے۔

"کیس کی چابی، میں سمجھا نہیں۔" طوسی بہادر کے لہجے میں حیرت تھی۔

"اس کیس کی چابی دوست ملک کے صدر مسٹر عین بھنڈارا ہیں۔ یہ بات صرف وہ جانتے ہیں کہ انہوں نے ہمارے ملک کے سائنسدانوں کو کیوں بلایا تھا اور کہاں بلایا تھا، وہ چھ ماہ کہاں رہے، کیا کرتے رہے؟ یہ تمام باتیں اگر بتا سکتے ہیں تو مسٹر عین بھنڈارا۔ اب جب ہمارے دو بہت بڑے سائنس دان سلاٹر اور التانیو کے جال میں پھنس چکے ہیں اور ان کی قید میں جا چکے ہیں ۔۔۔ مسٹر عین بھنڈارا کو یہ بات بتا دینی چاہیے کہ یہ سارا معاملہ کیا ہے ۔۔۔ صاف ظاہر ہے، التانیو اور سلاٹر ہمارے ساتھیوں کو لے کر اسی مقام کی تلاش میں نکلے ہیں۔" وہ کہتے چلے گئے۔

طوسی بہادر کافی دیر تک سوچ میں گم رہے، آخر بولے:

"ٹھیک ہے، میں صدر مملکت کو فون کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ فون پر جٹ گئے ۔۔۔ آخر پندرہ منٹ بعد سلسلہ ملا۔ صدر مملکت نے ساری بات سننے کے بعد جواب دیا:

"ٹھیک ہے، انسپکٹر کامران مرزا کی روانگی کا بندوبست کر دیا جائے۔ میں عین بھنڈارا کو فون کیے دیتا ہوں کہ وہ آ رہے ہیں۔ یا پھر کامران مرزا فون پر ان سے بات کرنا چاہتے ہیں؟"

طوسی بہادر نے ان سے یہ بات پوچھی اور جواب نفی میں پا کر بولے:

"جی نہیں سر، وہ خود جا کر بات کرنا چاہتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے، ان کی روانگی کا انتظام کر دیں۔ میں انہیں فون کر دیتا ہوں۔"

"ایک منٹ سر۔" یہ کہہ کر طوسی بہادر انسپکٹر کامران مرزا کی طرف مڑے:

"اور کوئی بات کامران مرزا؟"

"میں یہ معلوم کرنے کے لیے بھی بے چین ہوں کہ اس طرف تو خیریت ہے نا ۔۔۔ میرا مطلب ہے، پروفیسر داؤد کے ساتھ تو کوئی چکر نہیں چلا؟"

طوسی بہادر نے یہ سوال صدر مملکت سے پوچھا تو وہ بولے:

"کچھ نہیں کہا جا سکتا۔"

"جی کیا مطلب؟" طوسی بہادر چونک کر بولے۔

"انسپکٹر جمشید، خان رحمان، تینوں بچے اور پروفیسر داؤد کسی نامعلوم پروگرام کے تحت کسی نامعلوم جگہ گئے ہوئے ہیں۔ اس بار انہوں نے اپنے پروگرام سے کسی کو بھی خبردار نہیں کیا تھا، کیونکہ ان کا خیال تھا۔ ان کی تفریح ہر مرتبہ غارت ہو جاتی ہے، لہٰذا اس بار وہ بہت ہی خفیہ انداز میں جائیں گے ۔۔۔ اب مجھے معلوم نہیں کہ وہ کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں۔"

"تب تو وہ خیریت سے ہی ہوں گے۔" طوسی بہادر بولے۔

"ہاں، نظر تو یہی آتا ہے۔"

"اچھا سر، بہت بہت شکریہ۔"

شکریہ۔" دوسری طرف سے ریسیور رکھے جانے پر انہوں نے بھی ریسیور رکھ دیا اور انسپکٹر کامران مرزا کو پروفیسر داؤد کے بارے میں اطلاع دی۔

"ٹھیک ہے، اس سے تو یہی ظاہر ہے کہ وہ لوگ خیریت سے رہیں۔"

ایک گھنٹے بعد ایک خصوصی جہاز میں بیٹھے دوست ملک کی طرف پرواز کر رہے تھے ۔۔۔ ان کا سفر دو گھنٹے بعد ختم ہوا۔ ایئرپورٹ پر انہیں ایک سرخ لمبی کار میں بٹھایا گیا اور اس کے آدھ گھنٹے بعد وہ مسٹر عین بھنڈارا کے سامنے بیٹھے تھے۔ مسٹر عین بھنڈارا پکے سے رنگ کے سڈول آدمی تھے ۔۔۔ ان کے ہونٹوں میں ایک موٹا سا سگار دبا ہوا تھا، جس سے نیلگوں دھواں ہر پل لپٹتا اوپر اٹھ رہا تھا۔ ان کی آنکھوں میں گہری سوچ کے آثار تھے۔ آخر وہ بولے:

"صدر صاحب کا فون سننے پر ہی میں فکر مند ہو گیا تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اتنے بڑے بڑے لوگ اس راز کو جاننے کے پیچھے پڑ جائیں گے۔ میں تو اس پر بھی حیران ہوں کہ سلاٹر اور التانیو کو یہ بات معلوم کس طرح ہو گئی کہ میں نے آپ کے ملک کے

مشہور سائنس دانوں کو ایک نامعلوم جگہ جمع کیا تھا اور وہ وہاں چھ ماہ تک رہے ہے۔"

"آپ شاید ان لوگوں کو نہیں جانتے۔ ان سے تو بڑے بڑے ملک گھبراتے ہیں۔"

"اب آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟" مین ہینڈاوا بولے۔

"یہ جاننا چاہتا ہوں، وہ نامعلوم جگہ کون سی ہے، کہاں ہے اور وہاں کیا کام کیا گیا ہے۔"

"اس راز کو میرے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔ سائنس دانوں کو بھی مکمل طور پر بے ہوشی کی حالت میں وہاں لے جایا گیا تھا۔ چھ ماہ بعد اسی حالت میں واپس دیا گیا، لہٰذا ان کے فرشتوں کو بھی معلوم نہیں کہ وہ جگہ کون سی ہے۔"

"لیکن وہ یہ تو بتا ہی سکتے ہیں کہ وہاں انہوں نے کیا کام کیا ہے؟"

"نہیں، کیونکہ انہوں نے صرف اپنے اپنے حصے کا کام کیا ہے۔" انہوں نے جواب دیا، پھر چند سیکنڈ ٹھہر کر بولے:

"جو کچھ کیا گیا ہے، تمام اسلامی ملکوں کے لیے کیا گیا ہے لیکن یہ منصوبہ صرف اور صرف میرا تھا۔ میں نے تمام اسلامی ملکوں سے رابطہ قائم کیا تھا۔ سب مجھ پر اندھا دھند اعتماد کرتے ہیں۔ میں نے ان سب کو بتایا کہ تمام مسلمان ممالک کی بھلائی کے لیے ایک بہت عظیم منصوبہ میرے ذہن میں ہے، لیکن وہ عظیم صرف اسی صورت میں ہو سکتا ہے، جب مکمل طور پر راز داری اختیار کی جائے اور مکمل طور پر راز داری کا مطلب یہ ہوگا کہ سب مجھ سے ایک بھی سوال نہ کریں اور جو میں کہوں، اس پر عمل کریں۔ سب نے منظور کیا۔ مالی امداد کے ساتھ ساتھ میں نے جو کچھ بھی کہا، انہوں نے کیا۔ یہ میں نے ضرور کہہ دیا تھا کہ مکمل طور پر کامیابی کے بعد انہیں منصوبے کی تفصیلات اس حد تک بتا دی جائیں گی کہ دشمن ممالک کوئی فائدہ نہ اٹھا سکیں۔ چنانچہ کام شروع ہوا۔ اس منصوبے میں دنیا کے بہترین سائنس دانوں سے کام لیا جانا تھا۔ انہیں اس خفیہ مقام پر جمع کیا گیا۔ انہیں تفصیلات نہیں بتائی گئیں۔ بس حصوں میں کام لیا گیا۔ یعنی وہ جان ہی نہ سکے کہ کیا کام کر رہے ہیں، لیکن چونکہ وہ کام صرف سائنس دان ہی کر سکتے تھے۔ اس لیے انہیں وہاں جمع کرنا بہت ضروری تھا۔ اب انہیں نہ تو یہ معلوم ہے کہ وہ نامعلوم مقام کہاں ہے اور نہ یہ کہ انہوں نے وہاں کیا کیا ہے۔ ان حالات میں میں حیران ہوں کہ الٹانو اور سلاٹر سائنس دانوں کو اغوا کر کے کیا فائدہ اٹھا سکتے ہیں؟"

"وہ کسی طرح اس خفیہ مقام تک پہنچنا چاہتے ہیں اور بس۔"

"بہت مشکل ہے، وہ نہیں پہنچ سکیں گے۔" مسٹر مین ہینڈاوا بولے۔

"آپ انہیں نہیں جانتے۔ وہ دنیا کے چالاک اور ذہین ترین لوگ ہیں۔" انسپکٹر کامران مرزا نے کہا۔

"خیر، اب آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟"

"آپ مجھے اس خفیہ جگہ کے بارے میں بتا دیں، تاکہ ان لوگوں سے پہلے میں وہاں پہنچ جاؤں اور انہیں وہاں پہنچنے سے روک دوں۔ اپنے ساتھیوں کو بھی چھڑا لوں۔"

"افسوس یہ راز کسی کو نہیں بتایا جا سکتا۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"اس منصوبے کی بنیاد یہی ہے۔" مین ہینڈاوا بولے۔

"اس صورت میں میں اپنے ساتھیوں کو کس طرح ان سے چھڑا سکوں گا؟"

"مجھے افسوس ہے، میں اس سلسلے میں کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ یہ تمام اسلامی ملکوں کی سلامتی کا معاملہ ہے۔ چند جانیں بچانے کی خاطر اتنا بڑا خطرہ مول نہیں لیا جا سکتا۔"

"مجھے بتانے کی صورت میں بھلا خطرہ کس طرح لاحق ہو جائے گا؟" وہ حیران ہو کر بولے۔

"جب تک میں کسی کو نہیں بتاؤں گا۔ یہ راز راز رہے گا، لیکن جب میں کسی بھی دوسرے کو بتاؤں گا تو اس بات کی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔ معاملہ اب بھی راز میں ہے۔"

"ہوں، شاید آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ اچھا میری ایک اور تجویز ہے۔"

"میں سننے کے لیے تیار ہوں۔" وہ مسکرائے۔

"مجھے اس مقام کے صرف راستے میں چھوڑ دیا جائے۔ اس مقام سے بہت دور۔ شاید اس طرح میں انہیں پا لوں۔"

"تو آپ صرف اپنے بچوں کے لیے بے چین ہیں یا پھر پروفیسر غوری اور پروفیسر عقلان کے لیے۔" مین ہینڈاوا ان کی طرف بغور دیکھتے ہوئے بولے۔

"نہیں، کم از کم مجھے اپنے بچوں کی فکر نہیں۔ ہاں پروفیسر غوری اور عقلان ملک کے لیے ضروری ہیں۔ خیر کسی بہت بڑے نقصان کے مقابلے میں ان کی طرف سے بھی لاپروائی برتی جا سکتی ہے، لیکن میری الجھن یہ ہے کہ اگر سلاٹر اور الٹانو کسی طرح اس خفیہ مقام تک پہنچ گئے تو کیا ہوگا؟"

"وہ لوگ۔ اس۔ مقام۔ تک۔ نہیں۔ پہنچ۔ سکیں۔ گے۔" مین ہینڈاوا نے ایک ایک لفظ الگ الگ کر کہا۔

"یہ آپ کا خیال ہے، میرا نہیں۔ اور اگر میرے خیال کے مطابق وہ وہاں تک پہنچ گئے تو کیا اس صورت میں خطرہ سر پر نہیں ہوگا؟"

"نہیں، حفاظتی انتظامات عجیب و غریب ہیں۔"

اچانک کمرے میں ایک سرخ بلب جلنے بجھنے لگا۔ ساتھ میں ہلکی سی ٹوں ٹوں کی آواز گونجنے لگی۔ مین ہینڈاوا زور سے اچھلے اور پھر کچھ کہے بغیر کمرے سے نکل گئے۔ انسپکٹر کامران مرزا حیرت زدہ انداز میں اس بلب کو دیکھنے لگے۔ ان کی آنکھوں سے گہرے فکر کے

انتظار کر رہے تھے۔ آخر جب جلا بجھا بند ہو گیا اور کمرے میں خاموشی چھا گئی ——— تین منٹ بعد جب سینڈولا اندر داخل ہوئے تو ان کا رنگ بالکل زرد پڑ چکا تھا ——— یوں لگتا تھا جیسے ان کے جسم کا سارا خون نچوڑ لیا گیا ہو ——— ایک خوف کے سے چہرے پر اس قدر خوف شاید انھوں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

"تم ——— میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔"

"خیر تو ہے آپ کیا نہیں سوچ سکتے تھے؟"

"یہ افراد اس خفیہ مقام کی طرف بڑھ رہے ہیں ——— اگرچہ ابھی وہ دور ہیں، لیکن ان کا رخ بالکل درست ہے ———"

انسپکٹر کامران مرزا سکتے میں آ گئے ———

☆ ☆ ☆

وہ لڑکھڑا کر مڑے اور یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ لانچ ڈرائیور ایک پستول ان کی طرف تانے کھڑا تھا۔ اس کی آنکھیں شعلے اگل رہی تھیں۔

"کک۔ کیا مطلب؟" آصف ہکلایا۔

"میں نے کہا ہے، ہاتھ اوپر اٹھا دو۔"

"لیکن کیوں اٹھا دیں اور یہ تمہارے پاس پستول کہاں سے آیا ——— تمہارے پاس اگر پستول تھا تو لانچ میں تم نے ہم پر کیوں نہ تان لیا؟"

"یہ پستول اس پڑھے لکھے آدمی کا ہے ——— ریت کی بوچھاڑ نے اسے پستول نکالنے کی مہلت نہیں دی تھی ——— پھر مقابلے کی تیزی رکاوٹ بن گئی ——— اب جو تم پیش کرتے میں مصروف ہوئے تو میں نے اس کی تلاشی لے ڈالی اور یہ پستول ہاتھ لگ گیا۔ میں نے سوچا، کیوں نہ انھیں تم سے بھی نپٹ لیا جائے۔ بہت ستایا ہے تم نے۔"

"ٹھیک، لیکن بھئی، تم تو ہمارے ساتھی بن چکے ہو" آفتاب نے گڑبڑا کر کہا ———

"وہ تو مجبوری تھی ——— اب میں مجبور نہیں ہوں۔ یہ پیٹی میں تمہارے ہاتھ کیوں لگنے دوں۔ خود کیوں نہ اس کا مالک بن جاؤں۔"

"احمق نہ ہو، پیٹی میں ایسی کوئی قیمتی چیز نہیں ہے" آصف نے منہ بنایا ———

"احمق تم ہو، ابھی کہہ رہے تھے، اس میں ہیروں سے زیادہ قیمتی چیز ہے اور اب کہہ رہے ہو، اس میں اتنی قیمتی چیز نہیں ہے۔ جھوٹ تو نہ بولو ——— وہ غرایا۔

"ہیں، میں جھوٹ نہیں بول رہا ——— اس پیٹی میں تمہارے لیے کوئی قیمتی چیز نہیں ہے، ہاں وہ ہمارے لیے ضرور قیمتی ہوگی ———" آصف نے کہا۔

"تمہارا دماغ چل گیا ہے۔ جو چیز تمہارے لیے قیمتی ہے، بھلا میرے لیے کیوں نہ ہوگی ——— اور سے، تم نے ہاتھ اوپر نہیں اٹھائے۔

یہ غلط بات ہے۔ میں بے دریغ گولی چلا دوں گا۔ ظاہر ہے، مجھے تم سے کیا ہمدردی ہو سکتی ہے۔"

اور ان کے ہاتھ اوپر اٹھ گئے۔

"بس ٹھیک ہے، اسی طرح کھڑے رہو۔ چہرے میری طرف رکھو۔" اس نے کہا اور ایک بے ہوش آدمی کے پاس جا کر اس کی پسلیوں میں ہلکی ہلکی ٹھوکریں مارنے لگا۔

"یہ ——— یہ تم کیا کر رہے ہو؟" فرحت نے نفرت سے ہونٹ سکوڑے۔

"ان لوگوں کو ہوش میں لاؤں گا، پھر تم سب مل کر پیٹی کو میری لانچ میں رکھواؤ گے۔ میں تمہیں ساحل پر زندہ سلامت چھوڑ کر یہاں سے چل دوں گا۔ کہو، کیسا پروگرام ہے؟"

"بے تو شاندار" آفتاب نے مسکرا کر کہا۔

وہ بڑی باری باری بے ہوش لوگوں کو ٹھوکریں مارتا چلا گیا ——— آخر چند منٹ کی کوشش کے بعد انہیں ہوش میں لانے میں کامیاب ہو گیا۔

"چلو، اٹھو، مل کر اس پیٹی کو اٹھاؤ اور لانچ پر رکھ دو۔"

"کل۔ لانچ پر رکھ دیں ———" پڑھا لکھا آدمی حیران ہو کر بولا۔

"ہاں، اب یہ پیٹی میری ہے۔ میں اسے اپنے ملک لے جاؤں گا۔" اس نے پھول کر کہا۔

"ٹھیک ہے، چلو بھئی، رکھ دو پیٹی لانچ پر ———"

"ارے مسٹر، یہ تم کیا کہہ رہے ہو ———" آصف نے بیتا کر کہا۔

"کیوں، میں نے کچھ غلط کہا؟"

"ہم اسے اتنی آسانی سے پیٹی نہیں لے جانے دیں گے۔" آصف بولا۔

"دیکھو، مجھے اناڑی نہ سمجھو ——— اس عمر میں سلاٹر نے بہت پڑھے ہوئے آدمی مار لیے ہیں۔ میں بہت ہی بہترین نشانچی ہوں ——— صرف لانچ ڈرائیور ہی نہیں ہوں ——— اگر یقین نہیں تو لو میرا نشانہ دیکھو۔" ان الفاظ کے ساتھ ہی اس نے پڑھے لکھے آدمی کے ایک ساتھی کی طرف فائر جھونک مارا ——— اس کے حلق سے ہولناک چیخ نکلی اور انھوں نے اس کے کان کی لو اڑتے دیکھی ——— ساتھ ہی لانچ ڈرائیور کا قہقہہ گونجا۔

"دیکھا تم نے، اسے کہتے ہیں نشانہ ——— شکر کرو، ابھی میں نے کان کی لو کا نشانہ لیا ہے، آنکھوں کا نہیں لیا۔"

وہ دم بخود رہ گئے ——— سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ایک لانچ ڈرائیور بہترین نشانچی بھی ہو سکتا ہے۔ کچھ سوچ کر آفتاب نے کہا۔

"تو تم یہ پیٹی سلاٹر کو پیش کرو گے۔"

"جہنم میں جائے سلاٹر ——— میں تو اب اس پیٹی کو لے کر اپنے گھر جاؤں گا۔"

"تو کیا لانچ میں اتنا پیٹرول ہے کہ یہ تمہیں تمہارے گھر

تک پہنچا دے :

فرحت کے اس سوال نے اسے چکرا دیا ۔۔۔ وہ سوچ میں ڈوب گیا، آخر بولا :

"یہ مسئلہ بھی سنگین ہے، لیکن خیر، میں اس کا بھی کوئی نہ کوئی حل ڈھونڈ لوں گا "

"کب ڈھونڈ لو گے " فرحت شاید اسے بُری طرح الجھا دینے پر تل گئی تھی ۔

"یہاں سے رخصت ہونے کے بعد "

"لیکن اس وقت سوچنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا، جب کہ ہم اس سلسلے میں تمہاری مدد کر سکتے ہیں " فرحت نے گویا تجویز پیش کی ۔۔

"کیا مدد کر سکتے ہو ؟"

"ہم یہیں اس پیٹی کو کھول لیتے ہیں ۔۔ پیٹی کا نصف مال تمہارا اور نصف ہمارا، پھر ہم میں سے ایک شہر جا کر تمہیں پٹرول کے کئی گیلن لا دے گا اور تم آسانی سے جا سکو گے "

"اب میں اتنا بھی احمق نہیں، تم اپنے ساتھ پولیس لے آؤ گے " وہ مسکرایا ۔

"بھئی، ہمارے دو ساتھی تمہارے پاس رہیں گے ۔ اگر تم پولیس کو آتے دیکھو تو ان دونوں کو گولیوں کا نشانہ بنا سکتے ہو اور ان لوگوں کو بھی " فرحت بولی ۔

"ٹھہرو، مجھے سوچنے دو " اس نے کہا اور گہری سوچ میں ڈوب گیا ۔ فرحت نے اسے سوچ میں ڈال ہی دیا تھا ۔

"ضرور سوچو، سوچنے پر کوئی پابندی نہیں " آفتاب مسکرایا، پھر خاموشی چھا گئی ۔ بس لہروں کا شور کانوں میں گونجتا رہا ۔ آخر ساجو نے سر اٹھایا اور بولا :

"وہ مارا، بہت شاندار ترکیب میرے ذہن میں آئی ہے "

"چلو اچھا ہوا ۔۔ خاموشی سے جان چھوٹی ۔ جلدی بتاؤ، کیا ترکیب ہے "

"نہ رہے گا بانس، نہ بجے گی بانسری ۔ " وہ بولا ۔ اس کے منہ سے بامحاورہ اردو سن کر انہیں بہت حیرت ہوئی ۔

"کہیں تم ہمارے ملک کے تو نہیں " فرحت نے بوکھلا کر کہا ۔

"نہیں، یہ سلاٹر کا کمال ہے ۔ اس نے اپنے ملک پر اپنے ماتحتوں کو یہ زبان سیکھنے کا حکم دے رکھا ہے، تاکہ انہیں کسی بھی جگہ جانا پڑے، دشواری نہ پیش آئے "

"ہوں، تو یہ بات ہے ۔۔ خیر، سوال یہ ہے کہ یہاں بانس اور بانسری کا کیا سوال پیدا ہو گیا "

"میں نے حالات کا جائزہ لیا ہے ۔ اگر میں تمہیں شہر پٹرول لینے کے لیے بھیج دیتا ہوں تو بظاہر تم پٹرول لے آؤ گے اور اپنے ساتھ پولیس کو بھی نہیں لاؤ گے، کیونکہ اپنے ساتھیوں کی زندگی خطرے میں نہیں ڈال سکتے، لیکن پولیس کو ساری صورتِ حال تو بتا دو گے تا

اور وہ خفیہ طور پر لانچ کا تعاقب شروع کر دے گی، پھر جہاں بھی اسے موقع ملا، مجھے گرفتار کرے گی، لہٰذا میں نے فیصلہ کیا ہے کہ تمہیں شہر بھیجنے کا خطرہ مول نہیں لیا جا سکتا "

"تب پھر تم پٹرول کا مسئلہ کیسے حل کرو گے "

"اس کے لیے میں نے ایک ترکیب سوچ لی ہے " وہ چہک کر بولا ۔۔

"اور وہ ترکیب کیا ہے ؟" فرحت بے چین ہو کر بولی، کیونکہ اس کا چہکنا اسے فکر میں ڈالے دے رہا تھا ۔۔

"میں پیٹی کو لانچ پر رکھوا کر چلتا بنوں گا ۔۔ ایک چھوٹی سی آزاد ریاست جو کہ درحقیقت ایک جزیرہ ہے، میں پٹرول مل جائے گا، لیکن وہاں پٹرول کے دام بہت زیادہ دینا ہوں گے، لیکن میں نے اس کا بھی حل سوچ لیا ہے "

"کیا، یہ کہ اس پیٹی میں سے نکال کر انہیں کچھ دے دو گے " آفتاب نے پوچھا ۔

"نہیں، پیٹی کی تو انہیں ہوا بھی نہیں لگنے دوں گا ۔۔ لانچ کو سمندر میں ہی روک کر، تیر کر اس ریاست کے ساحل تک جاؤں گا، اور پٹرول خرید لاؤں گا "

"لیکن کیسے، کیا تمہارے پاس نقدی کی صورت میں رقم ہے ؟"

"بہت تھوڑی ۔۔ کیونکہ یہ کسے معلوم تھا، اس لانچ میں مجھے خود پٹرول ڈلوانا پڑے گا اور مسٹر سلاٹر سے الگ ہونا پڑے گا " ساجو بولا ۔

"خیر، اگر تم اس طرح مطمئن ہو سکتے ہو تو اس پیٹی کو لے جاؤ ۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں ۔ ہم اسے لانچ پر رکھوائے دیتے ہیں " آفتاب نے تنگ آ کر کہا ۔۔

"کیا کہ رہے ہو آفتاب، ہم اس پیٹی کو اس کے حوالے ہرگز نہیں کریں گے " آصف نے جھنا کر کہا ۔

"کیسے نہیں کرو گے ۔۔ دیکھتے نہیں میرے ہاتھ میں پستول موجود ہے اور یہ خالی نہیں ہے " ساجو ہنسا ۔

"ہاں، یہ ٹھیک ہے، لیکن اس کے باوجود ہم پیٹی لے جانے کی اجازت تمہیں ہرگز نہیں دیں گے " آصف بولا ۔

"آصف، کہیں تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا ۔۔ ہمکتنگ کے مال و دولت سے ہمیں کیا واسطہ ۔۔ یہ پیٹی لے کر جاتا ہے تو جائے " آفتاب نے جلدی سے کہا ۔

"تم چپ رہو، تمہیں کیا معلوم کہ پیٹی کس قدر قیمتی ہے "

"معلوم ہو چکا ہے، یورینیم ۲۳۵ سے زیادہ قیمتی چیز بھلا اس میں کیا ہو سکتی ہے "

"میں نے کہا نا، چپ رہو "

"اب باتیں بند کرو اور پیٹی اٹھا کر لانچ میں رکھ دو ۔ تم سب میری نظروں میں رہو گے ۔۔ سنا " اس نے گویا دھمکی دی ۔

اب وہ مجبور تھے، چنانچہ سب نے مل کر پیٹی اٹھائی اور لانچ پر رکھنے کے لیے لے چلے ۔ پیٹی بہت وزنی تھی اور اس میں کوئی

چیز ہلتی محسوس ہو رہی تھی۔ آخر خدا خدا کر کے وہ پانی میں داخل ہوئے اور پیٹی لانچ پر رکھ دی۔۔۔ ان کے سانس بری طرح پھول گئے تھے۔

"لیجیے سانبو صاحب، پیٹی لانچ پر لد گئی۔۔۔ اب ہمیں اجازت دیجیے۔ آپ کے ساتھ یہ سفر ہمیں ہمیشہ یاد رہے گا۔"

"نہیں بھئی، ایسا بھی کیا۔۔۔ میں تو اس ساتھ کو ابھی اور طویل بنا دینا چاہتا ہوں۔" سانبو نے شوخ لہجے میں کہا۔

"کک، کیا مطلب؟" وہ ایک ساتھ ہکلائے۔

"مطلب یہ کہ تم لوگوں کو بھی میرے ساتھ چلنا ہوگا۔"

"لل، لیکن آپ ہمیں اب ساتھ لے جا کر کیا کریں گے۔۔۔ اب تو آپ اپنے باس کے پاس جائیں گے۔"

"ہاں، یہ ٹھیک ہے۔ میں سیدھا اپنے گھر جاؤں گا، لیکن اس کے باوجود میں تم لوگوں کو ساتھ لے جانے پر مجبور ہوں۔۔۔ وہ مجبوری کیا ہے، یہ تمہیں جلد معلوم ہو جائے گا۔"

"اور اگر ہم تمہارے ساتھ جانے سے انکار کر دیں؟"

"تو بھی میں پستول کے زور پر تمہیں لے جا کر رہوں گا۔"

"ان لوگوں کے بارے میں کیا خیال ہے۔" آصف نے ان پانچوں کی طرف اشارا کیا۔

"یہ ساحل کی طرف جا سکتے ہیں۔ یہ پولیس کو اطلاع نہیں دے سکیں گے، کیونکہ خود مجرم ہیں۔" اس نے لاپروائی سے کہا اور پھر ان سے بولا:

"جاؤ، تم پانچوں آزاد ہو۔" اس نے گویا حکم دیا۔

وہ ایک ایک کر کے لانچ میں سوار ہو گئے۔ پڑھا لکھا آدمی اور اس کے چاروں ساتھی ساحل کی طرف جاتے نظر آئے۔ ایسے میں سانبو نے لانچ سٹارٹ کر دی اور وہ تیر کی طرح سمندر میں روانہ ہو گئی۔۔۔ سانبو نے یہ کام ایک ہاتھ سے کیا۔ دوسرے ہاتھ میں پستول تھا۔ وہ ان کی بھی نگرانی کر رہا تھا۔

"ایک ہاتھ میں پستول لے کر آخر تم کب تک لانچ چلاؤ گے۔" آصف نے مایوسانہ لہجے میں کہا۔

"جب تک جان میں جان ہے۔۔۔ میں پستول تمہیں دینے سے تو رہا۔" وہ بولا۔

"ہمیں چاہیے بھی نہیں، یہ تمہی کو مبارک۔" آفتاب نے منہ بنایا۔

"جانتے ہو، میں پٹرول کس چیز کے بدلے میں حاصل کروں گا؟" اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"ہمیں غائب کا علم نہیں آتا۔" آفتاب بولا۔

"میں تم لوگوں کے بدلے میں اتنا پٹرول تو حاصل کر ہی سکتا ہوں کہ گھر پہنچ سکوں۔"

"کک، کیا مطلب؟" وہ زور سے اچھلے۔

"مطلب یہ کہ جس جزیرے کا میں ذکر کر رہا ہوں، وہاں انسانوں کی تجارت ہوتی ہے۔۔۔ یوں تو تم میں سے صرف ایک کے بدلے میں کافی پٹرول مل جائے گا، لیکن میں باقی دو کو ساتھ رکھ کر کیا کروں گا۔ اس لیے باقی دو کی نقدی وصول کر لوں گا۔" اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"نن، نہیں، نہیں۔" فرحت خوف زدہ لہجے میں کہا۔

"مجھے افسوس ہے، میں ایسا کرنے پر مجبور ہوں، ورنہ گھر نہیں جا سکوں گا۔"

"ب، بہت خوف ناک ترکیب سوچی مسٹر سانبو تم نے۔ خدا ایسی ترکیب سے سب کو محفوظ رکھے۔" آفتاب نے کانپتی آواز میں کہا۔

"ارے، تمہاری آواز تو کانپنے لگی۔۔۔ میں نے تو سنا تھا، تم لوگ بہت بہادر ہو۔" اس نے ہنس کر کہا۔

"بہادر ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ ہم خوشی خوشی فروخت ہو جائیں۔" آصف جھنا کر بولا۔ اس نے بھی کانپنا شروع کر دیا۔

انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔۔۔ رنگ اڑے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

"آفتاب، مم، میرا دل بیٹھا جا رہا ہے۔ انسانوں کی تجارت کرنے والوں کے بارے میں میں نے بہت عجیب و غریب اور خوف ناک قسم کی باتیں سن رکھی ہیں۔"

"میں نے بھی تم سے کم عجیب و غریب اور خوف ناک باتیں نہیں سن رکھیں۔" آفتاب بولا۔

"اس سے۔۔۔ اس سے تو بہتر ہے، میں سمندر میں چھلانگ لگا دوں۔ لو میں تو چلی۔" یہ کہتے ہوئے فرحت اٹھ کھڑی ہوئی۔

"خبردار، یہ کیا کر رہی ہو۔۔۔ اپنی جگہ سے حرکت نہ کرنا، ورنہ گولی مار دوں گا۔"

"ضرور مار دو گولی۔۔۔ سمندر میں ڈوب کر مرنے سے شاید اس طرح مرنا آسان ہوگا۔۔۔ شاید اس لیے کہ مجھے اس کا تجربہ نہیں۔" یہ کہہ کر فرحت کنارے کی طرف بڑھی۔۔۔

"خبردار، رک جاؤ۔" سانبو نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے فرحت، ہم بھی تمہارے پیچھے آ رہے ہیں۔ فروخت ہونے سے تو یہی بہتر رہے گا۔ اس طرح ہم مسٹر سانبو کو بھی کہیں کا نہیں رہنے دیں گے۔ جب یہ تیل حاصل نہیں کر سکیں گے تو سمندر میں ہی بھٹکتے مر جائیں گے۔ اس پیٹی سمیت اپنے گھر تک نہیں پہنچ سکیں گے۔" آصف نے کہا اور وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

"ویری گڈ، بہت خوب، بلکہ بہت شاندار۔۔۔ لو مسٹر سانبو، میں بھی چلا ان کے ساتھ۔۔۔ اب خود کو بیچ کر پٹرول حاصل کر لینا۔" آفتاب نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"نن، نہیں، نہیں۔۔۔ رک جاؤ۔"

"کیوں رک جائیں۔۔۔ تم جیسے سنگ دل کے لیے رک جائیں جو ہمیں بیچ دینا چاہتا ہے۔۔۔ خدا جانے خریدنے والے ہمارے ساتھ کتنا خوف ناک سلوک کریں۔" آصف بولا۔

اب تینوں لانچ کے کنارے کی طرف بڑھے۔۔ سانبو اچھل کر کھڑا ہوگیا۔۔ اس نے وینچ کا انجن بند کر دیا اور تیزی سے ان کی طرف بڑھا۔۔ ہاتھ میں پکڑا ہوا پستول اب اس کے لیے بے کار ہو چکا تھا۔ وہ اس نے جیب میں رکھا اور ان کی طرف جھپٹتے ہوئے غرّا کر بولا:

"اب میں تمہیں اپنے ہاتھوں سے روکوں گا اور باندھ کر ڈال دوں گا، پھر دیکھوں گا، کیسے کودتے ہو سمندر میں" یہ الفاظ اس نے چیخ کر کہے۔۔

پھر ان پر ٹوٹ پڑا۔۔ اس وقت تک وہ بھی مڑ چکے تھے۔۔ تینوں میں اس وقت گویا بجلی بھر گئی۔۔ وہ تین طرف سے سانبو پر حملہ آور ہوئے۔ وہ ایک کو کوئی مکا وغیرہ لگا کر دوسرے کی طرف مڑتا تو اتنے میں باقی دو اس پر کئی مکے اور کئی لاتیں برسا دیتے۔ سانبو بوکھلا کر رہ گیا۔۔ یہ لڑائی اسے بہت مہنگی پڑ رہی تھی۔ کئی تابڑ توڑ مکے اسے وصول کرنا پڑ رہے تھے۔۔ جواب میں اس نے بھی خوب ہاتھ پیر چلائے، لیکن کب تک۔۔ آفتاب کا ایک مکا اس کی عین ناک کی ہڈی پر پورے زور سے لگا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔۔ صاف دیکھنے کے قابل نہ رہا۔۔ اندھوں کی طرح ادھر ادھر ہاتھ چلائے، لیکن تینوں میں سے کوئی بھی زد پر نہ آیا، الٹا اسے زد پر رکھ لیا۔ اب آصف نے ایک ٹھوکر اس کی پسلیوں پر دی۔۔ وہ دھڑام سے گرا اور بلبلا اٹھا۔۔ اب انہوں نے اسے موقع دینا مناسب نہ سمجھا۔ مل کر چھاپ بیٹھے۔۔ اوپر تلے مکوں نے اس کے کس بل نکال کر رکھ دیے۔

ایسے میں آفتاب بولا:

"مسٹر سانبو، ہو تم عقل سے پیدل"

"ککک، کیا مطلب؟" اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

"تم میں سلاٹر جیسی عقل کہاں۔۔ اگر اس وقت سلاٹر لانچ پر ہوتا تو تم سے کہتا، لگانے دو ان لوگوں کو چھلانگ، کیونکہ اسے یہ بات معلوم تھی، ہم سمندر میں چھلانگ ہرگز ہرگز نہیں لگا سکتے تھے"

"کیا مطلب، کیوں نہیں لگا سکتے تھے"

"اس لیے مسٹر سانبو کہ ہم مسلمان ہیں اور مسلمان خودکشی نہیں کرتا۔۔ خودکشی اس کے مذہب کی رو سے حرام ہے"

"اوہ" اس کے منہ سے نکلا۔

"لیکن اب ہم تمہیں ضرور سمندر میں چھلانگ لگوا رہے ہیں" آصف بولا۔

"ککک، کیا مطلب؟"

"لانچ میں ابھی اتنا پٹرول ہے کہ ہم واپس جا سکیں، لیکن اگر ہم نے تمہیں بھی ساتھ رکھا تو تم کسی وقت بھی خطرے کا باعث بن سکتے ہو۔ اس لیے اب ہم تمہارا کوئی ٹھکانا نہیں کر سکتے۔۔ ساحل پر ہم نے ضرور تمہارے بارے میں یہ سوچا تھا کہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچنے دیں گے، لیکن اب جب کہ تم ہمیں بیچنے پر تل گئے، ہم بھی تمہیں سمندر کو فروخت کر دیں گے۔ سمندر تمہیں خرید کر بہت خوش ہوگا" آفتاب جلدی جلدی کہتا چلا گیا۔۔

"سمندر خوش ہوگا، کیا کہہ رہے ہو؟" فرحت نے مارے حیرت کے آنکھیں نکالیں۔۔

"ہاں۔۔ بالکل خوش ہوگا۔۔ سمندری مخلوق اگر خوش ہوگی تو کیا سمندر خوش نہیں ہوگا۔۔ سمندر میں آدم خور مچھلیاں بھی ہوتی ہیں، لہٰذا مسٹر سانبو، خدا حافظ"

ان الفاظ کے ساتھ ہی تینوں نے مل کر اسے اٹھایا اور سمندر میں پھینک دیا۔۔ آخر وقت تک وہ خوف کے مارے لرزتے ہوئے نہیں، نہیں، کہتا رہا، لیکن اس کے کسی نہیں کا اب ان پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ ایک چھپاکے کے ساتھ گرا اور تیرنے لگا۔۔ اس نے تیرتے ہوئے لانچ کی طرف آنے کی کوشش کی۔۔ یہ دیکھ کر آصف نے ایک چپو سنبھال لیا اور اس کے سر پر دے مارا۔۔ دوسرے ہی لمحے اس کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے اور وہ ڈوبتا نظر آیا۔۔ انہوں نے اس کے چہرے پر خوف کا ایک ایسا عالم دیکھا کہ بہت کم دیکھا ہوگا۔۔ دوسرے ہی لمحے اس کا چہرہ غائب ہوگیا۔

"خدا کا شکر ہے، ہم بکنے سے بال بال بچے۔۔ اب لانچ کو ساحل کی طرف موڑنا چاہیے"

"میں وینچ چلانے کی کوشش کرتا ہوں۔۔ یہ اتنا مشکل نہیں ہے" آفتاب بولا۔۔

اس نے سٹیرنگ سنبھال لیا اور لانچ سٹارٹ کر دی۔ سمت بتانے والی سوئی کو وہ پہلے ہی نظر میں رکھے ہوئے تھے۔ اب انہوں نے اس کے مطابق رخ تبدیل کیا اور چل پڑے۔

"آفتاب، لانچ چلاتے رہو۔ ہم اس پیٹی کو کھول کر دیکھ لیں" آصف بولا۔

"ہرگز نہیں، لانچ پر اسے کھولنا مناسب نہیں ہوگا۔۔ ساحل پر پہنچ کر ہی کھولیں گے" آفتاب نے منہ بنایا۔

"میں بھی یہی مناسب سمجھتی ہوں"

"اچھا خیر، یونہی سہی" آصف نے کندھے اچکائے۔

دو گھنٹے تک ساحل کی طرف چلتے رہنے کے باوجود انہیں ساحل کے آثار نظر نہ آئے تو وہ پریشان ہوگئے۔

"کک، کہیں، کہیں ہم غلط سمت میں تو نہیں چل پڑے"

"اگر بات یہی ہے تو سمجھو مارے گئے" فرحت نے پریشان ہو کر کہا۔۔

"کسی اور سمت میں مڑنا مناسب نہیں، کیا خبر ہم ساحل کے قریب ہوں اور مڑنے کے بعد دور ہو جائیں، لہٰذا اسی سمت میں چلتے رہو"

"اچھا، اچھا" آفتاب نے لرزتی آواز میں کہا۔

مزید ایک گھنٹے کے سفر کے بعد ان پر یہ حقیقت روشن ہو چکی تھی کہ وہ واقعی غلط سمت میں نکل آئے ہیں اور اسی وقت چاند بھی غائب ہوگیا۔ انہوں نے اپنے چاروں طرف اندھیرے کا سمندر بھی محسوس کیا، گویا وہ دو سمندروں کے درمیان میں تھے اور ایسے میں

اچانک لانچ کو ایک زور دار جھٹکا لگا اور انجن بند ہو گیا۔

"لو بھئی شاید پٹرول ختم ہو گیا۔" آفتاب نے کانپ کر کہا۔ جواب میں آصف اور فرحت ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکال سکے۔

☆ ☆ ☆

چند منٹ کی خاموشی کے بعد انسپکٹر کامران مرزا بولے:

"پھر مسٹر عین بھنڈارا، اب کیا ارادہ ہے۔ کیا اب بھی آپ مجھے اس جگہ کا پتا نہیں بتائیں گے؟"

"نن، نہیں! البتہ میں ان لوگوں کے مقابلے کے لیے صرف آپ کو اس جگہ تک لے جا سکتا ہوں، تاکہ ان کی پیش قدمی روکی جا سکے۔"

"چلیے یونہی سہی۔ کیا آپ خود مجھے لے کر جائیں گے؟" ان کے لہجے میں حیرت تھی۔

"ہاں، خود ہی لے کر جانا ہوگا، کیونکہ میرے علاوہ تو کوئی اس جگہ کو جانتا ہی نہیں۔"

"تو پھر جلدی کیجیے۔"

"ہاں، چلیے۔ میں تیار ہوں۔" انہوں نے کہا۔

انسپکٹر کامران مرزا اٹھ کھڑے ہوئے۔ عین بھنڈارا انہیں ساتھ لے کر محل کے ایک اور کمرے میں آئے۔ کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا اور پھر دیوار میں لگے ایک فریم کے پیچھے ہاتھ لے جا کر کچھ کیا۔ فوراً ہی آتش دان کے نیچے ایک خلا بن گیا۔ اور اس میں سیڑھیاں نظر آنے لگیں۔

"آئیے مسٹر کامران مرزا۔"

وہ ان کے ساتھ سیڑھیاں اترنے لگے۔ ان کی پریشانی لمحہ بہ لمحہ بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ ابھی تک ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا۔ آخر سیڑھیاں ختم ہوئیں۔ اندر روشنی ہو رہی تھی۔ انہوں نے دیکھا، وہ ایک سرنگ میں کھڑے تھے۔ سرنگ بہت چوڑی تھی۔ دہانے پر ایک جیپ موجود تھی۔ دونوں جیپ میں بیٹھ گئے۔ مسٹر عین بھنڈارا جیپ چلانے لگے۔ اب وہ سرنگ میں سفر کر رہے تھے۔ آدھ گھنٹے بعد سرنگ ختم ہوئی اور وہ ایک کھلے میدان میں داخل ہوئے۔ یہاں ایک چھوٹا سا ہوائی جہاز موجود تھا۔ اس پر بادلوں کا سا رنگ کیا گیا تھا۔ انہوں نے جیپ چھوڑی اور جہاز میں بیٹھ گئے۔ عین بھنڈارا نے جہاز کا انجن سٹارٹ کیا۔ تھوڑی دیر بعد جہاز اوپر اٹھنے لگا، پھر وہ اس قدر اوپر اٹھا کہ بادلوں میں چھپ گیا۔ اب اسے نیچے سے نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ ان کا سفر بادلوں میں جاری رہا۔ ٹھیک دو گھنٹے تک پرواز کرنے کے بعد جہاز ایک جھٹکے سے نیچے اترنے لگا۔ انسپکٹر کامران مرزا نے نیچے دیکھا۔ ہر طرف پہاڑ ہی پہاڑ تھے۔ شاید یہ پہاڑ سیکڑوں میل میں پھیلے ہوئے تھے۔ پہاڑوں کے علاوہ نیچے کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

جہاز نیچے اترتا رہا۔ یہاں تک کہ ایک ہموار میدان میں اتر کر دوڑنے لگا، لیکن یہ ہموار میدان بھی پٹھانی تھا۔ آخر جہاز رک گیا۔ دونوں نیچے اترے۔ انسپکٹر کامران مرزا نے چاروں طرف دیکھا، سبزے کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ دور دور تک کوئی انسان یا چرند پرند بھی نظر نہیں آ رہے تھے۔ وہ بہت پریشان ہوئے۔

"یہ۔ یہ آپ مجھے کہاں لے آئے ہیں؟"

"اس راستے پر، جس طرف سے وہ لوگ گزریں گے۔ آئیں گے وہ اسی راستے سے۔"

"کیا آپ کو یقین ہے؟"

"ہاں بالکل۔ اس راستے کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں۔ تب پھر ہم ان کے آنے کا انتظار کیوں کریں۔ خود کیوں نہ ان کی طرف روانہ ہو جائیں۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"ایسا بھی کیا جا سکتا ہے، لیکن جہاز اتارنے کی اس کے علاوہ کوئی جگہ نہیں۔ آگے ایک سبزہ زار ضرور ہے۔ وہاں ناریل کے درخت بے تحاشا لگے ہیں، لیکن جہاز نہیں اتر سکتا۔ زمین وہاں بہت نرم ہے۔ دھنس جائے گا اور اس پورے علاقے میں بس وہی ایک سبزہ زار ہے۔ یا پھر وہ مقام، جہاں وہ لوگ پہنچنا چاہتے ہیں۔" عین بھنڈارا نے کہا۔

"مسٹر عین بھنڈارا، کیا آپ اس موقعے پر بھی وضاحت نہیں کریں گے کہ آخر معاملہ کیا ہے؟"

"مجھے افسوس ہے، مسٹر کامران مرزا، تمام اسلامی ممالک کی مرضی سے یہ کام ہوا ہے۔ راز صرف مجھے معلوم ہے۔ اسلامی ممالک کے تمام صدر بھی راز سے ناواقف ہیں۔ بس اتنا جانتے ہیں کہ مسلمان ممالک کی بہتری کے لیے ایک بہت بڑا منصوبہ ترتیب دیا گیا ہے اور اس پر عمل شروع کیا جا چکا ہے اور اس سلسلے میں سائنسدانوں کو وہاں خفیہ طریقے سے پہنچایا گیا تھا۔ یہ سب کام میں نے ذاتی طور پر کیے ہیں۔ اور اس سلسلے میں رازداری برتنے کے لیے مجھے کس قدر دشوار حالات کا سامنا کرنا پڑا، یہ بس میں ہی جانتا ہوں، لہٰذا میں معذور ہوں، کچھ نہیں بتا سکتا۔"

"اچھی بات ہے۔ ان لوگوں کی طرف روانہ ہونے کے سلسلے میں کیا آپ میرا ساتھ دیں گے۔"

"نہیں، میرا ملک میں رہنا ضروری ہے۔"

"تب تو آپ جہاز لے کر چلے جائیں گے۔ میری واپسی کس طرح ہوگی؟"

"ایک بہت طاقت ور ٹرانسمیٹر میں آپ کو دے دیتا ہوں۔ آپ مہم کے خاتمے پر اس کے ذریعے مجھے اطلاع دے سکتے ہیں اور یاد رکھیے، واپسی صرف اسی جگہ سے ہو سکے گی۔ آپ کو لوٹ کر یہیں آنا ہوگا۔" انہوں نے کہا۔

"بہت بہتر، تب آپ مجھے ٹرانسمیٹر دے دیں۔ اس کی فریکوینسی بتا دیں یا اس پر سیٹ کر دیں، میں پیغام دے دوں گا۔"

"ابھی لیجیے۔" مسٹر عین بھنڈارا یہ کہہ کر جہاز میں چڑھ گئے اور

ایک مختصر سیٹ ان کی طرف بڑھاتے ہوئے بولے :

"آپ اسے جیب میں بھی رکھ سکتے ہیں، لیکن یاد رہے، خطرے کے وقت آپ مدد کے لیے پیغام نہیں دیں گے۔ آپ کی مدد کے لیے کسی کو بھی نہیں بھیجا جا سکے گا۔۔۔ ہاں مہم کے خاتمے پر آپ کو لینے کے لیے سبزہ زار میں آجاؤں گا۔"

"شکریہ، اور کچھ؟" انہوں نے سوالیہ لہجے میں پوچھا۔

"آپ کو ہتھیاروں کی بھی ضرورت ہوگی۔۔۔ کس قسم کا ہتھیار پسند کریں گے آپ؟"

"کم از کم ایک ریوالور تو دے ہی دیں اور بس۔۔۔ میں ہلکا پھلکا رہنا پسند کرتا ہوں اور اگر ایک دوربین بھی مل جائے تو کیا بات ہے۔"

"کیوں نہیں، جہاز میں اس قسم کی کئی چیزیں ہیں۔" انہوں نے کہا اور دوربین اور ریوالور ان کی طرف بڑھا دیے۔۔۔

"کیا اب مجھے اجازت ہے؟"

"اور میں کھاؤں گا کیا؟" وہ بولے۔

"ہاں، یہ بھی ہے۔ جہاز میں بسکٹ کے ڈبے موجود ہیں، سبزہ زار میں آپ ناریل کھا اور پی سکتے ہیں۔"

"بہتر، ٹھیک ہے میں وہاں تک پہنچ سکا۔۔۔ کیا پانی کی بوتل نہیں مل سکے گی؟"

"ہاں، وہ بھی ہے۔"

پانی کی بوتل بھی انہیں مل گئی۔۔۔ آخر انہوں نے کہا:

"ٹھیک ہے، اب آپ جا سکتے ہیں۔۔۔ میری کامیابی کے لیے دعا کیجیے گا، خدا حافظ۔"

"خدا حافظ۔" عین بھنڈارا نے کہا اور جہاز کا دروازہ بند کر لیا۔

تھوڑی دیر بعد جہاز بلند ہو رہا تھا اور واپس اسی سمت میں جا رہا تھا جس طرف سے وہ آئے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ ان کی آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ ایسے میں انہیں آفتاب، آصف اور فرحت کا خیال آ گیا۔ وہ سوچنے لگے، نہ جانے کہاں ہوں گے۔۔۔ اس بار ایک ہولناک مہم سر کرنے کے لیے وہ تنہا رہ گئے تھے۔۔۔ انہوں نے اس سمت میں چلنا شروع کیا جس طرف عین بھنڈارا نے سبزہ زار بتایا تھا۔۔۔ نہ جانے وہاں کتنے آدمی موجود تھے اور کس کس قسم کے ہتھیاروں سے لیس۔۔۔ جو لوگ اس خفیہ ترین منصوبے کا سراغ لگانے نکلے تھے، ان کی تیاریاں کم تو نہیں ہو سکتی تھیں۔۔۔

انہی خیالات کے ہجوم میں انہوں نے اپنا سفر جاری رکھا۔ ایک گھنٹے تک چلتے رہنے کے بعد انہیں دور بہت دور سبزے کے آثار نظر آ گئے۔ دوربین آنکھوں سے لگائی تو ناریلوں کے اوپر والے حصے دکھائی دیے۔۔۔ نچلے حصے ابھی نظر نہیں آ رہے تھے۔ انہوں نے رفتار بڑھا دی اور بار بار دوربین میں بھی دیکھتے رہے۔۔۔ رفتہ رفتہ پورے درخت انہیں نظر آنے لگے۔۔۔ یہ درخت تھوڑے سے ایریے میں نہیں، بلکہ جہاں تک نظر جا رہی تھی، پھیلے ہوئے تھے۔ ناریلوں کے اتنے درخت دیکھ کر وہ حیران رہ گئے۔۔۔ کوئی شخص اگر یہاں زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا جاتا تو بھوکا پیاسا تو ہرگز نہیں مر سکتا تھا! تاہم ابھی تک انہیں وہاں کوئی انسان نظر نہیں آیا تھا۔۔۔ ان کے قدم اٹھتے رہے، یہاں تک کہ درخت ان کے بالکل سامنے آ گئے۔ اب بھی انہیں کوئی نظر نہ آیا۔۔۔ اب تو انہیں بہت حیرت ہوئی۔ کھڑے چند لمحے تک سوچتے رہے، پھر بڑبڑائے :

"کیا مسٹر عین بھنڈارا کو ملنے والی اطلاع غلط تھی۔۔۔ یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے۔"

پھر انہیں ایک ترکیب سوجھی۔۔۔ وہ ایک درخت پر چڑھنے لگے۔ اوپر پہنچ کر دوربین آنکھوں سے لگائی اور چاروں طرف کا جائزہ لیا، پھر چند ناریل توڑ کر نیچے گرا دیے۔ درخت سے نیچے اتر کر انہوں نے ٹرانسمیٹر پر رابطہ قائم کرنا چاہا، لیکن کئی منٹ کی کوشش کے بعد بھی رابطہ قائم نہ ہو سکا۔۔۔ انہوں نے سوچا، شاید ابھی مسٹر عین بھنڈارا محل میں نہیں پہنچ سکے۔۔۔ رابطہ قائم کرنے کی کوشش ترک کر کے وہ ناریل کی طرف متوجہ ہوئے۔ ایک پتھر کی مدد سے اسے بڑی مشکل سے توڑا۔ اس کا پانی پیا اور ناریل کھانے لگے۔۔۔ انہیں ٹارزن کی کہانیاں یاد آ گئیں۔۔۔ ساتھ ہی کچھ پرندوں کا شور سنائی دیا۔ نظریں اوپر اٹھائیں تو سرخ سرخ پروں والے پرندے اڑتے نظر آئے۔ انہوں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ ان کے علاوہ بھی یہاں زندگی موجود ہے۔

اچانک ایک زوردار دھماکا ہوا۔ انہیں اپنے کانوں کے پردے پھٹتے محسوس ہوئے۔ بوکھلا کر اٹھے اور آواز کی سمت میں دوڑ پڑے۔ اچانک ان کے اٹھتے قدم رک گئے۔ ناریل کے درختوں کو کاٹ کر پورے کے پورے درخت آپس میں جوڑے گئے تھے اور اس طرح ایک شاندار مکان بنایا گیا تھا اور اس مکان کی چھت سے دھوئیں کا ایک بگولہ اٹھ رہا تھا؛ گویا دھماکا اسی مکان میں ہوا تھا۔ یہ مکان ناریل کے درختوں کے درمیان کچھ اس طرح چھپ گیا تھا کہ بہت نزدیک پہنچنے پر ہی نظر آ سکتا تھا۔

مکان سے اگرچہ دھواں اٹھ رہا تھا، لیکن چیخ و پکار کی کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ ان کی حیرت بڑھ گئی۔ سوچے سمجھے بغیر ان کے قدم مکان کی طرف اٹھ گئے۔ دروازہ کھلا نظر آیا۔ وہ اندر داخل ہو گئے۔ ابھی تک وہ جگہ نظر نہیں آ سکی تھی، جہاں سے دھواں اٹھ رہا تھا، لہٰذا اور آگے بڑھے۔۔۔ اچانک کوئی چیز ان کے اوپر گری، وہ بوکھلا کر پیچھے ہٹے، لیکن وہ چیز ان کے چاروں طرف موجود تھی۔ پیچھے ہٹنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ نائیلون سے بنا ہوا ایک جال ان پر پھینکا گیا تھا۔ وہ اس میں ہاتھ پیر مار کر رہ گئے۔ جال کی رسی کھنچتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ وہ پوری طرح اس میں بندھ گئے۔۔۔

"رسی اوپر کھینچ لو۔" ایک آواز ابھری۔

رسی کو اوپر کھینچا جانے لگا۔ وہ اوپر اٹھنے لگے۔ یہاں

تک کر جھولنے لگے۔ رسی اور کھینچی گئی اور وہ مکان کی چھت کے نزدیک جال میں لٹکنے لگے۔ اسی وقت مکان کے دروازے سے کوئی اندر داخل ہوا۔

☆ ☆ ☆

ہوٹل کے کمرے میں داخل ہوتے ہی پروفیسر داؤد دبی آواز میں بولے:

"جمشید دروازے اور کھڑکیاں بند کرلو۔ اس ساؤنڈ پروف کمرے میں میں تمہیں ایک خاص بات بتانے کے لیے لایا ہوں۔"

"لیکن پروفیسر انکل، آپ نے تو کہا تھا، ہم اس بار ایک ایسی تفریح منائیں گے۔۔ جس کے بارے میں کسی کو بھی کچھ معلوم نہیں ہوگا۔ اب آپ کہہ رہے ہیں کہ آپ یہاں کوئی خاص بات بتانے کے لیے لائے ہیں۔" فاروق بے چین ہو کر بولا۔

"بھئی پہلے سن لو، پھر سوال کر لینا۔" پروفیسر داؤد ہاتھ اٹھا کر بولے۔

"جی بہت بہتر۔۔ اگر آپ کہتے ہیں تو پہلے سن ہی لیتے ہیں، لیکن ہمیں یہ سب کچھ بہت ہی عجیب لگ رہا ہے۔" محمود نے کہا۔

"لگنا بھی چاہیے۔" پروفیسر داؤد مسکرائے۔

"جی کیا مطلب، لگنا بھی چاہیے، یعنی کہ عجیب۔"

"ہاں، لیکن پہلے دروازے اور کھڑکیاں بند کر لو، کیونکہ اس کے بعد ہماری آواز نہیں سنی جا سکے گی۔۔ ہم نے اس ہوٹل میں پہلے سے کمرہ بھی بک نہیں کرایا تھا اور ہوٹل کا کلرک جو کمرہ دے رہا تھا، ہم نے وہ بھی نہیں لیا، لہٰذا کسی بھی قسم کا کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا۔۔ مم، میرا مطلب ہے۔۔ ہماری آواز سننے کی کوشش نہیں کی جا سکتی۔"

"لیکن انکل، سوال تو یہ ہے کہ کوئی ہماری آواز سننے کی کوشش کرنے ہی کیوں لگا۔" فرزانہ الجھ کر بولی۔

"بھئی، ذرا صبر کرو۔۔ کیوں سوال پر سوال کیے جا رہے ہو۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"ہاں واقعی صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔" خان رحمان نے جلدی سے کہا۔

انسپکٹر جمشید دروازے اور کھڑکیاں بند کرنے لگے۔ یہ سفر بھی عجیب حالات میں شروع کیا گیا تھا۔۔ چند گھنٹے پہلے انہیں پروفیسر داؤد کا فون موصول ہوا۔ فون انسپکٹر جمشید نے سنا۔

"ہیلو جمشید، میری آواز پہچان ہی چکے ہو۔ بس چلے آؤ۔"

"جی، کیا فرمایا، چلا آؤں۔" انہوں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"چلا آؤں نہیں۔۔ چلے آؤ۔ میں جمع کا صیغہ استعمال کر رہا ہوں۔"

"آپ کا مطلب ہے، بیگم اور بچوں سمیت چلا آؤں۔" وہ مسکرائے۔

"صرف بچوں سمیت۔۔ بیگم کی ضرورت نہیں۔" وہ بھی ہنسے۔

"لیکن معاملہ کیا ہے؟" وہ بولے۔

"بس کہہ جو دیا، چلے آؤ۔۔ بھابی کو یہ بھی نہ بتانا کہ کہاں کے لیے روانہ ہو رہے ہو۔" انہوں نے کہا۔

"خیر تو ہے، اس قدر رازداری کی کیا ضرورت۔"

"ضرورت ہے، اسی لیے تو کہہ رہا ہوں۔"

"جی بہتر، ہم آ رہے ہیں۔" یہ کہہ کر انہوں نے ریسیور رکھ دیا۔ وہ شام کا ناشتا کر کے فارغ ہوئے تھے، لیکن ابھی صحن میں ہی موجود تھے۔۔

"کس کا فون تھا ابا جان؟" محمود بولا۔

"آؤ چلو، باہر چل کر بتاؤں گا۔" وہ بولے۔

"باہر چل کر بتائیں گے! گویا میرے سامنے نہیں بتائیں گے۔" بیگم جمشید نے آنکھیں نکالیں۔۔

"ہاں بیگم، کچھ ایسی ہی بات ہے۔" وہ بولے۔

"کیسی ہی بات، کچھ پتا تو چلے۔"

"ابھی کچھ نہ پوچھو بیگم۔۔ آؤ بھئی چلیں۔"

"اس کا مطلب ہے، شروع ہو گیا کوئی چکر۔" فاروق نے گھبرا کر کہا۔

"آخر تم چکروں کے شروع ہونے سے اتنا گھبراتے کیوں ہو؟"

"گھبرائیں میرے دشمن، میں کیوں لگا گھبرانے۔" فاروق نے آواز میں گھبراہٹ پیدا کرتے ہوئے کہا اور انسپکٹر جمشید مسکرا پڑے۔

باہر نکل کر وہ جیپ میں بیٹھے اور بیگم جمشید نے حیرت زدہ انداز میں دروازہ بند کر لیا۔

"کیا معاملہ ہے ابا جان؟" فرزانہ بے چین تھی۔

"پتا نہیں۔" وہ بولے۔

"جی پتا نہیں، تو پھر ہم کہاں جا رہے ہیں؟" محمود نے چونک کر کہا۔

"پتا نہیں۔" انہوں نے مسکرا کر کہا۔

"کیا فرمایا، یہ بھی پتا نہیں کہ ہم کہاں جا رہے ہیں! حیرت ہے۔"

"تم تھوڑی دیر کے لیے خاموش نہیں رہ سکتے۔" انہوں نے منہ بنایا۔۔

"جی ہاں، کیوں نہیں رہ سکتے، یہ کیا مشکل ہے۔ بس آپ اتنا بتا دیں کہ کتنی دیر تک خاموش رہنا ہے۔" فاروق نے گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

"جب تک میں جیپ روک نہ لوں۔"

"اور آپ جیپ کب روکیں گے؟" فاروق فوراً بولا۔

"یہ تم خاموش ہوئے ہو؟"

"خاموشی کا پیریڈ تو اب شروع ہوا ہے ابا جان۔" فاروق مسکرایا۔

وہ پوری رفتار سے جیپ چلاتے ہوئے پروفیسر داؤد کی تجربہ گاہ پہنچے۔

"ہائیں، یہ تو پروفیسر انکل کی تجربہ گاہ ہے۔"

"تو میں کب کہہ رہا ہوں، یہ کوئی زمین دوز تہ خانہ ہے۔" وہ بولے۔

عین اسی وقت ایک لمبی کار اندر داخل ہوئی اور ان کی جیپ کے پیچھے رک گئی۔ اس وقت تک وہ نیچے اتر چکے تھے۔

"ہائیں، جمشید، یہ تم ہو۔ تم یہاں کیسے ٹپک پڑے؟"

"یہی سوال میں تم سے کرنا چاہتا ہوں۔"

"بھئی، کسی کو بتانا نہ ـــ مجھے تو بہت ہی خفیہ طور پر پروفیسر صاحب نے بلایا ہے۔" وہ راز دارانہ لہجے میں بولے۔

"کس حد تک خفیہ طور پر؟" فاروق بول اٹھا۔

"اس حد تک کہ روانہ ہونے سے پہلے میں نے گھر میں کسی کو بھی نہیں بتایا۔"

"تب پھر اپنی طرف بھی یہی حال ہے۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"کیا مطلب؟" وہ چونکے۔

"ہمیں بھی پروفیسر صاحب نے انتہائی خفیہ طور پر بلایا ہے۔"

"اللہ اپنا رحم فرمائے ـــ معاملہ کچھ زیادہ ہی خفیہ لگتا ہے۔" فاروق بڑبڑایا۔

"یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو۔ اندر کیوں نہیں آتے۔" اوپر ایک کھڑکی سے پروفیسر داؤد کی آواز سنائی دی۔

"اوہ، السلام علیکم انکل۔" وہ تینوں ایک ساتھ بول اٹھے۔

"وعلیکم ..... السلام ـــ بھئی سلام بعد میں ہو جائے گا۔ پہلے تم لوگ اوپر تو آ جاؤ۔"

"ابھی لیجیے۔"

جلد ہی وہ پروفیسر داؤد کے سامنے موجود تھے اور وہ نہایت خاموشی سے ان کی طرف دیکھ رہے تھے، پھر انہوں نے گھڑی پر نظر ڈالی اور اچھل کر کھڑے ہو گئے۔

"آؤ چلیں۔"

"لیکن کہاں انکل؟" فرزانہ بول پڑی۔

"میرا نام کہاں انکل نہیں ہے۔" وہ بولے۔

"جج، جی ہاں ـــ یہ بات تو خیر ہمیں معلوم ہے۔" محمود فوراً بولا ـــ

"بس تو پھر آؤ۔"

یہ کہہ کر وہ نیچے اتر آئے اور کار کی طرف بڑھے۔

"انکل، اگر نیچے ہی آنا تھا، وہ بھی کچھ بتائے بغیر، تو ہم لوگوں کو اوپر بلانے کی کیا ضرورت تھی؟" فرزانہ نے حیران ہو کر کہا۔

"ہاں، تم ٹھیک کہتے ہو، لیکن دراصل بات یہ ہے کہ میں نے اچانک پروگرام بدل دیا ہے۔"

"پروگرام بدل دیا ہے ـــ ہم سمجھے نہیں۔" خان رحمان حیران ہو کر بولے۔

"بھئی ذرا صبر کرو۔" وہ بولے، پھر خان رحمان کی کار میں بیٹھ گئے ـــ ان کی کار بڑی تھی، چھ آدمی آسانی سے آ جاتے تھے۔

"چلو خان رحمان، کار ڈرائیو کرو ـــ ہم ایک ہی کار میں چلیں گے۔"

"بہت بہتر۔" انہوں نے کہا اور کار باہر نکال لائے۔

"کس طرف چلوں؟" وہ بولے۔

"شہر سے باہر جانے والی سڑک پر چلو۔"

"شہر سے باہر تو کئی سڑکیں لے جاتی ہیں۔" انہوں نے الجھ کر کہا۔

"اچھا، تم جنوبی سڑک پر چلو۔" انہوں نے کچھ سوچ کر کہا۔

وہ جنوبی سڑک پر روانہ ہوئے ـــ ایسے میں فاروق بولا:

"انکل، ایک بات کہنے کی اجازت چاہتا ہوں۔"

"اجازت ہے۔" وہ بولے۔

"آپ اپنی زندگی میں اتنے پراسرار کبھی نظر نہیں آئے، جتنے کہ آج۔"

"ہاں، یہ بات تو تم نے ٹھیک کہی۔" وہ مسکرائے۔

"مارے بے چینی کے ہمارا برا حال ہے۔" فرزانہ نے کہا۔

"یہ جان کر خوشی ہوئی۔" وہ بولے۔

"کیا مطلب، کیا آپ ہمیں بے چین کرنے پر تلے ہیں؟"

"نہیں تو، میں تو کار پر تلا ہوں۔" انہوں نے کہا۔

"آج تو کمال کر رہے ہیں پروفیسر صاحب۔" خان رحمان بولے۔

"کتنا ہی زور لگا لو ـــ جب تک میں کسی محفوظ جگہ نہیں پہنچ جاؤں گا، کچھ نہیں بتاؤں گا۔"

"اور وہ محفوظ جگہ کون سی ہے؟"

"جب آ جائے گی، بتا دوں گا۔"

"یا اللہ رحم، آج تو آپ ابا جان کو بھی پیچھے چھوڑ رہے ہیں۔" فاروق نے سرد آہ بھری۔

"نن، نہیں تو ـــ میرے ساتھ تو بیٹھے ہیں۔" پروفیسر داؤد بوکھلا کر بولے اور وہ مسکرائے بغیر نہ رہ سکے ـــ

آخر وہ دوسرے شہر میں داخل ہوئے اور پروفیسر داؤد بولے:

"اس شہر میں ایک ہوٹل ہے ـــ نام ہے ہوٹل آبان ـــ اس کے کمرے ساؤنڈ پروف ہیں، یعنی کمروں میں ہونے والی بات چیت باہر سے سنی نہیں جا سکتی۔ بس اسی کی طرف چلو۔ ہم وہاں ایک بڑا کمرہ کرائے پر لے لیں گے اور پھر میں ساری بات بتاؤں گا۔"

"اور ہوٹل کو کونسی سڑک جاتی ہے۔" خان رحمان بولے۔

"بالکل ٹھیک جا رہے ہو خان رحمان۔" انہوں نے کہا۔

اسی طرح وہ ہوٹل تک پہنچے اور اب کمرہ حاصل کرنے کے بعد کمرے کے دروازے اور کھڑکیاں بند کیے جا رہے تھے۔۔۔ آخر انسپکٹر جمشید ان کی طرف مڑے :

"لیجیے پروفیسر صاحب، آپ کی آخری شرط بھی پوری ہو گئی۔ اب تو بتائیے، کیا معاملہ ہے۔"

"شکریہ جمشید، اب ذرا غور سے سنو، میں کیا کہنا چاہتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئے۔

"غور سے کس طرح سنیں انکل، جب تک آپ کچھ کہیں گے نہیں۔" فاروق نے بے تاب ہو کر کہا۔

"بات دراصل یہ ہے کہ میں بہت خوف زدہ ہوں۔" انہوں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

"آپ بہت خوف زدہ ہیں۔۔۔ کیا مطلب، کس سے خوف زدہ ہیں؟"

"پتا نہیں، کیوں خوف زدہ ہوں۔۔۔ بس میں اپنے چاروں طرف خطرات کو منڈلاتا محسوس کر رہا ہوں۔۔۔ لہٰذا میں نے یہی سوچا، کیوں نہ تجربہ گاہ سے کہیں اور منتقل ہو جاؤں، لیکن تنہا نہیں آ سکتا تھا، اس لیے تم لوگوں کو بھی ساتھ لے آیا۔"

"لیکن پروفیسر صاحب، یہ بات تو آپ ہمیں وہیں تجربہ گاہ میں بھی بتا سکتے تھے۔"

"بلایا تو دراصل تمہیں اسی لیے تھا، لیکن پھر مجھے اچانک ایک خیال آ گیا۔"

"اور وہ خیال کیا تھا؟"

"یہ کہ کہیں دشمن بھی یہی نہ چاہتا ہو کہ میں تم لوگوں کو بھی تجربہ گاہ میں بلا لوں۔"

"ہم سمجھے نہیں، آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟" انسپکٹر جمشید الجھ کر بولے۔

"اب مجھے تفصیل سے ہی بتانا پڑے گا۔" انہوں نے منہ بنایا۔

"جی ہاں، اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔" خان رحمان بولے۔

"اچھا خیر، سنو۔۔۔ یہ آج سے تین دن پہلے کی بات ہے۔۔۔"

ان کے الفاظ درمیان میں ہی رہ گئے۔۔۔ اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی تھی۔۔۔ پروفیسر داؤد کے چہرے پر خوف دوڑ گیا۔ انہوں نے تھرتھر کانپتی آواز میں کہا:

"جمشید، پوری طرح اطمینان کیے بغیر دروازہ نہ کھولنا۔"

"آپ فکر نہ کریں۔" یہ کہہ کر وہ دروازے پر آئے اور وہ چٹخنی گرا کر دروازہ ذرا سا کھولتے ہوئے بولے:

"کیا بات ہے، کون ہے؟"

"بیرا سر، ایک صاحب آپ لوگوں سے ملنا چاہتے ہیں۔ وہ کاؤنٹر پر موجود ہیں۔ چونکہ آپ لوگ ابھی ابھی آئے ہیں، اس لیے ہم نے انہیں اوپر نہیں بھیجا۔ آپ کو اطلاع دینا مناسب خیال کیا۔"

"تم نے بہت اچھا کیا۔۔۔ میں نیچے آ رہا ہوں، اسے وہیں روکو۔"

"جی بہتر۔" یہ کہہ کر بیرا مڑنے لگا۔ اسی وقت انہیں کوئی خیال آیا۔ جلدی سے بولے:

"ذرا ٹھہرو، اس نے ہمارے بارے میں کیا پوچھا تھا۔۔۔ میرا مطلب ہے، کیا نام لے کر پوچھا تھا؟"

"یہ تو مجھے معلوم نہیں۔۔۔ کاؤنٹر کلرک اس بات کا جواب دے سکتے ہیں۔"

"ہوں، ٹھیک ہے۔۔۔ میں آ رہا ہوں، تم چلو۔"

بیرا چلا گیا۔ انہوں نے دروازہ بند کیا اور اندر آتے ہوئے بولے:

"کوئی صاحب ہم سے ملنے کے لیے نیچے موجود ہیں۔ حیرت کی بات ہے، ہم تو کسی کو بھی بتائے بغیر یہاں آئے ہیں، پھر کسی کو کس طرح پتا چل گیا؟"

"اسی لیے میں خوفزدہ تھا اور اسی لیے میں نے اس قدر راز داری اختیار کی تھی، لیکن افسوس میری کوشش بے کار گئی۔"

"مجھے اس سے ملنے کے لیے نیچے جانا ہے، لیکن میں اس سے ملنے سے پہلے یہ بہتر سمجھتا ہوں کہ آپ مجھے جلدی جلدی معاملے کی تفصیل سنا دیں۔"

"نہیں جمشید، پہلے تم اس سے نبٹ آؤ۔ اتنی دیر ہم دروازہ اندر سے بند کر کے بیٹھے رہیں گے۔" پروفیسر داؤد بولے۔

"کیا آپ کوئی خطرہ محسوس کر رہے ہیں؟"

"ہاں شاید، لیکن میں خوف یقیناً محسوس کر رہا ہوں۔" وہ بولے۔

"اچھا خیر، آپ دروازہ اندر سے بند کر لیں۔ میں جلد واپس آنے کی کوشش کروں گا۔" انہوں نے کہا اور کمرے سے نکل آئے۔ لفٹ کے ذریعے نیچے پہنچے اور سیدھے کاؤنٹر پر گئے۔

"میں جمشید احمد ہوں۔ ملاقاتی کہاں ہے؟"

"وہ رہے اس طرف۔" کاؤنٹر کلرک نے ایک طرف اشارہ کیا۔ وہاں ایک شخص ایک کرسی پر بیٹھا تھا۔۔۔ اس نے اپنی کہنیاں میز پر ٹکا رکھی تھیں۔۔۔

"کیا انہوں نے میرا یا میرے ساتھیوں میں سے کسی کا نام لے کر پوچھا تھا؟" انسپکٹر جمشید اس پر ایک نظر ڈالتے ہوئے بولے۔

"جی نہیں، صرف اتنا کہا تھا کہ ابھی ابھی جو لوگ آ کر ہوٹل میں ٹھہرے ہیں، میں ان میں سے ایک سے ملنا چاہتا ہوں، چنانچہ میں نے آپ لوگوں کو پیغام بھیج دیا۔"

"شکریہ، آپ نے اچھا کیا۔ میں ان سے مل لیتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ مڑے اور اس شخص کی طرف چلنے لگے۔ نہ جانے کیوں ان کی الجھن بڑھتی جا رہی تھی۔۔۔ نزدیک پہنچ کر وہ نرم آواز میں بولے:

"آپ کو زحمت نہ ہو تو میں بیٹھ جاؤں۔"

اس نے چونک کر ان کی طرف دیکھا اور بولا:

"ضرور تشریف رکھیے، مجھے تو بس ایک صاحب سے ملاقات کرنی ہے" اس نے کہا۔

انسپکٹر جمشید اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئے۔ انہوں نے بغور اس کی طرف دیکھا، آخر بولے:

"فرمائیے، میں حاضر ہوں"

"جی کیا مطلب؟"

"آپ اس ہوٹل میں ابھی آکر ٹھہرنے والے حضرات میں سے کسی ایک سے ملنا چاہتے تھے نا۔ میں ان میں سے ایک ہی ہوں"

"اوہو اچھا، آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی" یہ کہہ کر اس نے ہاتھ آگے بڑھا دیا، پھر بولا:

"کیا آپ انسپکٹر جمشید ہیں؟"

"آپ کا اندازہ درست ہے، کیسے پہچانا؟"

"پہچانا نہیں، کسی کی ہدایت پر عمل کیا ہے" اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"کک، کیا مطلب؟" ان کے لہجے میں حیرت در آئی۔

"ایک صاحب ہیں۔ انہوں نے بتایا تھا کہ آپ آج کی تاریخ میں رات کے وقت ہوٹل آبان میں آکر ٹھہریں گے۔ آپ کا نام انسپکٹر جمشید ہوگا۔۔۔ آپ مجھے ایک بہت بڑی مصیبت سے نجات دلائیں گے۔ انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ آپ کے علاوہ کوئی نہیں جو نجات دلا سکے گا"

"میں آپ کی باتیں پوری طرح سمجھ نہیں پایا۔ ذرا وضاحت کریں" وہ بولے۔

"جی، جی ہاں۔۔۔ سنیے، میں پوری تفصیل بیان کیے دیتا ہوں۔۔۔ میں اس قصبے کے ایک سرے پر رہتا ہوں۔ میرا مکان محل نما ہے۔ شاید کسی بادشاہ نے بنوایا تھا اسے۔۔۔ ویسے میں نے وہ محل ایک ہندو جاگیردار سے خریدا تھا۔ پندرہ سال رہتے ہوئے گزر گئے، لیکن اب وہ آسیب زدہ ہوگیا ہے"

"آسیب زدہ ہوگیا ہے" ان کے لہجے میں حیرت تھی۔

"جی ہاں، راتوں کو اس میں روحیں چکراتی رہتی ہیں۔ سفید سفید روحیں، کفن پوش روحیں۔۔۔ وہ چیختی اور چلاتی ہیں اور ہم مارے خوف کے تھر تھر کانپتے رہتے ہیں۔۔۔ کسی زمانے میں میرے حالات بہت اچھے تھے۔ دولت کی ریل پیل تھی، لیکن پھر میری دولت ختم ہوگئی اور میں کنگال ہوگیا۔ اب لے دے کے بس وہ ایک محل ہی پاس رہ گیا ہے۔ میں اسے فروخت کرکے کوئی کاروبار کرنا چاہتا ہوں، لیکن اس وقت تک قصبے کے ہر آدمی کو اس کے آسیب زدہ ہونے کے بارے میں پتا چل گیا ہے۔ کوئی اسے کسی قیمت پر بھی خریدنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔۔۔ میں اسی پریشانی کے عالم میں بھٹکتا پھر رہا تھا کہ ایک دن جنگل میں ایک بزرگ نظر آئے۔ ان کی سفید داڑھی بہت لمبی تھی۔۔۔ مجھے دیکھ کر کہنے لگے:

'بچہ! میں جانتا ہوں، تم کیوں پریشان ہو، لیکن تم فکر نہ کرو، تمہاری پریشانیاں عنقریب ختم ہونے والی ہیں۔۔۔ اس شہر میں بہت جلد ایک مرد خدا آنے والا ہے۔ وہ تمہاری تمام پریشانیاں دور کر دے گا'

میں ان کے الفاظ سن کر دھک سے رہ گیا، پھر ہمت کرکے پوچھا:

'لیکن بابا، آپ کون ہیں اور آپ کو کس طرح معلوم ہوگیا کہ میں بہت پریشان ہوں'

'ہم جیسوں سے کب کوئی بات چھپی ہے بچہ' وہ بولے۔

'اچھا تو پھر یہ بھی تو بتائیں، وہ صاحب کون ہیں اور کس دن آئیں گے؟'

'میرے اس سوال کے جواب میں انہوں نے آپ کا نام انسپکٹر جمشید بتایا۔ آنے کی تاریخ اور وقت تک بتایا اور یہ بھی کہا کہ آپ اور آپ کے ساتھی ہوٹل آبان میں آکر ٹھہریں گے، لہٰذا میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوں" یہاں تک کہہ کر وہ خاموش ہوگیا۔ انسپکٹر جمشید چند لمحے تک سوچ میں گم رہے، پھر بولے:

"دیکھیے جناب، آپ نے بہت ہی عجیب و غریب باتیں کی ہیں۔۔۔ میں اللہ کے نیک بندوں سے انکاری نہیں۔۔۔ ایسے لوگ دنیا میں آتے رہتے ہیں جو مستقبل کی باتیں بتا دیتے ہیں۔ میں آپ کی مدد بھی کر سکتا ہوں، لیکن پہلے آپ کو مجھے اس بزرگ کے پاس لے جانا ہوگا۔ میں ان سے دو باتیں کروں گا، پھر آپ کی مدد کے لیے آپ کے ساتھ چلوں گا"

"حیرت ہے، کمال ہے" اس کی آنکھیں باہر کو اُبل آئیں۔

"آپ کس بات پر حیران ہو رہے ہیں۔۔۔ میں نے تو ایسی کوئی بات نہیں کہی"

"بزرگ نے پہلے ہی کہہ دیا تھا، آپ میری باتوں پر اعتبار نہیں کریں گے اور ان سے ملنے کی شرط رکھیں گے، لہٰذا انہوں نے مجھے اجازت دی تھی کہ میں آپ کو ان کے پاس لے آؤں"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔۔۔ کیا آپ کو جنگل میں ان کا ٹھکانا معلوم ہے؟"

"جی ہاں بالکل" اس نے کہا۔

"تو پھر ہم صبح چلیں گے" وہ بولے۔

"جی صبح، اس کا مطلب ہے ہمیں ایک رات اور مصیبت بھرنا ہوگی"

"آپ نے اپنے گھر کے افراد کو وقتی طور پر اس محل سے نکال کیوں نہیں لیا" انہوں نے منہ بنایا۔

"نکال کر رکھوں کہاں۔۔۔ مکان کہاں سے لاؤں۔ آج کل مکانات کے کرائے اس قدر خوفناک ہیں کہ سن کر پتہ پانی ہو جاتا ہے"

"ہوں خیر، میں اسی وقت آپ کے ساتھ چلا چلتا ہوں۔۔۔ ذرا ٹھہریے، میں اپنے ساتھیوں کو بتا آؤں"

یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ اوپر آئے، کمرے کے دروازے پر دستک دی ہی تھی کہ دروازہ کھل گیا ۔۔۔ انہیں بہت حیرت ہوئی، کیونکہ پروفیسر داؤد نے تو کہا تھا کہ ہم دروازہ اندر سے بند کر کے بیٹھ جاتے ہیں ۔۔۔ جلدی سے کمرے میں داخل ہوئے، لیکن پھر سر پر پڑنے والی وزنی چیز نے انہیں گہری بے ہوشی کے عالم میں پہنچا دیا۔

ہوش آیا تو اسی طرح دروازے کے ساتھ قالین پر پڑے تھے اور دروازہ بند تھا ۔۔۔ سر پر ہاتھ گیا تو وہاں ایک اور سر ابھر آیا تھا ؛ گویا اب ان کے دو سر ہو گئے تھے ؛ البتہ خون نہیں نکلا تھا۔ شاید وہ کوئی نرم چیز تھی، جس سے ان کے سر پر چوٹ ماری گئی تھی۔

"تت، تو کیا اس شخص نے ہمیں دھوکا دیا ۔۔۔ مجھے دھوکے سے نیچے بلا لیا اور ایک فرضی کہانی میں الجھا لیا اور اس کے ساتھی ادھر آ دھمکے۔ خالی کمرہ گویا پکار پکار کر کہہ رہا تھا۔ آپ کے ساتھیوں کو اغوا کر لیا گیا ہے ۔۔۔ انہوں نے اٹھ کر جلدی جلدی پورے کمرے کی تلاشی لی ۔۔۔ وہاں صرف سامان موجود تھا۔ ان کے ساتھیوں میں سے کوئی نہیں تھا۔ چند لمحے تک وہ کھڑے سوچتے رہے۔ آخر بولے :

"وہ لوگ نہ جانے کب کے جا چکے ہوں گے ۔۔۔ ہوٹل میں تو ہوں گے نہیں، لہٰذا مجھے ان کی تلاش میں نکلنا ہی ہوگا۔" یہ کہہ کر انہوں نے دروازہ بند کیا اور نیچے آئے۔ سر بہت بُری طرح دکھ رہا تھا۔ وہ سیدھے کاؤنٹر پر آئے اور کلرک سے بولے :

"آپ نے میرے ساتھیوں کو نیچے اتر کر باہر جاتے تو نہیں دیکھا۔"

"جی، جی نہیں تو ۔۔۔ کیوں کیا بات ہے۔" اس نے بوکھلا کر کہا۔

پھر اس کی نظریں ان کے سر پر جا پڑیں ۔۔۔ وہ بوکھلا اٹھا۔

"ارے، یہ آپ کے سر پر کیا ہوا ؟"

"چوٹ لگ گئی ہے۔ فکر نہ کریں ۔۔۔ تو آپ نے میرے ساتھیوں کو باہر جاتے نہیں دیکھا ؟"

"نہیں، آخر بات کیا ہے ؟"

"کیا اس ہوٹل کا کوئی پچھلا دروازہ بھی ہے۔" اس کا سوال جیسے انہوں نے سنا ہی نہیں ۔۔۔

"جی بالکل ہے۔"

"وہ کس طرف ہے۔ ذرا جلدی بتائیے۔" انہوں نے پریشان ہو کر کہا۔

"دائیں ہاتھ کی دیوار کے ساتھ جو تین دروازے نظر آ رہے ہیں، ان میں سے دو لٹرینوں کے ہیں، تیسرے دروازے کے ساتھ ایک چھوٹا سا برآمدہ مڑ رہا ہے، اس برآمدے میں چل پڑیے۔ آپ پچھلے دروازے تک پہنچ جائیں گے۔"

"بہت بہت شکریہ ۔۔۔ اگر میرے ساتھی آپ کو واپس آتے نظر آئیں تو ان سے کہہ دیجیے گا، وہ یہیں ٹھہر کر میرا انتظار کریں۔"

"جی بہت بہتر۔" اس نے کہا۔

وہ کاؤنٹر پر سے مڑے اور پھر ٹھٹک کر رہ گئے۔ ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

☆ ☆ ☆

ان کے جانے کے فوراً بعد محمود نے اٹھ کر دروازہ اندر سے بند کر لیا اور ان کی طرف مڑتے ہوئے بولا :

"پروفیسر انکل، مارے بے قراری کے ہمارا بُرا حال ہے۔ خدا کے لیے جلد بتائیے، یہ معاملہ کیا ہے۔"

"بھئی، اپنے ابا جان کو تو آ لینے دو۔" انہوں نے منہ بنایا۔

"جی، جی بہتر۔" محمود نے مایوسانہ لہجے میں کہا۔ اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی ۔۔۔ محمود چونک اٹھا۔ انداز انسپکٹر جمشید کا نہیں تھا ؛ تاہم اس نے سوچا، وہ احتیاط سے دروازہ کھولے گا۔ اس نے اٹھ کر چٹخنی گرائی اور بولا :

"کون ہے ؟"

"انسپکٹر جمشید اور اس کے ساتھی اسی کمرے میں ٹھہرے ہوئے ہیں نا۔" باہر سے ایک بوکھلائی ہوئی آواز سنائی دی۔

"جج، جی ہاں ۔۔۔ کیوں کیا بات ہے ؟" محمود نے بھی بوکھلا کر کہا، کیونکہ کسی کو بھی یہ بات معلوم نہیں تھی، وہ اپنے مشہور نام کے ساتھ ہوٹل میں نہیں ٹھہرے تھے۔

"جو شخص انسپکٹر صاحب سے ملنے آیا تھا، وہ ان پر وار کر کے چلتا بنا۔ انسپکٹر صاحب زخمی حالت میں نیچے پڑے ہیں ۔۔۔ انہوں نے ہی مجھے یہاں بھیجا ہے۔"

"نہیں۔" وہ ایک ساتھ چلائے۔

"وہ کہاں ہیں۔"

"ہوٹل کے پچھلے حصے میں ۔۔۔ اس آدمی نے ان سے اسی طرف ملاقات کی تھی۔"

"اف خدا، جلد ہمیں وہاں لے چلیے۔" محمود نے گھبرا کر کہا۔

اس وقت تک وہ چاروں بھی اچھل کر کھڑے ہو چکے تھے۔ پھر پانچوں باہر نکلے اور اس پتلے دبلے آدمی کے پیچھے چل پڑے۔ اس نے پچھلی طرف کے زینے کا رخ کیا ۔۔۔ کئی کئی سیڑھیاں پھلانگتے وہ ایک تنگ سے برآمدے میں آئے۔ برآمدے کے سرے پر ایک دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ افراتفری کے عالم میں دروازے سے باہر نکل آئے۔ اسی وقت اس پتلے دبلے آدمی نے کہا :

"ارے، وہ کہاں چلے گئے ؟"

انہوں نے بوکھلا کر ادھر ادھر دیکھا، انسپکٹر جمشید وہاں کہیں بھی نہیں تھے ؛ البتہ دروازے کے پاس خون ضرور پھیلا ہوا تھا اور دو آدمی پریشان صورتیں لیے کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک نے کہا :

"حالت خراب ہوتی جا رہی تھی، لہٰذا انہیں ایک گاڑی میں

ڈال کر ہسپتال کی طرف روانہ کر دیا گیا ہے۔

"مہربانی فرما کر ہمیں بھی ہسپتال تک لے چلیے۔ ہمیں نہیں معلوم، ہسپتال کس طرف ہے۔"

"آئیے، لے چلتے ہیں — میری گاڑی باہر کھڑی ہے۔" پتلے دبلے آدمی نے کہا۔

سڑک کے کنارے واقعی ایک سفید رنگ کی کار کھڑی تھی۔ اس طرف آمدورفت نہ ہونے کے برابر تھی — شاید اسی لیے حادثے کا کسی اور کو پتا نہیں چلا تھا — وہ جلدی جلدی سفید کار میں بیٹھ گئے۔ دو آدمی جو انہیں کھڑے نظر آئے تھے، وہ بھی ان کے ساتھ بیٹھ گئے۔ کار میں اتنی جگہ نہیں تھی۔ لیکن کسی نہ کسی طرح وہ پھنس کر بیٹھ گئے اور سفید کار بلا کی رفتار سے روانہ ہوئی۔ پروفیسر داؤد کا رنگ سفید پڑ چکا تھا —

"کیا ہوا پروفیسر انکل، آپ بہت خوفزدہ نظر آ رہے ہیں۔"

"یہاں آتے ہی گڑبڑ شروع ہو گئی۔ گڑبڑوں سے بچنے کے لیے ہی تو میں تم لوگوں کو یہاں لے کر آیا تھا۔"

"آپ نے اب تک کچھ بھی نہیں بتایا۔ ایک الجھن یہ بھی ہے۔" خان رحمان بولے۔

"موقع ہی کہاں ملا ہے۔"

"لیکن اب تو موقع ہے انکل۔" فاروق بول اٹھا۔

"یہاں کچھ نہیں بتا سکتا۔" انھوں نے کہا، شاید وہ یہ کہنا چاہتے تھے کہ ان تینوں کے سامنے کچھ بھی نہیں بتایا جا سکتا۔ وہ بھی خاموش ہو گئے۔ پندرہ منٹ بعد انھوں نے کار کو آبادی سے دور پایا۔

"کیا یہاں ہسپتال آبادی سے دور ہے۔" محمود چونک کر بولا۔

"ہاں۔" پتلے دبلے آدمی نے کہا۔

"کمال ہے، ہسپتال کو تو عین شہر کے درمیان میں ہونا چاہیے تھا۔" فاروق بولا۔

"حکومت اب اسی پہلو پر غور کر رہی ہے۔" ان کے ساتھ بیٹھے ہوئے شخص نے کہا۔

"کیا آپ تینوں اس کار پر کہیں جا رہے تھے، جب آپ نے حادثہ ہوتے دیکھا۔" فرزانہ نے پوچھا۔ اس کی بے چینی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

"ہاں، ہم سڑک سے گزر رہے تھے کہ اچانک ایک شخص کو دوسرے پر خنجر سے وار کرتے دیکھا، پھر وہ بھاگ نکلا اور ہم نے کار روک لی۔ میں نے اتر کر اسے دیکھا، وہ شدید زخمی تھا اور پھر اس کے بتانے پر میں اوپر پہنچا۔"

"میرا خیال ہے، اب اور جھوٹ نہ بولیے۔" فرزانہ نے عجیب سا منہ بنایا۔

"اور کار کو روک لیجیے — کیونکہ ہم لوگ جھوٹے لوگوں کے ساتھ سفر کرنا پسند نہیں کرتے۔" محمود بولا۔

"بلکہ بہتر ہو گا کہ کار کا رخ تھانے کی طرف موڑ دیجیے۔" فاروق نے کہا۔

"نہیں بھئی کار تو اب اسی سڑک پر جائے گی۔" پتلا دبلا آدمی مسکرا کر بولا۔

"جیسے تمہاری مرضی، لیکن چاہتے کیا ہو، یہ تو بتا دو۔"

"پروفیسر داؤد سے پوچھو۔" دوسرے نے کہا۔

"اوہو، تم تو ہمارے نام بھی جانتے ہو۔"

"کیا کیا جائے، مجبوری ہے۔ جاننے پڑتے ہیں تم لوگوں کے نام۔" تیسرے نے شوخ لہجے میں کہا۔

"ایسی بھی کیا مجبوری ہے۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"بس دیکھتے جاؤ۔" پتلے دبلے نے کہا۔

اسی وقت کار ایک کچی سڑک پر مڑ گئی اور درختوں کے درمیان سے گزرنے لگی، پھر ایک کھنڈر نما مکان کے سامنے پہنچ کر رک گئی۔ انھوں نے دیکھا۔ مکان کے دروازے پر ایک سفید داڑھی والا بزرگ کھڑا تھا۔ انہیں کار سے اترتے دیکھ کر بولا:

"خوش آمدید پروفیسر صاحب اور انسپکٹر جمشید کے بچو اور اس کے دوست، میرا سلام قبول کرو۔"

"آپ جیسے بزرگ کا سلام تو قبول کرنا ہی پڑے گا جناب۔" فاروق نے خوش ہو کر کہا —

"تنہائی محسوس کرنے کی ضرورت نہیں۔ انسپکٹر جمشید بھی ابھی آ رہے ہوں گے۔"

"شکریہ، آپ کی تعریف۔" فاروق نے تلملا کر کہا۔

"بھئی، بے چین ہونے کی ضرورت نہیں — تعریف بھی ہو جائے گی۔" بزرگ مسکرایا۔

"اس مصنوعی داڑھی کی کیا ضرورت تھی۔ آپ تو اس کے بغیر بھی بزرگ ہی نظر آتے ہیں۔" محمود نے جل کر کہا۔

"تم لوگ انسپکٹر جمشید کے مزاج کو نہیں پہنچ سکتے۔"

"جی، کیا مطلب؟"

"وہ بہت ٹھنڈے مزاج کا آدمی ہے۔ تمہاری طرح یہاں آ کر مجھ پر غصہ ہرگز نہیں اتارے گا، بلکہ اپنی بیوقوفی پر افسوس بھی نہیں کرے گا۔ بس مسکرا دے گا۔" اس نے کہا۔

"بہت اچھی طرح واقف معلوم ہوتے ہو ان سے۔" فرزانہ نے اسے بغور دیکھا۔ شاید پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی۔ آواز اور لب و لہجے سے تو پہچاننے میں بری طرح ناکام رہی تھی —

"ہاں، اس کی رگ رگ سے واقف ہوں۔" اس نے ہنس کر کہا —

"اچھا، کمال ہے... رگ رگ سے ہم تو واقف نہیں ہیں۔" محمود نے منہ بنایا —

"پروگرام کیا ہے؟" فرزانہ بولی۔

"پروگرام پروفیسر داؤد بتائیں گے۔"

"کیا مطلب، پروفیسر انکل بتائیں گے۔" فاروق نے حیران ہو کر کہا۔

"ہاں بالکل، پوچھ لو بے شک ان سے۔"

"لیکن انکل، یہ کیا معاملہ ہے — پروگرام ان کا اور بتائیں آپ؟"

"ہم، میں نے پہلے ہی کہا تھا — میں خوف محسوس کر رہا ہوں۔" وہ ہکلائے۔

"خیر، وہ تو ٹھیک ہے، لیکن یہ کیا بات ہوئی کہ ان کا پروگرام آپ بتائیں گے۔"

"بات دراصل یہ ہے کہ یہ لوگ مجھے اغوا کرنا چاہتے ہیں۔"

"کیا!" وہ چلا اٹھے۔

"ہاں، یہی بات ہے — پروفیسر صاحب کا خیال بالکل ٹھیک ہے۔" بزرگ مسکرا دیا۔

"ابھی تک بات ہمارے پلے نہیں پڑی — پروفیسر صاحب، اس موقعے پر تو وضاحت کر دیں۔" خان رحمان نے الجھن کے عالم میں کہا۔

"ہاں پروفیسر صاحب، بالکل کر دیں وضاحت۔" بزرگ ہنسا۔

"اچھا۔" انھوں نے کہا اور ایک لمبا سانس کھینچا، پھر کہنے لگے۔

"ایک ہفتہ پہلے کی بات ہے، مجھ سے ایک شخص ملنے آیا۔ اس نے آ کر بہت ہی عجیب و غریب قسم کی باتیں شروع کر دیں۔ پہلے تو میں اس کی باتوں کو سمجھ ہی نہیں سکا اور جب سمجھنے کے قابل ہوا تو میری حیرت اور الجھن اور بڑھ گئی۔ اس نے مجھ سے کچھ اس قسم کی بات چیت شروع کر دی:

"میں جانتا ہوں، بلکہ صرف میں ہی نہیں۔ بے شمار لوگ اب تو اس بات کو جان گئے ہیں کہ" یہاں تک کہہ کر وہ رک گیا۔ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"کس بات کو جان گئے ہیں بہت سے لوگ اور آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟" میں حیرت بھرے لہجے میں بولا۔

"وہی بات، جسے آپ اور آپ کے ساتھی اب تک چھپاتے رہتے ہیں۔" اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"میں اور میرے ساتھی، کون سے ساتھی اور ہم کس بات کو چھپا رہے ہیں۔ آپ کی تو ایک بات بھی میرے پلے نہیں پڑی۔" میں الجھ گیا۔

"اب چھپانے کی کیا ضرورت ہے — اگر آپ صاف صاف بتا دیں گے تو فائدے میں رہیں گے، ورنہ ہمیں آپ کو اغوا کرنا ہوگا اور اغوا ہونے کے بعد آپ بے شمار مصیبتوں کو دعوت دے بیٹھیں گے۔"

"لیکن سوال تو یہ ہے کہ میں کیا چھپا رہا ہوں، آپ کیا جاننا چاہتے ہیں۔" میں چیخ کر بولا۔

"خیر، نہ بتائیں، لیکن وقت آنے والا ہے، جب آپ فرفر بتائیں گے۔" اس نے کہا۔

"اب میں تنگ آ گیا ہوں — آپ کی سمجھ میں نہ آنے والی باتیں میرا سکون برباد کیے دے رہی ہیں، لہٰذا میں پولیس کو فون کر رہا ہوں۔"

"ایسی کوئی کوشش کی تو انجام موت ہوگا — میں بے یارومددگار یہاں نہیں چلا آیا — میرے پاس ہر قسم کے ہتھیار اور اوزار موجود ہیں، بہرحال آپ سوچ لیں، میں پھر آپ سے بات کروں گا۔"

یہ کہہ کر وہ اٹھا اور اس سے پہلے کہ میں کچھ کرنے کے بارے میں کچھ سوچ سکتا، وہ جا چکا تھا۔ اس کی باتوں نے مجھے الجھن میں مبتلا کر دیا تھا — میں نے فوراً انسپکٹر جمشید کو فون کیا، لیکن وہ اور تم تینوں کسی کیس کے سلسلے میں شہر میں یا شہر سے باہر نہ جانے کہاں موجود تھے۔ دو دن بعد اس کا فون ملا۔ فون پر بھی اس نے اسی قسم کی باتیں کیں، لیکن میں بھلا اسے کیا جواب دیتا — آخر اس نے مجھے دھمکی دی کہ اب مجھے اغوا ہی کرنا پڑے گا — میں نے پھر تم لوگوں کو فون کیا، لیکن تم ابھی نہیں لوٹے تھے۔ آخر تم آ گئے اور میرا فون ملتے ہی چلے آئے۔ میں اسی لیے تم لوگوں کو لے کر اس الگ تھلگ شہر میں آ گیا، تاکہ اغوا ہونے سے محفوظ رہوں اور کچھ دن تم لوگوں کے ساتھ سیر و تفریح میں وقت گزار دوں، لیکن مجھے یہ کیا معلوم تھا کہ یہ لوگ پہلے سے یہاں پہنچ چکے ہوں گے۔" یہاں تک کہہ کر پروفیسر داؤد خاموش ہو گئے۔

"اور یہی اس سارے معاملے میں عجیب ترین پہلو ہے۔" فرزانہ نے حیران ہو کر کہا۔

"کیا مطلب، کون سا پہلو؟" خان رحمان چونک کر بولے۔

"آخر ان لوگوں کو کس طرح معلوم تھا کہ پروفیسر صاحب اس قصبے کا رخ کریں گے — جنگل میں اس مکان کو استعمال کرنے سے تو یہ ظاہر ہے کہ یہ یہاں پہلے ہی آ چکے تھے، ورنہ ہم یہ خیال کر سکتے تھے کہ ہمارا تعاقب کرتے ہوئے یہاں تک پہنچے ہیں، لیکن نہیں، یہ بات نہیں۔ یہ پہلے سے جانتے تھے کہ پروفیسر صاحب یہاں آئیں گے، بلکہ انہیں تو یہ تک معلوم تھا کہ ہم لوگ ہوٹل آبان میں آ کر ٹھہریں گے — اسی لیے تو ہمارے یہاں پہنچتے ہی یہ لوگ پروگرام پر عمل پیرا ہو گئے۔ پہلا قدم تو انھوں نے یہ اٹھایا کہ آبا جان سے ملاقات کے لیے ایک صاحب ہال میں آ موجود ہوئے۔ دوسری طرف ہمیں ان کے زخمی ہونے کی اطلاع دی گئی — نیچے کار بھی تیار تھی — ان سب باتوں کا مطلب صرف اور صرف یہ ہے کہ ان لوگوں کو پہلے سے معلوم تھا کہ آپ یہاں آئیں گے۔ آخر یہ کس طرح ممکن ہے — دوسرے یہ کہ آپ کو تجربہ گاہ سے بھی تو اغوا کیا جا سکتا تھا — اس کے لیے اتنا لمبا چوڑا چکر کیوں چلایا گیا۔" فرزانہ روانی کے عالم میں کہتی چلی گئی۔

"واقعی، یہ سب باتیں تو غور طلب ہیں۔" محمود بولا۔

"ان سب باتوں کے جواب میں نہیں دے سکتا۔ شاید یہ شخص دے سکے" پروفیسر داؤد نے ڈاڑھی والے کی طرف اشارا کیا۔

"لیکن کم از کم آپ یہ تو بتا ہی سکتے ہیں کہ آخر آپ نے اس قصبے میں آنے کا ارادہ کیوں کیا"

"چھ سات روز سے میں اخبارات میں اس شہر کے اس ہوٹل کے بڑے بڑے اشتہارات روز دیکھ رہا تھا۔ ان اشتہارات میں ہوٹل کے ساؤنڈ پروف کمروں کا ذکر بھی زور شور سے کیا جا رہا تھا، بس میں نے سوچا، کیوں نہ اس شہر میں آکر اس ہوٹل میں ٹھہرا جائے، مقصد تو صرف یہ تھا کہ کسی طرح اغوا ہونے سے بچ جاؤں۔ ذہنی سکون بھی تباہ و برباد نہ ہو، لیکن....." وہ کہتے کہتے رک گئے۔

"اخبارات میں اشتہارات میرے اشارے پر شائع کرائے گئے تھے۔ پروفیسر صاحب کی توجہ اس شہر اور شہر کے اس ہوٹل کی طرف دلانے کی بس یہی ایک ترکیب تھی؛ تاہم اگر یہ اس کے باوجود کسی اور شہر کا رخ کرتے یا دارالحکومت میں ہی رہ کر تم لوگوں کی مدد طلب کرتے تو بھی ہم پوری طرح تیار تھے اور انہیں اغوا پھر بھی کیا جاتا تھا۔ اس شہر کی طرف توجہ اس لیے بھی دی گئی کہ یہاں پہاڑ ساتھ ہیں۔ اور ان کے دوسری طرف سمندر ہے، فرار بہت آسان ہے۔ فرار کے انتظامات بھی ہم نے کر لیے ہیں۔ کسی اور جگہ یا دارالحکومت سے فرار ذرا طول پکڑ لیتا۔ یہاں سے ہم فوراً ہی غائب ہو سکتے ہیں"

"سوال یہ ہے کہ آپ کو پروفیسر صاحب کے اغوا کی ایسی کیا خاص ضرورت پڑ گئی" فرزانہ نے بے چین ہو کر کہا۔

"پروفیسر صاحب نے ہمارے اس آدمی کے سوالوں کے جواب نہیں دیے، جو ان سے آکر ملا تھا اور جس نے ان سے فون پر بھی بات کی تھی، اس لیے انہیں اغوا کرنا پڑا اور اگر یہ بتا بھی دیتے، اغوا تو شاید اس صورت میں بھی کرنا پڑتا"

"آپ دونوں کی باتیں ہمارے پلے نہیں پڑ رہیں۔ کہیں ہم اپنی عقلیں گھر تو نہیں بھول آئے" فاروق نے فکرمندانہ لہجے میں کہا۔

"بھئی، مجھے کچھ معلوم نہیں، بتاؤں کیا۔ ہاں، یہ ڈاڑھی والے صاحب شاید وضاحت کر سکیں"

"پروفیسر صاحب، میں آپ سے صرف ایک سوال کروں گا۔ دیکھنا یہ ہے کہ آپ کیا جواب دیتے ہیں" بزرگ نے کہا۔

"اور اگر انہوں نے جواب دے دیا تو کیا آپ اغوا کا پروگرام منسوخ کر دیں گے" فرزانہ جلدی سے بولی۔

"نہیں، اغوا تو ہو بھی چکا ہے اور پروگرام پر عمل بدستور جاری رہے گا"

"تب پھر کسی سوال کا جواب دینے کی کیا ضرورت ہے" فاروق نے منہ بنایا۔

"کم از کم اس طرح تم لوگوں کی الجھن ہی دور ہو گی" بزرگ نے مسکرا کر کہا۔

"آپ ہماری الجھن کے اندیشے میں دبلے نہ ہوں" فرزانہ جل کر بولی۔

"جیسے تم لوگوں کی مرضی۔ لیکن ہم پروفیسر صاحب سے وہ سوال پھر بھی کریں گے اور انہیں اس کا جواب دینا ہوگا"

"آخر وہ سوال کیا ہے؟" پروفیسر داؤد چلا اٹھے۔

"میں سوال بتا دیتا ہوں، لیکن جانتا ہوں، آپ جواب نہیں دیں گے۔ یہ سوال کچھ اور لوگوں سے بھی کیا جا رہا ہے لیکن انہوں نے بھی کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے باوجود میں سوال ضرور پوچھوں گا۔ نہ بتانے کی صورت میں جو حشر دوسروں کا ہوگا، وہی آپ کا بھی ہوگا"

"اور یہ دوسرے کون لوگ ہیں؟"

"تمہارے ملک کے مشہور و معروف سائنس دان۔ مثلاً پروفیسر غوری، پروفیسر عقلان اور چند اور....."

"اف خدا، یہ تو بہت گہرا معاملہ معلوم ہوتا ہے۔ آخر وہ سوال کیا ہے" محمود کانپ کر بولا۔

"ہاں، سمندر جتنا گہرا تو ہوگا ہی" فاروق نے فوراً کہا۔

"اس میں کوئی شک نہیں، معاملہ بہت گہرا ہے، ورنہ ہم لوگ ہرگز حرکت میں نہ آتے اور تمہارے ملک کے سائنس دانوں کو اغوا کرنے کا منصوبہ ترتیب نہ دیتے"

"تت، تو کیا، دوسرے سائنس دانوں کو بھی....." محمود جملہ مکمل نہ کر سکا۔

"ہاں، امید ہے، اب تک عمل شروع ہو چکا ہوگا"

"ارے باپ رے۔ ہم تو اب اس پوزیشن میں بھی نہیں کہ انہیں خبردار ہی کر سکیں" خان رحمان بوکھلا اٹھے۔

"کوئی فائدہ نہیں۔ خبردار کر کے بھی آپ لوگ انہیں نہیں بچا سکیں گے" بزرگ نے کہا۔

"مہربانی فرما کر پہلے تو اپنا تعارف کرا دیں اور پھر وہ سوال کر ڈالیں جو دوسرے سائنس دانوں سے بھی کیا جا رہا ہے۔ اب ہماری بے چینی آسمان کی بلندیوں کو چھونے لگی ہے اور جب کسی کی بے چینی اتنی بلند ہو جائے، تو پھر..... تو پھر..... تو پھر، ہاں تو خیر، تو پھر پتا نہیں کیا ہو جاتا ہے، لہٰذا میں ڈرتا ہوں، اس پتا نہیں کیا ہو جانے سے" فاروق رکے بغیر کہتا چلا گیا۔

"دیکھا آپ نے اس کی زبان کا کمال"

"واقعی حیرت انگیز چیز ہے" بزرگ نے مسکرا کر کہا۔

"کس چیز کا ذکر کر رہے ہیں آپ" فاروق نے حیران ہو کر کہا۔

"تمہاری زبان کا" وہ مسکرایا۔

عین اسی وقت ایک کار آتی نظر آئی۔ ڈاڑھی والا چونک کر بولا:

"لو بھئی، انسپکٹر جمشید تشریف لا رہے ہیں"

وہ پریشان ہو کر مڑے اور کار کی طرف دیکھنے لگے۔

☆ ☆ ☆

انہوں نے دیکھا، وہ شخص جو ان سے ملنے آیا تھا، ابھی تک اسی کرسی پر جوں کا توں بیٹھا تھا۔ ان کی حیرت کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ اگر یہ سب ان کے خلاف ایک سازش تھی تو پھر یہ شخص ابھی تک یہاں موجود تھا، اسے تو اسی وقت غائب ہو جانا چاہیے تھا، جب وہ یہاں سے اٹھ کر اوپر گئے تھے۔ چند سیکنڈ تک سوچتے رہنے کے بعد وہ اس کی طرف قدم اٹھانے لگے۔

"چلیے جناب، پہلے ہم اس بزرگ کی طرف چلیں گے پھر آپ کا محل دیکھیں گے۔" وہ پرسکون آواز میں بولے۔ اس نے چونک کر ان کی طرف دیکھا، پھر بولا:

"اوہو، آپ تشریف لے آئے۔ میں تو سمجھا تھا، آپ نے میری مدد سے ہاتھ کھینچ لیا۔"

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ مجھے ذرا دیر ضرور ہو گئی۔" وہ بولے۔

اس کے ساتھ ہوٹل سے باہر نکلے اور خان رحمان والی کار میں آ بیٹھے۔ آتے ہوئے میز پر سے کار کی چابی اٹھا لائے تھے۔ چابی وہاں خان رحمان نے ان کی موجودگی میں ہی ڈال دی تھی۔ دونوں بیٹھ گئے اور انسپکٹر جمشید کار چلانے لگے۔

"راستہ بتاتے جائیے۔"

"جی ہاں، کیوں نہیں۔" اس نے کہا اور راستہ بتانے لگا۔

جوں ہی کار شہر سے باہر نکلی اور سڑک سنسان نظر آئی۔ انسپکٹر جمشید نے خوف ناک انداز میں بریک لگائے۔ وہ شخص بالکل بے سہارا بیٹھا تھا، لہٰذا اس کا جسم کار کے اگلے حصے سے پوری قوت سے ٹکرایا، فوراً ہی وہ بے ہوش ہو گیا۔ انہوں نے کار کو سڑک سے نیچے اتار لیا اور دروازہ کھول کر اسے نیچے گھسیٹ لیا۔ اس کے کپڑے اتار ڈالے، پھر اپنے کپڑے اتار کر اسے پہنا دیے اور اس کے خود پہن لیے، ساتھ ہی اس کی کن پٹی پر ایک زبردست مکا رسید کیا۔ اب وہ آدھ گھنٹے سے پہلے ہوش میں نہیں آ سکتا تھا۔ اس کا ہیٹ سر پر رکھ لیا اور اسے چہرے پر جھکا لیا، پھر اسے کار کی پچھلی سیٹ پر ڈالا اور ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور آگے روانہ ہوئے۔ فوراً ہی انہیں خیال آیا کہ وہ ایک غلطی کر بیٹھے ہیں۔ انہیں اس کی کن پٹی پر مکا نہیں رسید کرنا چاہیے تھا۔ اب وہ کس طرح معلوم کر سکتے تھے کہ جنگل میں وہ بزرگ کس جگہ موجود ہے، تاہم وہ دائیں بائیں بغور دیکھتے ہوئے آگے چلتے رہے۔ آخر ایک جگہ جنگل میں انہیں روشنی نظر آئی۔ انہوں نے کار اس طرف موڑ لی۔ جلد ہی ایک مکان کے سامنے کچھ لوگ کھڑے دکھائی دیے اور پھر انہیں یہ جاننے میں دیر نہ لگی کہ ان میں ان کے ساتھی بھی موجود تھے۔ ان کے نزدیک پہنچتے ہی انہوں نے کار روک لی۔

"کیا رہا جانگو؟"

"بے ہوش پڑے ہیں۔" انہوں نے اس کی آواز کی نقل کرنے کی کوشش کی۔

"کیا مطلب؟" ڈاڑھی والا زور سے چونکا۔

"کس بات کا مطلب پوچھ رہے ہیں آپ؟" انہوں نے حیران ہو کر کہا۔

"ہاتھ اوپر اٹھا دیں مسٹر جمشید، آپ مجھے دھوکا نہیں دے سکتے۔" اور وہ چونک اٹھے۔

"کیا مطلب؟" محمود، فاروق اور فرزانہ کے منہ سے نکلا۔

"یہ آپ کے والد ہیں، میرا وہ ساتھی نہیں جو انہیں لینے گیا تھا۔ شاید وہ پچھلی سیٹ پر بے ہوش پڑا ہے۔" اب بزرگ کے ہاتھ میں پستول نظر آیا، لیکن انہوں نے ہاتھ اوپر نہ اٹھائے۔

"آپ نے سنا نہیں مسٹر جمشید۔"

"سن لیا ہے مسٹر۔ کیا خیال ہے، میں بھی تمہارا نام بتا دوں اپنے ساتھیوں کو۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"اوہ، تو تم نے مجھے پہچان لیا انسپکٹر جمشید۔" اس نے حیران ہو کر آپ سے تم پر آتے ہوئے کہا۔

"میں اور تمہیں نہ پہچانوں۔ خیر، تمہیں ایک بار پھر اپنے ملک میں دیکھ کر بہت حیرت ہوئی۔ ضرور کسی خاص مقصد سے آئے ہو۔ کہو تو یہ بھی بتا دوں کہ کیوں آئے ہو۔"

"یہ۔ یہ کس طرح ہو سکتا ہے انسپکٹر جمشید۔ میرا دعویٰ ہے کہ تم یہ بات نہیں بتا سکتے۔"

"بھئی، ذرا سوچ سمجھ کر دعویٰ کرو۔ کیا تم پروفیسر داؤد صاحب کو اغوا کرنے کی نیت سے نہیں آئے۔"

"ہاں، اس میں شک نہیں، لیکن میں انہیں کیوں اغوا کرنا چاہتا ہوں۔ اگر یہ بتا دو تو مانوں۔"

"میں نجومی نہیں۔ اتنا اندازہ بھی پروفیسر صاحب کی خوف زدہ باتوں سے لگایا ہے اور شاید اخبارات میں ہوٹل آبان کے اشتہارات بھی تم ہی شائع کراتے رہے ہو۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا۔"

"کمال ہے، تم نے یہ اندازہ بھی لگا لیا۔"

"اس لیے کہ ہوٹل آبان کے کمرے ساؤنڈ پروف نہیں ہیں۔ یہ بات میں نے پہلی نظر میں ہی بھانپ لی تھی۔ پھر مجھے وہ اشتہارات یاد آئے اور ان لوگوں کو ہوٹل کے کمرے سے غائب پا کر تو گویا ہر بات ذہن میں آ گئی۔"

"واقعی تم بہت ذہین ہو اور اسی لیے اپنے ملک کے معروف سراغ رساں ہو۔"

"اور اب ہو جائے یہ بات کہ اس اغوا کی کیا ضرورت پیش آ گئی۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"ابا جان، پہلے یہ تو بتا دیں، یہ ہیں کون صاحب، کیونکہ ابھی

تک ہم تو پہچان نہیں سکے۔"

"پہچانو گے بھی کس طرح — یہ حضرت ابھی تک بدلی ہوئی آواز میں بات کر رہے ہیں — ویسے ان کا نام رے راٹا ہے۔"

"کیا؟" وہ چیخ اٹھے۔

○

چند لمحے سکتے کے عالم میں گزر گئے۔ آخر محمود نے کہا:

"اف خدا، یہ آپ ہیں مسٹر رے راٹا۔"

"تمہارے والد کا خیال بالکل ٹھیک ہے شریر بچو!" رے راٹا مسکرایا —

"کیا مسٹر رے راٹا نے اغوا کی وجہ بتائی ہے۔"

"جی ہاں، ان کے اور ہمارے درمیان کچھ باتیں ہوئی تو ہیں۔"

"جلدی سے مجھے بھی بتا دو۔"

"انسپکٹر جمشید، تم نے ابھی تک ہاتھ نہیں اٹھائے۔ میں یہ بات واضح کر دوں کہ ہمیں صرف اور صرف پروفیسر داؤد کی ضرورت ہے۔ تم لوگوں کی ہم ذرا بھی پروا نہیں کریں گے۔"

"یہی تو میں جاننا چاہتا ہوں، کیوں ضرورت ہے۔"

"تو پھر ہاتھ اٹھا کر جانو —" رے راٹا غرایا۔

"شاید مجھ سے بہت خوف زدہ ہو — خیر یہ لو، تم بھی کیا یاد کرو گے۔" یہ کہہ کر انہوں نے ہاتھ اوپر اٹھا دیے، لیکن باقی یونہی کھڑے رہے۔ رے راٹا نے بھی اعتراض نہ کیا۔

"محمود، میں تفصیل جاننا چاہتا ہوں۔"

اور محمود شروع ہو گیا، جلدی جلدی ساری باتیں بتا گیا۔

"ارے باپ رے — پروفیسر غوری اور پروفیسر عقلان جیسے لوگوں کو بھی اغوا کرنے کے منصوبے پر عمل ہو رہا ہے اور وہ سوال کیا ہے جو یہ لوگ سائنس دانوں سے معلوم کرنا چاہتے ہیں؟"

"وہ ہمیں ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا۔"

"کیا مطلب؟" انسپکٹر جمشید چونک کر بولے۔

"تو مسٹر رے راٹا بتا دیں گے۔ فکر کی کیا بات ہے۔" خان رحمان بولے۔

"ہاں ضرور، میں تم لوگوں کی الجھن ضرور دور کر دوں گا اور پھر تمہیں پروگرام بتاؤں گا — تو سنو، سوال یہ ہے، پروفیسر داؤد اور دوسرے سائنس دان چھ ماہ تک کہاں رہے ہیں۔"

"چھ ماہ تک کہاں رہے ہیں — کیا مطلب؟" پروفیسر ... اچھل پڑے۔

"اس طرح اچھل پڑنے کی ضرورت نہیں۔" رے راٹا نے بُرا سا منہ بنایا۔

"تو پھر کس چیز کی ضرورت ہے۔" فاروق بول پڑا۔

"صرف سوال کا جواب چاہیے۔"

"میں چھ ماہ تک اپنے ملک میں، اپنے شہر میں اور اپنی تجربہ گاہ میں رہا ہوں۔" پروفیسر داؤد بولے۔

"یہ درست نہیں، آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔"

"جمشید، میرے لیے یہ بات بہت تکلیف دہ ہے کہ کوئی مجھے میرے منہ پر جھوٹا کہے۔"

"جی بہتر، آپ فکر نہ کریں۔ رے راٹا کو اپنے الفاظ واپس لینا پڑیں گے۔ مسٹر رے راٹا اگر ہم سے بات چیت کرنا چاہتے ہیں تو اپنے الفاظ واپس لے لیں۔"

"رے راٹا وہ آدمی نہیں جو تم جیسے چوہوں سے خوف کھائے۔"

"تب پھر یہ پستول کس لیے؟" انسپکٹر جمشید طنزیہ لہجے میں بولے۔

"یہ منصوبے کا ایک حصہ ہے — منصوبے کے تمام تر حصوں پر پوری طرح عمل کرنے کی ٹھان کر نکلے ہیں ہم لوگ۔"

"پروفیسر غوری اور پروفیسر عقلان کی طرف کن لوگوں کو روانہ کیا گیا ہے۔"

"الٹانیو اور سلاٹر کو —"

"اوہو، گویا سبھی بڑے مجرم اس بار ہمارے مقابلے میں آ گئے ہیں۔" فرزانہ نے کانپتی آواز میں کہا۔

"تمہارے مقابلے میں صرف میں آیا ہوں۔ پروفیسر صاحب، آپ نے سوال کا جواب نہیں دیا۔"

"دے تو چکا ہوں۔"

"لیکن ہماری اطلاعات یہ ہیں کہ تمام بڑے سائنس دان چھ ماہ تک ایک خفیہ مقام پر کچھ کرتے رہے ہیں۔"

"ان میں میں شامل نہیں تھا — مجھ سے کہا ضرور گیا تھا، لیکن میں ایک ایسے تجربے میں الجھا ہوا تھا، جسے درمیان میں چھوڑنا میرے لیے تقریباً ناممکن تھا۔" انہوں نے کہا۔

"مسٹر رے راٹا، میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں، اگر یہ ملک سے چھ ماہ تک غائب رہتے تو یہ بات میرے علم میں ضرور ہوتی، کیونکہ ہم ہفتے میں ایک آدھ مرتبہ تو ضرور ہی ملتے رہتے ہیں۔"

"میں کس طرح یقین کر لوں۔"

"یہ تمہاری مرضی کی بات ہے، بے شک یقین نہ کرو۔"

"لیکن اگر یہ درست ہے تو میں کیا کروں، کسے اغوا کر کے ہیڈ کوارٹر لے جاؤں۔"

"ہیڈ کوارٹر، کیا مطلب؟" وہ چونک کر بولے۔

"ہم نے ایک جگہ مقرر کر رکھی ہے — سب کو وہاں جمع ہونا ہے۔ پروفیسر صاحب کو بھی وہیں لے کر جانا ہے۔"

"لیکن جب کہ انہیں کچھ معلوم ہی نہیں تو لے جا کر کیا کریں گے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"سوری، اس طرح سارا منصوبہ درہم برہم ہو جائے گا، انہیں بھی ضرور لے جانا ہو گا، لہذا اب اجازت — مگر نہیں، پہلے تو تم لوگوں کو باندھنا ہو گا۔ تم میرے نشانے سے تو واقف ہی ہو —

پستول میں نے اسی لیے نکالا ہے کہ وقت نہ ضائع کرنا پڑے ـــ اب تم سب ہاتھ اوپر اٹھا دو۔ میرے آدمی تمہیں باندھ لیں گے۔ چلو بھئی نیچے اُتر آؤ۔"

اور درختوں پر سے تقریباً دس آدمیوں نے چھلانگیں لگائیں۔ انہوں نے سوچا، اچھا ہی ہوا، وہ ان لوگوں سے جھگڑے نہیں، ورنہ اس وقت ان کی چیں بول جاتی۔

محمود، فاروق اور فرزانہ نے سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھا، جیسے کہہ رہے ہوں:

"ابا جان، اب کیا کریں؟"

"گھبراؤ نہیں ـــ ہم پروفیسر داؤد کو اتنی آسانی سے اغوا نہیں ہونے دیں گے۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے ـــ

"جب کہ میرے خیال میں یہ بہت آسان ہے۔" رے راٹا نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"وہ کیسے؟"

"ایسے ـــ" یہ کہہ کر اس نے اپنے ایک آدمی کو اشارہ کیا۔ اس نے فوراً جیب سے پستول نکالا اور آگے بڑھ کر پروفیسر داؤد کی کن پٹی پر رکھ دیا ـــ

"اگر آپ لوگوں نے ذرا بھی حرکت کی تو پروفیسر داؤد اپنی جان سے جائیں گے۔ یہ تو اس منصوبے میں یوں بھی ہمارے لیے بے کار ثابت ہو چکے ہیں، لہٰذا انہیں گولی مارنا ہمارے لیے ذرا بھی مشکل ثابت نہیں ہو گا ـــ"

"تب تم لوگ گولی مار ہی دو۔ اس طرح میرے ساتھی تو مشکل سے بچ جائیں گے۔" پروفیسر داؤد نے منہ بنایا۔

"نہیں پروفیسر، ہو سکتا ہے، تم چھ ماہ تک غائب نہ رہے ہو، لیکن اس کے باوجود تم قوم کے لیے بہت بڑا سرمایہ ہو اور ہم اس سرمائے سے فائدہ ضرور اٹھائیں گے۔"

"لیجیے، اب ہمارے پروفیسر انکل سرمایہ بن گئے۔" فاروق نے برا سا منہ بنایا، لیکن اس وقت مسکرانے کا ہوش کسے تھا۔

"اچھا، اگر تم میرا وقت ضائع کرنے پر تل گئے ہو تو میں بھی کوئی لحاظ نہیں کروں گا، چلو بھئی پروفیسر صاحب کو لے چلو۔ یہ لوگ یہیں کھڑے رہیں گے ـــ ان میں سے جو بھی حرکت کرے، اس کے سینے میں گولی اتار دو۔"

"او کے سر۔" ان میں سے کئی ایک نے کہا، پھر پروفیسر داؤد کو دھکیلا جانے لگا ـــ انہوں نے سوالیہ نظریں انسپکٹر جمشید پر جما دیں، لیکن انہوں نے اپنی جگہ سے حرکت کرنے کی کوشش نہ کی۔ پروفیسر داؤد نے بے بسی کے عالم میں مڑتے ہوئے ان کی طرف دیکھا ـــ وہ تڑپ اٹھے اور بولے ـــ

"فکر نہ کریں پروفیسر صاحب، ہم ان لوگوں کو ان کے مقصد میں کامیاب نہیں ہونے دیں گے۔"

"مشکل ہے انسپکٹر جمشید، تم کچھ بھی نہیں کر سکو گے۔"

"میں وار کرنے لگا ہوں۔ درختوں پر اگر اور آدمی ہوں تو انہیں بھی نیچے بلا لو، یہ آدمی تمہارے لیے کم پڑ جائیں گے۔"

"پروا نہیں، تم لوگوں کے لیے تو میں تنہا کافی ہوں۔" رے راٹا ہنسا۔

"میں سمجھا، تمہارے ساتھ بس یہی آدمی ہیں۔ درختوں پر اب کوئی نہیں رہا۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"بہت اونچی ہواؤں میں اڑ رہے ہو انسپکٹر جمشید، آخر کرنا کیا چاہتے ہو۔" رے راٹا کی آنکھوں میں الجھن کے آثار نظر آئے۔

انسپکٹر جمشید دل ہی دل میں مسکرا دیے۔ انہوں نے اس گفت گو کے ذریعے کم از کم یہ معلوم کر لیا تھا کہ اب درختوں پر کوئی دشمن موجود نہیں ـــ سب کے سب دشمن اب ان کی آنکھوں کے سامنے تھے۔

اچانک فضا میں ایک چیخ بلند ہوئی۔ وہ دشمن ہوا میں اچھل کر نیچے گرا، جس نے پروفیسر داؤد کی گردن سے پستول کی نال لگا رکھی تھی۔ یہی نہیں، فائر مسلسل ہوتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ پندرہ سیکنڈ کے اندر اندر رے راٹا کے تمام ساتھی ڈھیر ہو چکے تھے ـــ رے راٹا نے ہکا بکا انداز میں انسپکٹر جمشید کی طرف دیکھا، لیکن ان کے ہاتھ میں کوئی پستول نظر نہ آیا؛ البتہ خان رحمان کے ہاتھ میں ایک پستول ضرور تھا اور اب اس کی نال کا رخ رے راٹا کی طرف تھا۔

"اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ اسے بھی اس کے ساتھیوں سمیت سفر پر روانہ کر دو۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

خان رحمان نے ایک بار پھر پستول کا ٹریگر دبایا۔ رے راٹا اپنی جگہ سے کئی فٹ اونچا اچھلا اور کچھ فاصلے پر کھڑا نظر آیا۔ یہ اور بات ہے کہ خان رحمان کے پستول سے گولی نہ نکلی۔ اس کی تو تمام گولیاں ختم ہو گئی تھیں۔

"میں حیران ہوں انسپکٹر جمشید، تمہارے ساتھی نے پستول جیب سے کس وقت نکالا۔"

"پستول میں نے نہیں، میری جیب سے فرزانہ نے نکالا تھا اور نکالتے ہی مجھے دے دیا ـــ فرزانہ مجھ سے نزدیک تھی، ورنہ پستول ضرور جمشید کو دیتی۔ یہ بہرحال مجھ سے زیادہ ماہر نشانہ باز ہیں۔"

"میں نے غلطی کی ـــ مجھے تم لوگوں کے ہاتھ بھی اٹھوا دینا چاہیے تھے۔" رے راٹا نے بغیر کسی افسوس کے کہا۔

"اب کیا پروگرام ہے؟"

"پروفیسر داؤد کو لے کر جاؤں گا اور کیا پروگرام ہوتا۔ میں ان لوگوں کے بل پر تو آیا نہیں۔"

"ہوں، تم لوگوں کی الجھن کیا ہے؟"

"ہم صرف یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ بڑے بڑے سائنس دان چھ ماہ تک کہاں رہے ہیں، کیونکہ ہمارا خیال ہے، انہوں نے ضرور کوئی ایسا کام کیا ہے، جو ہمارے لیے مشکلات پیدا کر سکتا ہے ـــ"

ایک بار ہمیں اس کام کی تفصیلات معلوم ہو جائیں، پھر ہم اس کی بنیادیں ہلا دیں گے۔"

"تب پھر پروفیسر داؤد کے اغوا کی کیا ضرورت رہ جاتی ہے، جب کہ یہ ان چھ ماہ کے دوران اپنی تجربہ گاہ میں ہی رہے ہیں۔"

"ہو سکتا ہے، یہ بات غلط ہو اور دوسرے سائنس دانوں کی طرح ان کے میک اپ میں کوئی اور شخص تجربہ گاہ میں موجود رہا ہو۔"

"اگر ایسی بات ہوتی تو ہم فوراً اقرار کر لیتے۔"

"اس کے باوجود میں انہیں لے کر جاؤں گا، کیونکہ ان کے اغوا کے سلسلے میں مجھے اپنے ان تمام ساتھیوں کی قربانی دینا پڑی ہے۔"

"تو ٹھیک ہے، لے جا کر دکھا دو۔"

"اگر روک سکتے ہو تو روک لو۔" یہ کہہ کر رے راٹا نے پروفیسر داؤد کی طرف دوڑ لگا دی۔ وہ بوکھلا اٹھے۔ اتنے میں رے راٹا جھک کر پروفیسر داؤد کو کندھے پر لاد چکا تھا اور ہوا کی مانند اڑا جا رہا تھا۔ انسپکٹر جمشید نے اس کے پیچھے دوڑ لگا دی اور دوڑتے دوڑتے جیب سے پستول نکال لیا، پھر رے راٹا کی کمر کا نشانہ لے کر فائر کر دیا۔ انہوں نے گولی اس کی کمر پر لگتے صاف دیکھی، لیکن گولی نے اس کا کچھ بھی نہ بگاڑا، وہ بدستور بھاگتا رہا۔ محمود، فاروق اور فرزانہ بھی اس کے پیچھے جان توڑ کر بھاگ رہے تھے اور ساتھ خان رحمان بھی۔ لیکن رے راٹا اور انسپکٹر جمشید کا درمیانی فاصلہ بڑھتا ہی جا رہا تھا اور انسپکٹر جمشید کا اور ان کا درمیانی فاصلہ بڑھتا جا رہا تھا۔ انہیں حیرت تو اس بات پر تھی کہ رے راٹا نے پروفیسر داؤد کو کندھے پر اٹھا رکھا تھا، پھر بھی وہ ان سے بہت تیز دوڑ رہا تھا۔ کیوں نہ ہو، یہ وہ شخص تھا جو کار کی سی تیزی سے دوڑ لیتا تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ پسینے میں نہا چکے تھے اور رے راٹا ان کی نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا، لیکن انہوں نے ابھی تک اس کا تعاقب ختم نہیں کیا تھا۔ پھر انسپکٹر جمشید بھی ان کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ اس پر بھی وہ دوڑتے رہے۔ شاید وہ اپنی زندگی میں اتنا کبھی نہیں دوڑے تھے۔ بہت دیر سے ان میں سے کسی نے کوئی بات بھی نہیں کی تھی۔ چاروں ساتھ ساتھ دوڑ رہے تھے، تاکہ وہ کم از کم وہ تو ایک دوسرے سے نہ بچھڑ جائیں۔ شاید محمود نے دوڑتے میں خاموشی کو محسوس کر لیا، وہ بول اٹھا:

"مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے، جیسے ہم آج دوڑتے دوڑتے دنیا سے باہر نکل جائیں گے۔"

"ہم، مشکل ہے۔ ہم اپنی زندگیوں میں تو اس دنیا سے نکل نہیں سکیں گے۔ یوں کہہ لو ہم اس دنیا کے قیدی ہیں۔ مر کر ہی اس قید سے آزاد ہوں گے۔" محمود نے کہا۔

"عجب، بھئی۔ آخر ہم کب تک دوڑیں گے؟" خان رحمان نے ہانپتے ہوئے کہا۔

"جب تک ہم ابا جان یا رے راٹا تک نہیں پہنچ جاتے یا پھر تھک کر گر نہیں جاتے۔"

"اگر یہ بات ہے تو میں تو اسی جگہ تھک کر گرنے کے لیے تیار ہوں۔" فاروق نے فوراً کہا۔

"یہ نہ بھولو کہ رے راٹا ہمارے پروفیسر انکل کو اٹھا لے گیا ہے اور ابا جان اس کے پیچھے گئے ہیں۔" فرزانہ جھلا اٹھی۔

"واقعی اس وقت اس سے زیادہ یاد رکھنے کے لائق کوئی بات نہیں۔" خان رحمان نے اس کی تائید کی۔

"لیکن اب ہم میں دوڑنے کی ہمت نہیں رہی۔ یوں لگتا ہے، جیسے ہم اب گرے کہ اب گرے۔" فاروق نے کہا۔

"ہاں، لیکن ہمیں دوڑنا ہو گا۔ گرنے پر بھی اٹھ کر دوڑنا ہو گا۔" محمود کھوئے کھوئے لہجے میں بولا اور فاروق دھم سے گرا، ان کے قدم رک گئے۔

"کیا ہوا فاروق؟" فرزانہ نے گھبرا کر کہا۔

"کک، کچھ نہیں۔ گر کر اٹھ رہا ہوں۔" اس نے واقعی اٹھتے ہوئے کہا۔ انہوں نے دیکھا، اس کا منہ خاک آلود ہو گیا تھا، لیکن اس وقت اتنی فرصت کسے تھی کہ منہ صاف کرنے کی طرف توجہ دیتا۔ وہ پھر بھاگ کھڑے ہوئے۔ اچانک انہوں نے انسپکٹر جمشید کو دیکھا۔ وہ پہاڑ کے دامن میں کھڑے ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ آس پاس کہیں رے راٹا دکھائی نہ دیا۔

وہ بجھ سے گئے۔ دوڑتے ہوئے ان کے قریب پہنچے۔

"تو وہ۔ نکل گیا؟" فرزانہ نے اٹک اٹک کر کہا۔

"ابھی ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ نکل گیا۔ وہ دیکھو، وہ رہا رے راٹا۔"

انہوں نے پہاڑ کی بلندی کی طرف اشارہ کیا۔ سب کی نظریں ایک ساتھ اٹھ گئیں۔ انہوں نے ایک حیرت انگیز منظر دیکھا۔ پروفیسر داؤد کو کمر پر لادے، رے راٹا ایک موٹے رسے کو پکڑ کر اوپر چڑھ رہا تھا۔ رسہ پہاڑ کی چوٹی سے نیچے تک لٹکا ہوا تھا۔ رے راٹا ابھی پہاڑ کے تقریباً نصف تک پہنچا تھا۔

"پھر آپ کیوں رک گئے، کیا ہمارے انتظار میں؟" محمود حیران ہو کر بولا۔

"نہیں، یہاں پہنچ کر میں رکنے پر مجبور ہو گیا تھا، افسوس۔" انہوں نے حسرت زدہ لہجے میں کہا۔

"کیا مطلب؟" وہ چونکے۔

"رے راٹا نے دھمکی دی تھی کہ اگر میں رسے پر چڑھا تو وہ پروفیسر صاحب کو نیچے پھینک دے گا۔"

"اوہ۔" وہ دھک سے رہ گئے۔

"پھر اب ہم کیا کریں گے۔ کیا اپنی آنکھوں کے سامنے پروفیسر صاحب کو اغوا ہوتے دیکھتے رہیں گے؟"

"ہاں، جب تک رے راٹا انہیں لے کر چوٹی پر نہیں پہنچ جاتا

اور ہماری نظروں سے اوجھل نہیں ہو جاتا۔ اس وقت تک ہم کچھ نہیں کر سکتے۔" انہوں نے جواب دیا۔

"لیکن جمشید، اس وقت ہمارے حرکت میں آنے کا بھلا کیا فائدہ ہوگا؟"

"فائدہ شاید نہ ہو — لیکن اس وقت حرکت میں آنے کا مطلب پروفیسر صاحب کی موت ہوگا، کیونکہ وہ رے ماٹا ہے، کوئی عام مجرم نہیں۔ وہ جو کہتا ہے، کر بھی گزرتا ہے۔"

"تو تمہارا پروگرام یہ ہے کہ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو جائے، اس وقت ہم اس رستے پر چڑھنا شروع کریں گے۔"

"ہاں، کیونکہ اس کے علاوہ ہم کچھ بھی تو نہیں کر سکتے۔"

"کیا ہم قصبے تک جا کر ہیلی کاپٹر وغیرہ کا بندوبست نہیں کر سکتے۔" خان رحمان بولے۔

"ضرور کر سکتے ہیں، لیکن یہ تو سوچو، ہم قصبے سے کتنے فاصلے پر ہیں۔ جتنی دیر میں ہم وہاں پہنچیں گے، رے ماٹا غائب ہو چکا ہوگا۔"

"اچھا خیر، مطلب یہ ہوا کہ ہم مجبور ہو کر رہ گئے ہیں۔" انہوں نے کندھے اچکائے۔

"ہاں، خان رحمان، یہی بات ہے — ان لوگوں نے بہت سوچ سمجھ کر منصوبہ ترتیب دیا ہے۔ ایک ہی وقت میں بڑے بڑے عالمی جاسوس اس کام پر مقرر کیے ہیں اور میں تو حیران ہوں — ہمارے سائنس دان کہاں جمع کیے گئے تھے اور وہاں چھ ماہ تک وہ کیا کرتے رہے ہیں۔"

"یہ بات تو پروفیسر انکل بھی نہیں بتا سکتے۔" فاروق نے منہ بنایا —

"ہوں، خیر دیکھا جائے گا۔" انہوں نے کہا اور رے ماٹا پر نظریں جما دیں — وہ برابر اوپر چڑھ رہا تھا اور ساتھ ساتھ نیچے بھی دیکھتا جا رہا تھا کہ کہیں انہوں نے چڑھنا تو شروع نہیں کر دیا — شاید وہ ان کی بے بسی پر ہنس بھی رہا ہوگا۔ شاید اس لیے کہ اس کا چہرہ انہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ اب تو جسم بھی بہت ننھا سا نظر آ رہا تھا اور اس کی کمر پر لدے پروفیسر داؤد تو ایسے نظر آ رہے تھے، جیسے رے ماٹا نے کوئی گٹھڑی کمر پر لاد رکھی ہو۔

آدھ گھنٹے بعد رے ماٹا انہیں چوٹی پر لیٹا نظر آیا — وہ اب بھی کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ آخر رے ماٹا ایک بار پھر اٹھا اور انہیں کمر پر لادتا نظر آیا — ایک منٹ بعد وہ ان کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

"آؤ بھئی، اب ہماری باری ہے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"چلیے ہم تو پہلے ہی بری طرح بے تاب ہیں۔" محمود بولا۔

"ویسے ابا جان، یہ رے ماٹا ہے عقل مند، جاتے ہوئے رستہ کاٹ بھی تو سکتا تھا۔"

"رسہ کاٹنے میں بھی کچھ وقت لگتا اور شاید وہ وقت ضائع کرنے کا عادی نہیں۔ دوسرے یہ کہ اسے ہماری طرف سے کوئی خطرہ بھی نہیں ہے، آؤ۔"

یہ کہہ کر انسپکٹر جمشید رسے کو پکڑ کر پہاڑ پر چڑھنے لگے۔

"چلیے انکل۔" محمود بولا۔

"بھئی، بہتر تو یہ ہوگا کہ تم تینوں مجھ سے اوپر رہو۔ اگر تم میں سے کوئی گرنے لگا تو میں سنبھال تو لوں گا۔"

"جیسے آپ کی مرضی — ویسے ہمارا گر پڑنے کا کوئی پروگرام نہیں۔" فاروق بولا۔

"وہ تو خیر ٹھیک ہے۔ کبھی کبھی آدمی کو پروگرام کے خلاف بھی چلنا پڑ جاتا ہے۔" جواب میں خان رحمان بھی مسکرائے۔

آخر انسپکٹر جمشید کے پیچھے محمود پھر فاروق اور فرزانہ چڑھنے لگے۔ فرزانہ کے بعد خان رحمان حرکت میں آئے۔

"ویسے مہم ہے زور دار اس بار کی۔" خان رحمان بولے۔

"اگر ہم پروفیسر انکل کو نہ چھڑا سکے تو یہ خاک بھی زور دار نہیں رہ جائے گی۔" فاروق نے منہ بنایا۔

انسپکٹر جمشید کافی تیزی دکھا رہے تھے — جلد ہی انہوں نے ان چاروں کو کافی پیچھے چھوڑ دیا۔

"بھئی جمشید، ہم اس قدر تیز نہیں چل سکتے۔"

"اور میں بھی مجبور ہوں۔ اس سے کم رفتار سے اوپر نہیں چڑھ سکتا، کیونکہ معاملہ پروفیسر داؤد کا ہے۔"

"اچھا خیر، ہم بھی کوشش کرتے ہیں۔" انہوں نے تیز تیز ہاتھ چلانے شروع کیے اور درمیانی فاصلہ قدرے کم ہو گیا۔ ایسے میں انہوں نے چوٹی کی طرف دیکھا اور دم بخود رہ گئے۔

چوٹی پر چار آدمی کھڑے ان کی طرف طنز بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

☆ ☆ ☆

"ابا جان، آپ دیکھ رہے ہیں، چوٹی پر چار دشمن موجود ہیں۔"

"ہاں، دیکھ رہا ہوں — رے ماٹا سے مقابلہ ہو تو ہر قدم پر خطرات کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ میں پہلے ہی سوچ رہا تھا، وہ رسہ کاٹے بغیر نظروں سے اوجھل کیوں ہو گیا — اب اس کی چال سمجھ میں آئی۔ ہم پہاڑ کے تقریباً درمیان میں پہنچ گئے تو اس کے آدمی نظر آئے ہیں اور اب یہ ہم پر حملہ بھی کریں گے۔"

"اف خدا، رسے پر حملہ۔" فاروق بولا۔

"رسے پر نہیں، ہم پر۔" وہ بولے۔

"لیکن ہم بھی تو اس وقت رسے پر ہیں۔"

اچانک ایک چھوٹا سا پتھر اوپر سے پھینکا گیا۔ فرزانہ چلا اٹھی۔

"ابا جان بچیے۔"

انہوں نے فوراً اوپر دیکھا اور پھر ایک ہاتھ رسے پر سے ہٹا لیا، جوں ہی پتھر ان کے نزدیک آیا، انہوں نے اسے ہاتھ سے پرے دھکیل دیا اور وہ ان سے ہٹ کر نیچے کی طرف سفر کرنے

لگا۔ ایسا کرنے پر ان کے ہاتھ کو زبردست چوٹ آئی، لیکن اس کے سوا وہ کر بھی کیا سکتے تھے۔ اسے سر یا جسم کے کسی اور حصے پر تو وصول کر نہیں سکتے تھے۔

"محمود، جوتے کی ایڑی میں سے اپنا چاقو نکالو" انہوں نے پرسکون آواز میں کہا۔

"جی بہتر" اس نے کہا۔ رسے کو ایک ہاتھ سے تھاما اور ایڑی میں سے چاقو نکالنے لگا۔ ایسے میں اس کی نظر نیچے جا پڑی۔ سیکڑوں فٹ کی گہرائی دیکھ کر ایک بار تو اس کے جسم میں سنسناہٹ دوڑ گئی اور جان نکلتی محسوس ہوئی، پھر اس نے جلدی سے نظریں ہٹالیں۔

"جلدی کرو محمود، ایک اور پتھر آ رہا ہے" انسپکٹر جمشید چلائے۔

"یہ لیجیے" اس نے کہا اور چاقو ان کی طرف بڑھا دیا۔ انہوں نے جھک کر چاقو لے لیا۔ اس کی بٹن دبائی تو پھل نکل آیا۔

"لیکن ابا جان، بھلا اس چاقو سے آپ پتھر کو کس طرح روک سکیں گے" فاروق حیران ہو کر بولا۔

اسی وقت پتھر ان کے سر پر پہنچ گیا۔ انہوں نے فوراً چاقو کی نوک پتھر کی سیدھ میں کر دی۔ پتھر چاقو کی نوک پر گرا اور ایک طرف لڑھک گیا۔ انسپکٹر جمشید نے اسے بہت مہارت سے پرے پھینکا تھا۔ اوپر کھڑے دشمنوں نے بھی اپنے پتھر کو ناکام ہوتے دیکھا تو ان میں سے ایک بولا:

"یوں کام نہیں چلے گا۔ یہ لوگ بہت چالاک ہیں۔ میں انہیں روکتا ہوں" اس کی آواز ہوا کے دوش پر ان کے کانوں سے ٹکرائی۔

"اف اللہ، اب ہمیں رسے پر لڑنا ہوگا" فرزانہ کانپ اٹھی۔

"اوپر سے آنے والا دشمن دونوں پیر استعمال کر سکتا ہے۔ جب کہ نیچے سے اوپر جانے والا صرف ایک ہاتھ سے کچھ کام لے سکتا ہے" محمود نے کانپتی آواز میں کہا۔

اتنے میں ایک دشمن رسے پر تیزی سے سرکتا نظر آیا۔

"دیکھیے ابا جان، ایک آ رہا ہے" محمود نے بلند آواز میں کہا۔

"اللہ مالک ہے" انسپکٹر جمشید پرسکون آواز میں بولے۔

اوپر سے آنے والا اچانک رک گیا۔ شاید وہ درمیانی فاصلہ دیکھنا چاہتا تھا۔ اندازہ لگا کر وہ پھر تیر کی طرح نیچے آنے لگا اور ان کے ہاتھوں کے اوپر آ رکا۔ وہ پہلے ہی رسہ ایک ہاتھ سے سنبھالے ہوئے تھے۔ دوسرے ہاتھ میں محمود کا چاقو موجود تھا۔ دشمن نے بھی ان کے ہاتھ میں چاقو دیکھ لیا۔ وہ بے رحمی سے مسکرایا اور اپنے جوتے کا تلا ان کی طرف کر دیا۔ انہوں نے دیکھا، جوتے میں عجیب قسم کی میخیں سی لگی ہوئی تھیں۔ ان کے نوک دار سرے اوپر کی طرف تھے؛ گویا وہ ان خوف ناک جوتوں سے ان پر خوف طاری کر دینا چاہتا تھا، لیکن انسپکٹر جمشید نے بھلا خوف زدہ ہونا کب سیکھا تھا۔ وہ پوری طرح تیار تھے۔ دشمن نے چند سیکنڈ کے لی[...] حملے کا پہلو سوچا اور پھر اس کا ایک جوتا ان کے اس ہاتھ [...] طرف بڑھا، جس سے انہوں نے رسے کو پکڑ رکھا تھا؛ گویا وہ چا[...] تھا، ان کے اس ہاتھ کو بھی رسے پر سے ہٹا دے اور وہ سید[...] نیچے جا گریں۔ جوں ہی جوتا ان کے ہاتھ کی طرف آیا، انہوں [...] دوسرے ہاتھ میں پکڑا چاقو اس کی پنڈلی پر دے مارا۔ اس [...] پہلے کہ جوتا ان کے ہاتھ سے ٹکراتا، چاقو اس کی پنڈلی میں ا[...] گیا، بس پھر کیا تھا، ایک دل دوز چیخ اس کے حلق سے نکلی اور نیچے جاتا نظر آیا۔

پہاڑوں نے اس کی چیخ کو لوٹایا اور وہ کئی سیکنڈ تک گو[...] سنتے رہے۔ اوپر کھڑے اس کے ساتھی اس منظر کو پتھرائی ہو[...] آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ ان پر گویا سکتے کی حالت طاری ہو[...] ادھر وہ بھی اوپر چڑھنا بھول گئے تھے۔ لاش ابھی تک پہاڑ [...] سے ٹکراتی نیچے جا رہی تھی۔

"اف خدا، نیچے پہنچتے پہنچتے تو اس کی ہڈیاں سرمہ ہو جائیں" فرزانہ نے تھر تھر کانپتی آواز میں کہا۔

"اور گوشت کا قیمہ بن جائے گا" فاروق بولا۔

"اور اوپر سے دوسرا آ رہا ہے" محمود نے گویا خبردار [...] انہوں نے چونک کر اوپر دیکھا۔

"کوئی پروا نہیں، میں ان سے نبٹ لوں گا" انسپکٹر جم[...] بولے۔

دوسرا طوفانی انداز میں نیچے آ رہا تھا۔ اس نے رکنے [...] بھی کوشش نہیں کی اور سیدھا ان کے رسے والے ہاتھ پر کر رکا۔ ایک بار تو ان کا ہاتھ رسے پر سے ہٹتے ہٹتے بچا۔ جوتے کی میخیں ان کے ہاتھ کی پشت میں دھنستی چلی گئیں۔ انہیں یوں لگا جیسے ان کی جان نکلتی جا رہی ہو؛ تاہم انہوں سنبھل کر اس کی کمر پر وار کیا۔ چاقو اس کی ریڑھ کی ہڈی کاٹتا چلا گیا۔ اس کے ہاتھ رسے پر سے اکھڑ گئے۔ منہ سے [...] والی چیخ دل دوز تھی؛ تاہم اس کے ہاتھ مکمل طور پر رسے سے ہٹے۔ وہ ان کے اوپر سے پھسلتا نیچے کی طرف چلا۔ اچانک ا[...] کے ہاتھ میں محمود کا پیر آ گیا۔ محمود کو ایک زبردست جھٹکا [...] ایک ہاتھ سے تو رسہ نکل ہی گیا۔ دوسرا ہاتھ بھی اس نے مشکل سے رسے پر جمائے رکھا اور پھر پہلا ہاتھ بھی جما دیا، [...] اب وہ سخت مشکل میں تھا۔ زخمی دشمن نے دونوں ہاتھ مضبوط[...] اس کے ٹخنے پر جما دیے تھے اور اب وہ اس کے پاؤں سے لٹک رہا تھا۔ محمود اپنے جسم کے علاوہ اس کے جسم کا سارا بوجھ سنبھالے ہوئے تھا اور یہ ان کی زندگی کے خطرناک ترین ہولناک ترین لمحات تھے۔

"تم، میں — میں چلاتے" محمود پھنسی پھنسی آواز میں بو[...]

"ہمت نہ ہارو محمود، فاروق تم اس کی کمر پر وار کرو۔ اس جگہ جہاں سے یہ زخمی ہے" انسپکٹر جمشید چلائے۔ کیونکہ محمود کی مدد اس وقت ان میں سے صرف فاروق ہی کر سکتا تھا۔ اشارا ملتے ہی فاروق نے رسہ ایک ہاتھ میں پکڑا اور دوسرے ہاتھ کا مکا دشمن کی کمر پر دیا، پھر تابڑ توڑ مارتا چلا گیا۔ وہ محمود کے عین نیچے تھا، لہذا اس کا ہاتھ اس کی کمر پر آسانی سے جا رہا تھا۔ ایسے میں نیچے سے فرزانہ نے حرکت کی اور کچھ اوپر چڑھ آئی، لیکن اس سے پہلے کہ وہ فاروق کے لیے کچھ کر سکتی۔ محمود کا رسے والا ہاتھ ڈھیلا پڑ گیا اور وہ نیچے سرکنے لگا۔

"سنبھلو، محمود سنبھلو" فاروق چلایا اور مکا اور تیزی سے چلانے لگا۔ وہ کم بخت بھی محمود کی ٹانگ سے جونک کی طرح چمٹ کر رہ گیا تھا۔ فاروق کا ہاتھ اس کے خون میں لت پت ہو گیا تھا۔ اس کا خون یوں بھی قطرات کی صورت میں نیچے گر رہا تھا۔ اور اب تک فاروق، فرزانہ اور خان رحمان کے کپڑے رنگ چکا تھا۔

اچانک فرزانہ کو ایک ترکیب سوجھی۔ وہ چلائی:

"ابا جان، آپ چاقو محمود کے ہاتھ میں دے دیں۔ محمود جھک کر اپنے ٹخنے کے پاس دشمن کے ہاتھوں پر وار کر کے اس مصیبت سے نجات حاصل کر سکتا ہے"

"اوہ ہاں، کاش تم نے یہ ترکیب پہلے ہی بتا دی ہوتی" انہوں نے چونک کر کہا اور جھک کر چاقو محمود کے ہاتھ کی طرف بڑھایا

"لو محمود، ہمت کرو۔ چاقو سنبھال لو اور اس سے دشمن کے ہاتھوں پر وار کرو۔ ایک ہی وار کافی ہوگا"

"ج، جی اچھا" اس نے کہا اور چاقو لے لیا۔ اب تقاضا یہ تھا کہ چاقو لینے کے لیے اسے ایک ہاتھ رسے پر سے ہٹانا پڑا تھا۔ دوسرے ہاتھ سے گویا وہ نہ صرف لٹک رہا تھا، بلکہ اس کے جسم سے لٹکا ہوا دشمن بھی لٹک رہا تھا۔ اسے اپنا بازو ٹوٹتا محسوس ہوا، لیکن رسے پر سے بازو ہٹا لینے کا مطلب سو فی صد موت تھا۔ وہ جھکا ہی تھا کہ فرزانہ کی نظر پہاڑ کی چوٹی پر پڑی اور کانپ کر رہ گئی۔ تیسرا آدمی رسے پر پھسل رہا تھا اور اس کے والد تک پہنچنا ہی چاہتا تھا۔ جب کہ ان کا ایک ہاتھ پہلے ہی زخمی ہو چکا تھا اور اب ان کے پاس چاقو بھی نہیں تھا۔ اس نے چند سیکنڈ کے لیے سوچا کہ کیا کرے۔ اپنے والد کو خبردار کرے یا نہ، کیونکہ ان کی بھی توجہ اس وقت محمود کی طرف تھی۔ اس نے سوچا، اگر اس نے انہیں خبردار کرنے کے لیے منہ سے آواز نکالی تو محمود بوکھلا جائے گا اور اسی بوکھلاہٹ میں کہیں اس کا ہاتھ رسے پر سے نہ ہٹ جائے، لہذا اس نے ہونٹ بھینچ لیے، کیونکہ اس کے والد کی نسبت بہر حال محمود زیادہ نازک پوزیشن میں تھا۔۔۔ عین اسی لمحے جب کہ تیسرا دشمن ان کے سر پر پہنچا، محمود نے چاقو کا وار دشمن کے ہاتھوں پر کر دیا۔۔۔ ایک اور چیخ اس کے منہ سے نکل گئی اور ہاتھ محمود کے پیر پر سے ہٹ گئے اور وہ نیچے کی طرف چلا۔ اس کی چیخ لہراتی چلی گئی۔ ساتھ ہی فرزانہ چلائی:

"ابا جان، پیچھے"

انہوں نے جلدی سے اوپر دیکھا۔۔۔ دشمن اپنا خونی جوتا اٹھا کر ان کے ہاتھ پر مار چکا تھا۔ وہ یک لخت کچھ نیچے کھسک آئے اور اس طرح اس کے وار سے بچ سکے، لیکن فوراً ہی ان پر پھر وار کیا گیا۔۔۔ مشکل یہ تھی کہ چاقو ان کے پاس نہیں تھا۔ اس مرتبہ جو وار کیا گیا، وہ صرف دو تین انچ نیچے کھسک آئے اور اپنا ہاتھ اس کے اٹھے ہوئے پاؤں پر ڈال دیا۔ گھٹنے کے پاس سے پاؤں پکڑتے ہی پوری طاقت سے جو مروڑا، وہ چکر کھا گیا اور سنبھل نہ سکا۔ اس کے ہاتھوں سے رسہ نکل گیا اور وہ بھی نیچے گرتا چلا گیا۔

انہوں نے قدرے سکون کا سانس لیا۔۔۔ اوپر دیکھا، چوٹی پر اب ایک دشمن رہ گیا تھا۔ وہ ساکت آنکھوں سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اپنے تین ساتھیوں کا انجام دیکھ چکا تھا اور شاید سوچ رہا تھا کہ اب کیا کرے۔ یہ چیز بھانپ کر انسپکٹر جمشید بولے:

"آؤ بھئی، تم بھی آؤ۔۔۔ سوچ کیا رہے ہو"

"وہ تینوں بے وقوف تھے، میں بے وقوف نہیں ہوں"

اس نے اوپر سے جواب دیا۔

"کیا مطلب؟"

"میں نے ان سے کہا تھا، ہم چوٹی پر رہ کر تم لوگوں کو نہایت آسانی سے روک سکیں گے، بلکہ نیچے بھی گرا دیں گے لیکن انہوں نے میری بات نہ مانی اور رسے پر اترنا شروع کر دیا۔ اب میں تمہارے استقبال کے لیے اوپر موجود ہوں اور یہیں رہوں گا۔ چلے آؤ موت کے منہ میں"

ان کے جسموں میں سنسنی دوڑ گئی۔۔۔ وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ چوٹی پر رہ کر وہ چاروں ان کے لیے حد درجے خوفناک ثابت ہو سکتے تھے۔۔۔ انہوں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ چار میں سے اب صرف ایک چوٹی پر موجود تھا۔

"محمود، چاقو مجھے دے دو، کیونکہ سب سے پہلے اس سے مجھے ہی استقبال کروانا ہوگا" انسپکٹر جمشید مسکرا کر بولے۔

محمود نے چاقو انہیں دے دیا۔۔۔ زخمی ہاتھ کی وجہ سے انسپکٹر جمشید بھی کمزوری محسوس کر رہے تھے۔۔۔ محمود کی حالت اور بھی ردی تھی۔ اس جنگ نے اس کے کس بل بھی ڈھیلے کر دیے تھے۔ لیکن اب وہ اوپر چڑھنے کے علاوہ کچھ کر بھی تو نہیں سکتے تھے! چنانچہ اوپر چڑھنے کا عمل جاری رہا۔۔۔ یہاں تک کہ انسپکٹر جمشید چوٹی کے نزدیک پہنچ گئے۔

"تو تم اوپر تک آ ہی گئے دوستو، اب میں تم سے اپنے تینوں ساتھیوں کا انتقام لوں گا۔ تمہارا حال بھی ان سے مختلف نہیں ہوگا" یہ کہہ کر وہ چوٹی پر الٹا لیٹ گیا۔۔۔ انہوں نے دیکھا، اس کے دائیں ہاتھ میں ایک نوکیلا پتھر تھا۔

"اس نوک دار پتھر کو دیکھ رہے ہو۔ یہ خنجر سے بھی زیادہ کام

کہے گا۔"

"دیکھا جائے گا" انسپکٹر جمشید سنجیدہ لہجے میں بولے۔ ساتھ ہی انہوں نے سر ابھارا، لیکن نوکیلا پتھر اپنی طرف آتے دیکھ کر یک دم سر نیچے کر لیا اور چاقو والا ہاتھ لہرایا۔ وہ بلا کی پھرتی سے وار بچا گیا اور ان کے چاقو والے ہاتھ پر پتھر مارنے کی کوشش کی۔ پتھر چاقو کی نوک سے ٹکرایا۔ اس میں سے چنگاریاں سی نکلیں اور پتھر دو ٹکڑے ہو گیا۔ دونوں ٹکڑے اس کے ہاتھ سے نکل گئے۔ ساتھ ہی انسپکٹر جمشید نے چاقو کا وار اس کی گردن پر کیا۔ دوسرے ہی لمحے اس کی گردن سے خون کا فوارہ سا نکلا اور وہ چوٹی پر تڑپنے لگا۔ انسپکٹر جمشید فوراً چوٹی پر چڑھ گئے۔ ان کے بعد باقی چاروں نے بھی دیر نہ لگائی۔ چوٹی پر کافی طویل و عریض ہموار جگہ تھی۔ دشمن ابھی تک تڑپ رہا تھا۔ آخر دو منٹ بعد وہ ساکت ہو گیا۔ اس کے جسم سے نکلنے والے خون سے بچنے کے لیے وہ قدرے پیچھے ہٹ آئے اور رسے راڈما کی تلاش میں نظریں دوڑانے لگے۔ رسہ اسی جگہ لوہے کے ایک کھونٹے سے باندھا گیا تھا اور وہ دوسری طرف بھی جا رہا تھا۔ انہوں نے اس طرف جھک کر دیکھا اور حیرت زدہ رہ گئے۔ دوسری طرف گہرائی میں انہیں سمندر نظر آیا۔ رسہ سمندر تک چلا گیا تھا، لیکن سمندر میں اس وقت کوئی لانچ یا کشتی نہیں تھی؛ گویا رسے راڈما رسے کے ذریعے اتر کر سمندر میں کھڑی لانچ پر بیٹھ کر جا چکا تھا۔

وہ سکتے میں آ گئے۔ اس قدر زبردست جدوجہد کے باوجود پروفیسر صاحب ان سے بہت دور تھے، بلکہ نہ جانے کہاں تھے۔

"اب کیا کیا جائے جمشید" خان رحمان بڑبڑائے۔

"ہم اس طرف اتریں گے خان رحمان، اس کے سوا اور کر بھی کیا سکتے ہیں۔"

"لیکن سوال تو یہ ہے، اتر کر کریں گے کیا۔ سمندر میں تیر کر تو ہم رسے راڈما تک نہیں پہنچ سکتے۔"

"اور ہم چوٹی پر رک کر بھی تو کچھ نہیں کر سکتے۔ واپس اپنے ملک کی طرف اتر کر ہم پروفیسر صاحب سے اور بھی دور ہو جائیں گے۔"

"ہوں۔ خیر جیسے تمہاری مرضی۔"

"اس طرف اترنے میں فی الحال کوئی فائدہ تو نظر نہیں آ رہا" فرزانہ بول اٹھی۔

"پھر تم ہی بتاؤ۔ فائدہ اس وقت کس بات میں نظر آ رہا ہے" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"ہاں، یہ بھی ٹھیک ہے۔ تینوں صورتیں ہی ایک جیسی ہیں۔ بلکہ نسبتاً یہ بہتر ہے کہ ہم بھی اسی طرف چلیں، جس طرف رسے راڈما گیا ہے۔ کیا خبر اس سے ٹکراؤ ہو ہی جائے۔"

چند منٹ سانس لے کر وہ رسے پر سے پھسلنے لگے۔ یہ کام بھی اتنا آسان نہیں تھا۔ ان میں سے اگر کسی کا ہاتھ رسے پر سے ہٹ جاتا تو وہ سیکڑوں فٹ نیچے بہنے والے سمندر میں جا گرتا۔

وہ پوری احتیاط سے سرکتے رہے۔ واپسی کے سفر میں انہیں کسی خطرے کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ یہاں تک کہ نیچے پہنچ گئے۔ سمندر پہاڑ سے پوری قوت سے ٹکرا رہا تھا۔ گویا دو بڑی طاقتیں ایک دوسرے کے سامنے ڈٹی ہوئی تھیں۔ دور دور تک کوئی کشتی یا جہاز نظر نہیں آ رہا تھا۔ نزدیک ہی ایک چٹان نظر آئی۔ کم از کم وہ اس چٹان پر کھڑے ہو کر سمندر کی موجوں سے محفوظ رہ سکتے تھے، لیکن چٹان رسے سے کچھ فاصلے پر تھی اور اس تک پہنچنے کے لیے بھی انہیں تیرنا پڑتا؛ چنانچہ یہ بھی کرنا پڑا۔ چاند کی روشنی میں انہوں نے رسے کو چھوڑا اور پانی میں کود گئے۔ زخموں کو نمکین پانی چھوا تو بس مزا ہی آ گیا۔ کوئی اور ہوتا تو اس تکلیف کو برداشت نہ کر پاتا اور سمندر میں بہہ جاتا، لیکن وہ وقت کے عجیب ترین انسان تھے۔ جلد ہی چٹان پر کھڑے نظر آئے۔

"اس چٹان پر رات گزارنا کس قدر عجیب ہو گا جمشید" خان رحمان کھوئے کھوئے لہجے میں بولے۔

"ہاں، وہ بھی بھوکے پیاسے۔ ہمیں تو ہوٹل آبان میں پہنچ کر ان لوگوں نے کھانا کھانے کی بھی مہلت نہیں دی" فاروق نے سرد آہ بھری۔

"فکر نہ کرو۔ میں یہاں تمہارے لیے مچھلیوں کا بندوبست کر دوں گا" انسپکٹر جمشید بولے۔

"جی، وہ کیسے، بھلا ہمارے پاس مچھلیاں پکڑنے کا سامان کہاں" محمود حیران ہو کر بولا۔

"اور ہم انہیں بھونیں گے کیسے۔ یہاں آگ کس طرح جلے گی" فرزانہ بھی چپ نہ رہ سکی۔

"عقل سے کام لے کر، تم فکر نہ کرو۔ جب بھوک لگے، بتا دینا۔ میں تازہ تازہ مچھلیاں تمہارے لیے حاضر کر دوں گا" انہوں نے مسکرا کر کہا۔

"کیا آپ مذاق کے موڈ میں ہیں ابا جان" فاروق نے ان کی طرف بغور دیکھا۔

"نہیں بھئی، اس میں مذاق کی کیا بات ہے۔ یوں بھی یہ مذاق کا وقت نہیں" وہ بولے۔

"تو پھر ذرا وضاحت تو کر دیں، کیونکہ میرے خیال میں یہ تو ہو سکتا ہے، آپ کسی طرح مچھلیاں پکڑ لیں، لیکن بھون لینے کا کوئی امکان نظر نہیں آتا، کیونکہ یہاں گھاس پھونس اور پتھر وغیرہ کچھ بھی تو نہیں ہے۔"

"انسان کے پاس عقل ہونی چاہیے اور بس" انسپکٹر جمشید نے کہا۔

"مارے حیرت کے ہمارا برا حال ہے۔ مہربانی فرما کر وضاحت کر دیں"

"اچھا تو سنو، میں سمندر میں اتر کر اس چاقو کی مدد سے مچھلیوں کو شکار کر سکتا ہوں۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں۔ مچھلیوں

کی چکنائی نکال کر اپنے رومالوں کو اس چکنائی میں بھگو کر خان رحمان کے لائٹر سے ان رومالوں کو آگ دکھا دوں گا اور اس آگ پر مچھلی بھون لوں گا۔ کہو کیسی رہی؟"

"لیکن انکل کے پاس لائٹر کیوں ہونے لگا؟" فرزانہ حیران ہو کر بولی۔ حیران اس بات پر ہو رہی تھی کہ ان کے والد نے ایک بالکل ناممکن سی بات کو آسانی سے ممکن بنا دیا تھا۔

"یہ کسی زمانے میں سگار پیتے تھے۔ پھر میرے کہنے پر چھوڑ دیئے لیکن شوقیہ طور پر لائٹر ضرور اپنے پاس رکھتے ہیں۔ شاید اسی کو کہتے ہیں، چور چوری چھوڑ سکتا ہے، ہیرا پھیری نہیں چھوڑ سکتا۔"

"ہائیں جمشید، تم مجھے چور کہہ رہے ہو۔" وہ بھی اس عجیب ترین مقام پر۔" خان رحمان بول اٹھے اور وہ مسکرانے لگے۔

"خیر ابا جان، ہم صبح تک کا وقت تو آسانی سے گزار سکتے ہیں۔"

"کیوں نہ پہلے ہم اس چٹان پر نماز ادا کر لیں۔ ہم نے ابھی تک عشاء کی نماز نہیں پڑھی۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"اس سے اچھی بات بھلا کیا ہو سکتی ہے۔" خان رحمان خوش ہو کر بولے

انہوں نے سمندر کے پانی سے وضو کیا اور خدا کے حضور سجدے میں گر گئے۔ نماز سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ اچھل پڑے۔ ایک لانچ چٹان کے دوسری طرف بندھی ہوئی تھی۔

☆ ☆ ☆

"لیجیے ابا جان! ادھر ہم نے اللہ کی عبادت کی، ادھر اس نے ہمارے لیے ایک عدد کشتی بھیج دی۔" فاروق خوش ہو کر بولا۔

"ہاں! تم نے ٹھیک کہا۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"میرے خیال میں یہ کشتی ان لوگوں کے لیے یہاں چھوڑ دی گئی۔ جو ہم سے نبٹنے کے لیے پہاڑ کی چوٹی پر چھوڑ دیئے گئے تھے۔ اب یہ ہمارے کام آئے گی۔" خان رحمان نے کہا۔

"ہاں۔ آؤ چلیں۔ نہ جانے ریے راٹا پروفیسر صاحب کو کہاں لے گیا ہو گا۔" انسپکٹر جمشید کا لہجہ فکر میں ڈوبا ہوا تھا۔

چکر کاٹ کر وہ لانچ تک پہنچے اور اس میں سوار ہو گئے۔ انسپکٹر جمشید کو لانچ چلانے کا تجربہ تھا، لہٰذا انہیں کوئی دشواری نہیں ہوئی، لیکن یہ الجھن ضرور پیش آئی کہ جائیں کس طرف۔

"جمشید۔ ان پہاڑوں کے مخالف سمت چلتے چلتے ہیں۔ مجھے ایسا نظر آ رہا ہے، جیسے اس طرف بھی آگے کچھ پہاڑ ہیں۔"

"خیر یونہی سہی۔"

انہوں نے کہا اور لانچ اس پہاڑ کے مخالف سمت میں چلانے لگے جس سے اتر کر وہ سمندر تک پہنچے تھے۔

"اس وقت تک ریے راٹا اپنے مقصد میں کامیاب رہا ہے، ہم اس کے آدمیوں کو شکست دینے میں ضرور کامیاب ہو گئے ہیں۔" فرزانہ بڑبڑائی۔

"اس نے جال بھی تو عجیب و غریب بچھایا تھا۔ پروفیسر صاحب سنبھل ہی نہ سکے۔ اگر وہ دارالحکومت میں ہی ساری باتیں بتا دیتے تو ہم ضرور بھانپ جاتے کہ یہ جال ہے۔" محمود بولا۔

"سوال یہ ہے کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں۔ اب ہم اپنے ملک کی حدود سے نکل چکے ہیں۔" خان رحمان نے کہا۔

"ہاں! ان پہاڑوں کے اس طرف ہمارا ملک نہیں ہے۔"

"گویا ہمیں کسی وقت بھی سرحدی حدود کی خلاف ورزی کے جرم میں گرفتار کیا جا سکتا ہے۔"

"اللہ مالک ہے۔ اب ہم پروفیسر صاحب کے بغیر تو جا نہیں سکتے۔"

جلد ہی انہیں پہاڑی علاقہ نظر آنے لگا۔ لیکن یہ پہاڑ زیادہ اونچے نہیں تھے۔ لانچ جونہی ساحل پر پہنچی، وہ اتر پڑے، اسے ایک پتھر کے ساتھ باندھا اور آگے بڑھے۔ نیچے پہاڑوں کے دوسری طرف کافی دور انہیں آبادی کے آثار نظر آئے۔

"ہم۔ آبادی کا رخ نہیں کر سکتے۔" فرزانہ ہکلائی۔

"لیکن جب تک ہم آبادی کا رخ نہیں کریں گے۔ پروفیسر صاحب کو کس طرح تلاش کر سکیں گے۔" محمود نے جل بھن کر کہا۔

"تب پھر کام ایسا ہونا چاہیے کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔" فاروق مسکرایا۔

"ایسا کام بھی تم ہی بتا دو۔" فرزانہ نے اسے گھورا۔

"ترکیبیں بتانا تمہارا کام ہے، نہ کہ میرا۔" فاروق نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔ ہمیں اپنے حلیوں کو کسی قدر بدلنا ہو گا۔ لباس بھی مقامی پہننے ہوں گے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"لیکن کیسے۔ ہم یہاں کے لباس کس طرح حاصل کریں گے؟"

"یہ کام اتنا مشکل بھی نہیں۔ بس تم تینوں جاؤ اور کسی آدمی کا بٹوہ اڑا لاؤ۔"

"جی کیا فرمایا۔ بٹوہ اڑا لائیں۔" فاروق نے بوکھلا کر کہا۔

"ہاں! اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ مقامی کرنسی کے بغیر ہم کوئی چیز بھی نہیں خرید سکتے۔ نہ کچھ کھا پی سکتے ہیں، نہ پروفیسر صاحب کو تلاش کر سکتے ہیں۔"

"جی، بات تو ٹھیک ہے۔ لیکن ابا جان۔ آپ نے یہ بھی سوچا۔ اگر ہم پکڑے گئے تو بس پکڑے ہی جائیں گے۔" فرزانہ نے

کہا۔۔

"ہاں! یہ تو ہے، لیکن تم ہی بتاؤ۔ اور ہم کیا کر سکتے ہیں؟" انہوں نے پوچھا۔

"ہم۔ ہم کیا کر سکتے ہیں۔ کیوں فاروق۔ ہم اس موقع پر بھلا کیا کر سکتے ہیں؟"

"یہ۔ یہ تم مجھ سے پوچھ رہی ہو۔ ہوش میں تو ہو؟" فاروق نے بوکھلا کر کہا۔

"لیجیے، ان سے پوچھنے کے لیے بے ہوش ہونا بھی ضروری ہے؟" فرزانہ نے کندھے اچکائے۔

"کچھ نہیں۔ اس کے علاوہ کوئی ترکیب نہیں ہو سکتی۔ ہمیں یہ کام کرنا ہی ہو گا۔" انسپکٹر جمشید نے منہ بنایا۔

"بہت بہتر۔ آپ ہمیں کہاں ملیں گے؟"

"یہی جگہ مناسب ہے، کیونکہ ہم اس جگہ لانچ سے بہت قریب ہیں۔ خطرے کی صورت میں سمندر کا رُخ کریں گے۔"

"ہاں۔ لیکن ابا جان۔ ہمارے بغیر نہ کر لیجیے گا۔" فاروق نے معصومانہ انداز میں کہا۔

"نہیں۔ فکر نہ کرو۔" خان رحمان مسکرائے۔

"اچھا تو پھر خدا حافظ۔ ہمارے لیے دُعا کیجیے گا کہ ہم چوری کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔" فاروق بولا۔

"اور میرا خیال ہے۔ آپ نے اتنی عجیب و غریب دُعا کبھی نہیں مانگی ہو گی۔" محمود مسکرایا۔

"ہاں۔ شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔ خیر ہم دونوں تمہاری کامیابی کی دُعا کریں گے۔ اب جاؤ۔"

تینوں وہاں سے آگے بڑھے۔ ابھی دو منٹ ہی چلے ہوں گے کہ محمود رُک گیا:

"اب کیا ہوا۔ کہیں پیچھے مڑ کر تو نہیں دیکھ لیا۔" فاروق نے پھاڑ کھانے والے لہجے میں کہا۔

"یہ جادوئی دیس نہیں ہے۔ میں سوچ رہا ہوں۔ کیوں نہ ہم الگ الگ چلیں۔"

"الگ الگ، کیا مطلب؟" فرزانہ چونکی۔

"بھئی الگ الگ کا مطلب تو بس الگ الگ ہی ہو سکتا ہے۔"

"دیکھو نا۔ اگر ہم پھنس گئے تو تینوں پھنسیں گے، لیکن اگر الگ الگ گئے تو کم از کم تینوں تو ہرگز نہیں پھنسیں گے۔ ہم میں سے ایک دو تو کامیاب لوٹیں گے ہی اور اس صورت میں ابا جان اور انکل کچھ کر ہی گزریں گے۔"

"ترکیب میں وزن ہے۔" محمود نے سر ہلایا۔

"ترکیبوں میں ہی کیا، اس کی تو ہر بات میں وزن ہوتا ہے۔ پتا نہیں یہ اتنا وزن کس طرح برداشت کر لیتی ہے۔" فاروق نے جھنائے ہوئے انداز میں کہا۔

"چلیے جلنے کیوں جا رہے ہو۔ کچھ وزن تم اٹھا لو۔" فرزانہ نے شوخ لہجے میں کہا اور محمود مسکرائے بغیر نہ رہا۔ آخر تینوں نے الگ الگ سمت میں قدم اٹھانا شروع کیے۔۔

آدھ گھنٹے بعد محمود انسپکٹر جمشید اور خان رحمان کے قریب پہنچا تو انسپکٹر جمشید چونک کر بولے:

"خیر تو ہے۔ تم تنہا آ رہے ہو۔"

"اس لیے کہ ہم نے الگ الگ مہم سر کرنے کا پروگرام بنایا تھا۔"

"اوہ۔ تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔" انسپکٹر جمشید گھبرا گئے۔۔

"جی کیوں۔ اس میں کیا حرج ہے؟"

"اگر تم میں سے کوئی ایک نہ لوٹا تو ہم اسے کہاں تلاش کریں گے۔ ابھی تو ہم پروفیسر صاحب کی تلاش میں ہیں، پھر دو کو تلاش کرنا ہو گا۔"

"ہوں واقعی۔ بس اس وقت یہی مناسب معلوم ہوا تھا۔ خیر۔ اللہ مالک ہے۔"

"اچھا یہ بتاؤ۔ لائے کیا ہو؟" خان رحمان نے کہا۔

"جی یہ لیجیے۔ ایک بٹوہ ہاتھ لگا تو ہے۔ اب یہ معلوم نہیں کہ اس میں سے کچھ نکلے گا بھی یا نہیں۔"

انسپکٹر جمشید نے بٹوہ لیا ہی تھا کہ فاروق بھی آتا نظر آیا:

"شکر ہے۔ دوسرے کی صورت نظر آئی۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔۔

"اور اب رہ گئی تیسری۔ نہ جانے وہ کہاں رہ گئی۔" فاروق نے قریب آتے ہوئے کہا۔ اس کے ہاتھ میں بھی ایک سیاہ رنگ کا بٹوہ تھا۔۔

"ادھر لاؤ۔" انسپکٹر جمشید نے کہا اور بٹوہ لے لیا۔ پھر فرزانہ کی تلاش میں نظریں دوڑائیں۔ لیکن اس کا دُور دُور تک پتا نہیں تھا۔

پہلے انہوں نے محمود والا بٹوہ کھولا۔ اس میں سُرخ اور نیلے رنگ کے کرنسی نوٹ کافی مقدار میں موجود تھے۔ بٹوے کے مالک کی تصویر بھی تھی۔ اس کے جسم پر فوجی وردی تھی۔۔

"ارے باپ رے۔ محمود۔ تم ایک فوجی کا بٹوہ اڑا لائے۔" انسپکٹر جمشید گھبرا کر بولے۔

"اب مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ کوئی فوجی ہے۔ ایک ہوٹل میں داخل ہو رہا تھا کہ میں نے اس کی جیب پر ہاتھ صاف کر دیا۔" اس نے بتایا۔

"میں تو خود سوچ رہا تھا۔ رات کے اس وقت تمہیں شکار ملے گا کیسے۔" خان رحمان بولے۔

"خیر ایسی تو کوئی بات نہیں انکل ۔ یہ شہر تو شاید رات کو جاگتا ہے اور دن کو سوتا ہے ۔ بہت چہل پہل ہے ۔ ہر قسم کی دکانیں بھی کھلی ہیں۔"

"اوہو اچھا۔" خان رحمان بولے۔

فاروق والے بٹوے میں بھی کافی کرنسی نوٹ تھے ۔ اس میں کچھ کاغذات بھی تھے ۔ انہوں نے نکال کر پڑھے ۔ انگریزی زبان میں تھے ۔ اور بٹوے والے شخص کی ملازمت کے تھے جو دوسرے شہر سے تبدیل ہو کر آیا تھا۔

اچانک انہوں نے دوڑتے قدموں کی آوازیں سنیں ـــ آوازیں ایک سے زائد آدمیوں کی تھیں ۔ وہ چونک اٹھے ۔ آوازوں کی سمت میں دیکھا تو فرزانہ بے تحاشہ دوڑتی ان کی طرف آ رہی تھی ۔ اور پھر وہ ان کے پاس رکنے کی بجائے ۔ آگے نکل گئی :

"ارے ارے ۔ ہم یہ رہے فرزانہ۔" فاروق نے بوکھلا کر کہا اور ساتھ میں اپنے جسم کو بھی ٹٹولا :

"تم جسم کو کیوں ٹٹول رہے ہو ؟"

"اس خیال سے کہ کہیں ہم لوگ غائب تو نہیں ہو گئے اور اس لیے فرزانہ کو نظر نہ آئے ہوں۔"

اسی وقت دو آدمی دوڑ کر آتے نظر آئے ۔ اور پھر ان کے قریب رک گئے ۔ وہ بری طرح ہانپ رہے تھے :

"وہ ۔ وہ لڑکی ۔ دیکھی آپ نے۔"

"ایک وہی کیا ۔ نہ جانے اس جیسی کتنی لڑکیاں دیکھی ہوں گی ہم نے ۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"وہ کس طرف گئی ہے ۔ اس نے میرا بٹوہ اڑا لیا ہے۔"

"بس ۔ اس طرف گئی ہے ۔" انسپکٹر جمشید نے سمندر کی طرف اشارا کیا۔

انہوں نے قدم اٹھائے ہی تھے کہ ایک ایک ہاتھ ان کی کمر پر پڑا ۔ دونوں تیورا کر گرے۔

"آجاؤ فرزانہ ۔ یہ دونوں ڈھیر ہو گئے ۔" خان رحمان نے آواز لگائی۔

"ویری گڈ ۔" انہوں نے فرزانہ کی آواز سنی اور وہ ایک چٹان کی اوٹ سے نکل کر ان کے سامنے آگئی ۔

"فرزانہ ۔ تم نے بہت نکمے پن کا ثبوت دیا ۔ انہیں اپنے پیچھے لگا لائیں ۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"اور کیا ۔ تم اتنی صفائی سے بٹوہ کیوں نہ اڑا سکیں کہ انہیں پتا ہی نہ چلتا۔" محمود نے کہا۔

"کیا خیال ہے انکل ۔ یہ دونوں ٹھیک کہہ رہے ہیں۔"

"ہاں ۔ بالکل۔" خان رحمان نے فوراً کہا۔

"لیکن ابا جان کا یہ خیال نہیں ہے۔" فرزانہ مسکرائی ۔ انسپکٹر جمشید بھی مسکرائے ۔

"کیا مطلب ۔ ابا جان کا یہ خیال نہیں ہے ۔ یہ کیا بات ہوئی ۔ خیال ابا جان کا اور بتا رہی ہو تم ۔ ہے کوئی تک ۔" فاروق نے جھنا کر کہا۔

"ہاں ۔ اور کیا کروں ۔ ابا جان کا خیال یہ ہے کہ میں نے بہت اچھا کیا کہ ان دونوں کو اپنے پیچھے لگا لائی۔"

"کیوں ابا جان ۔ کیا آپ کا واقعی یہ خیال ہے۔" محمود نے بوکھلا کر کہا۔

"ہاں بھئی ۔ اس میں کوئی شک نہیں۔"

"لیکن فرزانہ کو آپ کے خیال کی ہوا کس طرح لگ گئی۔" محمود بولا۔

"اف خدا ۔ اب خیال کی بھی ہوا ہونے لگی۔" فاروق نے کانپ کر کہا۔

"میرے مسکرانے کے انداز سے اس نے یہ اندازہ لگا لیا کہ میں اس کا مطلب سمجھ گیا ہوں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"اس کا مطلب ۔ تو کیا ان دونوں کو پیچھے لگا لانے سے فرزانہ کا کوئی مطلب ہے۔"

"ہاں ۔ بالکل سیدھی سی بات ہے ۔ ان دونوں کے کپڑے میرے اور خان رحمان کے کام آئیں گے ۔ ان کے کپڑے پہن کر ہم آبادی کا رخ کر سکیں گے اور ضرورت کی چیزیں خرید سکیں گے۔"

"اوہ ۔ دھت تیرے کی ۔ اتنی سی بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔" محمود نے جھلا کر ران پر ہاتھ مارا۔

"اور میں بھی تم دونوں میں شامل ہو گیا۔" خان رحمان افسوس زدہ لہجے میں بولے۔

"لیکن ابا جان ۔ فرزانہ کی اس ترکیب میں یہ خطرہ بھی تو تھا کہ یہ ان دو کے ساتھ اور بھی کئی آدمیوں کو پیچھے لگا لاتی۔" محمود نے اعتراض کیا۔

"جی نہیں ۔ میں نے ایک پارک میں ٹہلتے دو آدمیوں میں سے ایک کا بٹوہ اڑایا تھا اور اس وقت پارک میں یا آس پاس کوئی نہیں تھا۔"

"ہوں ۔ تم نے بہت اچھا کیا فرزانہ ۔ اب میں اور خان رحمان آسانی سے خرید و فروخت کر سکیں گے۔"

انہوں نے جلدی جلدی ان دونوں کے کپڑے اتارے، اپنے کپڑے اتار کر ان کے قریب ڈال دیے اور خود ان کے پہن لیے ۔ پھر ان سے بولے :

"اب تم یہیں ہمارا انتظار کرو ۔ ہم ضرورت کی چیزیں لے کر ابھی آتے ہیں۔" انسپکٹر جمشید نے کہا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔

"ان کا ہم کیا کریں۔"

"اگر یہ ہوش میں آنے لگیں تو ایک ایک ہاتھ اور رسید کر دینا۔ ہماری واپسی تک ان کا یہاں ٹھہرنا ضروری ہے۔" انہوں نے کہا۔

"تب آپ بے فکر رہیں۔ یہ یہیں رہیں گے۔" فاروق نے خوش ہو کر کہا۔

آخر وہ دونوں رخصت ہوئے، پھر ایک گھنٹے بعد ان کی واپسی ہوئی تو سامان سے لدے پھندے تھے۔ اس میں کھانے پینے کی چیزیں بھی تھیں۔ کپڑے بھی تھے۔ دو سوٹ کیس بھی تھے۔ کھانے سے فارغ ہو کر پانچوں نے مقامی لباس پہنے۔ دونوں بے ہوش آدمیوں کو پھر ان کے کپڑے پہنائے۔ اپنے پرانے کپڑے سوٹ کیس میں رکھے اور آبادی کی طرف چلے۔

تھوڑی دیر بعد وہ ایک اچھے سے ہوٹل میں داخل ہو رہے تھے۔ ان کے حلیے بھی کسی قدر تبدیل ہو چکے تھے۔ اور وہ مقامی رنگ میں رنگ گئے تھے۔ ہوٹل کا نام ہوٹل رمشاب تھا۔ اس کے کاؤنٹر پر رکتے ہوئے انسپکٹر جمشید بولے:

"ہمیں ایک بڑا کمرہ چاہیے۔" یہ الفاظ انہوں نے انگریزی زبان میں ادا کیے۔

"ضرور۔ کیوں نہیں۔ رجسٹر میں خانہ پُری کر دیں۔" کلرک نے کہا۔

انسپکٹر جمشید نے اپنے فرضی نام وغیرہ لکھ دیے۔ اور رجسٹر اس کی طرف سرکا دیا۔ اس نے ایک نظر اندراجات پر ڈالی اور بولا:

"آپ نے اپنے شناختی کارڈوں کے نمبر درج نہیں کیے۔"

"سوٹ کیسوں میں ہیں کمرے میں جا کر نکالیں گے اور پھر ہم میں سے ایک آ کر نمبر لکھ جائے گا۔" انہوں نے کہا۔

"ہوں۔ ٹھیک ہے۔ ایک ہفتے کا کرایہ پیشگی دے دیں، تین سو پچاس ڈالر۔"

"ضرور لیجیے۔" انہوں نے کہا اور بٹوے میں سے نوٹ نکال کر دے دیے۔ پھر ایک بیرے کے ساتھ اوپر آئے۔ ان کے کمرے کا نمبر ۱۱۱ تھا۔

کمرے میں پہنچتے ہی انہوں نے دروازہ اندر سے بند کر لیا:

"اب کیا ہوگا ابا جان۔ شناختی کارڈ ہم کہاں سے لائیں، ان پر تو تصویر بھی ہوتی ہے۔" فرزانہ نے گھبرا کر کہا۔

"فی الحال تو مسئلہ صرف نمبر لکھنے کا ہے۔ نمبروں کی سیریز کا مجھے کچھ پتا نہیں۔ ہاں اگر میں کسی ایک کے شناختی کارڈ کو دیکھ لوں تو پھر کام آسان ہو جائے گا۔"

"بات تو ٹھیک ہے۔ تب پھر۔" محمود کہتے کہتے رک گیا۔ اسی وقت انسپکٹر جمشید نے ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش ہو جانے کا اشارہ کیا تھا:

"ساتھ والا کمرہ روشن ہے۔ ٹھہرو۔ میں شناختی کارڈ کی سیریز دیکھ ہی آؤں۔"

یہ کہہ کر انہوں نے اپنا ہیٹ سر پر اور جھکا لیا۔ منہ پر رومال نقاب کی صورت لگا لیا۔ اور باہر نکل کر کمرہ نمبر ۱۱۰ کے دروازے پر دستک دی۔ فوراً ہی دروازہ کھل گیا اور دروازہ کھولنے والے کے سر پر ایک بھرپور ہاتھ پڑا۔ وہ لڑکھڑایا اور گر پڑا۔ اس کے گرنے کی آواز کمرے میں گونج اٹھی۔

"کیا ہوا جیک۔" اندر سے ایک عورت کی آواز سنائی دی۔

اس سے پہلے کہ عورت اندرونی کمرے سے باہر آتی۔ انہوں نے اس کی جیبوں کی تلاشی لے ڈالی۔ جلد ہی شناختی کارڈ ان کے ہاتھ میں تھا۔ انہوں نے نمبر کی سیریز پر نظر ڈالی۔ کارڈ واپس رکھا اور باہر نکل آئے۔ فوراً ہی اپنے کمرے میں داخل ہوئے اور دروازہ ایک بار پھر اندر سے بند کر لیا۔ اب وہ بیٹھے، اس سیریز کے مطابق پانچ نمبر کاغذ پر لکھ رہے تھے۔ زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

"دیکھو محمود۔ کون ہے۔" انسپکٹر جمشید نے دبی آواز میں کہا۔

محمود نے اٹھ کر دروازہ کھولا اور بیرے کی صورت نظر آئی:

"آپ میں سے کوئی نمبر لکھنے نہیں آیا۔"

"بھئی ابھی ابھی سامان رکھ کر فارغ ہوئے ہیں، بس میں آ ہی رہا ہوں۔ یہ کوئی ایسی پریشانی کی بات تو ہے نہیں۔" انسپکٹر جمشید نے بُرا مان کر کہا۔

"بات دراصل یہ ہے جناب کہ اس سلسلے میں تھوڑی دیر پہلے ہی ٹی وی پروگرام روک کر نوٹس جاری کیا گیا ہے۔"

"خیر تو ہے۔ ایسا کرنے کی کیا ضرورت پیش آ گئی" خان رحمان حیران ہو کر بولے۔

"معلوم ہوا ہے۔ کچھ غیر ملکی دشمن ہمارے ملک میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔"

"اوہ۔ تو یہ بات ہے۔"

"جی ہاں۔" اس نے فوراً کہا۔

"آپ چلیے۔ میں آ رہا ہوں۔"

انہوں نے کہا اور بیرا چلا گیا۔ آخر وہ کمرے سے نکلے اور کاؤنٹر پر آئے۔ کلرک نے فوراً رجسٹر کھول دیا اور انہوں نے کاغذ پر نوٹ کیے ہوئے نمبر لکھ دیے:

"بس۔ اب تو آپ مطمئن ہیں۔"

"جی۔ جی ہاں۔" اس نے کہا اور رجسٹر بند کر دیا۔

وہ اوپر آ گئے۔ اور مطمئن انداز میں بولے:

"یہ مرحلہ تو طے ہوا۔ اب سوال یہ ہے کہ ہم رے راٹا کو کس طرح تلاش کریں۔ کیونکہ جہاں رے راٹا ہے۔ وہیں پروفیسر صاحب ہوں گے۔ یا کم از کم اس کے ذریعے ہم ان تک پہنچ سکتے ہیں۔"

"اس کے لیے ہم براہِ راست ترکیب اختیار کر سکتے تھے۔" فرزانہ نے کہا۔

"براہِ راست ترکیب۔ ذرا اس ترکیب کی وضاحت کر دو۔" محمود نے منہ بنایا۔

"وضاحت اس کی یہ ہے کہ ہم خود کو شک کی زد میں دے دیتے۔ اور پولیس یا ملٹری خود ہی ہمیں رے راٹا کے سامنے پہنچا دیتی۔" فرزانہ نے جلدی جلدی کہا۔

"اگر تمہیں خود کو شک کی زد میں دینے کا اتنا ہی شوق ہے تو ضرور دے دو۔ ہمیں تو خدا بچائے شک کی زد سے۔ یہ زد بہت بُری ہوتی ہے۔"

"بس تم سے تو فضول باتیں کرا لو۔" فرزانہ نے جل بُھن کر کہا۔

"چلنے سے ذرا احتیاط۔ کیونکہ یہاں جوتیاں حاصل کرنا بھی مشکل کام ہوگا۔" فاروق نے گویا خبردار کیا اور فرزانہ تلملا کر رہ گئی۔ خان رحمان شوخ انداز میں مسکرانے لگے۔ لیکن اسی وقت ان کی مسکراہٹ نے دم توڑ دیا، کیونکہ دروازہ بہت زور سے دھڑ دھڑایا گیا تھا۔ حالانکہ دروازے پر گھنٹی کا بٹن بھی لگا ہوا تھا۔

وہ چونک اٹھے۔ پہلے تو سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، پھر انسپکٹر جمشید نے سرگوشی کی:

"میں غسل خانے میں جا رہا ہوں۔ باقی لوگ جوں کے توں بیٹھے رہیں۔ محمود۔ تم دروازہ کھول دو۔"

"جی بہتر۔" اس نے کہا اور دروازے کی طرف قدم اُٹھا دیے۔ دروازہ کھولنے سے پہلے اس نے مڑ کر یہ ضرور دیکھ لیا تھا کہ اس کے والد غسل خانے میں جا چکے ہیں یا نہیں۔ دروازہ کھلتے ہی اس نے ملٹری پولیس کی جھلک دیکھی۔

ان کے چہروں پر ایک رنگ آ کر گزر گیا۔

☆ ☆ ☆

دروازہ کھولتے ہی ملٹری پولیس اندر گھس آئی۔ یہ تعداد میں کُل چھ تھے۔ ان میں سے اگلا بڑے رینک کا آفیسر تھا۔ اس نے پورے کمرے پر ایک نظر ڈالی اور بولا:

"تم میں سے ایک کم ہے۔"

"باتھ روم میں ہیں۔" محمود نے کہا، کیونکہ اس بات کو چھپانے کا بھی اب کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اس وقت انسپکٹر جمشید ہاتھ تولیے سے خشک کرتے باہر نکل آئے اور پُرسکون آواز میں بولے:

"کیا معاملہ ہے سر۔"

"تم لوگ کہاں سے آئے ہو؟" آفیسر نے بارُعب آواز میں کہا۔

ایک لمحے کے لیے انسپکٹر جمشید چکرا کر رہ گئے۔ پھر انہیں ان کاغذات کا خیال آگیا جو بٹوے سے برآمد ہوئے تھے، ان میں ایک میں دوسرے شہر کا نام بھی تھا۔ انہوں نے فوراً اس شہر کا نام لے دیا۔

"مانٹریان سے۔"

"لیکن تمہارے شناختی کارڈوں کے نمبر تو مانٹریان کے نہیں ہیں۔"

"تو کیا سر۔ یہ ضروری ہے کہ ہم جس شہر سے آئیں، کارڈ بھی اُسی شہر کے ہوں۔" انسپکٹر جمشید مسکرا اٹھے۔ آفیسر نے لاجواب ہو کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ پھر اس نے کہا۔

"بہرحال۔ تم لوگوں کو میرے ساتھ ملٹری پولیس اسٹیشن تک چلنا ہوگا۔ اگر تم لوگ درست ثابت ہوئے تو اس ہوٹل میں واپس آنے کی اجازت مل جائے گی۔"

"لیکن ایسا کیوں ہے سر۔ اس سے پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا۔"

"کچھ غیر ملکی جاسوس ہمارے ملک میں سمندر کے راستے داخل ہو گئے ہیں، ان کی گرفتاری کے سلسلے میں ایسا ہو رہا ہے۔"

"بہت بہتر۔ چلیے۔ ہم تیار ہیں۔" انہوں نے کہا۔

وہ ان کے ساتھ باہر نکلے۔ کمرے کے دروازے کو تالا لگایا اور نیچے اتر آئے۔ ہال میں بیٹھے لوگوں کی نظریں ان کی طرف جم کر رہ گئیں۔ پورے ہال میں یک لخت خاموشی چھا گئی تھی۔ شاید ملٹری کا آنا یہاں بہت خوفناک خیال کیا جاتا تھا۔ جب تک وہ ہال سے نکل نہیں آئے۔ نظریں بدستور ان کے تعاقب میں لگی رہیں۔ باہر ملٹری کی جیپیں کھڑی تھیں۔ انہیں ایک جیپ کے پچھلے حصے میں بٹھایا گیا۔ حفاظت کے پیش نظر ان کے ساتھ تین آدمی ریوالور ہاتھوں میں لے کر بیٹھ گئے۔

انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ جیسے کہہ رہے ہوں۔ آخر فرزانہ کی ترکیب پر خود بخود ہی عمل شروع ہو گیا۔ یعنی اس کے لیے انہیں کچھ بھی نہیں کرنا پڑا تھا۔ اور وہ شک کی زد میں آ گئے تھے۔

جلد ہی وہ ایک سُرخ رنگ کی عمارت میں داخل ہوئے، یہاں ہر طرف ملٹری پولیس موجود تھی۔ جونہی انہیں جیپوں سے اتارا گیا، کئی رائفلیں ان کی طرف اٹھ گئیں۔

"سر۔ یہ آخر کیا ہو رہا ہے؟" انسپکٹر جمشید کے لہجے میں گہرا طنز تھا۔

"بات دراصل یہ ہے کہ۔" وہ کہتے کہتے رک کر مسکرایا، پھر بولا:

"ہمیں یقین ہے۔ وہ غیر ملکی جاسوس تم لوگ ہی ہو۔"

"اور یہ یقین کیوں ہے آپ کو؟" انسپکٹر جمشید ہنستا کر بولے۔

"اس طرح کہ جو نمبر آپ نے لکھوائے۔ ان کے گئے ہمارے رجسٹروں میں کچھ اور ہی نام ہیں۔"

"اوہو۔ اتنی جلدی چیک بھی کر لیا گیا۔" انسپکٹر جمشید چونک کر بولے۔

"اس میں دیر ہی کتنی لگتی ہے۔ خاص طور پر اس صورت میں جب خاص طور پر احکامات دیے گئے ہوں۔ آؤ چلیں۔" اس نے پُرجوش لہجے میں کہا اور آگے بڑھ گیا۔

راہداریوں کے زرغے میں وہ ایک بہت بڑے کمرے میں داخل ہوئے۔ سامنے والی دیوار کے ساتھ ایک طویل میز رکھی تھی۔ اس کی دوسری طرف بیٹھے ہوئے شخص نے مسکرا کر دیکھا اور بولا:

"مجھے خوشی ہے انسپکٹر جمشید۔ ہم بہت جلد دوبارہ مل رہے ہیں۔ تو تم نے پہاڑ کی چوٹی پر کھڑے میرے آدمیوں کو ٹھکانے لگا دیا۔" آواز رے ماٹا کی تھی اور لہجے میں ذرا بھی ناگواری نہیں تھی۔

"مجبوری تھی۔ وہ ہمیں جان سے مارنے پر تُل گئے تھے۔"

"انہیں حکم بھی یہی تھا کہ۔ یا تو وہ تم لوگوں کو ختم کر دیں یا خود ختم ہو جائیں۔ اور انہوں نے لفظ بہ لفظ میرے حکم کی تعمیل کی۔ مجھے اس کی بھی خوشی ہے۔ تم لوگوں کی صلاحیتوں پر بھی خوشی ہے کہ ایک مشکل ترین جنگ میں بھی تم نے سو فیصد کامیابی حاصل کی۔ لیکن مسٹر جمشید۔ جہاں تک پروفیسر داؤد کی واپسی کا تعلق ہے۔ اس میں تم کامیاب نہیں ہو سکو گے، کیونکہ وہ صرف اور صرف میرے قبضے میں ہیں۔ اور انہیں قبضے میں رکھنے کے سلسلے میں میں نے کسی سے بھی کوئی کام نہیں لیا۔"

"لیکن۔ ہمارا خیال ہے۔ ہم انہیں ساتھ لے کر ہی جائیں گے تم نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا تھا کہ مر جائیں یا مار دیں۔ اب میں خود کو اور اپنے ساتھیوں کو تمہارے سامنے حکم دیتا ہوں کہ مر جائیں گے یا پھر پروفیسر داؤد صاحب کو واپس لے کر جائیں گے۔ ان کے بغیر نہیں جائیں گے۔"

"بہت خوب۔ اچھا حکم دیا تم نے خود کو۔ پسند آیا۔ اب تو مجھے اپنے پروگرام میں تبدیلی کرنا ہی ہو گی۔"

"کیسی تبدیلی۔" انسپکٹر جمشید چونکے۔

"موت کی تبدیلی۔ انہوں نے اپنی موت کے پروگرام میں تبدیلی کر لی ہے۔" فاروق جل کر بولا۔

"شٹ اپ۔" رے ماٹا غرایا۔

"تم چپ رہو بھئی۔ ان سے مجھے ہی بات کر لینے دو۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"پہلے میں نے سوچا تھا۔ تم لوگوں کو سرحد پار کروا دوں گا اور سرحد پر کڑی نگرانی شروع کر دی جائے گی۔ اس طرح تم دوبارہ ادھر نہیں آ سکو گے۔ لیکن اب جب کہ تمہارا پروگرام کچھ اور ہے۔ میں بھی پروگرام بدلنے پر مجبور ہو گیا ہوں۔ لہٰذا میں نے فیصلہ کیا ہے۔ تمہیں موت کے جزیرے میں پھینکوا دیا جائے۔ جہاں تم ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جاؤ۔ اور مرتے وقت واپسی کا خواب ہی دیکھتے رہو۔ اس وقت پروفیسر داؤد کا خیال تمہیں بھولے سے بھی نہیں آئے گا۔"

"تمہارا خیال غلط ہے رے ماٹا۔ ہم مرتے وقت بھی پروفیسر صاحب کو نہیں بھولیں گے۔" محمود بولا۔

"اور موت کا جزیرہ کیا چیز ہے۔ یہ بھی تو بتا دیں۔" فرزانہ بولی۔

"بس اس جزیرے میں ہر طرف موت ہی موت ہے۔ اس کے چاروں طرف چٹانیں ابھری ہوئی ہیں۔ اور ان چٹانوں کے چاروں طرف بہت خوفناک بھنور چکراتے ہیں۔ لہٰذا کوئی جہاز یا لانچ اس جزیرے کا رُخ نہیں کرتی۔ اتفاق سے اگر کوئی جہاز اس طرف نکل جاتا ہے تو وہ پھرکی کی طرح گھومنے لگتا ہے اور گھومتا گھومتا چٹانوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اس جزیرے میں پھینکے جانے والے لوگوں کو کسی بھی مدد کی اُمید نہیں کرنی چاہیے۔"

"اور اس جزیرے میں کیا کچھ ہے۔"

"جزیرے میں ہر وہ چیز ہے۔ جس سے موت آنکھوں کے سامنے نظر آتی ہے۔ میں تفصیل بتا کر پہلے سے تمہیں خوفزدہ نہیں کرنا چاہتا۔ ہلکا سا اشارا کر دیتا ہوں۔ اس جزیرے کی صرف ایک چیونٹی اگر تم لوگوں کو باری باری کاٹ لے۔ تو تم میں سے ایک بھی زندہ نہ بچے۔ دوسری چیزوں کا تو ذکر ہی کیا۔"

"بھئی واہ۔ پھر وہ موت کا جزیرہ نہ ہوا۔ چیونٹیوں کا جزیرہ ہو گیا۔" فاروق نے خوش ہو کر کہا۔

"خیر۔ آج رات تم میرے مہمان رہو گے۔ صبح پو پھٹنے سے پہلے پہلے تمہیں اس جزیرے تک پہنچا دیا جائے گا۔"

"لیکن سوال یہ ہے کہ اس جزیرے تک تو کوئی کشتی یا لانچ جا ہی نہیں سکتی۔ پھر ہمیں کس طرح پہنچایا جائے گا۔"

"یہ ذرا بھی مشکل نہیں۔ ہیلی کاپٹر کی ایجاد آخر کس دن کام آئے گی۔" رے ماٹا ہنسا۔

دل ہی دل میں وہ لرز اُٹھے۔ رے ماٹا کا پروگرام واقعی بہت خوف ناک ہو گیا تھا۔

○

چند لمحے کی خاموشی کے بعد انسپکٹر جمشید نے کہا:

"تب پھر مہمان رکھنے کی بھی کیا ضرورت ہے۔ اسی وقت کیوں نہ بھیج دیں۔"

"نہیں۔ایک بات میں بھی تسلیم کرتا ہوں۔تم لوگ بہادر ہی نہیں، ذہین بھی ہو اور دلیری بھی تم میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔تم جیسے دشمن خوش قسمتی سے ملا کرتے ہیں۔تمہاری موت پر افسوس مجھے بھی ہوگا، لیکن کیا کیا جائے۔تم پروفیسر داؤد کے بغیر اپنے ملک جانا نہیں چاہتے۔اور میں تمہارے ساتھ پروفیسر داؤد کو بھیج نہیں سکتا۔اب کیا جائے تو کیا۔صرف یہی کہ تم لوگوں کو موت کے حوالے کر دوں اور اپنے مشن پر روانہ ہو جاؤں۔"

"روانہ ہو جاؤں۔تو گویا پروفیسر داؤد کو یہاں سے کہیں اور لے جانے کا پروگرام ہے۔"

"ہاں۔ہیڈکوارٹر۔جہاں وہ تمام سائنس دان جمع کیے جا رہے ہیں۔جو چھ ماہ تک غائب رہے ہیں۔ہوسکتا ہے، اس وقت تک کئی سائنس دان پہنچائے بھی جا چکے ہوں۔"

"لیکن پروفیسر داؤد وہاں کیا کام آئیں گے۔جب کہ وہ چھ ماہ تک غائب نہیں رہے۔"

"یہ ان کا یا تم لوگوں کا بیان ہے۔ضروری نہیں کہ درست ہو۔"

"ہمارے مذہب میں جھوٹ بڑا گناہ ہے۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"ہوگا۔میرا خیال ہے۔پروفیسر داؤد بھی ان میں شامل تھے۔۔ان لوگوں کو مہمان خانے میں لے جاؤ۔یہ میرے مہمان ہیں، لیکن فرار نہ ہونے پائیں۔ورنہ ان کی جگہ تم لوگوں کو موت کے جزیرے کا نوالہ بننا ہوگا۔"

"اف توبہ۔اتنا بڑا نوالہ۔" فاروق نے خوف زدہ لہجے میں کہا اور وہ مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔نہ صرف مسکرائے بغیر۔بلکہ دل ہی دل میں اسے داد دیے بغیر بھی نہ رہ سکے۔وہ ان حالات میں بھی چہک سکتا تھا۔

"آپ فکر نہ کریں سر۔ان کے فرشتے بھی نہیں بھاگ سکتے۔"

"بھئی ہمارے فرشتوں کی بات نہ کریں۔ورنہ ہم برا مان جائیں گے۔" فاروق نے واقعی برا سا منہ بنا کر کہا۔

"چلیے جناب۔باتیں بعد میں بنا لیجیے گا۔" اسی آفیسر نے کہا جو انہیں یہاں تک لایا تھا۔

اور وہ ان کے درمیان چلتے ایک اور کمرے میں داخل ہوئے، یہ کمرہ شاہانہ طرز پر سجا تھا اور آرام کی ہر چیز یہاں موجود تھی:

"ارے میرا تو خیال تھا۔حوالات کی قسم کا کوئی کمرہ ہوگا۔۔لیکن یہ تو واقعی مہمان خانہ ہے۔بلکہ مہمان خانے سے بھی دو ہاتھ آگے ہے۔" فاروق نے جلدی جلدی کہا۔

"تت۔تم یہ کس طرح کہہ سکتے ہو کہ یہ کمرہ مہمان خانے سے بھی دو ہاتھ آگے ہے۔جب کہ دو ہاتھ پیچھے ہم نے کوئی مہمان خانہ نہیں دیکھا۔" محمود نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔

"چپ چپ۔" فاروق ہکلایا۔

"کیا پتا نہیں۔" فرزانہ نے اسے گھورا۔

"یہ کہ۔میں یہ بات کس طرح کہہ سکتا ہوں۔" اس نے کہا۔

"تمہارے لیے تو ہر بات کہنا ہی بہت آسان ہے۔اس بات کی کیا بات ہے۔" فرزانہ نے جل کر کہا۔

"دھت تیرے کی۔پڑ گئی بات کے پیچھے۔" محمود نے جھلا کر کہا، ران پر ہاتھ مارا۔

"ہم کمرے کے باہر موجود ہیں۔اس کمرے کی دیواریں، دروازے اور کھڑکیاں تم لوگوں سے ٹوٹ نہیں سکیں گی۔لہٰذا اس قسم کی کوشش بھی نہ کرنا۔مسٹر رے راٹا کے مہمانوں کو ہم اس وقت تک کوئی تکلیف دینا پسند نہیں کرتے، جب تک کہ وہ خود کوئی غلط حرکت نہ کریں۔" آفیسر نے کہا۔

"آپ فکر نہ کریں جناب۔اتنے شریف میزبان کے خلاف کوئی غلط حرکت کرنا ہم بہت غلط بات سمجھتے ہیں۔" فاروق نے جلدی جلدی کہا۔

"شکریہ۔آج آپ لوگوں کو بہت ہی پرتکلف کھانا پیش کیا جائے گا۔لیکن اگر آپ کوئی خاص قسم کا کھانا کھانا پسند کریں تو وہ بھی تیار کرایا جا سکتا ہے۔"

"ہم لوگ آپ کی پسند کا کھانا ہی کھا لیں گے، کیونکہ ہم تکلفات میں پڑنے کے عادی نہیں۔آپ فکر نہ کریں۔"

"فکر میں کیوں نہ پڑیں۔مسٹر رے راٹا نے آپ لوگوں کے بارے میں کچھ عجیب و غریب باتیں بیان کی ہیں۔ان باتوں نے ہمارا سکون برباد کر دیا ہے۔لیکن دیکھنے میں تو آپ بالکل بے ضرر نظر آ رہے ہیں۔"

"بس جی۔گزارا ہو کرتا ہوا۔" فاروق نے معصومانہ انداز میں کہا اور وہ انہیں گھور کر رہ گیا۔

ساتھ ہی دروازہ بند کر دیا گیا:

"ذرا ہم ان دروازوں، کھڑکیوں اور دیواروں کو دیکھ لیں ابا جان۔جن کے بارے میں اس نے بڑا دعویٰ کیا ہے۔"

"میرا خیال ہے۔ہم اس کمرے کی کسی چیز کو توڑ نہیں سکیں گے۔اگر ایسا ہونے کا امکان ہوتا تو رے راٹا کبھی ہمیں اس میں نہ بھیجتا، لہٰذا اس کی کوئی ضرورت نہیں۔"

"لیکن اس میں حرج بھی کیا ہے۔"

"اچھا خیر۔دیکھ لو۔" انہوں نے کہا۔

ان تینوں کے ساتھ خان رحمان بھی اٹھے، لیکن انسپکٹر جمشید جوں کے توں بیٹھے رہے۔

"تو آپ ہمارا ساتھ نہیں دیں گے۔"

"نہیں بھئی۔جب مجھے پہلے ہی اندازہ ہے تو وقت کیوں برباد کروں۔" وہ مسکرائے۔

"لیکن اس کمرے میں رہ کر آپ وقت کو کس طرح آباد کر

سکتے ہیں۔" فاروق نے حیران ہو کر پوچھا۔

"سوچ کر۔ اس سارے معاملے کے تمام پہلوؤں پر غور کر کے۔" وہ مسکرائے اور فاروق لاجواب ہو گیا۔

انہوں نے کمرے کو خوب ٹھوک بجا کر دیکھا۔ اچانک محمود کو اپنے چاقو کا خیال آ گیا۔

"ارے واہ۔ ہم چاقو کی مدد سے ان کھڑکیوں کو تو کاٹ ہی سکتے ہیں۔"

"یہ بھی کر کے دیکھ لو۔ منہ کی کھاؤ گے۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

محمود نے چاقو نکالا اور کھڑکی کی لکڑی پر آزمانے لگا۔ لکڑی کٹنے لگی۔ اس کا برادہ نیچے گرنے لگا۔ یہاں تک کہ کافی بڑا سوراخ ہو گیا۔ دوسری طرف انہیں سلاخیں نظر آئیں۔

"جب تک ہم پوری لکڑی نہ کاٹ لیں۔ سلاخوں پر چاقو آزمانے کا کوئی فائدہ نہیں۔" محمود نے کہا۔

"مجھے تو خیر اس سارے کام کا ہی کوئی فائدہ نظر نہیں آ رہا۔ تم لوگ یہ کیوں نہیں سوچتے کہ رے راٹا کے ماتحت باہر موجود ہیں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"لیکن ابا جان۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ باہر ایک بھی محافظ نہ ہو۔ انہوں نے ہمیں صرف ڈراوا ہی دیا ہو۔"

"خیر تم اپنی تسلی کر لو۔" انہوں نے کندھے اچکائے۔

آدھ گھنٹے تک وہ باری باری کھڑکی کی لکڑی کاٹتے رہے۔ آخر پوری سلاخیں نظر آنے لگیں اور ایک آدمی کے نکلنے کی جگہ بن گئی۔

"اور اب آتی ہے سلاخوں کی باری۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔" محمود نے عجیب سے لہجے میں کہا اور ایک سلاخ پر پوری طاقت سے چاقو مارا۔ اس وقت تک انہیں کمرے سے باہر کوئی بھی نظر نہیں آیا تھا۔ پہلے ہی وار میں سلاخ نصف تک کٹ گئی۔ اور دوسرے وار نے سلاخ کو کاٹ کر رکھ دیا۔ اب تو ان میں جوش بھر گیا۔ باری باری تمام سلاخیں کاٹ ڈالیں۔

"ابا جان۔ آئیے چلیں۔ سلاخیں کٹ گئی ہیں۔" فاروق نے پُرجوش لہجے میں کہا۔

"اور کیا باہر کوئی بھی نگران موجود نہیں۔" انسپکٹر جمشید حیران ہو کر بولے۔

"جی نہیں۔ کوئی بھی نظر نہیں آ رہا۔" فاروق نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"حیرت ہے۔ خیر بھئی۔ میں تو باہر جاؤں گا نہیں۔ تم لوگ اگر جانا ہی چاہتے ہو تو جا سکتے ہو۔ مجھے تو یہ بھی رے راٹا کی کوئی چال لگتی ہے۔" وہ بولے۔

"لیکن ابا جان۔ ہم آپ کے بغیر نہیں جائیں گے۔" محمود نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"بھئی کوئی فائدہ نہیں۔ بہتر ہو گا کہ یہیں بیٹھے رہو۔"

"لیکن اگر ہمیں کوئی موقع مل ہی گیا ہے۔ تو ہم اس سے فائدہ کیوں نہ اٹھائیں۔" اس نے کہا۔

"اچھا۔ جیسے تمہاری مرضی۔ چلو نکلیں۔" تنگ آ کر انسپکٹر جمشید بولے۔

وہ ایک ایک کر کے کھڑکی سے باہر نکل آئے۔ برآمدے میں کوئی بھی شخص نہیں تھا۔

"حیرت ہے۔ تمام محافظ کہاں چلے گئے۔" انسپکٹر جمشید بڑبڑائے۔

"شاید انہوں نے سوچا ہو گا۔ ہم اس کمرے سے نکلنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے۔" محمود نے کہا۔

"ہاں۔ ضرور یہی بات ہے۔ چلو اچھا ہے۔ ہم اس طرح موت کے جزیرے میں جانے سے بچ جائیں گے۔ آؤ بیرونی دروازے کا رُخ کریں۔" خان رحمان جلدی جلدی بولے۔

انہوں نے بیرونی دروازے کا رخ کیا۔ جونہی برآمدہ عبور کیا، ٹھٹک کر رُک گئے۔ رے راٹا ان سب محافظوں کے ساتھ ان کے سامنے کھڑا تھا۔ جنھوں نے انہیں مہمان خانے میں بند کیا تھا۔ آفیسر کے چہرے پر حیرت کا ایک دریا موجیں مار رہا تھا۔ آنکھیں باہر کو اُبلی پڑ رہی تھیں، ایسے میں رے راٹا کے ہونٹ ہلے:

"دیکھا روڈف۔ میں جیت گیا نا۔"

یہ الفاظ اس نے بچوں کی سی چہکتی آواز میں کہے۔

☆ ☆ ☆

"آپ جیت گئے۔ واقعی آپ جیت گئے۔ ہار میری ہوئی۔" آفیسر نے جواب دیا۔ اسے رے راٹا نے روڈف کے نام سے پکارا تھا۔

"یہ کیا۔ آپ لوگ تو آپس میں ہارنے جیتنے لگے۔ اب ہمارا کیا بنے گا۔" فاروق نے بوکھلا کر کہا اور وہ ہنس پڑے۔

"بات سمجھ میں نہیں آئی۔" انسپکٹر جمشید اُلجھ کر بولے۔

"میں بتاتا ہوں۔" رے راٹا نے کہا۔ ایک لمحے کے لیے خاموش رہا پھر کہنے لگا:

"میں پروفیسر داؤد کو لے کر یہاں پہنچا تو میں نے روڈف کو خبردار کر دیا کہ تم لوگ بھی شہر پہنچ جاؤ گے۔ یہ کہنے لگا۔ بھلا کیسے پہنچ جائیں گے۔ جب کہ آپ چوٹی پر اپنے جانثاروں کو چھوڑ آئے ہیں اور انہیں حکم دے آئے ہیں کہ مر جانا یا مار ڈالنا۔ اس پر میں نے کہا۔ کچھ بھی ہو۔ تم لوگ آ کر رہو گے۔ لہٰذا حفاظتی انتظامات کر لیے جائیں اور جوں ہی کسی ہوٹل میں مشکوک آدمی ٹھہریں اطلاع دی جائے۔ چنانچہ ہوٹل مہتاب میں کچھ مشکوک لوگوں کے ٹھہرنے کی خبر ملی۔ میں نے روڈف کو اسی وقت کہہ دیا کہ یہ تم لوگ ہو، لیکن اسے یقین نہ آیا۔ پھر تم لوگوں کو یہاں لایا گیا۔ اور جب میری ہدایات پر تم لوگوں کو مہمان خانے میں بند کر دیا گیا تو میں نے باہر نکل کر روڈف سے کہا:

"روڈوف خبردار رہنا۔ یہ لوگ کمرے سے بھی نکلنے کی کوشش ضرور کریں گے۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے سر۔ اول تو اس کمرے کی دیواریں، دروازے اور کھڑکیوں کو توڑنا یا کھونا ہی ممکن نہیں اور اگر وہ کسی طرح اس قابل ہو بھی سکیں تو بھی انہیں معلوم ہے کہ باہر مسلح آدمی موجود ہیں، بھلا وہ باہر نکل کر کیا کر لیں گے؟" روڈوف نے جواب دیا۔

"اس کے باوجود روڈوف۔ یہ لوگ کمرے سے نکلنے کی بھرپور کوشش کریں گے اور کچھ عجیب نہیں کہ نکل ہی جائیں۔" میں نے اس سے کہا۔ اسے یقین نہ آیا۔ آخر میں نے ان سب کو کمرے کے پاس سے ہٹا لیا۔ اور اب روڈوف نے دیکھ لیا کہ میں تم لوگوں کو واقعی بہت اچھی طرح جانتا ہوں، جب کہ روڈوف کی معلومات تم لوگوں کے بارے میں صفر کے برابر ہیں۔ مسٹر جمشید۔ یہ پوری عمارت اس وقت ہماری نظروں میں ہے۔ اور یہ ممکن ہی نہیں کہ تم لوگ اس میں سے نکل سکو۔ یہاں تک بھی تم لوگ اس لیے پہنچ گئے کہ میں نے ان لوگوں کو کمرے کے آس پاس سے ہٹا لیا تھا۔ ورنہ جونہی کھڑکی یا دروازے میں سوراخ ہوتا۔ رائفل کی نالی اس سوراخ پر آ جمتی۔ اور اب وہ چاقو ہمارے حوالے کر دو۔" یہ کہتے ہوئے محمود کی جوتی کی ایڑی کھسکا کر چاقو نکال لیا گیا۔

"میں نے تو ان لوگوں کو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ فضول کوشش کر رہے ہو۔ آؤ اب چلیں۔" انسپکٹر جمشید نے مڑتے ہوئے کہا۔

انہیں بڑی حیرت ہوئی۔ کہ آخر وہ یہاں سے فرار کی کوشش کیوں نہیں کر رہے۔ اور کمرے میں واپس آنے کے بعد یہ سوال فرزانہ کی زبان پر آ ہی گیا:

"بھئی کوشش تو تب کریں نا۔ جب یہ معلوم ہو کہ پروفیسر داؤد کہاں ہیں۔ میں کہہ چکا ہوں کہ ان کے بغیر نہیں جاؤں گا۔"

"لیکن ابا جان فرار کے بعد انہیں بھی تلاش کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔" محمود نے کہا۔

"کیسے۔ اس وقت پورا شہر رے راٹا کے آدمیوں کی نظروں میں ہے اور وہ یہ بھی بتا چکا ہے کہ پروفیسر داؤد صرف اور صرف اسی کی نگرانی میں ہیں۔ انہیں اس نے کسی دوسرے کی نگرانی میں نہیں دے رکھا۔ ان حالات میں ہمیں صرف صبر کرنا چاہیے۔ تیل دیکھو، تیل کی دھار دیکھو۔ حالات کیا رخ اختیار کرتے ہیں۔ ہمیں معلوم نہیں، لیکن کوئی نہ کوئی موڑ تو ایسا آئے گا ہی جب ہمیں حرکت میں آنا ہوگا۔ لیکن اس وقت میں مناسب نہیں سمجھتا۔ میرے پیش نظر میرے ملک کے وہ دوسرے سائنس دان بھی تو ہیں۔ جنہیں اناتیو یا سلاؤ اغوا کر چکے ہیں۔ دیکھنا تو یہ ہے کہ وہ کہاں ہیں۔ وہ جہاں بھی ہیں۔ رے راٹا بھی پروفیسر صاحب کو لے کر وہیں جانے والا ہے اور میں چاہتا ہوں۔ ہم بھی اس کا تعاقب کرتے وہاں پہنچ جائیں۔"

"لیکن ابا جان۔ میں پھر کہوں گا۔ کہ کیسے۔ کیونکہ یہ لوگ تو ہمیں موت کے جزیرے میں اتار دینا چاہتے ہیں۔"

"جب تک میری یا تمہاری موت نہیں آ جاتی۔ کوئی موت کا جزیرہ ہمارے لیے موت کا جزیرہ نہیں ہو سکتا۔" انہوں نے پرسکون آواز میں کہا اور وہ لاجواب ہو کر رہ گئے۔

رات کا کھانا۔ ان کے سامنے رکھا گیا تو ساتھ ہی ایک بلی بھی لائی گئی۔ بلی سفید رنگ کی اور بہت خوبصورت تھی۔ انہوں نے بلی کو حیرت بھری نظروں سے دیکھا۔ آخر فرزانہ سے رہا نہ گیا:

"کھانے کے ساتھ اس بلی کی موجودگی سمجھ میں نہیں آئی۔"

"اسے رے راٹا کی طرف سے تحفہ سمجھیے۔" کھانا لگانے والوں میں سے ایک نے کہا۔

"جی۔ کیا مطلب۔" وہ ایک ساتھ چونک کر بولے۔

"ہو سکتا ہے۔ کھانا سامنے رکھ کر آپ یہ خیال کریں کہ کہیں مسٹر رے راٹا نے کھانے میں زہر تو نہیں ملا دیا۔ لہٰذا انہوں نے یہ بلی ساتھ بھیجی ہے۔ تاکہ پہلے آپ اس بلی کو تمام کھانوں میں سے تھوڑا تھوڑا کھلا کر دیکھ لیں۔ اس طرح آپ لوگوں کا اطمینان ہو جائے گا۔"

"اوہ۔ تو یہ بات ہے۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے، پھر بولے:

"ویسے میں نے تو ایک پل کے لیے بھی یہ بات نہیں سوچی تھی۔ چلو بھئی کھانا شروع کرو۔" اس بار ان کا لہجہ عجیب تھا۔

"کیا کہا۔ کھانا شروع کرو۔ تو کیا آپ بلی کے ذریعے کھانا چیک نہیں کریں گے؟" کھانا لگانے والے نے حیران ہو کر کہا۔

"نہیں۔ یہ بلی بہت خوبصورت ہے۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"بلی بہت خوبصورت ہے۔ تو کیا آپ اسے بچانے کے لیے کھانا چیک نہیں کریں گے؟"

"یہ بات نہیں۔ جہاں تک میرا خیال ہے۔ یہ بلی مسٹر رے راٹا کی پالتو بلی ہے۔ اگر اس کھانے میں زہر ہوتا تو وہ ہرگز اپنی بلی پر تجربہ نہ کراتے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا۔ یہ بلی پالتو ہی ہے نا۔"

"اوہ۔" ملازم کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں، اس نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا: "اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ پالتو بلی ہے۔"

آخر انہوں نے کھانا شروع کیا، واقعی لذیذ تھا۔ ابھی پو نہیں پھٹی تھی کہ رے راٹا کی صورت دکھائی دی:

"رے راٹا کی مہمانی کا وقت پورا ہوا، اب تم لوگوں کو موت کے جزیرے کا رخ کرنا ہے۔ ہیلی کاپٹر تیار ہے، لہٰذا اٹھ کھڑے ہوں۔"

"شکریہ مسٹر رے راٹا۔ کھانا بہت لذیذ تھا۔ آپ واقعی ایک اچھے میزبان ہیں۔" محمود نے مسکرا کر کہا۔

"تو کیا آپ موت کے جزیرے میں بھیجنے سے پہلے ہمیں یہ نہیں بتائیں گے۔ یہ سب آخر چکر کیا ہے؟"

"چکر کا پتا تو خود ہمیں بھی نہیں۔ اور میں حیران ہوں۔ اس بار ملک کے وفادار ترین آدمی کو بھی بے خبر رکھا گیا ہے۔" اس کے لہجے میں گہرا طنز تھا۔

"تمہارا اشارا شاید میری طرف ہے۔ لیکن ملک کے تمام معاملات کا میرے علم میں لایا جانا تو ضروری نہیں۔ اور پھر پروفیسر داؤد اس منصوبے میں شریک ہی نہیں تھے۔ اس لیے بھی میں بے خبر ہوں۔"

"مطلب یہ کہ میں تم لوگوں کی معلومات میں کوئی اضافہ نہیں کر سکتا۔ ہم لوگوں کو یہ بات پورے یقین کے ساتھ معلوم ہو چکی ہے کہ تمہارے ملک کے بڑے بڑے سائنس دانوں کو سات ماہ پہلے کہیں خفیہ طور پر لے جایا گیا تھا۔ وہ چھ ماہ تک غائب رہے۔ بس ہماری حکومتیں یہ جاننے کے لیے بے چین ہو گئیں کہ سائنس دان آخر غائب کہاں رہے اور کیا کرتے رہے۔ بلکہ چند اور اسلامی ممالک کے بڑے بڑے سائنس دان بھی غائب رہے ہیں، اس وقت تک انہیں بھی اغوا کیا جا چکا ہو گا۔"

"گویا آپ کی معلومات بھی ہماری معلومات کے برابر ہیں۔ اب چونکہ ہماری معلومات صفر کے برابر ہیں، لہٰذا آپ کی معلومات بھی صفر کے برابر ہوئیں۔" فاروق نے برا سا منہ بنایا۔

"کیا معلومات معلومات لگا رکھی ہے۔" فرزانہ جھنجلا اٹھی۔

"وقت بہت کم ہے۔ تم لوگوں کو روانہ کرنے کے بعد مجھے پروفیسر داؤد کو لے کر ہیڈ کوارٹر تک بھی پہنچنا ہے۔ آؤ اب چلیں۔"

بیسیوں رائفلوں کے گھیرے میں انہیں ایک بند گاڑی میں بٹھایا گیا، باہر سے تالا لگایا گیا۔ ان کے ساتھ بھی رائفل بردار محافظ موجود رہے۔ لیکن انہوں نے فی الحال کوئی عملی قدم اٹھانے کا ارادہ ہی نہیں کر رکھا تھا، لہٰذا راستہ پرسکون انداز میں کٹا۔ گاڑی کا دروازہ کھولا گیا تو انہوں نے خود کو ایک ہیلی کاپٹر کے سامنے پایا۔ یہاں بھی ہر طرف رائفلیں اٹھی نظر آ رہی تھیں۔

وہ ہیلی کاپٹر پر سوار ہوئے تو صبح کی سفیدی نمودار ہو رہی تھی۔ ہیلی کاپٹر بلند ہوتا چلا گیا۔ اور پھر ایک سمت میں چل پڑا۔ جلد ہی انہوں نے خود کو پہاڑوں کے اوپر دیکھا۔ آخر ہیلی کاپٹر اترنے لگا۔ اب انہیں اپنے نیچے سمندر نظر آ رہا تھا۔ آخر سمندر سے تقریباً پچاس فٹ اونچائی پر ہیلی کاپٹر رک گیا۔ رسی کی سیڑھی نیچے لٹکنے لگی۔ یہ ہیلی کاپٹر بھی کچھ نئی قسم کا تھا۔ پائلٹ انہیں دکھائی دیا ہی نہیں تھا۔ شاید وہ بہت محفوظ جگہ بیٹھا تھا۔ یوں بھی انہیں پائلٹ سے کیا دشمنی ہو سکتی تھی۔ سیڑھی لٹکتے ہی انہوں نے اس کی آواز سنی:

"بس۔ اب اتر جائیے۔ ہم جزیرے کے عین اوپر موجود ہیں۔"

"بہت بہتر۔" انسپکٹر جمشید بولے اور پھر ان کی طرف مڑے:

"پہلے میں اتروں گا۔ آخر میں خان رحمان اتریں گے۔"

"جی اچھا!" وہ ایک ساتھ بولے۔

انسپکٹر جمشید رسی کی سیڑھی پر لٹک گئے اور اترنے لگے۔ نیچے کا منظر دیکھ کر ایک بار تو انہیں بھی چکر آ گیا۔ وہ ایک بہت چھوٹا سا جزیرہ تھا، چاروں طرف اونچی اور نوکیلی چٹانیں تھیں، اور ان چٹانوں کے چاروں طرف پانی کے بڑے بڑے اور مہیب بھنور تھے۔ ان میں اس قدر گہرے چکر چل رہے تھے کہ دیکھ کر ہی رونگٹے کھڑے ہوتے تھے۔ سیڑھی عین جزیرے کے درمیان میں لٹکی ہوئی تھی۔ درخت قدم قدم پر تھے۔ اور عجیب قسم کے پتوں اور شاخوں والے تھے، انہوں نے اس قسم کے درخت اپنی زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ آخر انہوں نے قدم جزیرے پر ٹکا دیے۔ ان کے بعد محمود، فاروق، فرزانہ اور خان رحمان اترے۔ سیڑھی کھینچ لی گئی اور ہیلی کاپٹر اوپر اٹھنے لگا، وہ اسے دیر تک دیکھتے رہے۔ لیکن پھر ایک زور دار پھنکار سن کر بوکھلا اٹھے۔ تیزی سے اپنے سامنے دیکھا تو ایک بہت بڑا اژدھا چلا آ رہا تھا۔

"موت کے جزیرے کا پہلا تحفہ۔" فاروق بڑبڑایا۔

"اف خدا۔ ہم اس کا مقابلہ کس طرح کریں گے۔" فرزانہ کانپ کر بولی۔

"کاش۔ اس وقت۔" فاروق کہتے کہتے رک گیا۔

"کاش اس وقت کیا؟" محمود جھلا اٹھا۔

"ہمارے پاس انہوں نے کوئی چیز بھی تو نہیں چھوڑی۔ چاقو تو خیر لے ہی لیا تھا۔ تلاشی کے وقت لائٹر تک جیب میں نہیں رہنے دیا۔" فاروق نے کہا۔

"تم۔ تم فکر نہ کرو۔ اس سے مقابلہ میں کروں گا۔" خان رحمان نے غصیلے انداز میں کہا۔

"آپ۔ انکل آپ۔ آخر آپ بغیر کسی ہتھیار کے مقابلہ کس طرح کریں گے۔" فرزانہ نے بوکھلا کر کہا۔

"کسی نہ کسی طرح تو کر ہی لوں گا۔" خان رحمان نے آستین اوپر چڑھاتے ہوئے کہا۔

"نہیں خان رحمان۔ تم نہیں، اس کا مقابلہ میں کروں گا۔ مجھے ایک ترکیب سوجھ گئی ہے۔ ہاں۔ اگر تم دیکھو کہ مجھے مدد کی ضرورت ہے، تو ضرور مدد کرنا۔" انسپکٹر جمشید نفی میں سر ہلا کر بولے۔

"اور تم نے کیا ترکیب سوچی ہے۔" خان رحمان نے پریشان ہو کر کہا۔

"بس دیکھتے جاؤ۔ اور ہاں۔ اسی طرح کھڑے رہو۔ شاید یہ اژدھا ہماری بو پا کر آیا ہے۔" یہ کہہ کر وہ ان کے آگے سے ہٹ کر پیچھے چلے گئے اور پھر نیم دائرے کی صورت میں اژدھے کی دُم کی طرف بڑھنے لگے۔ ابھی اژدھا دُور تھا اور اس کی پھنکار

سنائی نہ دے جاتی تو ابھی تک وہ اس کی طرف سے بے خبر ہی رہتے — محمود، فاروق، فرزانہ اور خان رحمان پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں اژدھے کی دُم کی طرف جاتے دیکھتے رہے — ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں، آخر وہ عین دُم کے نزدیک پہنچ گئے — اژدھا ابھی تک ان کی اس طرف موجودگی سے بے خبر تھا — اور یہ شاید اس لیے تھا کہ اس کے سامنے چار انسان کھڑے تھے اور ان کی بُو اسے آ رہی تھی۔

وہ اچانک جھکے اور اژدھے کی دُم کو پکڑ کر اسے چکر دینے کے لیے زور لگایا، لیکن اس وقت ان کی ترکیب دھری کی دھری رہ گئی جب اژدھے کا صرف نصف پچھلا دھڑ ہی ان سے اٹھ سکا وہ بہت وزنی تھا — شاید کئی من اور اس قدر وزنی اژدھے کو انسپکٹر جمشید اکیلے اٹھا کر گھما نہیں سکتے تھے — انہوں نے دراصل سوچا یہی تھا — کہ گھماتے گھماتے اس کا منہ کسی درخت سے ٹکرا دیں گے، لیکن جب ایسا نہ ہو سکا تو اژدھے نے اپنا اگلا دھڑ اٹھایا اور ان پر حملہ آور ہوا — وہ اس کی دُم چھوڑ کر پیچھے ہٹے، لیکن فوراً ہی دُم ان کے دائیں پہلو سے ٹکرائی — انہیں یوں لگا جیسے دایاں پہلو جل اٹھا ہو — وہ کئی قدم پیچھے لڑکھڑا گئے — اب اژدھا ان کی طرف مڑا — انہوں نے چلا کر کہا:

" اس کا مقابلہ ہتھیار کے بغیر بہت مشکل ہے — محمود، فاروق — فرزانہ — درختوں کی بڑی بڑی شاخیں توڑنے کی کوشش کرو — کم از کم میں ایسی کسی شاخ سے اس کی آنکھیں تو پھوڑ ہی سکوں گا۔"

تینوں ان کا حکم سُن کر درختوں کی طرف بڑھے — خان رحمان نے بھی ان کا ساتھ دینے کے لیے قدم اٹھائے ہی تھے کہ انسپکٹر جمشید بولے:

" نہیں خان رحمان — تم میری طرف متوجہ رہو — میں شدید تکلیف محسوس کر رہا ہوں — یہ اژدھا انتہائی خطرناک ہے — رے راٹا نے غلط نہیں کہا تھا — یہ موت کا جزیرہ ہے۔" انہوں نے جلدی جلدی کہا —

" جمشید فکر نہ کرو — اور مجھے بتاؤ — میں کس طرح تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔" خان رحمان نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

عین اسی وقت انہوں نے محمود، فاروق اور فرزانہ کی چیخیں سنیں — اژدھا اس وقت تک پوری طرح انسپکٹر جمشید کی طرف گھوم چکا تھا اور اب پھر ان کا رُخ کر رہا تھا — دونوں نے بوکھلا کر اس پر سے نظریں ہٹائیں اور ان کی طرف دیکھا — وہ مارے خوف کے لرزتے نظر آئے:

" کک — کیا ہوا؟" خان رحمان ہکلائے۔

" ہم — ہم کسی درخت کی شاخ نہیں توڑ سکتے۔" محمود نے تھر تھر کانپتی آواز میں کہا۔

" کیوں — کیا بات ہے؟" انسپکٹر جمشید نے حیران ہو کر پوچھا۔

" ہر درخت کی ہر شاخ پر بڑی بڑی سرخ رنگ کی چیونٹیاں رینگ رہی ہیں — یہ ادھر سے ادھر آ جا رہی ہیں، یوں لگتا ہے — جیسے انہیں شاخوں پر آنے جانے کے سوا کوئی کام نہ ہو — رے راٹا نے بھی ان چیونٹیوں کا ذکر کیا تھا — ان حالات میں آپ ہی بتائیے، ہم کیا کر سکتے ہیں۔"

" اوہ — تب تو یہ خونی چیونٹیاں ان درختوں کے نیچے بھی گر رہی ہوں گی — اور وہ ہمارے پیروں پر چڑھ کر ٹانگوں پر کاٹ سکتی ہیں۔" خان رحمان گھبرا کر بولے اور زمین کی طرف دیکھا — ان کا رنگ اڑ گیا — نہ جانے کتنی چیونٹیاں اژدھے کی طرف بڑھی چلی آ رہی تھیں — ادھر اژدھا ان کی طرف سے بے فکر ان کی طرف متوجہ تھا — فرق صرف یہ تھا کہ چیونٹیاں چاروں طرف سے اژدھے کا رُخ کر رہی تھیں — جب کہ اژدھا ان کی طرف صرف ایک سمت سے بڑھ سکتا تھا — لہٰذا نتیجہ یہ ہوا کہ چیونٹیاں اس تک پہنچ گئیں — اور اس کے جسم پر چڑھتی نظر آئیں — انہوں نے اژدھے کو پلٹنی کھاتے دیکھا، اس نے اپنی دُم کو اس زور سے زمین پر مارا کہ زور دار دھمک پیدا ہوئی — اور ہزاروں چیونٹیاں اس کی دُم کا شکار ہو گئیں — لیکن اس وقت تک وہ بھی اسے جگہ جگہ سے کاٹ چکی تھیں اور وہ بُری طرح پلٹنیاں کھا رہا تھا — بار بار زمین پر دُم اور منہ مار رہا تھا — اس کی پھنکار جلدی جلدی سنائی دینے لگی — چیونٹیوں اور اژدھے کی جنگ انہوں نے زندگی میں پہلی بار دیکھی تھی — ان کے رونگٹے پوری طرح کھڑے ہو چکے تھے — ایسے میں ان کی نظریں جزیرے کے درختوں کی طرف اٹھ گئیں — وہ لرز ہی تو اٹھے — درختوں پر عجیب و غریب شکل کے پرندے اس جنگ کو حیرت بھرے انداز میں دیکھ رہے تھے، ان کی چونچیں بہت لمبی تھیں — اچانک ان میں سے کچھ اڑے اور اژدھے کے جسم پر اپنی لمبی چونچوں سے ٹھونگیں مارنے لگے — شاید اژدھا انہیں کھاتا رہا تھا — اور چیونٹیوں سے بچتا رہا تھا — آج انہیں اس سے انتقام لینے کا موقع مل گیا تھا — اژدھا اب بُری طرح پیچ و تاب کھانے میں مصروف تھا — ایسے میں انہیں سرسراہٹ سی سنائی دی — دوسرے ہی لمحے وہ دم بخود رہ گئے — ایک اسی قسم کا اژدھا، لیکن اس سے قدرے چھوٹا ان کی طرف بڑھ رہا تھا — شاید یہ مادہ تھی اور اپنے ساتھی کو مشکل میں دیکھ کر مدد کو آ پہنچی تھی۔

" دوڑو ساحل کی طرف — یہ واقعی موت کا جزیرہ ہے۔" انسپکٹر جمشید چلائے اور دوڑ لگا دی۔

" لیکن ابا جان ساحل کی طرف پہنچ کر بھی ہم کیا کر لیں گے، جزیرے کے چاروں طرف تو چٹانیں ہیں — اور چٹانوں کے دوسری طرف بھنور۔" محمود بولا۔

" بھئی — کم از کم ان بلاؤں سے تو دُور ہو جائیں گے۔" خان رحمان نے جواب دیا۔

" لیکن کیسے — یہ بلائیں بھی تو چٹانوں کا رُخ کر سکتی ہیں۔"

"دیکھا جائے گا۔ ہو سکتا ہے، چٹانوں پر پتھر مل جائیں۔ پتھر ہمارے لیے بہترین ہتھیار ثابت ہو سکتے ہیں۔"

وہ دوڑتے چلے گئے۔ ایک بار مڑ کر جو دیکھا تو مادہ اژدھا کو اپنے تعاقب میں پایا۔

"ارے باپ رے۔ یہ تو باقاعدہ تعاقب کر رہی ہے۔" محمود نے تھر تھر کانپتی آواز میں کہا۔

"تو تم کیا چاہتے ہو۔ بے قاعدہ تعاقب کرے۔" فاروق نے منہ بنایا۔

دوڑتے ہوئے وہ چٹانوں تک پہنچ گئے اور ان پر چڑھتے چلے گئے۔ لیکن ایک بھی پتھر نظر نہ آیا۔ چٹانوں کی چوٹی پر پہنچ کر انہوں نے دوسری طرف نظریں ڈالیں۔ سمندر دیکھ کر انہیں چکر سے آنے لگے۔ ان میں کوئی آدمی گر کر مشکل سے ہی بچ سکتا تھا۔

"ہم۔ میرا خیال ہے۔ ہم ان سمندروں سے دور چھلانگیں لگا سکتے ہیں۔" انسپکٹر جمشید بڑبڑائے۔

"بے شک لگا سکتے ہیں۔ لیکن جائیں گے کہاں۔ ہمارے تو چاروں طرف سمندر ہی سمندر ہے۔ آخر ہم سمندر میں کب تک تیر سکیں گے۔" فرزانہ نے کہا۔

"ہوں۔ بات تو یہ بھی ٹھیک ہے۔ اس کا مطلب ہے، دے واٹا نے ہمیں پوری سنجیدگی کے ساتھ موت کے منہ میں دھکیل دیا ہے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

انہوں نے چاروں طرف دیکھا۔

"ہم تو اس جزیرے پر ایک رات بھی نہیں گزار سکیں گے۔ اگر اژدھوں سے بچ بھی گئے تو یہ چیونٹیاں ہمیں نہیں چھوڑیں گی۔" خان رحمان نے کہا۔

"ہوں۔ یہ سب ٹھیک ہے۔ یہ موت کا جزیرہ ہے، ہمارے پاس بچنے کی کوئی صورت نہیں۔ کوئی ترکیب نہیں، کوئی سامان نہیں۔ ہم نہ سمندر میں چھلانگ لگا سکتے ہیں۔ نہ ان چٹانوں پر محفوظ رہ سکتے ہیں، نہ درختوں پر بسیرا کر سکتے ہیں۔ ان سب باتوں کے باوجود میں صرف ایک بات جانتا ہوں۔" انسپکٹر جمشید جذباتی انداز میں کہتے چلے گئے۔

"اور وہ کیا بات ہے، ابا جان۔" محمود بے چین ہو کر بولا۔

اس سے پہلے کہ انسپکٹر جمشید وہ ایک بات انہیں بتاتے، ایک تیز چیخ ان کے کانوں سے ٹکرائی۔

☆ ☆ ☆

"اف خدا۔ یہ چیخ کس کی تھی۔ کیا اس جزیرے پر ہمارے علاوہ کوئی اور انسان بھی ہے۔" فرزانہ نے تھر تھر کانپتی آواز میں کہا۔

"ہو سکتا ہے۔ دے واٹا نے ہم سے پہلے کسی اور کو بھی موت کے جزیرے پر پھنکوایا ہو۔ تاہم یہ آواز پروفیسر صاحب کی تو ہرگز نہیں تھی۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"ہوں، لیکن تھی انسانی ہی۔ کسی جانور کی ہرگز نہیں تھی۔ گویا ہمیں اسے بچانے کے لیے ایک بار پھر جزیرے کا رُخ کرنا ہوگا۔" محمود فکر مندانہ لہجے میں بولا۔

"ایک ترکیب ہے، کہ تم سب یہیں ٹھہرو۔ صرف میں جا کر دیکھتا ہوں۔ وہ کون ہے۔"

"نہیں جمشید۔ جائیں گے تو سب جائیں گے۔" خان رحمان نے پُرزور انداز میں نفی میں سر ہلایا۔

"بھئی۔ یہ کیا عقل مندی ہے۔ سب کی جان کیوں خطرے میں ڈالی جائے۔"

"اور یہاں جانیں خطرے سے باہر کب ہیں۔" فرزانہ بول اٹھی۔

"اچھا خیر آؤ۔ دیکھتے ہیں۔"

یہ کہہ کر وہ نیچے اترنے لگے۔ پھر جزیرے کی زمین پر دوڑنے لگے۔ انہوں نے دیکھا۔ دونوں اژدھا چیونٹیوں سے پیچھا چھڑا کر چٹانوں کا رُخ کر رہے تھے۔

"شاید انہوں نے چیونٹیوں کی دال نہیں گلنے دی۔"

"چیونٹیوں کی دال۔ وہ بھی ان زہریلی چیونٹیوں کی۔ ارے باپ رے۔" فاروق بوکھلا اٹھا۔

"نیچے دیکھتے ہوئے چلنا۔ ایسا نہ ہو۔ کوئی اور زہریلا کیڑا۔"

انسپکٹر جمشید کے الفاظ درمیان میں رہ گئے۔ انہیں اپنے رونگٹے کھڑے ہوتے دکھائی دیے۔ ان کے راستے میں نیلے رنگ کے چار بچھو ناچ رہے تھے۔ وہ چکر پھیریاں سی کاٹ رہے تھے۔ بچھو کم از کم مینڈک جتنے تو ضرور تھے۔

"اف خدا۔ سانپ سے بھی زہریلے بچھو۔ یہ۔ آدمی کو پانی بنا دیتے ہیں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"آدمی کو پانی۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔"

"ہاں۔ اگر آدمی کو کاٹ لیں تو چند منٹ میں آدمی پانی کر بہہ جاتا ہے۔"

"ارے باپ رے۔ یہاں تو پہلے ہی پانی بہت ہے۔" فاروق نے گڑبڑا کر کہا۔

"یہ کیا بات ہوئی۔ پانی پہلے ہی بہت ہے۔" محمود نے اسے گھورا۔ ساتھ ساتھ وہ بچھوؤں کے راستے سے ہٹتے جا رہے تھے، ایسے میں فرزانہ کو ایک چھوٹا سا پتھر نظر آ گیا اور یہ اس جزیرے پر پہلا پتھر نظر آیا تھا۔ اس نے جھک کر اسے اُٹھا لیا اور لگی ایک بچھو کا نشانہ لینے۔ انسپکٹر جمشید کی نظر عین اس وقت اس پر پڑی جب اس نے پتھر بچھوؤں پر دے مارا۔ وہ بجلی کی سرعت سے حرکت میں آئے اور پتھر کو دبوچ لیا، ساتھ ہی بولے:

"یہ کیا کر رہی ہو فرزانہ۔"

"لک۔ کیا۔ میں نے غلطی کی۔" وہ گھبرا گئی۔

"ہاں، اگر پتھر کسی بچھو کے لگ جاتا تو اس کے زہر کے چھینٹے

ہم پر پڑ سکتے تھے۔ زہر کے چھینٹے جسم پر گرنے پر بھی ہم پانی بن سکتے تھے۔"

"ارے باپ رے۔ پھر تو میں معافی چاہتی ہوں اباجان۔" فرزانہ نے بوکھلائی ہوئی آواز میں کہا۔

"اب معافی مانگنے کا کیا فائدہ۔ پتھر تو مار ہی چکی ہو۔" فاروق نے کہا۔

اتنی دیر میں وہ بچھوؤں کا راستہ کاٹ چکے تھے۔ اور جزیرے میں آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ کوئی درخت بھی انہیں ایسا نظر نہ آیا جس پر چیونٹیاں یا دوسرے کیڑے مکوڑے نہ ہوں۔ گویا پورا جزیرا ہی خطرات سے پٹا پڑا تھا۔

"حیرت ہے۔ وہ چیخ پھر سنائی نہیں دی۔ ایک بار سنائی دے کر ہی رہ گئی۔" فاروق بڑبڑایا۔

"شش۔ شاید ہمارا امتحان لے رہی ہے۔" محمود کے منہ سے نکلا۔

"کیا چیز ہمارا امتحان لے رہی ہے؟" فرزانہ نے بے دھیانی میں کہا۔

"وہ چیخ۔" محمود مسکرایا۔

"لیجیے۔ اب چیخیں بھی امتحان لینے لگیں۔ اُستاد صاحبان تو گئے کام سے۔" فاروق چہکا۔

"بھئی ان حالات میں تو سنجیدہ ہو جاؤ۔" انسپکٹر جمشید نے اسے گھورا۔

اتنی دیر میں وہ جزیرے کے دوسرے سرے پر پہنچ چکے تھے۔

"ہمیں تو جزیرے میں کوئی نظر نہیں آیا۔"

"تب پھر۔ کہیں کوئی شخص ان چٹانوں کے دوسری طرف بھنور میں تو نہیں پھنس گیا۔" محمود بولا۔

"وہ بھنور میں پھنسنے کے لیے یہاں کہاں سے آگیا۔" فاروق حیران ہو کر بولا اور خان رحمان کی ہنسی نکل گئی

"آؤ چٹانوں پر چڑھ کر ہی دیکھ لیتے ہیں۔"

انہوں نے تیز رفتاری سے چڑھنا شروع کیا۔ آخر چوٹی پر پہنچ کر سمندر کی طرف دیکھا۔ دوسرے ہی لمحے ان کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ آنکھیں خوف کے مارے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

بھنور میں ایک لانچ پھرکی کی طرح گھوم رہی تھی۔

○

"ارے۔ یہ تو لانچ ہے۔" محمود چیخا۔

"اور اگر۔ یہ لانچ کسی طرح ہم بھنور سے نکال لیں تو ہم اس جزیرے سے بچ سکتے ہیں۔" فرزانہ نے پُرجوش لہجے میں کہا۔

"ہاں۔ تم بھی ٹھیک کہتی ہو، لیکن میں کچھ اور دیکھ رہا ہوں۔" انسپکٹر جمشید نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"اور وہ کیا جمشید؟" خان رحمان بے چین ہو کر کہا۔

"میرا خیال ہے۔ لانچ میں کچھ انسان بھی سوار ہیں۔"

"اوہ۔ تت۔ تو کیا۔ پروفیسر داؤد۔" خان رحمان مارے بوکھلاہٹ کے جملہ مکمل نہ کر سکے۔

"نہیں۔ یہ ایک سے زائد ہیں۔ انتہائی تیزی سے گھومنے کی وجہ سے میں صاف طور پر دیکھنے کے قابل نہیں۔ خان رحمان، ان لوگوں کو ہمیں بچانا ہی ہوگا۔"

"لل۔ لیکن کیسے۔ جمشید۔ تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا۔"

"نہیں خان رحمان۔ ابھی میرا دماغ نہیں چلا۔" وہ بولے۔

"تب پھر۔ یہ کس طرح ممکن ہے کہ ہم انہیں بچا سکیں۔" وہ حیران ہو کر بولے۔

"پتا نہیں۔ یہ ممکن ہے یا نہیں۔ میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ اس لانچ کے ساتھ ایک رسہ بھی بندھا ہوا ہے۔ وہ بھی لانچ کے ساتھ پانی پر تیرتے ہوئے گھوم رہا ہے۔ خان رحمان، تم نے سکول، کالج اور فوج کی زندگی میں رسہ کشی تو کی ہوگی۔" انہوں نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"کک۔ مطلب۔ یہاں رسہ کشی کہاں سے آ کودی۔" خان رحمان کا منہ کھل گیا۔

"ہاں اور کیا۔ یہاں تو خودکشی کو آ کودنا چاہیے تھا۔" فاروق بول پڑا۔

"آج ہم بھی رسہ کشی کے مقابلے میں حصہ لیں گے۔ میرے پیچھے لمبی چھلانگیں لگا دو۔ تم لوگوں کو بھنور سے دُور گرنا چاہیے۔ ورنہ تم بھی لپیٹ میں آ جاؤ گے۔ ٹھہرو۔ پہلے میں چھلانگ لگاؤں گا۔"

"جمشید۔ سوچ سمجھ تو لو۔" خان رحمان کانپ اٹھے، لیکن ان الفاظ سے پہلے ہی وہ چھلانگ لگا چکے تھے۔ انہیں یوں لگا جیسے وہ ہوا میں تیرتے ہوئے بھنور پھلانگ گئے ہوں۔ ان کے گرنے سے ایک زوردار چھپاکا ہوا۔ ساتھ ہی انہوں نے آواز لگائی:

"آجاؤ۔ یہ زیادہ مشکل نہیں۔ اور اگر کوئی اوچھا بھی گرا۔ تو میں سنبھال لوں گا۔"

ان کے پیچھے پہلے محمود نے چھلانگ لگائی۔ اور ان کے قریب گرا۔ پھر فاروق اور فرزانہ نے۔ خان رحمان نے بھی چھلانگ لگانے میں دیر نہ لگائی۔ اب وہ بھنور سے کچھ فاصلے پر تیر رہے تھے اور بھنور کا اثر وہاں تک آ رہا تھا۔ پانی انہیں کھینچتا محسوس ہو رہا تھا۔

"خان رحمان۔ ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑ لو۔ تم میرا ہاتھ۔ محمود تمہارا۔ فاروق محمود کا اور فرزانہ فاروق کا۔ میں اس رسے کو۔

پکڑوں گا اور بھنور کے مخالف سمت میں زور لگانا شروع کروں گا۔ تم لوگ میری مدد کرو گے۔ گویا بھنور اور ہمارے درمیان رسہ کشی ہوگی۔"

"بھنور سے رسہ کشی۔" خان رحمان نے بوکھلا کر کہا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو وہ ضرور ہنس پڑتے، لیکن جمشید بھنور کے دائرے کے نزدیک ہوتے چلے گئے۔ بھنور انہیں اپنی لپیٹ میں لینے لگا۔ عین اسی وقت رسہ انسپکٹر جمشید کے ہاتھ سے چھو گیا۔ بس پھر کیا تھا۔ انہوں نے رسہ تھام لیا اور بولے:

"چلو میری ٹیم۔ آج اس بھنور کو شکست دے دو۔"

اور وہ مخالف سمت میں زور لگانے لگے۔ اس طرح تیرنا بے حد مشکل کام تھا۔ بھنور انہیں اپنی طرف کھینچ رہا تھا اور وہ اس میں پھنسی لانچ کو کھینچ لینے کے لیے زور لگا رہے تھے۔

"یار جمشید۔ یہ تو واقعی رسہ کشی کا مقابلہ ہے۔" خان رحمان نے ہانپتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ لیکن خدا کے لیے ابھی ہانپنا نہ شروع کرو۔ ہانپنے کو ذرا بریک لگا لو۔"

"ہانپنے کو بریک۔ ابا جان۔ کیا اس وقت آپ مذاق کے موڈ میں ہیں۔" فاروق نے بوکھلا کر کہا۔

"میرے لیے مذاق کے تو بس ایسے ہی مواقع ہوا کرتے ہیں۔" انسپکٹر جمشید خوش دلی سے بولے۔

اور پھر ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ جب پہلا ہی ہلہ کشتی کو بھنور سے نکال لایا اور یہ شاید اس وجہ سے ہوا کہ ان لوگوں نے جب رسہ پکڑا اور مخالف سمت میں زور لگایا، تو بلا کی رفتار سے چکر کھاتی لانچ کو زبردست جھٹکا لگا اور وہ اچھل کر بھنور کے باہر آگئی۔

"وہ مارا۔ اور زور لگاؤ۔ کہیں بھنور اسے واپس نہ کھینچ لے۔" انسپکٹر جمشید چلا اٹھے۔

"اب بے چارہ بھنور اسے کیا کھینچے گا۔" فاروق نے شوخ آواز میں کہا۔

دس منٹ بعد وہ پرسکون پانی میں تیر رہے تھے۔ اور تیرنے کے دوران سکون کا سانس لیتے ہی انہوں نے مڑ کر کشتی کی طرف دیکھا:

"اف خدا۔ اس پر تو واقعی کچھ انسان موجود ہیں۔" خان رحمان نے کانپ کر کہا۔

"انسانوں کے علاوہ کوئی اور چیز بھی ہے۔"

"اور یہ لوگ لقمۂ اجل بنتے بنتے بچے۔" خان رحمان بولے۔

"خیر۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا۔ ان کا ابھی وقت ہی نہیں آیا تھا تو موت کا لقمہ کس طرح بن سکتے تھے۔"

"آخر ہم کب تک اسی طرح تیریں گے۔ کیوں نہ لانچ پر سوار ہو جائیں۔" محمود نے تجویز پیش کی۔

"لانچ پر سوار ہونا خطرناک ہوگا۔ جب تک ہم میں سکت ہے۔ اسی طرح تیریں گے اور اگر کوئی جزیرہ یا ساحل نظر نہ آیا تو پھر مجبوراً اس پر چڑھ جائیں گے۔"

"ارے۔ وہ دیکھیے۔ کچھ درخت نظر آ رہے ہیں۔" فرزانہ چلائی۔

"خدا کرے۔ یہ کوئی جزیرہ ہو۔"

اس سمت میں آدھ گھنٹے تک مزید تیرنے کے بعد انہوں نے دیکھا۔ وہ کوئی جزیرہ نہیں تھا۔ البتہ سرسبز اور شاداب پہاڑ ضرور تھے۔

"چلیے خیر۔ کچھ نہ ہونے سے تو یہ پہاڑ ہی بہتر ہیں۔ ہم نہ صرف خود ان پر چڑھ سکتے ہیں۔ بلکہ ان لوگوں کو بھی پانی میں ڈوبنے سے بچا سکتے ہیں۔"

ایسے میں ان کی نظر پہاڑ کی چوٹی کی طرف گئی۔ پہاڑ کی چوٹی سے انہیں ایک عجیب سی چیز لٹکی نظر آئی۔ کئی سیکنڈ تک وہ اس کی طرف دیکھتے رہے۔ آخر انسپکٹر جمشید بولے:

"کیوں بھئی۔ کیا خیال ہے۔ یہ کیا چیز لٹک رہی ہے۔"

"شاید یہ بھڑوں کا چھتہ ہے۔ اف خدا۔ اتنا بڑا چھتہ ہم نے زندگی میں کبھی نہ دیکھا ہوگا۔" محمود بڑبڑایا۔

"لیکن میرا خیال ہے۔ یہ بھڑوں کا نہیں، شہد کی مکھیوں کا چھتہ ہے۔" فرزانہ نے کہا۔

"بھڑیں اور شہد کی مکھیاں اپنے چھتے پہاڑوں پر نہیں بناتیں، تمہیں اتنا بھی معلوم نہیں۔" فاروق تلملا کر بولا۔

"تب پھر۔ تم ہی بتاؤ۔ یہ کیا چیز ہے۔" محمود بھنا اٹھا۔

"میرے خیال میں تو یہ پہاڑ کا رس ہے۔ جیسے درختوں کا رس ہوتا ہے، اب یہ اور بات ہے کہ ہم درختوں کے رس کو گوند کہتے ہیں۔"

"لیجیے۔ اور سنیے۔ پہاڑ کا رس۔" فرزانہ نے مذاق اڑانے والے لہجے میں کہا۔

"خان رحمان۔ تم کیوں خاموش ہو۔ تم بھی تو کوئی خیال ظاہر کرو۔" انسپکٹر جمشید نے انہیں خاموش پا کر کہا۔

"م۔ میں۔ یعنی کہ میں۔ ہاں ٹھیک تو ہے۔ میرا بھی کوئی خیال تو ہونا ہی چاہیے۔ تو سنو جمشید۔ میرا خیال یہ ہے کہ یہ واقعی۔" وہ کہتے کہتے رک گئے۔

"یہ کیا بات ہوئی۔" انسپکٹر جمشید نے حیران ہو کر کہا۔

"سوچ رہا ہوں۔ آخر کیا خیال ظاہر کروں۔ بس یوں سمجھ لو کہ میرے فرشتے بھی ابھی تک نہیں جان سکے کہ یہ کیا ہے۔ ہاں ہے کوئی عجیب و غریب چیز۔" خان رحمان جلدی جلدی بولے۔

انسپکٹر جمشید اب پہاڑ کے دامن میں کھڑے ہو کر رسے کو کھینچ رہے تھے اور کشتی آہستہ آہستہ ان کی طرف بڑھ رہی تھی۔

سنائی نہ دے جاتی تو ابھی تک وہ اس کی طرف سے بے خبر ہی رہتے ــ محمود، فاروق، فرزانہ اور خان رحمان پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں اژدھے کی دُم کی طرف جاتے دیکھتے رہے ــ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں، آخر وہ عین دُم کے نزدیک پہنچ گئے ــ اژدھا ابھی تک ان کی اس طرف موجودگی سے بے خبر تھا ــ اور یہ شاید اس لیے تھا کہ اس کے سامنے چار انسان کھڑے تھے اور ان کی بُو اسے آ رہی تھی۔

وہ اچانک جھکے اور اژدھے کی دُم کو پکڑ کر اسے چکر دینے کے لیے زور لگایا، لیکن اس وقت ان کی ترکیب دھری کی دھری رہ گئی جب اژدھے کا صرف نصف پچھلا دھڑ ہی ان سے اٹھ سکا وہ بہت وزنی تھا ــ شاید کئی من اور اس قدر وزنی اژدھے کو انسپکٹر جمشید اکیلے اٹھا کر گھما نہیں سکتے تھے ــ انہوں نے دراصل سوچا یہی تھا ــ کہ گھماتے گھماتے اس کا منہ کسی درخت سے ٹکرا دیں گے، لیکن جب ایسا نہ ہو سکا تو اژدھے نے اپنا اگلا دھڑ اٹھایا اور ان پر حملہ آور ہوا ــ وہ اس کی دُم چھوڑ کر پیچھے ہٹے، لیکن فوراً ہی دُم ان کے دائیں پہلو سے ٹکرائی ــ انہیں یوں لگا جیسے دایاں پہلو جل اٹھا ہو ــ وہ کئی قدم پیچھے لڑکھڑا گئے ــ اب اژدھا ان کی طرف مڑا ــ انہوں نے چلّا کر کہا:

"اس کا مقابلہ ہتھیار کے بغیر بہت مشکل ہے ــ محمود، فاروق ــ فرزانہ ــ درختوں کی بڑی بڑی شاخیں توڑنے کی کوشش کرو ــ کم از کم میں ایسی کسی شاخ سے اس کی آنکھیں تو پھوڑ ہی سکوں گا۔"

تینوں ان کا حکم سُن کر درختوں کی طرف بڑھے ــ خان رحمان نے بھی ان کا ساتھ دینے کے لیے قدم اٹھائے ہی تھے کہ انسپکٹر جمشید بولے:

"نہیں خان رحمان ــ تم میری طرف متوجہ رہو ــ میں شدید تکلیف محسوس کر رہا ہوں ــ یہ اژدھا انتہائی خطرناک ہے ــ رے راٹا نے غلط نہیں کہا تھا ــ یہ موت کا جزیرہ ہے۔" انہوں نے جلدی جلدی کہا ــ

"جمشید فکر نہ کرو ــ اور مجھے بتاؤ ــ میں کس طرح تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔" خان رحمان نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

عین اسی وقت انہوں نے محمود، فاروق اور فرزانہ کی چیخیں سنیں ــ اژدھا اس وقت تک پوری طرح انسپکٹر جمشید کی طرف گھوم چکا تھا اور اب پھر ان کا رُخ کر رہا تھا ــ دونوں نے بوکھلا کر اس پر سے نظریں ہٹائیں اور ان کی طرف دیکھا ــ وہ مارے خوف کے لرزتے نظر آئے:

"کک ــ کیا ہوا؟" خان رحمان ہکلائے۔

"ہم ــ ہم کسی درخت کی شاخ نہیں توڑ سکتے۔" محمود نے تھر تھر کانپتی آواز میں کہا۔

"کیوں ــ کیا بات ہے؟" انسپکٹر جمشید نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ہر درخت کی ہر شاخ پر بڑی بڑی سُرخ رنگ کی چیونٹیاں رینگ رہی ہیں ــ یہ ادھر سے ادھر آ جا رہی ہیں، یوں لگتا ہے ــ جیسے انہیں شاخوں پر آنے جانے کے سوا کوئی کام نہ ہو ــ رے راٹا نے بھی ان چیونٹیوں کا ذکر کیا تھا ــ ان حالات میں آپ ہی بتائیے، ہم کیا کر سکتے ہیں۔"

"اوہ ــ تب تو یہ خونی چیونٹیاں ان درختوں کے نیچے بھی گر رہی ہوں گی ــ اور وہ ہمارے پیروں پر چڑھ کر ٹانگوں پر کاٹ سکتی ہیں۔" خان رحمان گھبرا کر بولے اور زمین کی طرف دیکھا ــ ان کا رنگ اڑ گیا ــ نہ جانے کتنی چیونٹیاں اژدھے کی طرف بڑھی چلی آ رہی تھیں ــ ادھر اژدھا ان کی طرف سے بے فکر ان کی طرف متوجہ تھا ــ فرق صرف یہ تھا کہ چیونٹیاں چاروں طرف سے اژدھے کا رُخ کر رہی تھیں ــ جب کہ اژدھا ان کی طرف صرف ایک سمت سے بڑھ سکتا تھا ــ لہٰذا نتیجہ یہ ہوا کہ چیونٹیاں اس تک پہنچ گئیں ــ اور اس کے جسم پر چڑھتی نظر آئیں ــ انہوں نے اژدھے کو پلٹنی کھاتے دیکھا، اس نے اپنی دُم کو اس زور سے زمین پر مارا کہ زور دار دھمک پیدا ہوئی ــ اور ہزاروں چیونٹیاں اس کی دُم کا شکار ہو گئیں ــ لیکن اس وقت تک وہ بھی اسے جگہ جگہ سے کاٹ چکی تھیں اور وہ بُری طرح پلٹنیاں کھا رہا تھا ــ بار بار زمین پر دُم اور منہ مار رہا تھا ــ اس کی پھنکار جلدی جلدی سنائی دینے لگی ــ چیونٹیوں اور اژدھے کی جنگ انہوں نے زندگی میں پہلی بار دیکھی تھی ــ ان کے رونگٹے پوری طرح کھڑے ہو چکے تھے ــ ایسے میں ان کی نظریں جزیرے کے درختوں کی طرف اٹھ گئیں ــ وہ لرز ہی تو اٹھے ــ درختوں پر عجیب و غریب شکل کے پرندے اس جنگ کو حیرت بھرے انداز میں دیکھ رہے تھے، ان کی چونچیں بہت لمبی تھیں ــ اچانک ان میں سے کچھ اُڑے اور اژدھے کے جسم پر اپنی لمبی چونچوں سے ٹھونگیں مارنے لگے ــ شاید اژدھا انہیں کھاتا رہا تھا ــ اور چیونٹیوں سے بچتا رہا تھا ــ آج انہیں اس سے انتقام لینے کا موقع مل گیا تھا ــ اژدھا اب بُری طرح پیچ و تاب کھانے میں مصروف تھا ــ ایسے میں انہیں سرسراہٹ سی سنائی دی ــ دوسرے ہی لمحے وہ دم بخود رہ گئے ــ ایک اسی قسم کا اژدھا، لیکن اس سے قدرے چھوٹا ان کی طرف بڑھ رہا تھا ــ شاید یہ مادہ تھی اور اپنے ساتھی کو مشکل میں دیکھ کر مدد کو آ پہنچی تھی۔

"دوڑو ساحل کی طرف ــ یہ واقعی موت کا جزیرہ ہے۔" انسپکٹر جمشید چلّائے اور دوڑ لگا دی۔

"لیکن ابا جان ساحل کی طرف پہنچ کر بھی ہم کیا کر لیں گے، جزیرے کے چاروں طرف تو چٹانیں ہیں ــ اور چٹانوں کے دوسری طرف بھنور ــ" محمود بولا۔

"بھئی ــ کم از کم ان بلاؤں سے تو دُور ہو جائیں گے۔" خان رحمان نے جواب دیا۔

"لیکن کیسے ــ یہ بلائیں بھی تو چٹانوں کا رُخ کر سکتی ہیں۔"

"دیکھا جائے گا۔ ہو سکتا ہے، چٹانوں پر پتھر مل جائیں۔ پتھر ہمارے لیے بہترین ہتھیار ثابت ہو سکتے ہیں۔"

وہ دوڑتے چلے گئے۔ ایک بار مڑ کر جو دیکھا تو مادہ اژدھا کو اپنے تعاقب میں پایا۔

"ارے باپ رے۔ یہ تو باقاعدہ تعاقب کر رہی ہے۔" محمود نے تھر تھر کانپتی آواز میں کہا۔

"تو تم کیا چاہتے ہو۔ بے قاعدہ تعاقب کرے۔" فاروق نے منہ بنایا۔

دوڑتے ہوئے وہ چٹانوں تک پہنچ گئے اور ان پر چڑھتے چلے گئے۔ لیکن ایک بھی پتھر نظر نہ آیا۔ چٹانوں کی چوٹی پر پہنچ کر انہوں نے دوسری طرف نظریں ڈالیں۔ سمندر دیکھ کر انہیں چکر سے آنے لگے۔ ان میں کوئی آدمی گر کر مشکل سے ہی بچ سکتا تھا۔

"ہم۔ میرا خیال ہے۔ ہم ان سمندروں سے دور چھلانگیں لگا سکتے ہیں۔" انسپکٹر جمشید بڑبڑائے۔

"بے شک لگا سکتے ہیں۔ لیکن جائیں گے کہاں۔ ہمارے تو چاروں طرف سمندر ہی سمندر ہے۔ آخر ہم سمندر میں کب تک تیر سکیں گے۔" فرزانہ نے کہا۔

"ہوں۔ بات تو یہ بھی ٹھیک ہے۔ اس کا مطلب ہے، سے راٹا نے ہمیں پوری سنجیدگی کے ساتھ موت کے منہ میں دھکیل دیا ہے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

انہوں نے چاروں طرف دیکھا۔

"ہم تو اس جزیرے پر ایک رات بھی نہیں گزار سکیں گے۔ اگر اژدھوں سے بچ بھی گئے تو یہ چیونٹیاں ہمیں نہیں چھوڑیں گی۔" خان رحمان نے کہا۔

"ہوں۔ یہ سب ٹھیک ہے۔ یہ موت کا جزیرہ ہے، ہمارے پاس بچنے کی کوئی صورت نہیں۔ کوئی ترکیب نہیں، کوئی سامان نہیں۔ ہم نہ سمندر میں چھلانگ لگا سکتے ہیں۔ نہ ان چٹانوں پر محفوظ رہ سکتے ہیں، نہ درختوں پر بسیرا کر سکتے ہیں۔ ان سب باتوں کے باوجود میں صرف ایک بات جانتا ہوں۔" انسپکٹر جمشید جذباتی انداز میں کہتے چلے گئے۔

"اور وہ کیا بات ہے، ابا جان۔" محمود بے چین ہو کر بولا۔

اس سے پہلے کہ انسپکٹر جمشید وہ ایک بات انہیں بتاتے، ایک تیز چیخ ان کے کانوں سے ٹکرائی۔

☆ ☆ ☆

"اف خدا۔ یہ چیخ کس کی تھی۔ کیا اس جزیرے پر ہمارے علاوہ کوئی اور انسان بھی ہے۔" فرزانہ نے تھر تھر کانپتی آواز میں کہا۔

"ہو سکتا ہے۔ سے راٹا نے ہم سے پہلے کسی اور کو بھی موت کے جزیرے پر پھنکوایا ہو۔ تاہم یہ آواز پروفیسر صاحب کی تو ہر گز نہیں تھی۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"ہوں۔ لیکن تھی انسانی ہی۔ کسی جانور کی ہر گز نہیں تھی۔ گویا ہمیں اسے بچانے کے لیے ایک بار پھر جزیرے کا رخ کرنا ہوگا۔" محمود فکر مندانہ لہجے میں بولا۔

"ایک ترکیب یہ ہے کہ تم سب یہیں ٹھہرو۔ صرف میں جا کر دیکھتا ہوں۔ وہ کون ہے۔"

"نہیں جمشید۔ جائیں گے تو سب جائیں گے۔" خان رحمان نے پرزور انداز میں نفی میں سر ہلایا۔

"بھئی۔ یہ کیا عقل مندی ہے۔ سب کی جان کیوں خطرے میں ڈالی جائے۔"

"اور یہاں جانیں خطرے سے باہر کب ہیں۔" فرزانہ بول اٹھی۔

"اچھا خیر آؤ۔ دیکھتے ہیں۔"

یہ کہہ کر وہ نیچے اترنے لگے۔ پھر جزیرے کی زمین پر دوڑنے لگے۔ انہوں نے دیکھا۔ دونوں اژدھا چیونٹیوں سے پیچھا چھڑا کر چٹانوں کا رخ کر رہے تھے۔

"شاید انہوں نے چیونٹیوں کی دال نہیں گلنے دی۔"

"چیونٹیوں کی دال۔ وہ بھی ان زہریلی چیونٹیوں کی۔ ارے باپ رے۔" فاروق بوکھلا اٹھا۔

"نیچے دیکھتے ہوئے چلنا۔ ایسا نہ ہو۔ کوئی اور زہریلا کیڑا۔"

انسپکٹر جمشید کے الفاظ درمیان میں رہ گئے۔ انہیں اپنے رونگٹے کھڑے ہوتے دکھائی دیے۔ ان کے راستے میں نیلے رنگ کے چار بچھو ناچ رہے تھے۔ وہ چکر پھیریاں سی کاٹ رہے تھے۔ بچھو کم از کم مینڈک جتنے تو ضرور تھے۔

"اف خدا۔ سانپ سے بھی زہریلے بچھو۔ یہ۔ آدمی کو پانی بنا دیتے ہیں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"کیا کہا۔ پانی۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔"

"ہاں۔ اگر یہ آدمی کو کاٹ لیں تو چند منٹ میں آدمی پانی کر بہہ جاتا ہے۔"

"ارے باپ رے۔ یہاں تو پہلے ہی پانی بہت ہے۔" فاروق نے گڑبڑا کر کہا۔

"یہ کیا بات ہوئی۔ پانی پہلے ہی بہت ہے۔" محمود نے اسے گھورا۔ ساتھ ساتھ وہ بچھوؤں کے راستے سے ہٹتے جا رہے تھے، ایسے میں فرزانہ کو ایک چھوٹا سا پتھر نظر آ گیا اور یہ اس جزیرے پر پہلا پتھر نظر آیا تھا۔ اس نے جھک کر اسے اٹھا لیا اور لگی ایک بچھو کا نشانہ لینے۔ انسپکٹر جمشید کی نظریں اس وقت اس پر پڑی جب اس نے پتھر بچھوؤں پر دے مارا۔ وہ بجلی کی سرعت سے حرکت میں آئے اور پتھر کو دبوچ لیا، ساتھ ہی بولے:

"یہ کیا کر رہی ہو فرزانہ۔"

"لگ۔ کیا۔ میں نے غلطی کی۔" وہ گھبرا گئی۔

"ہاں، اگر پتھر کسی بچھو کے لگ جاتا تو اس کے زہر کے چھینٹے

ہم پر پڑ سکتے تھے۔ زہر کے چھینٹے جسم پر گرنے پر بھی ہم پانی بن سکتے تھے۔"

" ارے باپ رے۔ پھر تو میں معافی چاہتی ہوں اباجان۔" فرزانہ نے بوکھلائی ہوئی آواز میں کہا۔

" اب معافی مانگنے کا کیا فائدہ۔ بہتر تو مار ہی چکی ہو۔" فاروق نے کہا۔

اتنی دیر میں وہ بچھوؤں کا راستہ کاٹ چکے تھے۔ اور جزیرے میں آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ کوئی درخت بھی انہیں ایسا نظر نہ آیا جس پر چیونٹیاں یا دوسرے کیڑے مکوڑے نہ ہوں۔ گویا پورا جزیرا ہی خطرات سے پٹا پڑا تھا۔

" حیرت ہے۔ وہ چیخ پھر سنائی نہیں دی۔ ایک بار سنائی دے کر ہی رہ گئی۔" فاروق بڑبڑایا۔

" شش۔ شاید ہمارا امتحان لے رہی ہے۔" محمود کے منہ سے نکلا۔

" کیا چیز ہمارا امتحان لے رہی ہے؟" فرزانہ نے بے دھیانی میں کہا۔

" وہ چیخ۔" محمود مسکرایا۔

" لیجیے۔ اب چیخیں بھی امتحان لینے لگیں۔ استاد صاحبان تو گئے کام سے۔" فاروق چہکا۔

" بھئی ان حالات میں تو سنجیدہ ہو جاؤ۔" انسپکٹر جمشید نے اسے گھورا۔

اتنی دیر میں وہ جزیرے کے دوسرے سرے پر پہنچ چکے تھے۔

" ہمیں تو جزیرے میں کوئی نظر نہیں آیا۔"

" تب پھر۔ کہیں کوئی شخص ان چٹانوں کے دوسری طرف بھنور میں تو نہیں پھنس گیا۔" محمود بولا۔

" وہ بھنور میں پھنسنے کے لیے یہاں کہاں سے آ گیا۔" فاروق حیران ہو کر بولا اور خان رحمان کی ہنسی نکل گئی۔

" آؤ چٹانوں پر چڑھ کر ہی دیکھ لیتے ہیں۔"

انہوں نے تیز رفتاری سے چڑھنا شروع کیا۔ آخر چوٹی پر پہنچ کر سمندر کی طرف دیکھا۔ دوسرے ہی لمحے ان کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ آنکھیں خوف کے مارے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

بھنور میں ایک لانچ پھرکی کی طرح گھوم رہی تھی۔

○

" ارے۔ یہ تو لانچ ہے۔" محمود چیخا۔

" اور اگر۔ یہ لانچ کسی طرح ہم بھنور سے نکال لیں تو ہم اس جزیرے سے بچ سکتے ہیں۔" فرزانہ نے پرجوش لہجے میں کہا۔

" ہاں۔ تم بھی ٹھیک کہتی ہو، لیکن میں کچھ اور دیکھ رہا ہوں۔" انسپکٹر جمشید نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

" اور وہ کیا جمشید؟" خان رحمان بے چین ہو کر کہا۔

" میرا خیال ہے۔ لانچ میں کچھ انسان بھی سوار ہیں۔"

" اوہ۔ تت۔ تو کیا۔ پروفیسر داؤد۔" خان رحمان مارے بوکھلاہٹ کے جملہ مکمل نہ کر سکے۔

" نہیں۔ یہ ایک سے زائد ہیں۔ انتہائی تیزی سے گھومنے کی وجہ سے میں صاف طور پر دیکھنے کے قابل نہیں۔ خان رحمان، ان لوگوں کو ہمیں بچانا ہی ہو گا۔"

" ل۔ لیکن کیسے۔ جمشید۔ تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا۔"

" نہیں خان رحمان۔ ابھی میرا دماغ نہیں چلا۔" وہ بولے۔

" تب پھر۔ یہ کس طرح ممکن ہے کہ ہم انہیں بچا سکیں۔" وہ حیران ہو کر بولے۔

" پتا نہیں۔ یہ ممکن ہے یا نہیں۔ میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ اس لانچ کے ساتھ ایک رسہ بھی بندھا ہوا ہے۔ وہ بھی لانچ کے ساتھ پانی پر تیرتے ہوئے گھوم رہا ہے۔ خان رحمان، تم نے سکول، کالج اور فوج کی زندگی میں رسہ کشی تو کی ہو گی۔" انہوں نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

" ک۔ مطلب۔ یہاں رسہ کشی کہاں سے آ کودی۔" خان رحمان کا منہ کھل گیا۔

" ہاں اور کیا۔ یہاں تو خودکشی کر آ کودنا چاہیے تھا۔" فاروق بول پڑا۔

" آج ہم بھی رسہ کشی کے مقابلے میں حصہ لیں گے۔ میرے پیچھے لمبی چھلانگیں لگا دو۔ تم لوگوں کو بھنور سے دور گرنا چاہیے۔ ورنہ تم بھی لپیٹ میں آ جاؤ گے۔ ٹھہرو۔ پہلے میں چھلانگ لگاؤں گا۔"

" جمشید۔ سوچ سمجھ تو لو۔" خان رحمان کانپ اٹھے، لیکن ان الفاظ سے پہلے ہی وہ چھلانگ لگا چکے تھے۔ انہیں یوں لگا جیسے وہ ہوا میں تیرتے ہوئے بھنور پھلانگ گئے ہوں۔ ان کے گرنے سے ایک زوردار چھپاکا ہوا۔ ساتھ ہی انہوں نے آواز لگائی:

" آ جاؤ۔ یہ زیادہ مشکل نہیں۔ اور اگر کوئی اوچھا بھی گرا۔ تو میں سنبھال لوں گا۔"

ان کے پیچھے پہلے محمود نے چھلانگ لگائی۔ اور ان کے قریب گرا۔ پھر فاروق اور فرزانہ نے۔ خان رحمان نے بھی چھلانگ لگانے میں دیر نہ لگائی۔ اب وہ بھنور سے کچھ فاصلے پر تیر رہے تھے اور بھنور کا اثر وہاں تک آ رہا تھا۔ پانی انہیں کھینچتا محسوس ہو رہا تھا۔

" خان رحمان۔ ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑ لو۔ تم میرا ہاتھ۔ محمود تمہارا۔ فاروق محمود کا اور فرزانہ فاروق کا۔ میں اس رسے کو۔

پکڑوں گا اور بھنور کے مخالف سمت میں زور لگانا شروع کردوں گا۔تم لوگ میری مدد کرو گے۔گویا بھنور اور ہمارے درمیان رسہ کشی ہوگی۔"

"بھنور سے رسہ کشی!" خان رحمان نے بوکھلا کر کہا۔کوئی اور موقع ہوتا تو وہ ضرور ہنس پڑتے، لیکن جمشید بھنور کے دائرے کے نزدیک ہوتے چلے گئے۔بھنور انہیں اپنی لپیٹ میں لینے لگا۔عین اسی وقت رسہ انسپکٹر جمشید کے ہاتھ سے چھو گیا۔بس پھر کیا تھا۔انہوں نے رسہ تھام لیا اور بولے:

"چلو میری ٹیم۔آؤ اس بھنور کو شکست دے دو۔"

اور وہ مخالف سمت میں زور لگانے لگے۔اس طرح تیرنا بے حد مشکل کام تھا۔بھنور انہیں اپنی طرف کھینچ رہا تھا اور وہ اس میں پھنسی لانچ کو کھینچ لینے کے لیے زور لگا رہے تھے۔

"یار جمشید۔یہ تو واقعی رسہ کشی کا مقابلہ ہے۔" خان رحمان نے ہانپتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔لیکن خدا کے لیے ابھی ہانپنا نہ شروع کرو۔ہانپنے کو ذرا بریک لگا لو۔"

"ہانپنے کو بریک۔ابا جان۔کیا اس وقت آپ مذاق کے موڈ میں ہیں۔" فاروق نے بوکھلا کر کہا۔

"میرے لیے مذاق کے تو بس ایسے ہی مواقع ہوا کرتے ہیں۔" انسپکٹر جمشید خوش دلی سے بولے۔

اور پھر ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔جب پہلا ہی بل کشتی کو بھنور سے نکال لایا اور یہ شاید اسی وجہ سے ہوا کہ ان لوگوں نے جب رسہ پکڑا اور مخالف سمت میں زور لگایا، تو بلا کی رفتار سے چکر کھاتی لانچ کو زبردست جھٹکا لگا اور وہ اُچھل کر بھنور کے باہر آگئی۔

"وہ مارا۔اور زور لگاؤ۔کہیں بھنور اسے واپس نہ کھینچ لے۔" انسپکٹر جمشید چلا اُٹھے۔

"اب بے چارہ بھنور اسے کیا کھینچے گا۔" فاروق نے شوخ آواز میں کہا۔

دس منٹ بعد وہ پُرسکون پانی میں تیر رہے تھے۔اور تیرنے کے دوران سکون کا سانس لیتے ہی انہوں نے مُڑ کر کشتی کی طرف دیکھا:

"اف خدا۔اس پر تو واقعی کچھ انسان موجود ہیں۔" خان رحمان نے کانپ کر کہا۔

"انسانوں کے علاوہ کوئی اور چیز بھی ہے۔"

"اور یہ لوگ لقمۂ اجل بنتے بنتے بچے۔" خان رحمان بولے۔

"خیر۔یہ تو نہیں کہا جاسکتا۔ان کا ابھی وقت ہی نہیں آیا تھا تو موت کا لقمہ کس طرح بن سکتے تھے۔"

"آخر ہم کب تک اسی طرح تیریں گے۔کیوں نہ لانچ پر سوار ہو جائیں۔" محمود نے تجویز پیش کی۔

"لانچ پر سوار ہونا خطرناک ہوگا۔جب تک ہم میں سکت ہے۔اسی طرح تیریں گے اور اگر کوئی جزیرہ یا ساحل نظر نہ آیا تو پھر مجبوراً اس پر چڑھ جائیں گے۔"

"ارے۔وہ دیکھیے۔کچھ درخت نظر آرہے ہیں۔" فرزانہ چلائی۔

"خدا کرے۔یہ کوئی جزیرہ ہو۔"

اس سمت میں آدھ گھنٹے تک مزید تیرنے کے بعد انہوں نے دیکھا۔وہ کوئی جزیرہ نہیں تھا۔البتہ سرسبز اور شاداب پہاڑ ضرور تھے۔

"چلیے خیر۔کچھ نہ ہونے سے تو یہ پہاڑ ہی بہتر ہیں۔ہم نہ صرف خود ان پر چڑھ سکتے ہیں۔بلکہ ان لوگوں کو بھی پانی میں ڈوبنے سے بچا سکتے ہیں۔"

ایسے میں ان کی نظر پہاڑ کی چوٹی کی طرف گئی۔پہاڑ کی چوٹی سے انہیں ایک عجیب سی چیز لٹکی نظر آئی۔کئی سیکنڈ تک وہ اس کی طرف دیکھتے رہے۔آخر انسپکٹر جمشید بولے:

"کیوں بھئی۔کیا خیال ہے۔یہ کیا چیز لٹک رہی ہے۔"

"شاید یہ بھڑوں کا چھتہ ہے۔اف خدا۔اتنا بڑا چھتہ ہم نے زندگی بھر کبھی نہ دیکھا ہوگا۔" محمود بڑبڑایا۔

"لیکن میرا خیال ہے۔یہ بھڑوں کا نہیں، شہد کی مکھیوں کا چھتہ ہے۔" فرزانہ نے کہا۔

"بھڑیں اور شہد کی مکھیاں اپنے چھتے پہاڑوں پر نہیں بناتیں، تمہیں اتنا بھی معلوم نہیں۔" فاروق تلملا کر بولا۔

"تب پھر۔تم ہی بتاؤ۔یہ کیا چیز ہے۔" محمود جھلا اُٹھا۔

"میرے خیال میں تو یہ پہاڑ کا رس ہے۔جیسے درختوں کا رس ہوتا ہے، اب یہ اور بات ہے کہ ہم درختوں کے رس کو گوند کہتے ہیں۔"

"لیجیے۔اور سنیے۔پہاڑ کا رس۔" فرزانہ نے مذاق اڑانے والے لہجے میں کہا۔

"خان رحمان۔تم کیوں خاموش ہو۔تم بھی تو کوئی خیال ظاہر کرو۔" انسپکٹر جمشید نے انہیں خاموش پا کر کہا۔

"م۔میں۔یعنی کہ میں۔ہاں ٹھیک تو ہے۔میرا بھی کوئی خیال تو ہونا ہی چاہیے۔تو سنو جمشید۔میرا خیال یہ ہے کہ یہ واقعی۔" وہ کہتے کہتے رُک گئے۔

"یہ کیا بات ہوئی۔" انسپکٹر جمشید نے حیران ہو کر کہا۔

"سوچ رہا ہوں۔آخر کیا خیال ظاہر کروں۔بس یوں سمجھ لو کہ میرے فرشتے بھی ابھی تک نہیں جان سکے کہ یہ کیا ہے۔ہاں ہے کوئی عجیب و غریب چیز۔" خان رحمان جلدی جلدی بولے۔

انسپکٹر جمشید اب پہاڑ کے دامن میں کھڑے ہو کر رسے کو کھینچ رہے تھے اور کشتی آہستہ آہستہ ان کی طرف بڑھ رہی تھی۔

اس میں پڑے ہوئے انسان مکمل طور پر بے ہوش تھے۔ ایسے میں کوئی چیز خان رحمان کے سر پر ٹپ سے گری۔ انہوں نے بوکھلا کر اوپر دیکھا، پھر نیچے دیکھا۔ کوئی چیز نظر نہ آئی۔ انہیں حیران پریشان دیکھ کر وہ لانچ کی بجائے ان کی طرف متوجہ ہوگئے:

" خیر تو ہے خان رحمان ۔ بہت پریشان ہوگئے۔"

" م ۔ میرے سر پر کوئی چیز گری تھی ۔ لیکن میں نے نیچے کچھ نہیں دیکھا۔ اس کا مطلب ہے ۔ وہ میرے سر پر ہی ہے۔" انہوں نے کہا۔

" لیکن تمہارے سر پر تو کچھ بھی نہیں ہے۔"

" ارے کیا واقعی ۔ محمود۔ ذرا غور سے جائزہ لینا میرے سر کا۔"

" لیکن انکل ۔ غور سے جائزہ لینے کی ضرورت ہی کیا ہے ۔ جب کہ کچھ نظر ہی نہیں آ رہا ۔"

" بھئی ۔ ذرا میرے بالوں کا بغور جائزہ لینا ۔ کہیں وہ چیز بہت ننھی سی تو نہیں تھی ۔ اور بالوں میں اٹک کر نہ رہ گئی ہو ۔ اس صورت میں بھلا نظر کیسے آ سکتی ہے۔"

" اوہ ہاں ! یہ تو ٹھیک ہے ۔ لیجئے میں دیکھوں۔" محمود یہ کہہ کر آگے بڑھا، خان رحمان اس کے آگے جھک گئے ۔ دوسرے ہی لمحے محمود زور سے اچھلا، اس کی آنکھوں میں خوف دوڑ گیا۔

" اف خدا۔" اس کی کپکپاتی آواز کانوں سے ٹکرائی۔

" کیا ہوا ۔ خیر تو ہے۔" خان رحمان نے بوکھلا کر کہا۔

" آ ۔ آپ ۔ یعنی کہ آپ کے سر پر خون۔" محمود ہکلایا۔

" کیا کہا ۔ میرے سر پر خون ۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے ۔" خان رحمان بوکھلا اٹھے۔

" محمود ۔ کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ میرے سر پر خون سوار ہے ۔ اگر بات یہی ہے تو سن لو ۔ اس وقت میرے سر پر خون تو کیا غصہ بھی سوار نہیں، ہاں ۔ ظہور کے سوٹ جلا دینے یا ڈرائینگ میں کوئی گڑبڑ کر جانے پر میرا خون ضرور کھول اٹھتا ہے، بلکہ یہی کہنا چاہیے کہ مجھ پر خون سوار ہو جاتا ہے۔"

" یہ بات نہیں انکل ۔ اس وقت آپ کے سر پر محاورے والا نہیں ۔ سچ مچ کا خون سوار ہے۔"

" ٹھہرو میں دیکھتا ہوں ۔ بات کو الجھایا نہ کرو۔" انسپکٹر جمشید جھنجلا کر بولے اور خان رحمان کی طرف بڑھے ۔ انہوں نے ان کے سر پر انگلی رگڑی اور جب ہٹائی تو سب نے ان کی انگلی کے سر پر خون لگا دیکھا:

" ارے باپ رے ۔ یہ تو واقعی خون ہے ۔ ل ۔ لیکن میں زخمی تو نہیں ہوں ۔ کیوں جمشید ۔ میں زخمی نہیں ہوں نا۔" انہوں نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

" بالکل نہیں ۔ اور اس کا صرف اور صرف یہ مطلب ہے کہ اس پہاڑ کے اوپر سے تمہارے سر پر خون کی کوئی بوند گری ہے۔" انہوں نے کہا۔

" لیکن ابا جان ۔ یہ تو بتائیے ۔ اس پہاڑ کے اندر خون کہاں سے آ گیا۔"

" تم اس ٹپکنے والی چیز۔" انسپکٹر جمشید کہتے کہتے رک گئے ۔ لانچ پہاڑ کے دامن سے آ لگی تھی ۔ اور اس میں پڑے لوگوں پر نظر پڑتے ہی وہ ٹپکنے والی چیز اور قطرے کی صورت میں گرنے والے خون کو بھول گئے ۔ وہ فوراً کشتی کی طرف جھپٹ پڑے ۔ اور پھر ان کی نظریں کشتی میں موجود بے ہوش لوگوں پر جم کر رہ گئیں ۔ وہ چت پڑے تھے ۔ ان کے قریب لکڑی کی ایک بڑی پیٹی رکھی تھی :

" اب ۔ ا ۔ ب ۔ جان ۔ کیا ہم سب کوئی خواب دیکھ رہے ہیں، ایک طویل خواب ۔" فاروق ہکلایا۔

" کم از کم میں تو ایسا نہیں سمجھتا۔" وہ بولے۔

" تب پھر ہم یہ کشتی میں کیا دیکھ رہے ہیں۔" محمود جلدی سے بولا ۔

" جو کچھ دیکھ رہے ہیں، خواب نہیں ہے ۔ نظر کا دھوکا نہیں ہے ۔ یہ واقعی آفتاب، آصف اور فرحت ہیں ۔ ل ۔ لیکن ۔ ان کے ساتھ انسپکٹر کامران مرزا نظر نہیں آ رہے ۔ حیرت ہے۔" وہ جلدی جلدی کہتے چلے گئے۔

انسپکٹر جمشید اسے پہلے ہی باندھ چکے تھے ۔ لانچ کے سمندر میں چلے جانے کا کوئی خوف نہیں تھا ۔ لہٰذا وہ سب ایک ساتھ بڑھے اور ان لوگوں کو جھنجھوڑنے لگے ۔ آخر خدا خدا کرکے سب سے پہلے آصف نے آنکھ کھولی :

" م ۔ میں ۔ میں کہاں ہوں۔"

" لانچ میں ۔" فاروق بولا۔

" ہائیں ۔ یہ آواز تو فاروق بھائی کی ہے ۔ اس کا مطلب ہے ۔ ابھی خواب ختم نہیں ہوا ۔ تب تو مجھے ۔" یہ کہتے ہوئے اس نے جلدی سے آنکھیں بند کر لیں۔

" تب تو مجھے کیا ۔ تمہاری یہ بات مجھے اچھی نہیں لگتی ۔ بات کو بیچ میں کاٹ دیتے ہو۔" آفتاب کی بھناتی ہوئی آواز سنائی دی ۔

" بتائیے کیا ۔ وہ تو پھر سو گیا ہے۔" فرحت نے گنگناتی آواز میں کہا ۔

" آپس میں ہی باتیں کیے جاؤ گے، خواب ہی دیکھتے رہو گے، یا کچھ ہماری طرف بھی توجہ دو گے ۔ ابھی ہمیں یہ بھی دیکھنا ہے کہ پہاڑ کی چوٹی پر کیا چیز لٹک رہی ہے ۔ اور اس میں سے خون کیوں ٹپک رہا ہے۔" فرزانہ نے بھناتی ہوئی آواز میں کہا۔

" اف خدا ۔ یہ تو بہن فرزانہ کی آواز ہے ۔ اس کا مطلب

ہے — میرا خواب بالکل سچا ہے اور وہ جاری ہے — لہذا میں تو ہرگز آنکھ نہیں کھولوں گا —" آصف نے جلدی جلدی کہا۔

" ٹھیک ہے — تو پھر ہم بھی تمہاری آنکھوں پر ٹیپ چپکا دیں گے۔" محمود نے جلے بھنے انداز میں کہا۔

" ہائے — محمود بھائی بول رہے ہیں — بھئی واہ — خواب کتنا پُر لطف ہو گیا ہے — ارے ہائیں — یہ کیا — م — میری آنکھیں کیوں چپک گئی ہیں —"

اس نے بوکھلا کر کہا اور آنکھیں کھول دیں — اس کے ساتھ ہی آفتاب اور فرحت بھی جلدی جلدی پلکیں جھپکانے لگے — ان کے چہروں پر حیرت کے بادل تیرنے لگے —

" یہ — یہ تو واقعی ہم خواب دیکھ رہے ہیں — اور کمال تو یہ ہے کہ آنکھیں کھولنے پر بھی خواب جاری ہے — بھئی واہ —" آصف نے خوش ہو کر کہا۔

" ذرا اپنی اُنگلی آگے بڑھاؤ۔" فاروق نے جھنا کر کہا۔

" کک — کیوں — میری انگلی کا کیا کرو گے۔"

" اچار ڈالوں گا — ادھر تو لاؤ۔" اس نے کہا اور آصف نے اپنی اُنگلی اس کی طرف بڑھا دی — اس نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اُنگلی دانتوں میں چبا ڈالی —

" ارے مرا — یہ کیا —"

" تمہیں جگا رہا ہوں — آنکھیں کھول کر بھی سوئے جا رہے ہو۔" فاروق نے تیز آواز میں کہا۔

" م — میرا — میرا خیال ہے آصف — ہم — ہم خواب نہیں دیکھ رہے —" فرحت نے کانپتی آواز میں کہا۔

" تب پھر — کیا دیکھ رہے ہیں۔" آصف نے بوکھلا کر کہا۔

" ہم محمود، فاروق اور فرزانہ کو دیکھ رہے ہیں، بلکہ انکل جمشید اور انکل خان رحمان کو بھی دیکھ رہے ہیں۔"

" اگر ہم انہیں بھی دیکھ رہے ہیں، تب یہ خواب نہیں ہو سکتا۔" آصف نے فیصلہ دیا۔

" کیوں — کیا تمہارے دونوں انکل تمہارے کسی خواب میں نہیں آ سکتے۔" فاروق نے جل کر پوچھا۔

" یہ بات نہیں — بلکہ خواب میں میں انہیں نہیں دیکھتا رہا ہوں۔" آفتاب کی بجائے آصف نے جواب دیا۔

" میرا خیال ہے — خان رحمان — اب یہ لوگ نہیں رُک سکیں گے — کیوں نہ انہیں ان کے حال پر چھوڑ کر ہم پہاڑ کی چوٹی کا رُخ کریں —" انسپکٹر جمشید نے تنگ آ کر کہا۔

" مناسب تو یہی معلوم ہوتا ہے — لیکن ان کی باتیں بھی بہت لطف دے رہی ہیں۔" خان رحمان نے مسکرا کر کہا۔

" تو پھر تم بھی ان کے پاس ٹھہر کر لطف اٹھاؤ — میں اکیلا اوپر کا رخ کرتا ہوں۔" انہوں نے جلے کٹے لہجے میں کہا اور واقعی پہاڑ پر چڑھنے لگے —

" ارے ارے — ٹھہرو بھئی — میں بھی آ رہا ہوں، ان کی باتیں تو ذرا بھی لطف نہیں دے رہیں۔" خان رحمان گھبرا گئے اور ان کے پیچھے چلے:

" لو بھئی — دونوں انکل تو گئے۔" آفتاب نے گویا اعلان کیا۔

" لیکن کام سے نہیں گئے — کب تک بے کاروں کی طرح لانچ میں پڑے رہو گے — اب اٹھو — لانچ سے نکلو اور یہ تم نے لانچ پر پیٹی کیسے لاد رکھی ہے —" محمود نے پیٹی کی طرف بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

" ارے — خبردار ہماری پیٹی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھنا۔" آصف نے اسے للکارا۔

" تب پھر کس طرح دیکھیں۔" فاروق نے فوراً کہا۔

" بس دیکھو ہی نہیں — اسے ہم نے جان کی بازی لگا کر حاصل کیا ہے —" آصف تڑ سے بولا۔

" یوں تو ہم نے بھی اس پوری لانچ کو جان کی بازی لگا کر پکڑا ہے — معلوم بھی ہے — یہ بھنور میں پھنس گئی تھی۔"

" ارے ہاں — واقعی — میری تو چیخ ہی نکل گئی تھی — بس ایک ہی چیخ نکل سکی — پھر شاید ہم تینوں ہی بے ہوش ہو گئے تھے۔" آصف نے چونک کر کہا۔

" اور بے ہوش ہونے کے بعد مزے سے خواب دیکھنے لگے — بے ہوشی سے اتنا بھی کیا فائدہ اٹھانا۔" فرزانہ نے منہ بنایا۔

" اس سے پہلے کہ ہم ایک دوسرے کی کہانی سُنیں — ہمیں اس پیٹی کو کھول کر دیکھ لینا چاہیے — یہ پیٹی ہمارے ہاتھ کچھ کم عجیب و غریب حالات میں نہیں لگی۔" آصف نے جلدی جلدی کہا —

" کیا کہہ رہے ہو — دماغ تو نہیں چل گیا — ہم اپنا خزانہ ان کے سامنے کھولیں گے۔" آفتاب نے بوکھلا کر کہا۔

" بھئی بے فکر رہو — ہم دولت کے بھوکے نہیں — یہ دولت تو اسی دُنیا میں رہ جائے گی — اور دُنیا کے بھوکوں کے ہی کام آئے گی — لہذا تم بے خطر کھول ڈالو اسے — اگر اس میں دولت ہوئی — تو ہم اس میں سے کوئی حصّہ نہیں مانگیں گے۔" محمود نے جل کر کہا۔

" اوہو — یار محمود — تم تو واقعی بُرا مان گئے — میں تو مذاق کر رہا تھا — ادھر ہم ہی کون سا دولت کے بھوکے ہیں — اللہ تعالیٰ نے سب کچھ تو دے رکھا ہے۔" آفتاب نے معافی چاہنے والے انداز میں کہا۔

" اچھا — یہ بات ہے تو آؤ — پیٹی کھولیں۔" محمود بولا۔

اور چھ کے چھ پیٹی کی طرف بڑھے — اچانک اوپر سے آواز سُنائی دی:

" ارے — یہ کیا۔"

آواز انسپکٹر جمشید کی تھی اور ان کی آواز میں بلا کی حیرت

تھی۔ آواز ہوا کے دوش پر ان تک آئی تھی۔ اس میں عجیب سی گونج تھی۔ پیٹی کو بھول کر انہوں نے سر اوپر اٹھا دیے۔
وہ دونوں انہیں پہاڑ کی چوٹی پر نظر آئے۔ دونوں مل کر اس لٹکی ہوئی چیز کو کھینچ رہے تھے۔

☆☆☆

"تم لوگ بھی فوراً اوپر آجاؤ۔" انسپکٹر جمشید کی پُرجوش آواز ان کے کانوں میں گونجی۔
"معلوم ہوتا ہے، کوئی بہت ہی خاص چیز ہاتھ لگی ہے۔" آفتاب خوش ہو کر بولا۔
"ہاں۔ ضرورت سے زیادہ خاص۔" خان رحمان بولے۔
"ضرورت سے زیادہ خاص کا ہم کیا کریں گے انکل۔" محمود نے اوپر کا رُخ کرتے ہوئے کہا۔
"پہلے اوپر آجاؤ، پھر فیصلہ کر لینا کہ کیا کرنا ہے۔" انسپکٹر جمشید نے منہ بنا کر جواب دیا۔
وہ پیٹی کو لانچ پر ہی چھوڑ کر اوپر چلے۔ اونچائی کا راستہ زیادہ مشکل نہیں تھا، جگہ جگہ پتھر ابھرے ہوئے تھے اور وہ ان کے سہارے تیزی سے اوپر چڑھ رہے تھے، یہاں تک کہ نزدیک پہنچ گئے، انہوں نے دیکھا۔ انسپکٹر جمشید اور خان رحمان ایک جال سے بُری طرح اُلجھے ہوئے تھے اور پھر جال کے اندر موجود شخص کو دیکھ کر تو ان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔
"اُف خدا۔ یہ۔ یہ تو ابا جان ہیں۔" آفتاب نے تھرتھر کانپتی آواز میں کہا۔
"ہاں، اور بے ہوش بھی ہیں اور زخمی بھی۔" انسپکٹر جمشید نے فکر مندانہ لہجے میں کہا۔
"دوسرے یہ کہ اس کم بخت جال کا منہ ہی نہیں مل رہا۔"
"تو اسے کاٹ ڈالیے نا۔" فرحت بے چین ہو کر بولی۔
"کاٹوں کس چیز سے۔ ہمارے پاس تو کوئی چاقو بھی نہیں۔" انسپکٹر جمشید جھنجلا اُٹھے۔
"محمود کا چاقو کس دن کام آئے گا انکل۔" آصف بول اٹھا۔
"وہ کام آچکا۔" فاروق بول اٹھا۔
"کام آچکا۔ کیا مطلب؟" آفتاب نے حیران ہو کر پوچھا۔
"رے راٹا نے چھین لیا۔" فرزانہ مسکرائی۔
"کیا کہا۔ رے راٹا۔ ارے باپ رے تو کیا آپ لوگوں سے رے راٹا کا ٹکراؤ ہوا ہے۔" آفتاب بوکھلا کر بولا۔
"ہاں۔ اللہ کی مہربانی سے۔" فاروق نے کہا اور وہ مسکرا دیے، لیکن پھر سب یک لخت سنجیدہ ہو گئے۔ اس وقت کا اہم ترین مسئلہ انسپکٹر کامران مرزا کو جال سے نکالنا تھا اور اسے کاٹنے کی ان کے پاس کوئی چیز تھی نہیں:
"کیا اسے ہاتھوں سے ادھیڑنا بھی ممکن نہیں۔" آصف نے پوچھا۔
"اگر ممکن ہوتا تو ابا جان اور انکل کھڑے ہمارے منہ نہ دیکھ رہے ہوتے۔" فرزانہ جل کر بولی۔
"تب پھر۔ آخر ہم اس میں سے انکل کو کس طرح نکالیں گے۔" آصف نے بے تاب ہو کر کہا۔
"غور کرو۔ کوئی ترکیب تو سمجھ میں آ ہی سکتی ہے۔"
"غور کرنے کی ہدایت آپ فرزانہ اور فرحت کو دیجیے۔ اب تو یہ ایک اور ایک گیارہ ہو گئی ہیں، لہٰذا بیک وقت گیارہ ترکیبیں سوچ سکتی ہیں۔" فاروق نے شوخ آواز میں کہا۔
"ہاں، ضرور سوچ سکتی ہیں، لیکن تمہاری زبان پر تالا لگ جائے تب۔" فرزانہ نے جل بھن کر کہا۔
"لیکن یہاں تالے کا بندوبست بھی تو نہیں ہو سکتا۔" فاروق نے معصومانہ لہجے میں کہا۔
"معلوم ہوتا ہے۔ تم لوگ صرف باتیں ہی بناتے رہو گے، کچھ سوچ نہیں سکو گے۔" خان رحمان نے جھنّا کر کہا۔
"آؤ فرزانہ سوچ میں ڈوب جائیں۔" فرحت بولی۔
"چلو۔" اس نے بھی سنجیدہ لہجے میں کہا۔
"زیادہ گہرائی میں نہ ڈوب جانا۔ کہیں ہم آوازیں دیتے اور انتظار کرتے ہی نہ رہ جائیں۔" فاروق بولا۔
"توبہ ہے اس کی زبان سے۔" فرحت نے پاؤں پٹخے۔
"اور آصف کی زبان سے کیا ہے؟" فاروق نے فوراً پوچھا۔
"اللہ کی پناہ۔" فرزانہ بولی۔
"بس۔ فیصلہ ہو گیا۔ یہ لوگ کسی کو کچھ نہیں سوچنے دیں گے، فرزانہ۔ فرحت۔ تم یہاں کرو کر ان سے کچھ دُور چلی جاؤ۔ اور کانوں میں انگلیاں ڈال کر سوچنا شروع کرو۔ تاکہ ان کی آواز تک تم دونوں کے کانوں میں نہ پڑے۔" انسپکٹر جمشید تلملا کر بولے۔
"لیکن ابا جان، کانوں میں اُنگلیاں دینے کے بعد یہ ایک دوسرے کی آواز کس طرح سنیں گی؟" فاروق نے معصومانہ لہجے میں پوچھا۔
"دونوں سوچنے جا رہی ہیں، غور کرنے نہیں۔" وہ بولے۔
"اوہ، ہاں۔ یہ بھی ٹھیک ہے۔ جاؤ بھئی تم دونوں۔ ذرا فاصلے پر چلی جاؤ۔"
اور وہ واقعی کچھ دُور چلی گئیں۔ ان کے جانے کے فوراً بعد ان کے درمیان گہری خاموشی چھا گئی۔ آفتاب نے حیران ہو کر چاروں طرف دیکھا، پھر بولا:
"کک۔ کہیں۔ کہیں یہ دونوں ہماری زبانیں ساتھ تو نہیں لے گئیں۔"
"اگر ایسا ہوتا تو تم کس طرح بول سکتے۔" محمود نے اُسے گھورا۔
"لیکن آپس میں گھورنے کی کیا بات ہے۔" آصف نے بُرا مان

کر کہا۔

"تو گھورنے کی بات کس بات میں ہوتی ہے؟" فاروق نے کہا۔

"وہ مارا۔ ایک ترکیب میرے ذہن میں آگئی۔" فرزانہ بول اُٹھی۔

"مجھے پہلے ہی یقین تھا۔ تم ہی میدان مارو گی۔ ترکیبیں بے چاریاں تو تمہاری غلام ہیں۔" فاروق نے منہ بنا کر کہا۔

"جلدی بتاؤ فرزانہ۔ بلکہ پہلے نزدیک آ جاؤ۔"

دونوں نزدیک آ گئیں۔ فرزانہ نے جلدی جلدی کہا:

"ہمیں ایک بڑا سا پتھر حاصل کرنا ہوگا۔ جال کا کچھ حصہ پہاڑ پر رکھ کر ہم اس پر پتھر برسا دیں گے۔"

"ویری گڈ۔ حیرت ہے۔ اس قدر آسان ترکیب ہمیں کیوں نہ سوجھی۔" محمود بولا۔

"سوجھے تو تب نا۔ جب تم لوگوں کو باتیں کرنے سے فرصت ہو۔" فرحت جل کر بولی۔

"اب جلدی سے ایک پتھر اٹھا لاؤ۔ چلو محمود اور آصف۔ یہ کام تم کرو۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"جی بہتر۔" انہوں نے ایک ساتھ کہا اور تیزی سے نیچے کی طرف بڑھے۔ جلد ہی دونوں ایک بڑا اور نوکیلا پتھر لے کر لوٹے۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے آرڈر پر تیار کرا کر لائے ہیں۔" فرزانہ مسکرائی۔

"تمہیں ضرورت ہو تو تمہارے لیے بھی آرڈر دے دیں۔" آصف نے منہ بنایا۔

"شکریہ۔ میں بے پتھر ہی بھلی۔"

انسپکٹر جمشید نے جال کا کچھ حصہ ایک اُبھری ہوئی جگہ پر رکھا اور اس پر پتھر دے مارا۔ نتیجہ دیکھنے کے لیے وہ رُکے اور پھر مایوس ہو گئے۔

"پہلی چوٹ سے تو جال کا بال بھی بیکا نہیں ہوا۔" محمود بڑبڑایا۔

"جال کا بال۔" آصف بڑبڑایا۔

"کوئی بات نہیں۔" انسپکٹر جمشید نے کہا اور پتھر تیزی سے جال پر برسانے لگے۔ ایک منٹ تک کوشش کرنے کے بعد رُکے۔ دیکھا تو جال کی رسیاں کسی قدر کچلی ہوئی نظر آ رہی تھیں، لیکن وہ کٹا اب بھی نہیں تھا۔

"شاید۔ یہ کوئی خاص قسم کی ڈوری سے بنایا گیا ہے۔" انہوں نے کہا اور پھر پتھر برسانے لگے۔ کچھ دیر بعد پتھر ان کے ہاتھ سے خان رحمان نے لے لیا۔

پندرہ منٹ کی مسلسل پتھر بازی کے بعد ایک جگہ سے جال کٹ ہی گیا۔ اب جو انہوں نے اسے اُس جگہ سے ادھیڑنا چاہا۔ تو تیزی سے ادھڑتا چلا گیا۔

اب انسپکٹر کامران مرزا ان کے سامنے چوٹی پر لیٹے تھے۔ وہ گہری گہری سانسیں لے رہے تھے۔ پیشانی پر زخم تھا۔ جس سے کافی خون بہہ چکا تھا۔ انہوں نے پہلے تو ان کے سر پر اپنے رومالوں کے ذریعہ پٹی باندھی، پھر انہیں ہلانے جلانے لگے۔ آخر ایک منٹ کی کوشش کے بعد انہوں نے آنکھیں کھول دیں۔

"یہ۔ یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔ انسپکٹر جمشید۔ یہ آپ ہیں۔"

"صرف میں ہی نہیں۔ باقی سب بھی یہاں موجود ہیں۔"

"باقی سب۔" انہوں نے جلدی سے سب پر نظر ڈالی اور پھر چہرے پر رونق دوڑ گئی۔ اُٹھنے کی کوشش کی تو چکر آ گیا۔ اور وہ لیٹے رہے۔

"حیرت ہے۔ ہم سب یہاں کس طرح جمع ہو گئے۔" انسپکٹر کامران مرزا بڑبڑائے۔

"قدرت کی مہربانی ہے۔ اس سے پہلے بھی ہم جمع ہوتے ہی رہے ہیں۔" محمود نے کہا۔

"مم۔ میں۔ بہت بھوکا ہوں۔ انہوں نے مجھے جال میں جکڑنے کے بعد پتھروں پر گھسیٹا تھا۔ میرے سارے جسم پر چوٹیں اور خراشیں ہوں گی، پھر وہ مجھے یہاں لٹکا کر چلے گئے۔ کچھ کھانے کو نہیں مل سکتا۔"

انسپکٹر کامران مرزا کے الفاظ نے خود ان کی بھوک چمکا دی۔ لیکن ان کے پاس کھانے کی کوئی چیز کہاں تھی، ایسے میں محمود بولا:

"کیا خبر اس پیٹی میں کھانے کی چیزیں موجود ہوں۔"

"کس پیٹی میں؟" انسپکٹر کامران مرزا حیران ہو کر بولے۔

"ہمیں ایک ساحل پر ایک پیٹی ملی تھی۔ یہ لمبی کہانی ہم بعد میں سُنا دیں گے۔ تو پھر کیوں نہ ہم پہلے پیٹی کو کھول ڈالیں۔" آصف نے جلدی جلدی کہا۔

"ٹھیک۔ تم سب جاؤ۔ ہم یہیں ٹھہرتے ہیں۔"

اور وہ نیچے اترنے لگے۔ لانچ تک پہنچے۔ پیٹی کو اٹھانا چاہا، لیکن وہ تو بہت وزنی تھی۔ آخر انہوں نے لانچ پر رکھ کر ہی اسے کھولنے کا پروگرام بنایا۔ اس کا اُوپر والا تختہ اکھاڑنے کے لیے انہوں نے پہلے تو باری باری زور لگایا، لیکن جب تختہ نہ اکھڑا تو سب نے مل کر ہاتھ جما دیے اور اوپر زور لگایا۔ اچانک تختہ اکھڑ گیا۔ اور انہیں ایک زور دار دھکا لگا۔ سنبھل کر وہ پیٹی پر جھکے، دوسرے ہی لمحے ان سب کی سٹی گم ہو گئی۔ پیٹی میں نہ تو مال اور دولت تھی۔ نہ سمگلنگ کا کوئی سامان۔ نہ نشہ آور ادویات اور نہ کھانے پینے کی چیزیں۔ بلکہ اس میں تو ایک اور ہی چیز تھی۔

اور یہ چیز تھی۔ ان کے ہم عمر۔ چار لڑکے۔ اور وہ مکمل طور پر بے ہوش تھے۔

"اُف خدا۔ اس میں تو چار انسان بند ہیں۔ اور ہم خزانہ خیال کرتے رہے۔" آصف کانپ اٹھا۔

"ساحل پر مجھے کچھ ایسا ہی احساس ہوا تھا جیسے اس میں

کوئی زندہ چیز ہے۔ لیکن یہ خیال مجھے بھی نہیں آیا تھا کہ زندہ انسان ہوں گے۔ ارے ہم باتوں میں لگ گئے۔ انہیں جلدی سے باہر نکال کر لٹا دینا چاہیے۔ اور پھر ہوش میں لانے کی تدبیر کرنی چاہیے۔" محمود نے کہا۔

انہوں نے مل کر ان چاروں کو باہر نکالا۔ اور لانچ پر لٹا دیا، پھر ان کے ہاتھ پیر ہلانے لگے۔ گال تھپتھپانے لگے۔ ایسے میں اوپر سے انسپکٹر جمشید کی آواز سنائی دی:

"محمود۔ پیٹی میں سے کیا نکلا؟"

"جی۔ چار انسان۔ ہماری عمر کے لڑکے۔"

"کیا کہا۔ چار لڑکے۔" انہوں نے حیران ہو کر کہا۔

"جی ہاں۔ سچ مچ کے چار لڑکے۔" آفتاب بولا۔

"ٹھہرو۔ اب ہم بھی رک نہیں سکتے۔ آرہے ہیں۔ انسپکٹر کامران مرزا بھی اٹھنے کے قابل ہو گئے ہیں۔"

اور وہ تینوں نیچے آنے لگے۔ ادھر وہ انہیں ہوش میں لانے کی کوشش کرتے رہے۔ اچانک ان میں سے ایک نے آنکھ کھول دی۔ اور لرزتی آواز میں بولا:

"یہ۔ یہ جنت ہے یا دوزخ۔"

○

انہوں نے اس کا سوال حیران ہو کر سنا، پھر فاروق نے جلدی سے کہا:

"تمہیں کیا چاہیے۔ جنت یا دوزخ۔"

اس نے چونک کر اس کی طرف دیکھا، پھر گھبرا کر بولا:

"کہیں تم دوزخ کے چوکیدار تو نہیں۔"

"دوزخ کے چوکیدار مجھ جیسے ہوتے ہیں۔" فاروق نے برا مان کر کہا۔

"اب مجھے کیا معلوم۔ کس جیسے ہوتے ہیں۔ پہلی بار تو مرا ہوں۔" اس نے برا سا منہ بنایا۔

"بھئی ابھی تم نہیں مرے۔ زندہ سلامت ہو۔ اس وقت نہ دوزخ میں ہو۔ نہ جنت میں۔ بلکہ سمندر کے کنارے ایک پہاڑ کے دامن میں ہو۔ ہم نے تم لوگوں کو ایک پیٹی میں بند پایا ہے۔" محمود جلدی جلدی بولا، تاکہ اس بے چارے کا ذہن کام کرنے لگے۔

"یہ۔ یہ میں کیسی آوازیں سن رہا ہوں۔ ہم کہاں ہیں۔" اس کے ساتھی دوسرے لڑکے نے بھی آنکھیں کھول دیں اور پھر بڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ جلدی جلدی پلکیں جھپکانے لگا۔

"اس طرح تو ہمیں بار بار تشریح کرنا پڑے گی۔ بہتر ہوگا پہلے تم چاروں ہوش میں آجاؤ۔ پھر بات چیت ہوگی۔"

"کک۔ کیا مطلب۔" دوسرا حیران ہو کر بولا۔

"اب ہم مطلب کس بات کا بتائیں۔" محمود بے چارگی کے عالم میں بولا۔

اب وہ دونوں اپنے دونوں بے ہوش ساتھیوں کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور انہیں ہلانے لگے۔

"اشفاق۔ اخلاق۔ بھئی اب اٹھ بھی چکو۔ بہت بے ہوش رہ لیے۔ اب اتنا بھی کیا بے ہوش رہنا۔"

فاروق اور آفتاب نے اس کے جملے حیران ہو کر سنے اور بوکھلا کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔ اب وہ کہہ رہا تھا:

"دیکھو۔ یہ لوگ کیا خیال کریں گے۔ کہیں ہمارے بارے میں کوئی ایسی ویسی رائے نہ قائم کر لیں۔ تم جانتے ہی ہو۔ ہم ایسی ویسی رائے سے بہت گھبراتے ہیں۔ لہذا مہربانی فرما کر اب آنکھیں کھول دو۔ بھئی واہ۔ کتنا پر لطف نظارا ہے۔"

فوراً ان دونوں کی آنکھیں کھل گئیں، پھر وہ اچھل پڑے۔

"یہ۔ یہ کون لوگ ہیں؟" ان میں سے ایک نے بوکھلا کر کہا۔

"پپ۔ پتا نہیں۔ ابھی ہم نے ان سے پوچھا نہیں۔ تمہارے ہوش میں آنے کا انتظار تھا۔ خیر اب پوچھ لیتے ہیں۔ کیوں جناب۔ کیا ہمیں یہ پوچھنے کی اجازت ہے کہ آپ لوگ کون ہیں؟"

"ہاں۔ اجازت ہے۔"

"تو بتائیے نا۔"

"میرا خیال ہے۔ پہلے تم لوگ پوری طرح ہوش میں آلو۔ پھر بتائیں گے۔" آصف نے کہا۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ چلو بھئی۔ جلدی سے پوری طرح ہوش میں آجاؤ۔" ان میں سے ایک ان کی طرف مڑا۔

"لیکن بھائی جان۔ ہمیں یہ کس طرح معلوم ہوگا کہ ہم پوری طرح ہوش میں آچکے ہیں۔" دوسرے نے حیران ہو کر کہا۔

"بھائی جان۔ تو کیا تم آپس میں بھائی بھائی ہو؟"

"جی ہاں۔ اللہ کی مہربانی سے۔"

"بھئی انسپکٹر جمشید۔ یوں کام نہیں چلے گا۔" ایسے میں انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"انسپکٹر جمشید۔" ان میں سے ایک نے تھرتھر کانپتی آواز میں کہا۔ باقی تینوں بھی دھک سے رہ گئے۔ ان کی نظریں انسپکٹر جمشید پر جم کر رہ گئیں۔

"تو پھر انسپکٹر کامران مرزا کس طرح کام چلے گا۔"

"انسپکٹر۔ کامران مرزا۔" دوسرے کے منہ سے نکلا۔ اب تو ان کا برا حال ہو گیا۔ ادھر انسپکٹر کامران مرزا کہہ رہے تھے:

"چوٹی کے دوسری طرف ایک سبزہ زار ہے۔ وہاں ناریلوں کے بے شمار درخت ہیں۔ ہم پہلے اپنی بھوک اور پیاس کیوں نہ مٹا ڈالیں، اس کے بعد باتیں ہوں گی۔"

"کیا کہا۔ آپ نے۔ ناریلوں کے درخت۔ اف۔ پہلے کیوں نہ

بتایا:" یہ کہتے ہی آصف نے اوپر کی طرف دوڑ لگا دی۔

"احتیاط سے۔ کہیں لڑھک نہ جانا۔" انسپکٹر کامران مرزا چلاتے۔

پھر تو سبھی دوڑ پڑے۔ پہلے چوٹی پر پہنچے اور پھر اترنے لگے۔ دامن میں پہنچ کر انہیں کافی فاصلے پر سبزہ نظر آنے لگا۔ انہوں نے بے تحاشہ دوڑ لگا دی۔ اور پھر درختوں پر چڑھنے لگے، بھوک نے انہیں دیوانہ بنا دیا تھا۔ تڑا تڑ ناریل گرنے لگے۔ انسپکٹر جمشید اور انسپکٹر کامران مرزا کے ساتھ وہ چاروں لڑکے بھی نیچے کھڑے حیرت بھری نظروں سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ انسپکٹر کامران مرزا نے پتھر کے ذریعے ناریل توڑنا شروع کر دیے۔ جلد ہی نیچے ناریلوں کا اچھا بھلا ڈھیر لگ گیا۔

وہ ان کا پانی پینے لگے اور ناریل کھانے لگے۔ خوب سیر ہو چکے تو گھاس پر لیٹ گئے۔ اور اس سے پہلے کہ ایک دوسرے کی کہانیاں سنتے۔ انہیں گہری نیند نے آ لیا۔ شدید بھوک کے بعد انہوں نے خوب پیٹ بھر لیے تھے۔ اس کا نتیجہ گہری نیند ہی ہو سکتا تھا۔

نہ جانے کب تک سوتے رہے، پھر انسپکٹر جمشید کی آنکھ کھل گئی انہوں نے سبھی کو جھنجھوڑ ڈالا۔

"کیا ہوا۔ کیا بات ہے۔" کئی آوازیں ابھریں۔

"بات کیا ہوتی۔ کہیں ہم سوتے ہی نہ رہ جائیں۔ دشمن ہم پر نہ آ پڑے۔ ایسا وقت آنے سے پہلے یہ بہتر ہے کہ ہم ایک دوسرے کی کہانی سن لیں۔"

"لیکن ابا جان۔ ہم ان چاروں کے سامنے کس طرح کہانی سنا سکتے ہیں۔ پہلے تو ان کے بارے میں معلوم ہونا چاہیے کہ یہ کون لوگ ہیں۔ کیا خبر یہ دشمنوں کے جاسوس ہوں۔" محمود جلدی جلدی بولا۔

"دشمنوں کے جاسوس۔" ان میں ایک نے بوکھلا کر کہا۔

"ہاں۔ یہ بھی ٹھیک ہے۔ خیر۔ پہلے ان سے ہی بات کر لیتے ہیں۔ ہاں بھئی۔ تم لوگ بتاؤ۔ کون ہو۔ اس پیٹی میں کس طرح پہنچے اور پھر لانچ پر کس طرح سوار ہوئے۔ یہ سب چکر کیا ہے۔"

"جی بہتر۔ پہلے تو میں اپنا تعارف کرا دوں، لیکن نہیں سب سے پہلے تو مجھے بسم اللہ پڑھنی چاہیے۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ شروع کرتا ہوں۔ اللہ کے نام سے جو بڑے مہربان اور نہایت رحم والے ہیں۔ میرا نام شوکی ہے۔ یہ اشفاق، اخلاق اور آفتاب ہیں۔"

"کیا کہا۔ آفتاب۔" آفتاب نے حیران ہو کر کہا۔

"ہاں، کیوں۔ اس میں حیران ہونے کی کیا بات ہے۔" شوکی نے بھی حیران ہو کر کہا۔

"اس لیے کہ میرا نام بھی آفتاب ہے۔" اس نے بتایا۔

"اوہ!" آفتاب چونک کر بولا۔

"خیر۔ تو ہم شوکی برادرز کہلاتے ہیں۔ ہمارے والد کسی زمانے میں بہت مشہور و معروف سراغرساں تھے۔ اب وہ ریٹائر ہو چکے ہیں۔ اور۔"

"ایک منٹ۔ ان کا نام کیا ہے؟" انسپکٹر جمشید جلدی سے بولے۔

"مشتاق احمد خان۔" شوکی نے کہا۔

"اوہو۔ تو تم ان کے فرزند ہو۔ میں ان سے واقف ہوں۔ واقعی بہت مشہور سراغ رساں تھے اور دیانت دار بھی حد درجے کے۔"

"اور میں بھی انہیں جانتا ہوں۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"یہ جان کر خوشی ہوئی۔ اب سنیے۔"

شوکی نے اپنے بارے میں پوری تفصیل سے بتا دیا اور پھر موجودہ معاملے کی تفصیلات بھی سنا دیں۔ وہ حیرت بھرے انداز میں سنتے رہے۔ آخر اس کے خاموش ہونے پر آصف نے کہا:

"یہاں سے مجھے سنانا ہو گا، کیونکہ جس پیٹی میں یہ بند تھے۔ وہ پیٹی ہمیں کن حالات میں ملی۔ یہ بھی ایک دلچسپ داستان ہے۔"

"چلو تم ہی سنا دو۔"

اس نے بھی پوری تفصیل سنا دی، پھر انسپکٹر کامران مرزا نے اپنے اوپر بیتے حالات کہہ سنائے۔ آخر میں انسپکٹر جمشید کی باری آئی۔

اس طرح ان سب کے ذہنوں میں حالات اور واقعات سما گئے۔ اور محمود بول اٹھا:

"اس کا مطلب تو یہ ہوا۔ کہ ہم سب ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔"

"لیکن اب ہم کشتی میں سوار کہاں ہیں۔" فاروق نے حیران ہو کر کہا۔

"محاوروں کو سمجھنے کی سوجھ بوجھ پیدا کرو۔ میرا مطلب تھا، ہم ایک ہی معاملے سے دوچار ہیں اور اس صورت میں شوکی برادرز کو ساتھ رکھا جا سکتا ہے۔ ان کا بھی آخر اسی معاملے سے تعلق ہے اور الٹانیو جیسا بڑا مجرم ان سے الجھ چکا ہے۔"

"یہ تو خیر ٹھیک ہے کہ ان لوگوں کو ساتھ رکھنے میں کوئی حرج نہیں، لیکن ناموں والی الجھن کا کیا بنے گا، ہم میں پہلے ہی آفتاب موجود ہے۔ اب ایک اور آفتاب ٹپک پڑا۔ بات کس طرح بنے گی۔" آصف نے کہا۔

"ٹپک نہیں پڑا۔ پیٹی سے برآمد کیا گیا ہوں۔" دوسرا آفتاب بولا۔

"خیر۔ لڑو نہیں بھئی۔ اس کا حل بھی سوچ لیا جائے گا۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"ہاں اور کیا۔ حل سوچنا یہاں کیا مشکل ہے۔ حل سوچنے کی دو دو ماہر موجود ہیں۔" فاروق بول اٹھا۔

"تم ہر وقت ہم پر کیوں ادھار کھائے رہتے ہو۔"

"خدا نہ کرے۔ میں ادھار کھاؤں۔ ہمارے مالی حالات بہت مضبوط ہیں۔"

• ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ ان لوگوں کو ساتھ رکھا جا سکتا ہے ۔ اگر انہیں اعتراض نہ ہو ، لیکن اگر انہیں اعتراض ہے تو یہ اپنا راستہ لے سکتے ہیں۔ لیکن ایسے میں یہ جائیں گے کہاں۔ لے دے کر ایک لانچ موجود ہے۔ اس میں بھی معلوم نہیں اب پٹرول ہے یا نہیں۔"

• پٹرول ختم ہو چکا ہے۔ اسی لیے تو وہ بھنور میں پھنسی تھی۔" آصف نے کہا۔

• اگر آپ ہمیں ساتھ رکھنے میں کوئی حرج محسوس نہ کریں تو ہمیں آپ کا ساتھ دے کر خوشی ہوگی۔" شوکی بول اٹھا۔

• چلو ٹھیک ہے۔ اب ناموں کا مسئلہ کیسے حل کیا جائے۔" آفتاب نے کہا۔

• بھئی تم آفتاب نمبر ایک اور شوکی کے بھائی آفتاب نمبر دو۔" فرزانہ بولی۔

• ویسے میں تو اسے شوکی کے بھائی آفتاب ہی کہوں گا۔" فاروق مسکرایا۔

• لیکن یہ تو بہت لمبا نام ہو جائے گا۔" آفتاب نمبر دو نے بوکھلا کر کہا۔

• تو ہو جائے۔ تمہیں کیا۔ نام میں لوں گا۔ تم نہیں۔ تم تو صرف سنو گے۔"

• جج۔ جی اچھا۔ جیسے آپ کی مرضی۔" آفتاب نمبر دو نے مسکی صورت بنائی۔

• بری بات ہے فاروق۔ فرزانہ کی تجویز نہایت مناسب ہے، یہ آفتاب نمبر دو کہلائیں گے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

• جی۔ جی بہتر۔" فاروق نے جلدی سے کہا۔

• اب سوال یہ ہے کہ کیا کیا جائے۔"

• تھوڑی دیر کے لیے ہمیں باتیں کرنے کی اجازت دی جائے۔" آفتاب نمبر ایک بولا۔

• کیا مطلب۔ باتیں کرنے کی اجازت۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

• ہاں۔ بہت دنوں بعد تو ہم ایک جگہ جمع ہوئے ہیں اور پھر شوکی برادرز سے تو زندگی میں پہلی بار ملنے کا موقع ملا ہے، لہٰذا ہم ذرا گھل مل کر کچھ باتیں کر لیں۔"

• اچھا۔ یونہی سہی، لیکن ہم ادھر ادھر کا جائزہ لینا پسند کریں گے، خان رحمان۔ تم ہمارا ساتھ دو گے یا ان کی باتیں سنو گے۔" انسپکٹر جمشید ان کی طرف مڑے۔

• حیران ہوں کہ کیا فیصلہ کروں۔ ان کی چٹپٹی باتیں بھی کسی لذیذ چٹنی سے کم مزے دار نہیں ہوتیں۔ اور تمہارا ساتھ نہ دینا بھی گوارا نہیں۔ خیر۔ میں اس وقت ان لوگوں کو تنہا چھوڑ دینا زیادہ پسند کرتا ہوں۔ تاکہ یہ پوری آزادی سے باتیں کر سکیں۔ ہو سکتا ہے۔ میری موجودگی میں شوکی برادرز شرماتے رہیں۔"

• بالکل ٹھیک کہا تم نے خان رحمان۔ میں بھی تم سے یہی کہنے والا تھا۔" انسپکٹر کامران مرزا خوش ہو کر بولے۔

• جی ہاں انکل۔ ہیں تو ہم ذرا شرمیلے ہی۔" آفتاب نمبر دو نے شرماتے ہوئے انداز میں کہا۔

• ذرا نہیں۔ مجھے تو تم لوگ پورے شرمیلے لگتے ہو۔" فاروق بولا۔

• پپ۔ پورے شرمیلے۔ وہ کیسے ہوتے ہیں۔" شوکی ہکلایا۔

• آؤ بھئی چلیں۔ یہ تو شروع ہو چلے۔" انسپکٹر جمشید ہنسے۔ اور تینوں اس سمت میں چل پڑے جس طرف ناریل کے درختوں سے تیار کیا گیا مکان موجود تھا۔ انہوں نے سنا۔ آصف کہہ رہا تھا:

• لو بھئی۔ اب ہم بالکل آزاد ہیں۔ فضا بھی بالکل صاف ہے، دور دور تک کوئی ہمیں ٹوکنے والا نہیں۔ آجاؤ میدان میں۔"

• میدان میں۔ کیا آپ لوگ کشتی لڑنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟" اشفاق نے کانپ کر کہا۔

• ہاں، ہم باتوں کی کشتی لڑیں گے۔ بہت دن ہو گئے، یہ کشتی نہیں ہوئی۔"

• بلکہ۔ باتوں سے زیادہ، ہم محاورات کی کشتی لڑیں گے۔ تم لوگوں نے لڑی کبھی یہ کشتی۔" محمود بولا۔

• نن۔ نہیں۔ کبھی اتفاق نہیں ہوا۔" اخلاق نے گڑبڑا کر کہا۔

• تو کیا ہوا۔ آج تو ہو رہا ہے اتفاق۔" آفتاب نمبر ایک بولا۔

• لل۔ لیکن ہم کشتی لڑنے سے بہت گھبراتے ہیں۔" شوکی بوکھلا کر بولا۔

• اوہو۔ بھئی اس کشتی میں چوٹ ووٹ نہیں لگتی۔"

• اچھا خیر۔ دیکھتے ہیں۔ ویسے کشتی کسی بھی قسم کی ہو۔ ہمیں ڈر ہی لگتا ہے۔"

• تب پھر تم لوگ جاسوسی کے کام کس طرح کر لیتے ہو؟" فرزانہ نے حیران ہو کر پوچھا۔

• بس کسی نہ کسی طرح گزارا کر لیتے ہیں۔" اخلاق نے جواب دیا۔

• لیکن لڑائی بھڑائی کے موقعوں پر کیا کرتے ہو۔ ظاہر ہے۔ جاسوسی اور لڑائی بھڑائی کا چولی دامن کا تعلق ہے۔"

• چولی دامن کا ساتھ؟" شوکی سوالیہ لہجے میں بولا۔

• بھئی محاورہ ہے۔" فرزانہ جھلا اٹھی۔

• لڑائی بھڑائی کے موقعوں پر ہم ہمیشہ کنی کترا جاتے ہیں۔" شوکی نے فوراً کہا۔

• اس طرح کیسے کام چلتا ہوگا۔" فرحت حیران ہو کر بولی۔

• چلتا تو نہیں۔ ہم تو اسے چلاتے ہیں۔" آفتاب نمبر دو بولا۔

• کیسے؟" آصف نے بے دھیانی کے عالم میں کہا۔

• جاسوسی کے کام کو۔ اب کیا کیا جائے۔ ہم اسے بطور پیشہ اختیار کر چکے ہیں۔"

"خیر بھئی۔اب چھوڑو اس موضوع کو۔ان کی یہ جانیں۔یا پھر کوئی لڑائی بھڑائی کا موقع ہمارے سامنے انہیں پیش آیا تو ہم دیکھ ہی لیں گے کہ اس وقت کیا کرتے ہیں۔آؤ باتیں بگھاریں۔محاوروں کی ٹانگیں توڑیں۔" فاروق نے پکار کر کہا۔

"اچھی دعوت ہے۔اس دعوت کو منظور کرنا ہی ہوگا۔" محمود بولا۔

"تو ٹھیک ہے۔بسم اللہ کرو۔"

"لیکن کیا بات کریں۔آج تو یوں لگتا ہے جیسے باتوں نے ہم سے منہ موڑ لیا ہے۔" آصف نے حیران ہو کر کہا۔

"لیجیے۔اب باتیں بھی منہ موڑنے لگیں۔کل کو کہیں گے۔گھر کی دیواروں نے منہ موڑ لیا ہے۔اور پرسوں۔" فاروق جلدی جلدی کہہ رہا تھا کہ آفتاب نمبر ایک نے بات کاٹ دی:

"بس بس۔پرسوں تک نہ پہنچو۔"

"کیوں بھئی۔پرسوں سے آپ کی خاص رشتے داری ہے۔" آفتاب نمبر دو بول اٹھا اور سب ہنس پڑے۔

"شکر ہے۔تم نے بھی گفتگو میں حصہ لیا، ورنہ میں تو سمجھی تھی۔منہ میں گھنگھنیاں ڈالے بیٹھے ہو۔" فرحت نے خوش ہو کر کہا۔

"گھنگھنیاں اور اس کے منہ میں۔سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" شوکی نے منہ بنایا۔

"اور تم لوگوں کی طرف ہی کیا۔گھنگھنیاں بے چاری تو ہماری طرف کا رُخ کرنے سے بھی اپنا آپ بچا جاتی ہیں۔" محمود مسکرایا۔

"دیکھیے حضرات۔ہم یہاں گھنگھنیوں کے پیچھے پڑنے کے لیے جمع نہیں ہوئے۔" آفتاب نمبر ایک نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"تو پھر۔کس لیے جمع ہوئے ہیں۔" اشفاق بول اٹھا۔

"کس لیے جمع ہوئے ہیں۔" آفتاب نمبر ایک نے حیران ہو کر کہا۔

"ہاں۔کس لیے جمع ہوئے ہیں۔" اشفاق نے پُرزور لہجے میں کہا۔

"واقعی۔بھلا ہم یہاں کس لیے جمع ہوئے ہیں۔" محمود نے سرسراتی آواز میں کہا۔

"ہم یہاں جمع ہوئے نہیں۔کیے گئے ہیں۔بلکہ کیے بھی نہیں گئے۔اتفاق سے ہو گئے ہیں، یا یوں کہہ لیں کہ تقدیر ہمیں جمع کرنے پر تلی بیٹھی تھی۔" فرزانہ نے جلدی جلدی کہا۔

"لو آصف۔" فاروق نے کہنا چاہا، لیکن آفتاب نمبر ایک فوراً بول اٹھا:

"لاؤ۔"

"اوہو۔اتنی بھی کیا بے صبری۔ہاں تو میں کہہ رہا تھا۔لو۔اب تقدیر بھی تلنے لگی۔" فاروق تلملائے ہوئے انداز میں بولا۔

"واقعی۔فرزانہ بُری بات ہے۔تقدیر جیسی وزنی چیز بھلا تل سکتی ہے۔" آصف نے کہا۔

"دیکھا فرحت۔اترنے لگی بال کی کھال۔یہ ہے مصیبت یہاں، بس جوتیوں میں دال بٹنے لگ جاتی ہے۔" فرزانہ نے پاؤں پٹخ کر کہا۔

"یہ زبردستی محاورات گھسیٹے جا رہے ہیں جملوں میں۔بہت بُری بات ہے۔" محمود نے منہ بنایا۔

"واقعی۔یہ تو بے چارے محاوروں کے ساتھ بہت ناانصافی ہے پیچ پیچ۔" آفتاب نمبر ایک نے افسوس ظاہر کیا۔

"بڑے آئے۔محاوروں کے ہمدرد۔" فرزانہ نے اسے گھورا۔

"بھئی شوکی برادرز۔تم لوگ کیوں خاموش ہو۔کچھ تم بھی بولو نا۔" آصف بولا۔

"کک۔کیا بولیں۔ہم تو زبانوں کے اس میدانِ کارزار میں پھنس کر رہ گئے ہیں۔جملے گویا اولوں کی طرح برس رہے ہیں۔اور محاورات کی تو گویا بارات چلی آ رہی ہے۔" آفتاب نمبر دو نے جلدی جلدی کہا۔

"اوہو۔تم بھی کم نہیں معلوم ہوتے دوست۔محاورے استعمال کرنے میں۔" محمود چونکا۔

"ارے باپ رے۔تو کیا میں بھی استعمال کر گیا۔" آفتاب نمبر دو بوکھلا اٹھا۔

"بس بس رہنے دو۔نہو نہیں۔" اخلاق نے اسے جھڑکا۔

"ہاں۔بلکہ ان پر بگڑو۔آج کل بننے کا زمانہ کہاں ہے۔صرف بگڑا جاتا ہے۔" فاروق نے زوردار لہجے میں کہا۔

"کیوں نہ اب ہم کچھ کام کی باتیں بھی کر لیں۔" محمود نے کچھ سوچ کر کہا۔

"کام کی باتیں۔گویا ہم بالکل بے کار کی باتیں کر رہے ہیں، دوسرے لفظوں میں ہم بالکل بے کار ہیں۔سنا دوستو۔محمود نے ہم سب کو بے کار اور نکما کہا ہے۔میں احتجاج کرتا ہوں۔" آصف نے شریر لہجے میں کہا۔

"ہم بھی احتجاج کرتے ہیں۔" سب بلند آواز میں بولے۔

"اعتراض رد کیا جاتا ہے۔میں نے صرف یہ کہا تھا کہ کچھ کام کی بھی باتیں کر لیں، مطلب یہ تھا، موجودہ معاملات، واقعات اور حالات پر۔اس سے یہ کہنا مقصود نہیں تھا کہ تم سب لوگ نکمے ہو۔آصف نے مجھ پر کیچڑ اچھالنے کی کوشش کی ہے۔شاید یہ بھول گیا کہ چاند کا تھوکا منہ پر آتا ہے۔" محمود نے جلدی جلدی کہا۔

"بات تو محمود کی بھی ٹھیک ہے۔خیر چھوڑو۔ہم محمود کی بات ہی مان لیتے ہیں۔ہاں تو محمود بھائی کام کی کیا باتیں کریں۔" فرحت بولی۔

"موجودہ مسئلہ کچھ یوں ہے۔اناتیو، سلاٹر اور رسے راٹا تینوں ایک ہی مشن پر نکلے ہیں۔وہ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ ہمارے ملک کے مشہور و معروف عقلمند چھ ماہ تک کہاں غائب رہے اور کیا کرتے رہے ہیں، شاید ان کا خیال یہ ہے کہ تمام اسلامی ممالک کے بڑے بڑے سائنس دانوں نے جمع ہو کر غیر اسلامی ممالک کے خلاف چھ ماہ تک کوئی کام کیا ہے۔بس وہ اس کام کی نوعیت جاننا

چاہتے ہیں اور اس جگہ کے بارے میں بھی جاننا چاہتے ہیں کہ وہ ہے کہاں۔ گویا ان کی چھ ماہ کی کوششوں پر پانی پھیر دینا چاہتے ہیں۔ دوسری طرف معاملہ یہ ہے کہ آج سے تقریباً سات ماہ پہلے پڑوسی اور دوست ملک کے صدر جن کا نام مسٹر مین بھنڈارا ہے، نے ہمارے ملک کے صدر سے درخواست کی کہ اپنے ملک کے بڑے بڑے سائنس دانوں کو ان کے پاس بھیج دیا جائے۔ اشارتاً یہ بھی کہہ دیا ہوگا کہ تمام اسلامی ممالک کے سائنس دان ایک جگہ جمع ہو کر کچھ کام کریں گے جو اسلامی ممالک کی بھلائی کے لیے ہوگا۔

چنانچہ نہایت خفیہ طریقے سے سائنس دان حضرات کو بھیج دیا گیا۔ مسٹر مین بھنڈارا کے علاوہ یہ بات کسی کو بھی معلوم نہیں کہ سائنس دان چھ ماہ تک کہاں رہے ہیں اور کیا کرتے رہے ہیں۔ وہ انکل کامران مرزا کو ناریلوں کی اس وادی سے کچھ فاصلے پر ایک ہیلی کاپٹر میں چھوڑ گئے تھے۔ وہ سبزہ زار میں بنے مکان میں داخل ہو گئے۔ لیکن وہاں کچھ لوگ موجود تھے اور انہوں نے جال پھینک کر انہیں اس میں پھانس لیا۔ مسٹر مین بھنڈارا انہیں جو ٹرانسمیٹر دے گئے تھے۔ وہ بھی ان لوگوں نے چھین لیا۔ اب ہم مین بھنڈارا صاحب سے رابطہ قائم کرنے کے قابل بھی نہیں رہے۔ سارا علاقہ پہاڑوں سے پٹا پڑا ہے۔ پیدل سفر بھی نہیں کر سکتے۔ ادھر اتانیو، سلاٹر اور رے راٹا بھی اس طرح غائب ہیں جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ اتانیو تو شوکی برادرز سے ملاقات کے بعد ہی سمندر کے راستے فرار ہو گیا ہوگا۔ جاتے وقت وہ شوکی برادرز کو سردار حلیم جیسے غدار کے حوالے کر گیا۔ جس نے انہیں پیٹی میں بند کیا اور سمندر میں پھینکنے کے لیے ساحل پر آ گیا، لیکن یہاں آفتاب، آصف اور فرحت پہنچ گئے، پیٹی اور لانچ ان کے قبضے میں آ گئی۔ یہ لوگ بھنور میں پھنسے جہاں سے ہم نے انہیں نکالا۔ مختصر طور پر حالات کا جائزہ تو یہ ہے۔ اب ہمارے سامنے سوال یہ ہے کہ ہم کیا کریں؟"

"صبر۔ ان حالات میں صبر سے بہتر کوئی چیز نہیں۔" فاروق نے کہا۔

"ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہنے کا مطلب صبر نہیں ہوتا۔" آصف نے منہ بنایا۔

"کچھ بھی ہو۔ صبر کا پھل میٹھا ضرور ہوتا ہے۔" فاروق نے شریر لہجے میں کہا۔

"اب تم سے کون مغز مارے۔" اس نے جھنّا کر کہا۔

"آفتاب نمبر ۱ اور آفتاب نمبر ۲ ہی ماریں گے۔ تم لوگ تو مغز مارنے سے رہے۔" فاروق نے فوراً کہا۔

"میرا خیال ہے۔ ہمیں کچھ کرنا ہی ہوگا۔ کم از کم ہم اس طرف کا رُخ تو کر ہی سکتے ہیں۔ جس طرف مسٹر مین بھنڈارا نے اشارا کیا تھا۔"

"ہوں۔ بات تو ٹھیک ہے۔ خیر۔ اس کا فیصلہ ابّا جان اور انکلز کے آنے پر ہو جائے گا۔" آفتاب نمبر ایک بولا۔

"جن لوگوں نے انکل کامران مرزا کو جال میں پھانسا۔ کیا وہ اب لکڑی کے مکان میں نہیں ہوں گے؟"

"مشکل ہے۔ کیونکہ وہ لوگ بھی ہم سے اچھی طرح واقف ہیں۔"

"گویا اس بار ہمیں تین بڑے مجرموں سے ٹکرانا ہوگا۔" فرزانہ نے سوچ میں گم لہجے میں کہا۔

"تو کیا ہوا۔ مقابلے میں بھی تین ہی پارٹیاں ہیں۔"

"شوکی برادرز تو نہ ہونے کے برابر ہیں۔ یہ لڑ بھڑ تو سکتے ہی نہیں۔ اور ان بڑے مجرموں کے ساتھ زندگی اور موت کی جنگ مول لینا پڑتی ہے۔" آصف نے جلدی جلدی کہا۔

"خیر کوئی بات نہیں۔ دیکھا جائے گا۔ وہ لوگ پہلے سامنے تو آئیں۔ پہلے کیوں اپنے آپ کو اس فکر میں گھلایا جائے۔" محمود نے شوکی برادرز کی طرف ہمدردانہ نظروں سے دیکھا۔ وہ بھیگی بلّی کے سے انداز میں ان کی طرف دیکھ رہے تھے:

"بھئی تم لوگ تھوڑی بہت لڑائی بھڑائی کی ٹریننگ کیوں نہیں لے لیتے۔"

"ڈڈ۔ ڈڈ۔ ڈڈ۔" شوکی بُری طرح ہکلانے لگا۔

"ڈڈ کیا۔" فاروق نے حیران ہو کر کہا۔

"ڈڈ نہیں۔ ڈر لگتا ہے۔" شوکی بولا۔

"توبہ ہے۔ تم نے تو لفظ ڈر بھی ڈر ڈر کر بولا ہے۔" آفتاب نمبر دو نے بُرا سا منہ بنایا۔

"لگ۔ کیا کیا جائے۔ مجبوری ہے۔" اخلاق نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"مجبوری۔ کیسی مجبوری۔"

"ڈرنے کی۔" اشفاق نے کہا۔

"ڈرنے کی بھی مجبوری ہوتی ہے۔" فاروق نے حیران ہو کر کہا۔

"بھئی ان کے پیچھے پڑنے کی کوشش نہ کرو۔ یہ ہمارے درمیان مہمان پارٹی کی حیثیت رکھتے ہیں۔" محمود فوراً بولا۔

"آخر یہ اتانیو، رے راٹا اور سلاٹر کہاں چلے گئے۔ اور کیا ان لوگوں کو معلوم ہے کہ ہم یہاں موجود ہیں۔"

"بھلا انہیں کس طرح معلوم ہو سکتا ہے۔ ہم یہاں ان کے پروگرام کے مطابق تو جمع ہوئے نہیں۔" فرحت نے کہا۔

عین اسی وقت انہوں نے ایک فائر کی آواز سنی۔ آواز اس طرف سے آئی تھی۔ جس طرف بڑی پارٹی گئی تھی۔

وہ اچھل پڑے۔ دوسرے ہی لمحے تیزی سے اس سمت میں دوڑ رہے تھے۔

☆ ☆ ☆

انسپکٹر جمشید، انسپکٹر کامران مرزا اور خان رحمان ان سے دُور ہوتے جا رہے تھے۔ جب ان کی آوازیں کانوں میں آنا بند ہو گئیں

تو خان رحمان بولے:

"ان کی تو ہو گئی عید۔ اور عید بھی انتیس کی۔"

"انتیس کی کیسے؟"

"شوکی برادرز بھی شامل ہو گئے۔ یہ تو سونے پر سہاگہ والی بات ہو گئی۔"

"کہیں تم پر بھی تو ان کی صحبت کا اثر نہیں ہو گیا۔ محاورے بڑی تیزی سے استعمال کر رہے ہو۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"بھئی خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑ لیتا ہے۔ میں تو پھر انسان ہوں۔" خان رحمان بولے۔

"کیا خیال ہے، لکڑی کے مکان میں ابھی کوئی موجود ہو گا۔" انسپکٹر کامران مرزا نے کہا۔

"مشکل ہے۔ آپ کو وہاں ٹھکانے والے بے خبر تو رہے نہیں ہوں گے۔ ہم لوگوں کو دیکھ کر کھسک لیے ہوں گے یا پھر ہمارے مقابلے کے لیے بالکل تیار ہوں گے۔"

"اوہ، ہاں۔ اس کا امکان ہے۔" خان رحمان چونک کر بولے۔

"تب تو ہمیں چوکس ہو جانا چاہیے اور ناریل کے درختوں کی اوٹ لے کر بڑھنا چاہیے۔"

اور وہ احتیاط سے آگے چلنے لگے۔ یہاں تک کہ درختوں کے بنائے گئے مکان کے بالکل سامنے پہنچ گئے۔ اور یہ دیکھ کر ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ لکڑی کے مکان کے دروازے پر ایک آدمی ٹانگیں پسارے بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پستول تھا اور نظریں سامنے جمی تھیں، اچانک اس کے لب ہلے:

"تو تم لوگ آ پہنچے۔ اس پستول میں صرف چھ گولیاں ہیں — ان میں سے پانچ تم لوگوں کے لیے ہیں۔ اور چھٹی میرے لیے ہے۔" اس کا لہجہ حد درجے عجیب تھا۔

"تمہارے لیے۔ کیا مطلب؟" انسپکٹر جمشید نے ایک درخت کے پیچھے سے تھوڑا سا سر نکال کر کہا۔ فوراً ہی ایک فائر ہوا اور گولی ان کے سر سے نصف انچ اوپر سے گزر گئی۔

"مطلب یہ کہ۔ اگر میں تم لوگوں کو ختم نہ کر سکا تو آخری گولی خود کو مار لوں گا۔ باس کا حکم یہی ہے۔"

"اور تمہارے باس کا نام کیا ہے؟" اس بار انسپکٹر کامران مرزا نے سر نکالا۔ ایک اور گولی چلی۔ انہوں نے تیزی سے سر پیچھے کر لیا۔

"باس کا نام۔ پتا نہیں۔ تم اپنے کام سے کام رکھو۔ آؤ مجھے پکڑ لو۔"

"ہم اتنے بے وقوف نہیں۔" خان رحمان نے سر باہر نکالتے ہوئے کہا۔ ان پر بھی فائر کیا گیا، لیکن وار خالی گیا۔ اس کے مقابلے میں اناڑی آدمی تو تھے نہیں۔

"تم نے کہا تھا کہ پستول میں چھ گولیاں ہیں۔ اگر تمہاری سب گولیاں بھی نشانے پر لگیں تو بھی تم ہم میں سے صرف چھ کو ختم کر سکتے تھے۔ جب کہ ہم نو آدمی ہیں۔ یہ کیا بات ہوئی۔"

"اس پر تو خود میں بھی حیران ہوں، کیونکہ یہاں تو صرف ایک آدمی کے آنے کی اُمید تھی۔ اسے بھی ہم نے جال میں لٹکا دیا تھا اور امید یہی تھی کہ وہ جال سے نہیں نکل سکے گا۔ اور لٹکے لٹکے ختم ہو جائے گا، لیکن باس نے کہا تھا کہ ہم اس سے واقف نہیں۔ عین ممکن ہے، وہ جال سے نکل آئے۔ اس لیے مجھے یہاں مقرر کیا گیا تھا اور باقی لوگ رخصت ہو گئے۔"

"وہ کس طرف گئے ہیں؟" انسپکٹر جمشید بولے۔

"سوری! میں اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا۔"

"اچھا! اب تم اپنی باقی گولیاں بھی آزما لو۔ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔" انسپکٹر کامران مرزا نے نصف دھڑ درخت کی اوٹ سے باہر نکال لیا۔ اس نے بھی فائر کرنے میں دیر نہ لگائی — لیکن وہ تو پہلے ہی چوکس تھے۔ اس کی زد میں کیا آتے۔

"اب صرف دو گولیاں بچ گئی ہیں، اگر میں ان سے کامیاب نشانہ لگا بھی لوں تو بھی تم میں سے صرف دو ہلاک ہوں گے۔ میں تو پھر بھی موت کے گھاٹ اتر کر رہوں گا۔"

"آخر ایسا کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔" خان رحمان نے سر ابھارتے ہوئے کہا۔ فائر پھر ہوا اور گولی درخت میں دھنس گئی۔

"آخری گولی صرف میرے لیے ہے۔" یہ کہہ کر اس نے پستول کی نالی کن پٹی پر رکھ لی۔

"ٹھہرو دوست، حرام موت نہ مرو۔ زندہ رہو۔ یہ زندگی پھر نہیں ملے گی۔" انسپکٹر کامران مرزا درخت کی اوٹ سے پورے نکل آئے اور بولے:

"اچھا لو۔ اپنی آخری گولی میرے سینے میں اتار دو۔"

"نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔" وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولا۔

"کیوں۔ ہو کیوں نہیں سکتا؟"

"اس صورت میں میں کس طرح مر سکوں گا۔" اس نے حسرت زدہ لہجے میں کہا۔

"اس کی ضرورت ہی کیا ہے، زندہ رہو۔ چلو۔ پھولو۔" خان رحمان مسکرائے —

"ہرگز نہیں۔ باس کا حکم باس کا حکم ہے۔ ورنہ موت بہت ہی بھیانک ہو گی۔"

"اچھا تو پھر خود کو گولی مارنے سے پہلے یہ تو بتا دو کہ تمہارے ساتھی کس طرف گئے ہیں اور کیا تمہارا باس بھی ان کے ساتھ تھا؟"

"باس ان کے ساتھ نہیں تھا۔ اور وہ کس طرف گئے ہیں، یہ میں تمہیں ہرگز نہیں بتا سکتا۔"

ان الفاظ کے ساتھ ہی اس نے ٹریگر دبا دیا اور وہ ارے ارے کرتے اس کی طرف دوڑ پڑے۔ ان کے دیکھتے ہی دیکھتے وہ ساکت ہو گیا۔ جلد ہی انھوں نے اپنے پیچھے دوڑتے قدموں

کی آواز سنی ۔مڑ کر دیکھا تو ان کے سب ساتھی چلے آرہے تھے، چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

" یہ۔فائرنگ کس سلسلے میں ہو رہی تھی ابا جان۔" فاروق نے بوکھلا کر کہا۔

" ہمیں ہلاک کرنے کے سلسلے میں۔آخری گولی اس نے اپنے دماغ میں اتار لی۔اس کے کچھ ساتھی بھی یہاں موجود تھے۔جو اسے یہاں چھوڑ کر رخصت ہو گئے۔اسے یہاں اس خیال سے چھوڑا گیا تھا کہ کہیں انسپکٹر کامران مرزا جال میں سے کسی طرح نکل نہ آئیں۔ہماری یہاں آمد کے بارے میں تو انہیں معلوم ہی نہیں تھا۔" انہوں نے جلدی جلدی بتایا۔

" گویا اب ہمیں اس بات کا جائزہ لینا ہوگا کہ وہ لوگ کس طرف گئے ہیں۔" محمود نے بے چینی کے عالم میں کہا۔

" ہاں۔اور یہ جائزہ ابھی اور اسی وقت شروع کر دیا جائے۔"

" لیکن ہم اس لاش کا کیا کریں۔"

" اسے کسی کھائی میں گرا دیتے ہیں، لیکن اس سے پہلے اس کی تلاشی لینا ہوگی۔" یہ کہہ کر انسپکٹر جمشید اس پر جھک گئے۔

چھوٹی موٹی چیزوں کے علاوہ اس کی جیب سے ایک ننھی سی بوتل بھی نکلی۔اس پر نظر پڑتے ہی شوکی چونک اٹھا اور بوکھلا کر بولا:

" اف خدا۔یہ تو بالکل ویسی ہی بوتل ہے۔"

" او ہو اچھا۔" ان کے منہ سے نکلا۔

پھر وہ بوتل کا باری باری جائزہ لینے لگے، لیکن ان میں سے کسی کی سمجھ میں بھی نہ آیا کہ یہ کیا بلا ہے۔

" پروفیسر داؤد ہمارے ساتھ ہوتے تو شاید کچھ بتا سکتے تھے۔" انسپکٹر جمشید بولے اور بوتل کو جیب میں رکھ لیا۔

پستول انسپکٹر کامران مرزا نے سنبھالا اور پھر اس کی لاش کو ایک گہری کھائی میں دھکیل دیا گیا۔اب مکان کے چاروں طرف کی زمین کا بغور جائزہ شروع کیا گیا۔تاکہ ان لوگوں کے جانے کے راستے کا کچھ پتا چل سکے۔

" حیرت ہے۔چاروں طرف کسی ایک آدمی کے قدموں کے نشانات بھی موجود نہیں۔" آصف بڑبڑایا۔

" اب وہ ہوا میں اڑ کر تو یہاں سے گئے نہیں۔" محمود نے جھلا کر کہا۔

" کیا خبر ہوا میں اڑ کر ہی گئے ہوں۔ہیلی کاپٹر یہاں تک لایا گیا ہو اور اس کی سیڑھی کے ذریعے وہ اس میں سوار ہو گئے ہوں۔اس طرح ہم ان کے قدموں کے نشانات بھلا کس طرح تلاش کر سکتے ہیں۔"

" اگر ہیلی کاپٹر آیا ہوتا تو انکل کامران مرزا کو پتا نہ چلتا۔" محمود نے برا سا منہ بنایا۔

" ابا جان تو بے ہوش ہو گئے تھے۔" آفتاب نمبر ایک نے فوراً کہا۔

" جب تک میں ہوش میں رہا۔کسی ہیلی کاپٹر کی آواز نہیں سنی۔" انہوں نے کہا۔

" ہو سکتا ہے انکل۔ہیلی کاپٹر آپ کے بے ہوش ہونے کے بعد آیا ہو۔"

" آخر ہم ہیلی کاپٹر کے ہی پیچھے کیوں پڑ گئے۔کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ انہوں نے کسی اور ترکیب سے قدموں کے نشانات نہ بننے دیے ہوں۔" شوکی نے جلدی سے کہا۔

" ہاں۔بات ٹھیک ہے۔ہمیں ہر امکان کا جائزہ لینا چاہیے، صرف ہیلی کاپٹر کا نہیں۔آس پاس کی زمین پر زیادہ تر گھاس اُگی ہوئی ہے۔کیا خبر وہ صرف گھاس پر پیر رکھتے ہوئے آگے بڑھے ہوں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

" تب پھر ہمیں آگے بڑھ کر قدموں کے نشانات کا جائزہ لینا ہوگا۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

" ہاں، یہ ٹھیک رہے گا۔اب ہم ایک دائرے کی صورت میں آگے بڑھیں گے۔اور یہ دائرہ پھیلتا چلا جائے گا۔" انہوں نے گویا ہدایت دی۔

جلد ہی ایک دائرہ ترتیب پا گیا اور وہ زمین پر نظریں جمائے مکان سے دور ہونے لگے۔اب ان کی پشت کی طرف ناریل کا مکان تھا۔اس میدانی علاقے میں خود رو جھاڑیاں بکثرت تھیں۔دائرہ وسیع ہونے لگا۔ان کا درمیانی فاصلہ بڑھتا چلا گیا۔آخر فرزانہ کی بلند آواز سنائی دی:

" اب تک قدموں کے نشانات نظر نہ آنے کا مطلب یہ ہے کہ یہاں سے روانگی کا کوئی پُر اسرار طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ہو سکتا ہے، ہیلی کاپٹر والی بات ہی درست ہو۔"

" اگر وہ یہاں سے ہیلی کاپٹر پر گئے ہیں۔تب تو ہم ان کا سراغ لگا چکے۔" آصف نے منہ بنایا۔

" لیکن میں ایسا نہیں سمجھتا۔وہ پیدل ہی یہاں سے روانہ ہوئے ہیں۔ہاں یہ بات واقعی عجیب ہے کہ ان کے قدموں کے نشانات کیوں نہیں پیدا ہوئے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

" ہمیں اس دائرے کو اور وسیع کرنا ہوگا۔شاید ہم کوئی سراغ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔" انسپکٹر کامران مرزا نے کہا۔

وہ اور آگے بڑھنے لگے۔ایک جگہ محمود اچانک نیچے بیٹھ گیا اور بغور زمین کا جائزہ لینے لگا:

" کوئی خزانہ تو دفن نظر نہیں آ گیا تمہیں۔" آصف بولا۔

" خزانہ تو ہمیں پہلے ہی مل چکا ہے۔" محمود مسکرایا۔

" کک۔کیا آپ کا اشارہ ہماری طرف ہے۔" شوکی نے کافی دور سے کہا اور وہ مسکرا دیے۔

"ابا جان - ذرا ادھر آئیے - یہاں ایک عجیب سا نشان ہے لیکن یہ نشان کم از کم کسی انسانی پاؤں کا نشان ہرگز نہیں ہو سکتا۔"

وہ دائرے کو توڑ کر جلدی سے اس کی طرف آئے - اس جگہ آس پاس کوئی خود رو جھاڑی نہیں تھی - انہوں نے نشان کو بغور دیکھا - یہ گول سا تھا - گول اور کافی بڑا - نشان بالکل صاف اور تازہ تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے ابھی ابھی بنا ہے۔

"تت - کیا ان لوگوں کے پیر نیچے سے گول ہیں۔" فاروق نے کانپ کر کہا۔

"دماغ تو نہیں چل گیا - ان میں سے ایک کو ابھی ابھی تو ہم نے کھائی میں دھکیلا ہے - اس صورت میں اس کے پاؤں بھی گول ہونے چاہییں تھے۔" آفتاب نمبر ایک نے اسے گھور کر دیکھا۔

"آفتاب نمبر دو تمہارا کیا خیال ہے۔" فاروق اس کی طرف اُلٹ پڑا -

"ہمیں اس نشان کے آس پاس ایسا ہی کوئی دوسرا نشان تلاش کرنا چاہیے۔" آفتاب نے فوراً کہا۔

"بالکل ٹھیک ہے - اگر ہمیں کوئی اور ایسا نشان مل گیا تو شاید ہم کسی نتیجے پر پہنچ سکیں۔" انسپکٹر جمشید بولے -

وہ اس نشان کے تین طرف پھیل گئے اور آگے بڑھنے لگے، ایک بار پھر دائرہ بڑا ہونے لگا، لیکن ابھی زیادہ بڑا نہیں ہوا تھا کہ فرحت نے چیخ کر کہا :

"یہ رہا دوسرا نشان۔"

وہ سب دوسرے نشان کی طرف جھپٹ پڑے - نشان بالکل ویسا ہی تھا - اب تو ان پر جوش طاری ہو گیا - انہوں نے پہلے نشان کی طرف دیکھا - اب دونوں نشانات کی سیدھ میں آگے بڑھنا آسان تھا -

"آئیں بھئی - اب ہم اس طرف آگے بڑھیں گے۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے -

وہ چل پڑے - نظریں زمین پر ہی تھیں - اور پھر ٹھیک اتنے ہی فاصلے پر تیسرا نشان ملا جتنے فاصلے پر دوسرا ملا تھا -

"اف خدا - یہ تو ایسا معلوم ہوتا ہے - جیسے ان پُراسرار نشانات کا سلسلہ دُور تک چلا گیا ہے۔" فرزانہ کانپ کر بولی۔

"تو اس میں کانپنے کی کیا بات ہے - تیسرا نشان ملا ہے، کوئی بھوت تو نہیں ملا۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"بھوتوں سے ڈرتے ہو گے تم۔" فرزانہ نے اسے گھورا۔

"ارے باپ رے - اگر اس میدان میں واقعی بھوتوں سے ملاقات ہو گئی تو؟" اخلاق نے گھبرا کر کہا۔

"تو کیا - ان سے باقاعدہ ملاقات کریں گے۔" فرحت بول اٹھی۔

"آپ - آپ لوگ عجیب ہیں - کسی چیز سے ڈرتے ہی نہیں۔" اشفاق نے کہا۔

"بھئی - اللہ تعالیٰ سے جو ڈرتے ہیں۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے، وہ شوکی برادرز کو بہت دلچسپ نظروں سے دیکھ رہے تھے - یہ بات فرزانہ نے بھانپ لی، بولی :

"خیر تو ہے ابا جان - آپ انہیں بہت غور سے دیکھ رہے ہیں، ان میں کوئی خاص چیز تو نظر نہیں آ گئی۔"

"میں ان کے بارے میں اندازہ قائم کر رہا ہوں۔"

"اوہو اچھا - تو پھر کیا اندازہ قائم کیا؟" محمود نے حیران ہو کر پوچھا -

"یہ واقعی ڈرپوک ہیں - جھوٹ موٹ ڈرپوک نہیں بن رہے۔" وہ بولے۔

"اچھا - ہم تو سمجھے تھے، ایکٹنگ کر رہے ہیں اور دراصل بہت دلیر ہیں۔"

"نہیں - دلیری اور بہادری ان میں نام کو بھی نہیں - میں حیران ہوں - انہوں نے یہ پیشہ کس طرح اختیار کر لیا؛ تاہم یہ لوگ ذہین ضرور ہیں، اس میں کوئی شک نہیں۔"

"چلیے خیر - شکر ہے - ان کی کوئی کل تو ایسی ہے جس میں کوئی شک نہیں - ورنہ میں تو سمجھا تھا - اونٹ رے اونٹ تیری کون سی کل سیدھی والا معاملہ ہے۔" فاروق نے شریر لہجے میں کہا - اس وقت اس کی نظریں خاص طور پر اشفاق کے لمبے قد پر جمی تھیں - وہ جھینپ کر رہ گیا، آخر بولا :

"کچھ بھی ہو - ہم بے کل نہیں ہیں۔"

اس کی بات پر انہیں مسکرانا پڑ گیا - اب وہ تیسرے نشان سے آگے بڑھ رہے تھے - اور پھر انہیں قدموں کے نشانات نظر آ گئے :

"ارے یہ کیا - یہ یکایک قدموں کے نشانات کہاں سے ٹپک پڑے۔"

"ظاہر ہے - اوپر ہی سے ٹپکے ہوں گے - ٹپکنے والی ہر چیز کا اوپر ہونا ضروری ہے - ورنہ وہ ٹپک ہی نہیں سکتی۔" آفتاب نمبر ایک نے کہا -

"لیجیے - ٹپکنے کے پیچھے پڑ گئے۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے - لکڑی کے مکان سے یہاں تک وہ کسی چیز کے اوپر چل کر آئے ہیں - اور یہ گول گول نشان اسی چیز کے ہیں - ہو سکتا ہے - ان گول چیزوں پر انہوں نے لکڑی کا کوئی تختہ رکھا ہو اور اس پر چلتے ہوئے مکان سے دُور نکل آئے ہوں، پھر یہ سوچ کر اُتر گئے ہوں کہ ہم اتنی دُور تک نشانات دیکھنے کہاں آئیں گے، لیکن وہ یہ بات بھول گئے کہ گول نشانات بھی ہمیں اپنی طرف متوجہ کر سکتے ہیں - ان سے غلطی یہ ہوئی کہ گول نشان مٹانا بھول گئے یا پھر - ہو سکتا ہے - وہ مٹانے کے قابل ہی نہ رہے ہوں۔" فرزانہ جلدی جلدی کہتی چلی گئی -

"میرا تو صرف نام بدنام ہے - اور میرے ساتھ آفتاب کا بھی،

ورنہ فرزانہ کی زبان بھی ہم دونوں کی زبان سے کم تو نہیں — اور انصاف سے کہا جائے تو دو ہاتھ آگے ہی ہوگی۔" فاروق نے بُرا سا منہ بنایا۔

"لیکن میں نے اوٹ پٹانگ اور بے کار گفتگو کے لیے اتنے الفاظ منہ سے نہیں نکالے۔ کام کی گفتگو کی ہے۔" فرزانہ نے جل بھن کر کہا۔

"فرزانہ کا خیال بالکل درست معلوم ہوتا ہے۔ ان لوگوں نے یہی ترکیب کی ہے۔ تاکہ ہم ان کی منزل کا سراغ نہ لگا سکیں — لیکن اب جب کہ اللہ کی مہربانی سے ہم سراغ لگا چکے ہیں — اس طرف قدم اٹھائے بغیر نہیں رہ سکتے —۔ نہ جانے وہ لوگ ہمارے سائنس دانوں کے ساتھ کیا سلوک کرنے والے ہیں۔" انسپکٹر کامران مرزا کافی بے چین تھے۔

"تب پھر چلیے — اب ہمیں رکنے کی ضرورت بھی نہیں رہی — اب تو ہم اور بھی تیزی سے آگے بڑھ سکتے ہیں، قدموں کے یہ نشانات ہماری رہنمائی کریں گے۔"

انہوں نے تیز تیز چلنا شروع کیا۔ آدھ گھنٹے بعد انہیں کافی فاصلے پر ایک ٹیلہ نظر آیا۔ نزدیک پہنچنے پر انہیں معلوم ہوا۔ میدانی علاقے میں وہ ایک اُبھری ہوئی چٹان تھی۔ دُور سے انہیں مثلث نما نظر آئی تھی، لیکن اب انہیں اس کے اوپر بھی سطح نظر آ رہی تھی اور اسی سطح پر کوئی بیٹھا تھا۔ ان کے دل دھڑکنے لگے — ابھی فاصلہ کافی تھا۔ اس لیے وہ نقوش نہیں دیکھ سکے۔ لیکن جوں جوں وُہ نزدیک ہوتے گئے۔ اس آدمی کے نقش و نگار بھی واضح ہوتے گئے۔ اس کے چہرے پر ایک طنز بھری مسکراہٹ تھی — ہاتھ میں ایک رائفل تھی۔ اور وہ ٹیلے پر تنہا کھڑا تھا۔ انسپکٹر جمشید اور انسپکٹر کامران مرزا وغیرہ تو اسے دیکھ کر حیرت زدہ ہوئے ہی تھے۔ شوکی برادرز بھی بھونچکے رہ گئے۔ انہوں نے اپنے جسموں میں تھرتھری دوڑتے محسوس کی —

کیونکہ وُہ شخص الٹانیو کے سوا کوئی اور نہیں تھا —

☆ ☆ ☆

"ارے باپ رے — یہ — یہ تو وہی ہے — ال — ال — ٹانیو —" شوکی نے کانپ کر کہا۔

"کیوں — ڈر گئے۔" فاروق چہک کر بولا۔

"نن — نہیں تو — تم لوگوں کے ہوتے ہوئے ہمیں ڈرنے کی کیا ضرورت ہے — ہاں — اکیلے میں اس سے ملاقات ہوتی تو ڈرنے کی کوئی بات بھی تھی۔" آفتاب نمبر ۲ نے جلدی سے کہا۔

"ہیلو الٹانیو — بہت دنوں بعد ملاقات ہوئی — کیا حال ہے۔" انسپکٹر کامران مرزا ایک قدم آگے بڑھ گئے۔

"ٹھیک ہے — میں بھی تم سے مل کر بہت خوش ہوا، مکان میں چھوڑے گئے نگرانوں کا خیال تھا کہ تم لوگ مکان سے اس طرف نہیں آ سکو گے۔ کیونکہ انہوں نے اپنی روانگی کا کوئی سراغ نہیں چھوڑا تھا، لیکن میرا، مسٹر سلاٹر اور مسٹر رے ماٹا کا خیال یہ تھا کہ تم لوگ سراغ لگا لو گے، چنانچہ ہمارا خیال درست نکلا۔ اس لیے میں تم لوگوں کو روکنے کے لیے یہاں موجود ہوں۔"

"لیکن انکل الٹانیو — تم ہمیں کیوں روکنا چاہتے ہو — ہمارے تو بہت پرانے تعلقات ہیں۔" آفتاب نے چہکتی آواز میں کہا۔

"ہم چاہتے ہیں — تم اس مقام تک نہ پہنچ سکو — جس مقام پر اس وقت سائنس دان جمع کیے گئے ہیں۔" اس نے ہنس کر کہا۔

"کیوں — کیا حرج ہے — ہم بھی تم لوگوں کی کارروائی دیکھیں گے۔"

"نہیں بھئی — تم لوگ اس کارروائی کو نہیں دیکھ سکو گے — ہمیں سائنس دانوں سے یہ بات اگلوانا ہے کہ وہ چھ ماہ تک کہاں رہے اور کیا کرتے رہے۔"

"لیکن مسٹر الٹانیو — یہ بات تو انہیں معلوم ہی نہیں ہے۔" شوکی بول اٹھا۔

"ارے — یہ تو شوکی کی آواز ہے — اوہو — تو تم بھی یہاں پہنچ گئے — کمال ہے — بھئی کامران مرزا — ان لوگوں سے مل کر میں بہت خوش ہوا تھا — قدم قدم پر تمہارے بچوں کی یاد آئی تھی۔"

"لیکن — یہ لوگ تو ڈرپوک ہیں۔" آفتاب نمبر ایک نے بُرا سا منہ بنایا —

"ہاں — یہ ٹھیک ہے، لیکن عقل سے پیدل ہرگز نہیں ہیں، یہ عقل سے ہی اپنا کام نکال لیتے ہیں۔" الٹانیو مسکرایا۔

"خیر — اب یہ بتاؤ — تم ہمارا راستہ کس طرح روکو گے۔"

"اس رائفل کے ذریعے — یہ ایک خاص قسم کی رائفل ہے — ایک بار گولی جسم سے چھو جائے — بس پھر آدمی بچ نہیں سکتا — گویا تم یہ کہہ سکتے ہو — اس کی گولیاں زہر میں بجھی ہوئی ہیں — اور میرے پاس رائفل نہ ہو تو بھی کیا ہے — میں تو تم سب کو ہاتھوں اور پیروں سے بھی روک سکتا ہوں۔" اس نے فخر اور غرور کے لہجے میں کہا۔

"لیکن مسٹر الٹانیو — ہمارا اپنے ملک کے سائنس دانوں تک پہنچنا بہت ضروری ہے۔" آصف نے تیز آواز میں کہا۔

"ایک روز بعد پہنچ جانا، اس وقت تک ہم ان سے سب کچھ معلوم کر چکے ہوں گے۔"

"اور سب کچھ معلوم کرنے کے سلسلے میں ان کمزور اور ناتواں ہستیوں پر نہ جانے کیسے کیسے مظالم توڑ چکے ہو گے۔" محمود نے نفرت سے ہونٹ سکوڑے —

"مجبوری ہے، اگر وہ سیدھی طرح بتا دیں تو ہمیں سختی کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔" الٹانیو ہنسا۔

"تت — تو کیا — پروفیسر عقلان بھی وہاں پہنچ چکے ہیں۔"

"نہ صرف پروفیسر عقلان، پروفیسر غوری — بلکہ پروفیسر داؤد بھی —

اور کچھ دوسرے اسلامی ملکوں کے سائنس دان بھی۔"

"اف خدا — اب کیا ہوگا۔" شوکی نے کانپ کر کہا۔

"کانپنا بزدل کرتے ہیں، ہم اس رائفل کو خاطر میں لائے بغیر آگے بڑھیں گے۔" فرزانہ گرجی۔

"ضرور ضرور ننھی بچی — آؤ اور مزا چکھ لو — تمہارے پیچھے اور دائیں بائیں بچنے اور چھپنے کی کوئی بھی جگہ نہیں ہے — یہاں دور دور تک درخت بھی نہیں ہیں، جن کی اوٹ تم لے سکو — اور اس رائفل سے پچاس گولیاں ایک ہی بار میں فائر کی جا سکتی ہیں — مجھے رائفل دوبارہ بھرنے کی بھی ضرورت پیش نہیں آئے گی، کیونکہ تم لوگ تعداد میں پچاس سے کم ہو — ارے ہاں — تم تو صرف تیرہ ہو، لیکن میرے نزدیک تین ہیں نہ تیرہ ہیں۔" اس کا انداز طنزیہ تھا — وہ جھلا اٹھے۔

"اچھا تو خبردار انیو — میں آ رہی ہوں — اب تم میرا کمال دیکھو۔" فرحت نے غرا کر کہا اور ان کے درمیان سے آگے نکل کر اس کی طرف بڑھی —

"فرحت کیا کر رہی ہو۔" آصف چلایا۔

"کوئی تو آگے بڑھے گا — کسی ایک کو تو رائفل کا نشانہ بننا پڑے گا —" فرحت نے جذبات سے لبریز آواز میں کہا۔ اس وقت تک فرحت کئی قدم آگے بڑھ چکی تھی۔

"مجھے بھی تم لوگوں میں سے کسی پر ذرا رحم کرنے کی اجازت نہیں — مشورہ یہی ہے کہ تم لوگوں کا کانٹا بھی اس بار ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نکال ہی دیا جائے — تم ہر بار ہی ہمارے راستوں میں آ جاتے ہو — ہم ہر ممکن کوشش کرتے ہیں کہ تم لوگوں کو غچہ دے دیں، لیکن حالات کچھ ایسے کروٹ بدلتے ہیں کہ تم بھی وہیں پہنچ جاتے ہو، جہاں ہم — لیکن اس بار تمہیں اس میدان تک نہیں جانے دیا جائے گا — وہاں کا منظر تم برداشت نہیں کر سکو گے۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے فرحت کے سینے کا نشانہ لے لیا — رائفل اب اس کے کندھے سے لگی تھی — ایک آنکھ نشانہ لے رہی تھی اور دائیں ہاتھ کی انگلی ٹریگر پر تھی — ان کے دل دھک دھک کرنے لگے — اچانک محمود چلا اٹھا:

"نہیں فرحت — تم نہیں — میں آگے بڑھوں گا —" یہ کہتے ہی اس نے فرحت کی طرف دو تین چھلانگیں لگائیں — اور بازو سے پکڑ کر اسے باقی لوگوں کی طرف جھٹکا دیا — وہ لڑکھڑاتی ہوئی ان کی طرف گئی —

"تم — تم محمود ہر بار ہیرو بننے کی کوشش کرتے ہو، لیکن آج ایسا نہیں ہوگا۔" آصف کو غصہ آ گیا — اس نے آگے بڑھ کر محمود کے ایک دو ہتھڑ دے مارا — محمود تیزی سے جھکا، لیکن پھر بھی دوہتھڑ اس کی کمر پر لگ ہی گیا — تلملا کر اس نے ایک مکا آصف کی ٹھوڑی پر دے مارا — آصف لڑکھڑایا اور لڑکھڑاتے لڑکھڑاتے اپنی ٹانگ محمود کے سینے پر دے ماری — محمود دھڑام سے گرا، لیکن پھر فوراً ہی اٹھا:

"یہ تم لوگ کیا کر رہے ہو — پاگل تو نہیں ہو گئے۔" یہ کہہ کر فاروق ان کی طرف جھپٹا اور دونوں کے درمیان میں آ گیا — محمود اور آصف کے مکے ایک ساتھ اس پر پڑے، وہ بلبلا اٹھا —

"ارے مرا —" یہ کہتے ہی وہ سر پکڑ کر اکڑوں بیٹھ گیا — جھونک میں آصف اور محمود اس پر گر گرے —

"اوہو — کیا مصیبت آ گئی ہے —" آصف نمبر ایک نے چیخ کر کہا اور وہ بھی اس جھڑپ میں الجھ گیا — اس نے آتے ہی فاروق کو اٹھانا چاہا — فاروق پہلے ہی جھلایا ہوا تھا — ایک زوردار مکا آفتاب کی ٹھوڑی پر جما دیا — وہ تیورا کر گرا۔

"اب برداشت نہیں ہو سکتا۔" فرحت نے چیخ کر کہا اور فاروق کی طرف بڑھی — ادھر آصف اور محمود ایک دوسرے پر جھپٹے پڑ رہے تھے — نزدیک پہنچ کر اس نے فاروق کے سینے پر ٹھوکر رسید کرنا چاہی — ایسا کرتے وقت اس نے یہ جملہ بھی کہا:

"میں تم سے آفتاب کا انتقام لوں گی —" ساتھ ہی فاروق نے پینترا بدلا اور فرحت سیدھی آفتاب پر جا گری — آفتاب نے جھلا کر اسے اپنے اوپر سے اچھال پھینکا اور خونخوار انداز میں فاروق پر پل پڑا:

"میں — میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" اس نے غرا کر کہا۔

"ارے باپ رے — یہ — یہ تو سچ مچ لڑ پڑے ہیں — ہم — میں تو سمجھا تھا — جھوٹ موٹ کی لڑائی لڑ رہے ہیں —" شوکی نے تھرتھر کانپتی آواز میں کہا۔

"جھوٹ موٹ کی لڑائی بزدل لڑا کرتے ہیں۔" فاروق نے لڑتے لڑتے غرا کر کہا۔

"انکل — آپ — آپ انہیں چھڑا کیوں نہیں دیتے۔" آفتاب نمبر دو ہکلایا —

"اوہ — شکریہ آفتاب — تم نے اچھا خیال دلایا — آئیے کامران مرزا، خان رحمان تم بھی آؤ — یہ لوگ پاگل ہو گئے ہیں — بھلا یہ آپس میں لڑنے کا موقع ہے۔"

"یہی کیا — ابھی تو تم لوگ بھی پاگل ہو گے — اور اسی طرح لڑو گے۔" انانیو ہنسا —

وہ تینوں ان کی طرف بڑھے — شوکی برادرز جوں کے توں کھڑے کانپتے رہے —

"اف توبہ — کس قدر خونی انداز میں لڑ رہے ہیں — یوں لگتا ہے، جیسے آپس میں بہت پرانی دشمنی ہو۔" اخلاق نے لرز کر کہا۔

"رحم — خدا — ہمیں اس طرح آپس میں لڑنے سے محفوظ رکھے۔" اشفاق بولا۔

"آ — آ — آمین۔" آفتاب نے کہا۔

"بھئی ۔ ذرا پیچھے ہٹ آؤ ۔ کہیں ہم میں سے کوئی ان کی پلیٹ میں نہ آ جائے ۔" شوکی بولا ۔

عین اسی وقت التانیو کو ایک دھکا لگا ، وہ منہ کے بل ٹیلے پر گرا اور دوسرے ہی لمحے رائفل خان رحمان کے ہاتھ میں نظر آئی ، اس کے ساتھ ہی انسپکٹر جمشید چہک کر بولے :

" شکریہ فرزانہ ۔"

○

" شکریہ فرزانہ ۔ کیا مطلب ؟" شوکی نے حیرت بھرے لہجے میں کہا ۔

" یہ لڑائی لڑی ہی اس لیے گئی تھی کہ التانیو پوری طرح لڑائی دیکھنے میں محو ہو جائے اور ہم میں سے ایک چکر کاٹ کر ٹیلے کے پیچھے جا پہنچے ۔ یہ کام فرزانہ سے بہتر بھلا کون کر سکتا تھا ۔ لڑائی شروع ہوتے ہی میں ، انسپکٹر کامران مرزا اور خان رحمان پھیل کر کھڑے ہو گئے اور فرزانہ ہمارے پیچھے چلی گئی ۔ واضح رہے کہ اس نے اس لڑائی میں کوئی حصہ نہیں لیا ۔ پھر جونہی وہ ٹیلے کے پیچھے پہنچی ۔ ہم لڑائی چھڑانے کے بہانے آگے بڑھے اور ٹیلے سے نزدیک ہو گئے ، تاکہ جونہی التانیو کو دھکا لگے ۔ ہم رائفل پر قبضہ کر لیں ۔"

" تت ۔ تو یہ لڑائی واقعی جھوٹ موٹ کی لڑائی تھی ۔" اخلاق نے حیران ہو کر کہا ۔

" نہیں ۔ لڑائی سچ مچ کی تھی ، لیکن سچ مچ کی ہوتے ہوئے بھی جھوٹ موٹ کی تھی ۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے ۔

" کیا مطلب !" شوکی نے چونک کر کہا ۔

" انہوں نے ایک دوسرے پر جو وار کیے ۔ وہ مصنوعی ہرگز نہیں تھے ، اگر یہ صرف وار کرنے کی اداکاری کرتے تو یہ چیز التانیو کی نظروں سے چھپی نہ رہتی ۔ اور یہ بھانپ جاتا کہ کیا چال چلی جا رہی ہے ، لہذا آخر وقت تک انہوں نے ایک دوسرے کو بالکل اصل چوٹیں لگائیں ۔"

" ہاں ، یہی وجہ ہے کہ میں دھوکا کھا گیا ۔ تم لوگ واقعی بہت چالاک ہو ۔" التانیو بجھی بجھی مسکراہٹ چہرے پر لاتے ہوئے بولا ۔

" اور ہمارے لیے زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ ہم نے سچ مچ ایک دوسرے کو بے دردی سے مارا ۔" محمود بولا ۔

" حیرت ہے ۔ کمال ہے ۔" شوکی بڑبڑایا ۔

" اور اب مسٹر التانیو ۔ تم کیا کہتے ہو ۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے ۔

وہ سب التانیو کی طرف مڑے ۔ خان رحمان اس سے چند میٹر دور اس کے دل کا نشانہ لیے کھڑے تھے ۔ اب اس کی رائفل اسی پر تنی ہوئی تھی ۔

" بھئی کہنا کیا ہے ۔ فائر کرو اور مجھے ختم کر دو ۔ میں تمہارا کانٹا نکالنے پر تلا ہوا تھا ۔ تم میرا کانٹا نکال دو ۔ انصاف کا تقاضا یہی ہے ۔" التانیو نے بے خوفی کے عالم میں کہا ۔ وہ حیران رہ گئے ۔

" بالکل ٹھیک ۔ ہمیں افسوس ہے مسٹر التانیو ۔ آج ہم تم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نجات حاصل کر رہے ہیں ۔ خان رحمان ۔ گولی اس کے دل کے پار ہونی چاہیے ۔" انسپکٹر جمشید بولے ۔

" اگر ایسا نہ ہوا تو میں نشانہ باز کسی کام کا نہیں ۔"

خان رحمان کی انگلی ٹریگر پر دباؤ ڈالنے لگی ۔ وہ سب دم سادھے کھڑے تھے ۔ دنیا کا ایک مشہور ترین جاسوس گویا موت کے سفر پر جانے کے لیے تیار تھا ۔

اچانک گولی کا دھماکا گونجا ۔ التانیو کو ایک زبردست دھکا لگا ، وہ لڑکھڑا گیا ۔ لیکن گرا نہیں ۔ انہوں نے دیکھا ۔ اس کے چہرے پر ایک بھرپور مسکراہٹ تھی ، پھر اس نے قہقہہ لگایا اور بولا :

" اس رائفل کی گولیاں مجھے پہچانتی ہیں ، لہذا میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں ۔ ہاں یہ تم لوگوں کے پرخچے ضرور اڑائیں گی ۔"

وہ دم بخود رہ گئے ۔ گویا التانیو نے بلٹ پروف لباس پہن رکھا تھا ۔

" تو کیا ہوا ۔ جمشید ۔ میرا نشانہ تو خطا نہیں گیا نا ۔" خان رحمان نے بوکھلا کر کہا ۔

" ہاں خان رحمان ۔ تمہاری گولی اس کے ٹھیک دل پر لگی تھی ، خیر ۔ اب تم اس کی آنکھوں کا نشانہ لو ۔"

ان الفاظ کے ساتھ ہی التانیو نے خان رحمان پر چھلانگ لگا دی ۔ اور انہیں ساتھ لیتے ہوئے دوسری طرف الٹ پڑا ۔ التانیو کے ہاتھ رائفل پر جم گئے ۔ دوسرے ہی لمحے خان رحمان کو ایک شدید جھٹکا لگا ، اور رائفل ان کے ہاتھوں سے نکل کر التانیو کے ہاتھوں میں آ گئی ۔ وہ رائفل پر قبضہ کرتے ہی اٹھا ، لیکن خان رحمان نے یک دم اس کی ٹانگوں میں ٹانگ اڑا دی ۔ وہ لڑکھڑا گیا ۔ ساتھ ہی انسپکٹر جمشید آگے بڑھے اور اس کی کمر پر ایک ٹھوکر رسید کی ۔ وہ منہ کے بل زمین پر آ رہا ۔ محمود نے جھپٹا مارا اور رائفل چھین کر دور چلا گیا ۔

" اب اس رائفل کو دور ہی رکھنا محمود ۔" انسپکٹر جمشید چلائے ۔

اب انسپکٹر جمشید اور التانیو ایک دوسرے کے مقابل تھے ۔

" تو تم ہم سب سے لڑ سکتے ہو ۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے ۔

" نہ صرف لڑ سکتا ہوں ، بلکہ تم لوگوں کو تھکا ماروں گا اور جب تم بے دم ہو جاؤ گے تو رائفل کی ایک ایک گولی تمہارے جسموں میں اتار دوں گا ۔ اس وقت تم رائفل چھین لینے کی طاقت خود میں نہیں پاؤ گے ۔" وہ بولا ۔

اس نے ان پر طیش کے عالم میں چھلانگ لگائی ۔ انسپکٹر جمشید ترچھے ہو گئے ۔ اور التانیو جھونک میں آگے نکل گیا ۔

" اور میرا اعلان ہے کہ میں تم سے تنہا نبٹ لوں گا ۔ میرا کوئی

ساتھی میری مدد کو نہ بڑھے۔"

ابھی وہ یہ کہہ ہی رہے تھے کہ التانیو پھر ان کے نزدیک آ گیا اور اس بار اس نے ان کا دایاں بازو پکڑ لیا، یہ دیکھتے ہی شوکی چلا اٹھا:

"بچیے انکل۔ یہ آپ کے بازو کو جھٹکا نہ ..."

شوکی جملہ مکمل نہ کر سکا۔ التانیو اتنی دیر میں جھٹکا دے چکا تھا۔ انسپکٹر جمشید گویا اڑتے ہوئے دور جا گرے۔ لیکن دوسرا لمحہ حیران کن تھا۔ فوراً ہی اٹھ کر انہوں نے التانیو پر چھلانگ لگائی۔ پہلی مرتبہ انہوں نے اس کی آنکھوں میں حیرت کے بادل دیکھے، پھر حیرت خوف میں تبدیل ہو گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھل سکتا۔ انسپکٹر جمشید کے دونوں پاؤں اس کے سینے پر پوری قوت سے ٹکرائے۔ وہ چیخ مار کر گرا اور ساکت ہو گیا۔

چند سیکنڈ تک وہ اس پر نظریں جمائے رہے۔ آخر ان کی طرف مڑے۔

"اسے زندہ چھوڑنا مناسب نہیں ہو گا۔ اپنے ساتھیوں میں شامل ہو کر یہ ہمارے لیے خطرات میں اضافہ ہی کرے گا، لہٰذا خان رحمان تم رائفل سنبھالو اور آنکھوں کے راستے گولی اس کے دماغ میں اتار دو۔"

"ٹھیک ہے۔" خان رحمان محمود کی طرف مڑے۔ محمود رائفل لیے ان سے بہت دور پہنچ چکا تھا:

"یہ کیا محمود۔ تم اتنی دور کیوں جا کھڑے ہوئے۔" انسپکٹر جمشید جھلا اٹھے۔

"آپ ہی نے تو کہا تھا۔ رائفل اس سے دور رکھو۔" اس نے کہا۔

"اوہ ہاں۔ خیر۔ رائفل لے آؤ۔ اب کوئی خطرہ نہیں۔ اس کے کس بل ڈھیلے ہو چکے ہیں۔"

محمود ان کی طرف بڑھا۔ نزدیک پہنچنے پر خان رحمان نے رائفل اس سے لے لی اور التانیو کی طرف مڑے۔ دوسرے ہی لمحے وہ سب اچھل پڑے۔ جس جگہ وہ گرا تھا۔ اب وہاں موجود نہیں تھا۔ انہوں نے بوکھلا کر چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔

التانیو دور بہت دور گویا ہوا میں اڑا جا رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

"دھت تیرے کی۔ بھاگ نکلا بزدل۔" محمود نے جھلا کر ران پر ہاتھ مارا۔

"اور یہ تمہاری وجہ سے ہوا۔ آخر اتنے دور جانے کی کیا ضرورت تھی۔" آصف نے جھلا کر کہا۔

"اور تم سب کو اس کی طرف سے رخ موڑ کر کھڑے ہونے کی کیا ضرورت تھی۔" محمود نے بھی تلملا کر کہا۔

"اچھا اب آپس میں لڑنے کی ضرورت نہیں۔ پہلے ہی بہت لڑ چکے ہو۔ اور تمہارے جسموں کے کئی حصے بری طرح دکھ رہے ہوں گے۔"

انسپکٹر کامران مرزا مسکرائے۔

"جی۔ ہاں انکل۔ یہ تو درست ہے۔"

"اچھے تو رہے شوکی برادرز۔ اپنی جگہ سے ہلے تک نہیں۔" فاروق نے برا سا منہ بنایا۔

"بھئی ہمیں شرمندہ کرنے کی کوشش نہ کریں۔ ہم نے لڑائی بھڑائی کے کام کبھی نہیں کیے۔" اخلاق نے مسمسی صورت بنائی۔

"لیکن ہمارے ساتھ رہ کر تو لڑنا ہی ہو گا۔" آفتاب نے ہنس کر کہا۔

"ارے باپ رے۔ یہ۔ یہ کیسے ہو گا۔" اشفاق نے کانپ کر کہا۔

"کیوں پریشان کرتے ہو انہیں۔ اب ہمیں دیر نہیں کرنی چاہیے، التانیو اپنے ہیڈ کوارٹر پہنچ کر وہاں موجود سب ساتھیوں کو خبردار کر دے گا کہ ہم ان کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اس سے پہلے کہ وہ ہمارے خلاف انتظامات کر لیں۔ ہمیں ان تک پہنچ جانا چاہیے۔" انہوں نے جلدی جلدی کہا۔

"ہوں۔ ٹھیک ہے۔ تو پھر چلیے۔ ہم بھی اس سمت میں دوڑ پڑیں جس طرف التانیو گیا ہے۔"

انہوں نے دوڑ لگا دی۔ آج پروفیسر داؤد ان کے ساتھ نہیں تھے کہ انہیں آہستہ دوڑنا پڑتا۔ سر پر پیر رکھ کر دوڑے۔ ایسے میں انہیں پروفیسر داؤد کا خیال آ گیا۔

"خدا جانے۔ وہ لوگ ان کے ساتھ کیا سلوک کرنے والے ہیں۔" فرزانہ بڑبڑائی۔

"کوئی اچھا سلوک تو ہرگز نہیں کر رہے ہوں گے۔ یہ لوگ مسلمانوں کے ازلی دشمن ہیں، لہٰذا مسلمانوں کے لیے ان کے دلوں میں رحم کہاں۔"

"اور سب سے بڑی الجھن یہ ہے کہ بے چارے سائنس دانوں کو کچھ بھی معلوم نہیں۔ وہ بتائیں گے کیا۔ اس صورت میں تو اگر وہ لوگ ان کے جسموں کا ایک ایک ریشہ الگ کر دیں، تو بھی وہ کچھ نہیں بتا سکیں گے۔"

"آخر یہ لوگ اس بات پر یقین کیوں نہیں کر لیتے کہ انہیں کچھ معلوم نہیں۔" فرزانہ جھنجلا کر بولی۔

"ان کا خیال ہے۔ سائنس دان بتا نہیں رہے، جانتے سب کچھ ہیں۔"

"آپ۔ آپ لوگ بھاگتے میں بھی باتیں کر رہے ہیں۔" آفتاب نمبر ۲ ہکلایا۔

"اس۔ وقت بہت کم ملتا ہے نا باتیں کرنے کا۔ بھاگتے میں ذرا فرصت ہوتی ہے۔" فاروق بولا اور وہ مسکرانے لگے۔

"جب سے ہم اس چکر میں الجھے ہیں اور گھر سے دور آئے ہیں۔ یہی خیال ستا رہا ہے کہ واپسی کس طرح ہو گی۔ کیا آپ میں سے کوئی ہماری یہ الجھن دور کر سکے گا۔"

"ایسی فضول باتیں سوچنے کی ہمارے پاس فرصت کہاں۔ ہم لوگ تو آئے دن گھر سے بے گھر ہوتے رہتے ہیں۔ ایسی باتیں سوچنے لگیں، تو ہو لیے گھر سے بے گھر۔" آفتاب نمبر ایک نے منہ بنا کر کہا۔

"تو سوال کا جواب دیتے وقت منہ بنانے کی کیا ضرورت ہے۔" اشفاق نے اس سے بھی بُرا منہ بنایا۔

"یہ ہماری عادت ہے۔ دوسرے لفظوں میں منہ بنانا ہماری گھٹی میں پڑا ہے۔"

"لو۔ اب سمجھے۔ حیرت ہے۔" آفتاب نمبر ایک نے حیران ہو کر کہا۔

"تب یہ لڑائی جھگڑائی بھی آپ لوگوں کی گھٹی میں پڑی ہو گی۔" شوکی نے معصومانہ انداز میں کہا اور وہ ہنسنے لگے۔

"اس۔ اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے۔" شوکی بوکھلا کر بولا اور وہ زیادہ ہنسنے لگے۔

"اچھا خیر۔ ہنس لیجیے۔ اب آپ لوگوں کے درمیان پھنس ہو گئے۔" اس نے بے بسی کے عالم میں کہا۔

"ہم بھی موقع ملنے پر آپ پر خوب ہنسیں گے۔ اتنا ہنسیں گے کہ ہنس ہنس کر دوہرے ہو جائیں گے۔" آفتاب نمبر دو جل بھن کر بولا۔

"بلکہ ہنسی کے ریکارڈ توڑ دیں گے۔" اشفاق نے کہا۔

"بھئی جلنے بھننے کی ضرورت نہیں۔ ہم طنزیہ انداز میں نہیں خلوص سے ہنس رہے ہیں۔"

"اچھا یہ بات ہے۔ تب تو آپ سب کا شکریہ۔" آفتاب نے خوش ہو کر کہا۔

وہ دوڑتے دوڑتے تھک گئے، لیکن کہیں کسی ہیڈ کوارٹر کا نام و نشان تک نظر نہ آیا۔ میدان تھا کہ شیطان کی آنت کی طرح ختم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ اب تو ان کی اُلجھن بڑھنے لگی۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم دوڑتے دوڑتے بوڑھے ہو جائیں گے، لیکن یہ میدان ختم نہیں ہو گا اور نہ ہیڈ کوارٹر صاحب تشریف لائیں گے۔" فاروق نے جھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ہیڈ کوارٹر صاحب۔" شوکی حیران ہو کر بولا۔

"اور وہ اناتیو بھی تو پھر نظر نہیں آیا۔ اس طرح غائب ہو گیا جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔"

"اوہو۔ کہیں۔ کہیں۔" فرزانہ نے کانپتی آواز میں کہا، لیکن جملہ مکمل نہ کر سکی۔

"یہ ڈبل کہیں کس سلسلے میں کہا گیا۔" آفتاب نمبر ایک بولا۔

"کہیں اناتیو ہمیں چکمہ تو نہیں دے گیا۔"

"نن۔ نہیں تو۔ ہمارے پاس تو کوئی چکمہ وکمہ نہیں ہے۔" اشفاق نے بوکھلا کر کہا۔

"میرا مطلب ہے۔ کہیں وہ ہمیں دھوکا تو نہیں دے گیا۔"

"بھلا بھاگ کر بے چارہ کیا دھوکا دے سکتا تھا۔ وہ تو جان بچا کر بھاگا ہے۔" آصف نے منہ بنایا۔

"اور غلط سمت میں بھاگا۔" فرحت بول اٹھی۔

"ہاں۔ یہی میں کہنا چاہتی تھی۔"

"ہم بھی اب یہی سوچنے پر مجبور ہیں۔ ہمیں تو ٹیلے کی سیدھ میں ہی آنا چاہیے تھا۔ ہم اس سمت میں مڑ گئے۔ جس سمت میں اناتیو دوڑا۔"

"اوہ۔" وہ دھک سے رہ گئے۔ گویا یہ اتنا لمبا دوڑنا بے کار گیا تھا۔

"پھر۔ اب کیا کیا جائے۔" خان رحمان نے پریشان ہو کر کہا۔

"ٹیلے کو ہم نے دائیں ہاتھ چھوڑا تھا، کیوں نہ ہم دائیں ہاتھ مڑ جائیں۔ ہو سکتا ہے۔ اس طرح ہم ہیڈ کوارٹر تک پہنچ جائیں، کیونکہ آگے جا کر اناتیو بھی اسی سمت میں مڑا ہو گا۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

اگرچہ وہ تھک کر چور ہو چکے تھے۔ لیکن سمت تبدیل کرنے کے سوا کر ہی کیا سکتے تھے۔ اب انھوں نے بھاگنا بند کیا اور تیز تیز چلنے لگے۔ پھر تھکن کسی قدر دور ہوئی تو بھاگنے لگے۔

"انکل۔ کیا ہم کسی دشمن ملک میں ہیں۔" شوکی نے انسپکٹر جمشید کی طرف دیکھا۔

"نہیں۔ انسپکٹر کامران مرزا کے بیان کی روشنی میں ہم مسٹر مین ہنڈارا کے ملک میں ہیں اور ان کا ملک ہمارا دوست ملک ہے۔"

"تب تو شکر ہے۔ میرا تو ڈر کے مارے بُرا حال ہے۔"

"حد ہو گئی۔ آخر اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے۔" آصف نے تملا کر کہا۔

"اور میں حیران ہوں۔" اشفاق کا جملہ درمیان میں رہ گیا۔ اسی وقت انھوں نے ایک لرزہ خیز چیخ کی آواز سُنی تھی۔ ان کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ چہروں کے رنگ اڑ گئے۔

"تت۔ تت تو کیا ہم ہیڈ کوارٹر کے نزدیک پہنچ گئے ہیں۔" محمود ہکلایا۔

"ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"مشکل یہ ہے کہ یہاں کوئی درخت یا اونچے ٹیلے بھی موجود نہیں۔ ورنہ ہم ان پر چڑھ کر چاروں طرف کا جائزہ لے سکتے تھے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"خیر۔ اب ہم آواز کی سمت میں بڑھ ہی سکتے ہیں۔" فرزانہ پُرجوش انداز میں بولی۔

"ہوں۔ ٹھیک ہے۔ آگے بڑھنے کے سوا ہم کر ہی کیا سکتے ہیں۔ آخر اپنے پروفیسر صاحبان تک تو پہنچنا ہی ہے۔ چاہے جس حالت میں بھی پہنچیں۔" انسپکٹر جمشید اداس لہجے میں بولے۔

"جج۔ جی کیا مطلب۔ جس حالت میں بھی پہنچیں۔" شوکی نے گڑبڑا کر کہا۔

"یعنی اگر تم لوگوں کے غصے کا یہی حال رہا تو تم ہمیں بھی شکل میں ڈھالو گے۔"

"س س سوال۔" آفتاب نے سہم کر کہا۔

اسی وقت ایک اور چیخ فضا میں لہرائی۔ ان کے چہرے زرد پڑ گئے۔

"الٰہی خیر۔ وہاں تو چیخوں کا بازار گرم معلوم ہوتا ہے۔" محمود نے تھرتھر کانپتی آواز میں کہا۔

"چیخوں کا بازار۔ کیا کہہ رہے ہو۔" فاروق نے اسے گھورا۔

"کیوں بے چارے شوکی برادر کے پیروں تلے سے زمین نکل رہی ہو۔"

"ان کے پیروں سے ہی کیا، زمین تو اس وقت ہم سب کے پیروں سے نکلی ہوئی ہے۔" آصف نے منہ بنایا۔

"ارے باپ رے۔ تب ہم کس چیز پر رہے ہیں۔" آفتاب نمبر ایک بوکھلا اٹھا۔

"ہوا میں تیر رہے ہوں گے۔" فاروق نے کہا۔

"ہوں گے۔ گویا تم یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔ یہ کیا بات ہوئی۔" فرحت نے اسے گھورا۔

"ان حالات میں کوئی بات بھی یقین سے نہیں کہی جا سکتی۔ تمہیں اتنا بھی نہیں معلوم۔" فاروق نے جل بھن کر کہا۔

"یہ اس انداز میں جلا بھنا تم نے کس سے سیکھا۔" فرحت نے منہ بنایا۔

"اگر تمہیں اتنا ہی پسند آگیا ہے تو فرزانہ کی خدمات حاصل کر لو۔"

"شش۔ شاید۔ آپ لوگ ان چیخوں کو بھول گئے ہیں۔" شوکی نے گھبرائے ہوئے انداز میں کہا۔

"ایسی کوئی بات نہیں۔ وہ چیخیں تو ہمارے دلوں کی گہرائی تک اتر گئی ہیں۔ ان کا اثر کم کرنے کے لیے ہی ہم باتیں بنا رہے ہیں۔ تم بھی حصہ لو نا۔" محمود نے گویا دعوت دی۔

"یہ بے چارے کیا حصہ لیں گے۔ انہیں تو واپس جانے کی پڑی ہے۔ اتنا بھی نہیں سوچتے کہ اپنے حصے کے پروفیسر صاحبان کو ہی ساتھ لے جانے کی کوشش کریں۔" آفتاب نمبر ایک نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

"اپنے حصے کے پروفیسر۔" محمود حیران ہو کر بولا اور وہ مسکرا دیے۔

عین اسی وقت ایک تیسری چیخ ان کے کانوں میں گھستی چلی گئی۔ اب وہ رہ نہ سکے۔ انسپکٹر جمشید تو چلا ہی اٹھے:

"نہیں۔ میں ان لوگوں کو معاف نہیں کروں گا۔ ان کا وہ حشر کروں گا کہ آئندہ نسلیں تک یاد رکھیں گی۔"

یہ الفاظ انہوں نے پرسکون انداز میں ادا کیے اور پھر آواز کی سمت میں بھاگ کھڑے ہوئے۔ سبھی ان کے پیچھے دوڑے۔ وہ بے تحاشہ دوڑتے چلے گئے۔ اب تو گویا باتیں کرنا بھی بھول گئے تھے۔

اچانک ان کے اٹھتے قدم رک گئے۔ دور۔ بہت دور۔ انہیں انسانوں کا ایک ہجوم سا نظر آیا۔

"کیا ہم ہیڈ کوارٹر تک پہنچ گئے۔" محمود نے پرجوش لہجے میں کہا۔

"ہاں، اس کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے

"لیکن۔ سوال یہ ہے کہ ہم ان کے نزدیک کس طرح ہوں۔ راستے میں درخت ہیں نہ ٹیلے۔ نہ زمین اونچی نیچی۔ آخر ہم خود کو ان لوگوں سے کس طرح چھپائیں۔" خان رحمان نے پریشان ہو کر کہا۔

"کاش۔ ہمارے پاس سلیمانی ٹوپیاں ہوتیں۔" شوکی نے کانپتی آواز میں کہا۔

"جادوئی باتیں نہ کرو۔ ہم عمل کے میدان میں قدم رکھ چکے ہیں۔" آصف نے منہ بنایا۔

"فرزانہ، تم کیا کہتی ہو۔ کیا ہم سب اسی طرح بڑھتے چلے جائیں۔" انسپکٹر جمشید اس کی طرف مڑے۔ ان کے ساتھ باقی سب بھی اسے دیکھنے لگے۔

"میرے خیال میں یہ مناسب نہیں ہوگا۔ کیوں نہ یہاں سے ہم دو پارٹیوں میں تقسیم ہو جائیں۔ ایک یہاں ٹھہرے اور دوسری پارٹی آگے بڑھے۔ یہاں تک کہ مجمعے تک پہنچ جائے۔ اس کے بعد ہم حالات کے مطابق قدم اٹھا سکتے ہیں۔"

"بالکل ٹھیک۔ میں فرزانہ کی تائید کرتا ہوں۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"تب پھر جلد از جلد دو پارٹیوں میں تقسیم ہو جاؤ۔ ایک پارٹی میری ہوگی، دوسری انسپکٹر کامران مرزا کی۔ تم میں سے جو جس پارٹی کے ساتھ شامل ہونا چاہے۔ ہو جائے۔ میں اور انسپکٹر کامران مرزا الگ کھڑے ہو رہے ہیں۔"

یہ کہہ کر وہ انسپکٹر کامران مرزا سے الگ ہو گئے۔ باقی سب پریشانی کے عالم میں ان دونوں کو دیکھنے لگے:

"کیا بات ہے۔ کیا ہوا۔ تم لوگوں کو سانپ کیوں سونگھ گیا۔ ہم دونوں کی طرف بڑھتے کیوں نہیں۔ جلدی کرو۔ اس میں سوچنے کی کیا بات ہے۔ وقت بہت کم ہے۔ اور ادھر پروفیسر صاحبان پر ظلم توڑا جا رہا ہے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"یہ۔ یہ۔ ہم سوچ نہیں پا رہے ابا جان۔ کیا کریں، کیا نہ کریں۔"

"حالانکہ اس میں سوچنے کی بالکل کوئی بات نہیں۔ اچھا خیر، میں خود یہ مشکل حل کیے دیتا ہوں۔ محمود، آصف، فرزانہ، آفتاب نمبر دو اور خان رحمان میرے ساتھ آجائیں۔ ہم ہو گئے چھ۔ انسپکٹر کامران مرزا کی طرف فاروق، آفتاب نمبر ایک، اشفاق اور اخلاق اور فرحت چلے جائیں۔ یہ بھی ہو گئے چھ۔ اور ہو۔ ہم میں سے کوئی ایک تو رہ ہی گیا۔" انہوں نے بوکھلا کر کہا۔

"ن ج۔ جی۔ م۔ میں۔ یعنی کہ میں رہ گیا۔" شوکی نے بوکھلا کر کہا۔

"اوہ۔ اب تمہارا کیا کریں۔" انسپکٹر کامران مرزا نے پریشان ہو کر کہا۔

"آدھا آدھا کر دیں۔" فاروق بولا۔ شوکی نے اسے گھور کر دیکھا۔

"چلو۔ میں یہ بات شوکی پر چھوڑتا ہوں۔ شوکی جس طرف بھی شامل ہونا چاہو۔ ہو جاؤ۔"

"م۔ مجھے آپ اسی طرح کیوں نہیں رہنے دیتے۔" اس نے جلدی سے کہا۔

"ک ک۔ کیا مطلب؟" محمود نے چونک کر پوچھا۔

"مطلب یہ کہ۔ مجھے کسی پارٹی میں شامل ہی نہ کریں۔"

"تب پھر تم کیا کرو گے؟" انسپکٹر کامران مرزا نے مارے حیرت کے کہا۔

"آپ لوگوں کی کامیابی کے لیے دعا کروں گا۔"

ان کی ہنسی نکل گئی، پھر پروفیسر صاحبان کا خیال آتے ہی ہنسی کا گلا گھٹ کر رہ گیا۔ ایسے میں انسپکٹر جمشید بولے:

"میں تو ان لوگوں کو سنے کر جا رہا ہوں۔ شوکی سے آپ خود فیصلہ کرتے رہیے۔ آؤ بھئی میری فوج کے جوانو۔" انسپکٹر جمشید نے کہا اور تیز تیز قدم اٹھاتے ہیڈ کوارٹر کی طرف چل دیے۔

پھر قدم بہ قدم وہ مجمعے سے نزدیک ہوتے چلے گئے۔ رائفل ابھی تک خان رحمان کے ہاتھ میں تھی۔

"جمشید۔ کیوں نہ میں ان پر فائرنگ شروع کر کے کھلبلی مچا دوں۔"

"گولی ہمارے کسی آدمی کو بھی لگ سکتی ہے۔ ابھی ٹھہرو۔ ذرا صورتِ حال کا جائزہ لے لیں۔"

ابھی یہ الفاظ ان کے ہونٹوں پر تھے کہ ایک شوخ آواز گونجی:

"تھا جن کا انتظار۔ وہ لوگ آ گئے۔"

پورا کا پورا مجمع یک لخت ان کی طرف مڑا۔ وہ لوگ خالی ہاتھ تھے۔ ان کے جسموں پر عجیب و غریب لباس تھے۔ میدان کے بیچوں بیچ لکڑیاں جوڑ کر آگ دہکائی گئی تھی اور اس طرح کوئلوں کا ایک بہت بڑا ڈھیر لگ گیا تھا۔ لکڑیاں کوئلہ بن چکی تھیں اور دھواں نہیں اٹھ رہا تھا۔ ورنہ وہ اس دھوئیں کے سہارے بہت پہلے یہاں پہنچ جاتے، آگ کے الاؤ سے کچھ فاصلے پر لوہے کے پائپ زمین میں نصب تھے، یہ پائپ بالکل اس طرح لگائے گئے تھے کہ جس طرح شکاری لوگ سالم ہرن بھوننے کے لیے لگاتے ہیں۔ لیکن ہرن والی سلاخوں میں اس وقت چھ انسان باندھے گئے تھے۔ ان سلاخوں کے ایک سرے پر ہینڈل نما سلاخیں بھی لگی تھیں۔ ان ہینڈلوں کو چھ آدمیوں نے تھام رکھا تھا اور وہ انہیں گھما رہے تھے۔ گویا سلاخوں پر بندھے ہوئے انسان چکر کھا رہے تھے۔ اور ان کے نیچے دہکتے کوئلے رکھے تھے۔ ان کے جسموں سے پسینہ ٹپ ٹپ کوئلوں پر گر رہا تھا اور چھن چھن کی آوازیں پیدا کر رہا تھا۔ سلاخوں سے بندھے ہوئے انسانوں کے جسم سرخ ہو رہے تھے۔ پسینے میں تربتر تھے اور آنکھیں خوف اور دہشت سے پھیل گئی تھیں۔ انہوں نے جو چیخیں سنی تھیں، شاید انہی لوگوں کی تھیں۔ نیچے رکھے گئے کوئلے۔ زیادہ مقدار میں نہیں تھے؛ تاہم درمیان میں جو الاؤ دہک رہا تھا۔ اس میں سے کوئلے ان کے نیچے منتقل کرتے انہیں کیا دیر لگ سکتی تھی۔ ان چھ آدمیوں میں پروفیسر عقلان، پروفیسر غوری اور پروفیسر داؤد بھی تھے۔ باقی تین آدمی شاید دوسرے مسلمان ممالک سے اغوا کیے گئے تھے۔ انہوں نے اتنا خوفناک منظر اپنی زندگی میں شاید پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ابھی ان کے منہ سے کوئی لفظ نہیں نکل پایا تھا کہ وہی آواز پھر ابھری:

"ارے۔ یہ لوگ تو پورے نہیں ہیں۔"

اس بار انہوں نے الٹانیو کی آواز صاف پہچانی تھی۔

"پورے نہیں ہیں۔ تو کیا آدھے ہیں، لیکن ہمیں تو یہ بالکل پورے پورے نظر آ رہے ہیں۔" مجمعے میں سے کئی آوازیں ابھریں۔

"میرا مطلب ہے۔ تعداد کا نصف ہیں۔" الٹانیو نے برا سا منہ بنایا۔

"تب پھر ان میں سے نصف کچھ فاصلے پر ہوں گے۔ یہ ان کا پرانا طریقہ کار ہے۔" رے راٹا کی آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی۔

"کوئی بات نہیں۔ وہ بھی آ جائیں گے۔ ہمیں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ اور انسپکٹر جمشید۔ اپنے ساتھی سے کہو۔ اس رائفل کو پھینک دے۔ یہاں رائفلیں نہیں چل سکتیں۔ یہ ہمارا ہیڈ کوارٹر ہے۔ اسے صرف ایک میدان نہ سمجھو۔"

"کیا مطلب۔ نہیں چلتیں۔ تو کیا رائفل کی گولی رائفل میں سے نہیں نکلے گی؟"

"ضرور نکلے گی۔ لیکن اس میدان کے گرد نظر نہ آنے والی لہریں گردش کر رہی ہیں۔ ان لہروں کی موجودگی میں گولی اثر نہیں کرے گی۔ فوراً سرد ہو جائے گی اور نہ ہی کچھ زیادہ دور تک جائے گی۔ بس رائفل کی نالی سے نکل کر تمہارے قدموں میں گر پڑے گی، اگر یقین نہیں تو رائفل چلا کر دیکھ لو۔"

اس بار آواز سلاٹر کی تھی۔

☆ ☆ ☆

"کیا خیال ہے جمشید۔ تصدیق کر لی جائے؟" خان رحمان نے ان کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"ضرور۔ اس میں کوئی حرج نہیں۔ ان میں سے کسی ایک کا نشانہ لو اور گولی چلا دو۔" وہ بولے۔

مجمعے میں سبھی نے ان کے الفاظ سنے، لیکن وہ جوں کے توں کھڑے رہے، یہاں تک کہ خان رحمان نے ٹریگر دبا دیا، لیکن ہوا وہی جو سلاٹر نے کہا تھا۔

"گویا یہ ہتھیار یہاں، ہمارے لیے تو بے کار ہے ہی۔ ان کے لیے بھی بے کار ہے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"نظر تو یہی آتا ہے۔" خان رحمان نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ وہ یہ سوچ سوچ کر پریشان ہو رہے تھے کہ اس کھلے میدان میں۔ جہاں اوٹ لینے کی کوئی جگہ ہے نہ دشمن کے حملے سے بچاؤ کی کوئی راہ۔ وہ چند آدمی اتنے بہت سے لوگوں کے مقابلے میں کیا کر سکیں گے۔

"خیر کوئی بات نہیں۔ رائفل تمہارے ہاتھ میں ہی رہنی چاہیے، کم از کم یہ ایک لاٹھی کا کام تو دے ہی دے گی۔"

"باقی ساتھیوں کو کہاں چھوڑ آئے انسپکٹر جمشید۔" التانیو کے لہجے میں گہرا طنز تھا۔

"نزدیک ہی۔ تم ان کی طرف سے فکر مند کیوں ہو۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"فکر مند ہوں ہمارے دشمن۔ یعنی تم لوگ۔ ہم کیوں ہونے لگے فکر مند۔" التانیو نے کہا۔

"تب پھر کیوں اسلامی ممالک کے سائنس دانوں کو یہاں جمع کر لیا، اگر تم لوگ فکر مند نہیں تھے۔" محمود نے جل بھن کر کہا۔

"ہم ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے نہیں رہتے۔ معلومات حاصل کرتے رہتے ہیں۔ یہ چیز ہمیں عجیب۔ بلکہ بہت ہی عجیب نظر آئی کہ اسلامی ممالک کے سائنس دان اچانک غائب ہو گئے۔ وہ بھی ایک دو دن کے لیے نہیں، پورے چھ ماہ تک کے لیے۔ لہٰذا ہم یہ جاننے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم فکر مند ہیں۔" التانیو نے جلدی جلدی کہا۔

ابھی تک وہ تینوں انہیں نظر نہیں آئے تھے۔ نہ جانے وہ کہاں موجود تھے۔ آواز انہیں اپنے بالکل نزدیک سے ابھرتی محسوس ہو رہی تھی، شاید یہ بھی ان لہروں کا اثر تھا۔

"اچھا بھئی۔ نہیں ہو گے فکر مند۔" آفتاب نبردو نے منہ بنایا۔

"ان لوگوں کو بھی گھیرے میں لے لیا جائے۔ اگر یہ فرار ہونے کی کوشش کریں تو بے دھڑک انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔" سلاٹر کی گرج دار آواز نے سنسنی سی پھیلا دی۔

"ان بے گناہ لوگوں پر یہ ظلم بے وجہ توڑا جا رہا ہے۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں۔ انہیں کچھ معلوم نہیں، اگر کسی کو کچھ معلوم ہے تو وہ مسٹر مین بھنڈارا کو۔ جاؤ جا کر انہیں پکڑو۔"

"اس سلسلے میں بھی کوشش شروع کی جا چکی ہے اور بہت جلد تم مسٹر مین بھنڈارا کو بھی یہیں دیکھو گے۔" رے راٹا ہنسا۔

"بس تو پھر۔ ان سب لوگوں کو اس ظلم سے نجات دے دو۔ یہ بے چارے کچھ نہیں جانتے۔"

"لیکن کوئی نہ کوئی شخص ایسا ضرور ہے۔ جسے اصل بات کا علم ہے۔ میرا مطلب ہے، مسٹر مین بھنڈارا کے علاوہ۔" سلاٹر کا لہجہ چبھتا ہوا تھا۔

"آپ لوگ آخر بول کہاں سے رہے ہیں۔ سامنے آ کر بات کیوں نہیں کرتے۔ ہم لوگ آپ لوگوں کو کھا تو نہیں جائیں گے۔" فرزانہ نے جلے کٹے انداز میں جلدی جلدی کہا۔

"ہم تمہارے سامنے ضرور آئیں گے، لیکن مناسب وقت پر۔ اس وقت ہم ایک ایسی جگہ موجود ہیں جہاں تم نہیں پہنچ سکتے۔ تم ان سب لوگوں کو ختم بھی کر دو، تب بھی تم ہم تک نہیں پہنچ سکتے۔ ویسے تو لہروں کے اس جال کے اندر تم ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکو گے۔ ہاں۔ یہ اس صورت میں ضرور ممکن ہے، اگر یہ سب لوگ ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو جائیں اور تمہیں ہاتھ پیر چلانے کی کھلی چھٹی دے دی جائے۔" سلاٹر نے جلدی جلدی کہا۔

"گویا ہاتھ اور پیر کی لڑائی ان لہروں کے اندر ہو سکتی ہے۔"

"ہاں، لیکن تم اتنے لوگوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ہم جانتے ہیں۔ تم تعداد میں صرف تیرہ ہو۔ اور یہاں سو کے قریب لوگ موجود ہیں، لوگ بھی وہ جو لڑائی بھڑائی کا بہت تجربہ رکھتے ہیں۔"

"تت۔ تو کیا یہ سو آدمی تم لوگوں نے ہمارے مقابلے کے لیے یہاں جمع کیے ہیں۔" فرزانہ نے منہ بنایا۔

"ارے نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ یہ تو اس مقام کے لیے جمع کیے گئے ہیں جس کی ہمیں تلاش ہے۔ یعنی جہاں سائنس دانوں نے چھ ماہ گزارے ہیں۔ معلوم نہیں۔ وہاں کیا حالات پیش آئیں، کتنے لوگوں سے مقابلہ کرنا پڑے۔ یہ سب تیاریاں تو دراصل وہاں کے لیے ہیں۔ تم لوگ تو ہمارے راستے کے پتھر ہو اور ان پتھروں کو ہٹا کر ہی ہم یہاں سے آگے بڑھیں گے۔"

"لیکن بڑھو گے کیسے۔ کیا تمہیں معلوم ہو چکا ہے، وہ مقام کہاں ہے۔" خان رحمان بولے۔

"اگر معلوم ہو چکا ہوتا تو یہ اتنا لمبا جھنجھٹ کیوں کرتے۔" اس نے سلاخوں میں بندھے ہوئے سائنس دانوں کی طرف اشارا کیا۔ پروفیسر داؤد کی حالت دیکھ دیکھ کر ان کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ وہ باقی سائنس دانوں سے کمزور تھے۔ اچانک انسپکٹر جمشید بولے:

"مسٹر سلاٹر۔ تم لوگوں نے ان بے چاروں کو تو بلا وجہ ہی باندھ رکھا ہے۔ مسٹر بھنڈارا کے علاوہ صرف ایک اور آدمی یہ بات جانتا ہے کہ وہ کون سی جگہ ہے۔ اور اس آدمی کا نام صرف میں تم لوگوں کو بتا سکتا ہوں۔"

"کیا مطلب!" سلاٹر کی چونکی ہوئی آواز سنائی دی۔ ابھی تک وہ انہیں نظر نہیں آئے تھے۔

"اس آدمی کا نام صرف میں بتا سکتا ہوں۔ جسے اس مقام کے بارے میں سب کچھ معلوم ہے۔ وہ تمام معلومات تم لوگوں کو دے سکتا ہے۔"

"اور۔ وہ۔ کون۔ ہے۔" رے راٹا نے ایک ایک لفظ چبا چبا

کر کہا۔

"وہ۔ ہاں۔ میں اس کا نام بتا سکتا ہوں، لیکن شرط یہ ہے کہ ان لوگوں کو کھول ڈالا جائے۔" وہ بولے۔

"نہیں۔ اس کا نام پہلے بتانا ہوگا۔ اس کے بعد ہم ان لوگوں کو کھول دیں گے اور صرف اسے قابو میں کریں گے۔"

"اچھا خیر۔ لیکن میں حیران ہوں۔ تم نے بڑے آدمی کو اب تک گرفتار کیوں نہیں کیا۔ میرا مطلب مسٹر مین بھنڈارا سے ہے۔ ان سب لوگوں کو جمع کرنے کے جھنجٹ کی بجائے اگر تم لوگ صرف مسٹر مین بھنڈارا کو پکڑ لیتے تو اس سے یہ بات معلوم ہو سکتی تھی۔"

"ہم نے یہ کوشش کی تھی۔ لیکن مین بھنڈارا ایسا غائب ہوا کہ ہم کھوج لگا ہی نہیں سکے، اس بات پر ہمیں اب تک حیرت ہے کہ وہ کہاں غائب ہو گیا تھا۔ ہاں۔ اب وہ پھر اپنے محل میں نظر آنے لگا ہے، لیکن اس کے گرد بہت سخت پہرہ ہوتا ہے۔ ان تمام حالات کے باوجود ہماری کوشش یہی ہے کہ کسی طرح اسے بھی پکڑ کر یہاں لے آیا جائے۔ اور یہ بات ہمارے لیے ایک خوش خبری سے کم نہیں کہ مین بھنڈارا کے سوا بھی کوئی شخص سب باتیں جانتا ہے۔ اب تم جلدی سے بتاؤ، تاکہ ہم ان لوگوں کو کھول دیں۔"

"تو پھر سنو۔ اس سارے پروگرام کی ایک ایک تفصیل صرف اور صرف مجھے معلوم ہے۔"

"کیا!" وہ سب اچھل پڑے۔ چہروں پر خوف اور حیرت کا طوفان نظر آیا۔ پھر فرزانہ چلا اٹھی:

"ابا جان۔ یہ آپ نے کیا کیا۔ اگر آپ کو سب کچھ معلوم تھا تو آپ نے یہ بات کیوں بتائی۔"

"اس لیے فرزانہ۔ کہ میری غیرت نے اس بات کو گوارا نہیں کیا کہ بات مجھے معلوم ہو اور ظلم میری بجائے دوسرے برداشت کریں۔ مزا تو اس میں ہے کہ یہ لوگ مجھے آگ پر بھونیں اور میں معلوم ہوتے ہوئے بھی نہ بتاؤں۔ بہادری بھی یہی ہے، اس موقع پر خاموش رہنا بزدلی تھی۔" وہ کہتے چلے گئے۔

پورے مجمعے پر سناٹا طاری ہو گیا۔ آخر سلاٹر کی آواز گونجی:

"بہت خوب انسپکٹر جمشید۔ ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ یہ راز تمہیں معلوم ہوگا۔ ویسے کہیں تم جھوٹ تو نہیں بول رہے۔"

"بھلا میں جھوٹ کس لیے بولوں گا۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"ان لوگوں کو تکلیف سے نجات دلانے کے لیے۔"

"دنیا میں کون ایسا ہے۔ جو دوسروں کی بجائے خود آگ پر بھننا قبول کرے گا۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"تم۔ کیونکہ تم کم از کم پروفیسر داؤد کے لیے یہ تکلیف برداشت کر سکتے ہو۔"

"وہم ہے تمہارا۔ میں نے یہ بات صرف اس لیے بتائی ہے کہ میری غیرت گوارا نہیں کر سکی تھی۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔ یہ لوگ بھی آخر ہیں تو ہماری پہنچ میں ہی۔ اگر تم جھوٹے بھی ثابت ہوئے تو ہم انہیں پھر سلاخوں سے باندھ دیں گے۔" سلاٹر بولا۔

"میں جھوٹا ثابت نہیں ہوں گا۔ یہ اور بات ہے کہ میری چربی پگھل جائے، لیکن زبان نہ کھلے۔"

"یہ ناممکن ہے۔ یہ تکلیف کوئی مائی کا لال برداشت نہیں کر سکتا۔ اگر تمہیں معلوم ہوا تو فرفر بول اٹھو گے۔ چلو ان لوگوں کو کھول دو۔ اور اس کے بعد انسپکٹر جمشید کو باندھ لو۔ اس کے نیچے نئے کوئلے ڈھیر کر دو۔"

چرخیاں گھماتے ہوئے لوگ رک گئے۔ کچھ اور آدمی بڑھے اور بندھے ہوئے لوگوں کو کھول ڈالا، پھر وہ انسپکٹر جمشید کی طرف بڑھے۔

"اب کیا پروگرام ہے ابا جان۔" محمود نے تھر تھر کانپتی آواز میں کہا۔

"یہ لوگ مجھے آسانی سے تو ان چرخیوں تک لے جا نہیں سکیں گے۔ ویسے تمہیں بھی کھلی اجازت ہے۔"

"کیوں نہ ہم انکل کامران مرزا کو بھی آواز دے لیں۔"

"ابھی نہیں۔ کیا خبر حالات کیا پلٹا کھاتے ہیں۔ ابھی تک تو ہمیں یہ بھی معلوم نہیں کہ اتانیو، رے لاٹا اور سلاٹر ہیں کہاں۔ ہم ان کی آوازیں کس طرح سن رہے ہیں۔ کیا وہ یہاں سے آگے کسی جگہ موجود ہیں۔ اور اگر کسی اور جگہ موجود ہیں تو یہاں کا منظر کس طرح دیکھ رہے ہیں۔"

"ہوں۔ تو کیا۔ ہم ان سے جنگ شروع کر دیں۔"

"ہاں۔ جنگ شروع کرنا اس بات سے بہر حال بہتر ہے کہ میں آرام سے چرخی تک جاؤں اور خود کو بندھوا لوں۔" وہ بولے۔

"لیکن ہمیں نہیں معلوم۔ ان لہروں کی موجودگی میں لڑنا مفید رہے گا یا مضر۔"

"دیکھا جائے گا۔ کچھ کرنے سے ہی پتا چلے گا۔"

اتنے میں چار آدمی ان کے نزدیک آ گئے۔

"چلیے جناب۔" ان میں سے ایک نے کہا۔

"کہاں چلوں۔"

"اس طرف۔ اب آپ کو باندھا جائے گا۔"

"میں تو ہرگز نہیں جاؤں گا۔ ہاں تم اٹھا کر لے جاؤ۔" وہ بولے۔

وہ چاروں آگے بڑھے اور انہیں اٹھانے کے لیے لپکے۔ انسپکٹر جمشید پہلے تو پُر سکون انداز میں کھڑے رہے جیسے ان کا لڑائی بھڑائی کا قطعاً کوئی ارادہ نہ ہو، پھر انہوں نے اچانک ان میں سے دو کو گردنوں سے پکڑ لیا اور ان کے سر آپس میں اس

زور سے ٹکرائے کہ گونج دار آواز پیدا ہوئی۔

"بھئی واہ۔ ناریل ٹوٹنے کا مزا آگیا۔" آفتاب نمبر دو نے خوش ہو کر کہا۔

اتنے میں محمود اور آصف باقی دو پر چھلانگ لگا چکے تھے۔ خان رحمان اور فرزانہ ان کی مدد کو بڑھے اور دیکھتے ہی دیکھتے چار آدمی ان کے پاس ڈھیر ہو چکے تھے۔

"چلو بھئی۔ چار اور آؤ۔" محمود نے بلند آواز میں کہا۔

"یہ۔ یہ کیسے ہو گیا۔" آفتاب نے حیران ہو کر کہا۔

"دیکھا نہیں تھا آنکھوں سے۔"

"دو۔ دیکھا تو خیر تھا۔" آفتاب ہکلایا۔ اسی وقت انہوں نے چار اور آدمیوں کو بڑھتے دیکھا، لیکن اس مرتبہ ان کے ہاتھوں میں خنجر نظر آئے۔

"خبردار۔ انسپکٹر جمشید کو کوئی کاری خنجر نہ لگے۔ ورنہ یہ ہمیں کچھ بتانے کے قابل نہیں رہیں گے۔" سلاٹر کی آواز گونجی۔

"بھئی واہ، انکل تو یہ اعلان کر کے بہت مزے میں رہے۔" یہ کہتے ہی آصف چلا اٹھا:

"میں بھی اس مقام کے بارے میں سب کچھ جانتا ہوں، مجھے بھی کاری ضرب نہ لگائی جائے۔"

سلاٹر، ریے راٹا اور انٹانیو کے ہنسنے کی آوازیں ان کے کانوں سے ٹکرائیں۔ ساتھ ہی چار خنجر ایک ساتھ ان کی طرف لپکے۔ انہوں نے جھکائیاں دیں اور ان سے دور نکل گئے، خان رحمان نے رائفل کو نالی کی طرف سے پکڑ لیا اور نزدیک آنے والے ایک دشمن کے سر پر اس کا بٹ دے مارا۔ وہ تیورا کر آفتاب کے پاس گرا۔

"ارے باپ رے۔" آفتاب نمبر دو تھر تھر کانپتے ہوئے پیچھے ہٹ گیا۔

"آفتاب۔ اس کے خنجر پر قبضہ کر لو۔"

"م۔ میں قبضہ کر لوں۔ یعنی کہ میں۔ لیکن انکل۔ میں تو دوسرے والا آفتاب ہوں۔ یعنی شوکی برادرز والا۔" آفتاب نے تھرتھر کانپتی آواز میں کہا۔

"لاحول ولا قوۃ۔" فرزانہ نے جھنا کر کہا اور زخمی دشمن کی طرف چھلانگ لگا دی۔ دوسرے ہی لمحے خنجر اس کے ہاتھ میں تھا۔

"ایسے قبضے میں کرتے ہیں خنجر۔" اس نے آفتاب کو گھورا۔

"م۔ میں۔ میں کیا کروں۔" وہ بولا۔

"کرنا کیا ہے۔ بس لڑائی دیکھو مزے سے۔" وہ بولی۔

اتنی دیر میں انسپکٹر جمشید اپنی طرف بڑھنے والے کو ہاتھوں پر بلند کر کے تیسرے پر پٹخ چکے تھے۔ دونوں دھڑام سے گرے اور کچھ دور تک لڑھکتے چلے گئے۔ چوتھے کو محمود اور آصف بری طرح نچائے دے رہے تھے۔ ایسے میں فرزانہ اس کی طرف بڑھی اور خنجر اس کی کمر میں اتار دیا۔

"لیجیے مسٹر سلاٹر۔ چار اور گئے۔ ان آٹھوں کا ناشتا تیار کرا لیں اور ہماری طرف چار اور بھیج دیں۔" خان رحمان بولے۔

"اب یہ لوگ چار چار کی صورت میں نہیں آئیں گے۔ ٹوٹ پڑو سب مل کر ان پر۔ اور بے دم کر دو انہیں مار مار کر۔ اس کے بعد انسپکٹر جمشید کو باندھ لینا ہو گا۔"

تقریباً نوے آدمی چیختے چلاتے ان کی طرف بڑھے۔ وہ بوکھلا گئے۔

"اف خدا۔ اب کیا کریں۔" آصف نے چیخ کر کہا۔

"بھاگو۔" انسپکٹر جمشید پکار اٹھے۔

"جی، کیا فرمایا۔ بھاگو۔" فرزانہ نے حیران ہو کر کہا۔

"ہاں۔ بھاگو۔" یہ کہہ کر انسپکٹر جمشید بھاگ نکلے۔ ان کے ساتھیوں نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ دشمن ان کی طرف دوڑ پڑے۔

"آج بھاگنے کا ریکارڈ توڑ دو۔ ان کے ہاتھ نہ لگنا۔ سمجھے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"ج۔ جی سمجھ تو گئے، لیکن آپ چاہتے کیا ہیں؟" محمود نے گھبرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"یہ نوے آدمی اگر بیک وقت خنجروں سے ہم پر ٹوٹ پڑتے تو ہماری بوٹیاں بھی نہ ملتیں۔ لہٰذا ہم بھاگنے کے علاوہ کر ہی کیا سکتے تھے۔ دوسرے یہ کہ بھاگنے کی وجہ سے ہم ان لہروں کے جال سے نکل گئے ہیں۔ درمیانی فاصلہ ذرا زیادہ ہو لینے دو۔ پھر میں تمہیں نظارہ دکھاؤں گا۔"

"لیکن ابا جان۔ ہم اپنے سائنس دانوں کو وہاں چھوڑ آئے ہیں۔ تینوں بڑے دشمن آس پاس ہی کہیں موجود ہیں اور وہ ان پر کسی وقت بھی حملہ کر سکتے ہیں۔" فرزانہ نے پریشان لہجے میں کہا۔

"اللہ مالک ہے، ہم اور کر ہی کیا سکتے ہیں۔"

"جمشید۔ ہم ان سے کافی دور نکل آئے ہیں۔" خان رحمان نے گویا انہیں توجہ دلائی۔

"اچھا تو خان رحمان۔ ہم بدستور دوڑتے جائیں گے، تم اچانک زمین پر لیٹ جاؤ اور رخ ان کی طرف کر لو۔ جونہی وہ رائفل کی زد پر آئیں۔ اپنی تمام گولیاں کام میں لے آنا۔ اس طرح ان کی تعداد کچھ اور کم ہو جائے گی۔"

"ویری گڈ۔ اچھی ترکیب ہے۔ میں یہی کروں گا، لیکن یار۔ تم زیادہ دور نہ نکل جانا۔ کہیں گولیاں ختم ہونے کے بعد وہ سب کے سب مجھ پر نہ آ ٹوٹیں۔" وہ بولے۔

ان کی ہنسی نکل گئی، پھر خان رحمان اچانک نیچے گر گئے اور وہ آگے نکلے چلے گئے۔ پیچھے آنے والے دشمنوں کو پتا ہی نہ چلا کہ ان میں سے ایک نیچے گر گیا ہے۔ کچھ فاصلے پر پہنچ کر انہوں نے رفتار کم کر دی۔ انسپکٹر جمشید فرزانہ سے بولے:

"فرزانہ خنجر مجھے دے دو۔ اور تمہارے انکل جن لوگوں کو گرائیں، ان کے خنجروں پر قبضہ کرنے کے لیے تیار رہو۔"

"جی بہتر۔" اس نے کہا۔ اسی وقت گولیاں چلنے کی آوازیں کانوں سے ٹکرائیں۔

انہوں نے ایک چکر کاٹا اور اس طرف بڑھنے لگے جس جگہ خان رحمان فائرنگ کر رہے تھے۔ فائرنگ کی وجہ سے دشمنوں کی پیش قدمی رک گئی تھی۔ اور وہ زمین پر لیٹ کر خود کو بچانے کی کوشش کر رہے تھے، لیکن خان رحمان تو اس میدان کے پرانے کھلاڑی تھے، جونہی کسی کا سر ابھرتا۔ گولی داغ دیتے۔ اس وقت تک وہ نو آدمیوں کے سر اڑا چکے تھے۔ تاہم دشمن بھی پیچھے ہٹنے پر تیار نہیں تھے۔ برابر آگے کی طرف رینگ رہے تھے۔ یہاں تک کہ پندرہ منٹ کی جنگ کے بعد رائفل کی گولیاں ختم ہو گئیں۔ ان کی طرف خاموشی پا کر وہ اٹھے اور جوش میں بھر کر خان رحمان کی طرف دوڑے، خان رحمان بوکھلا کر اٹھے اور دوڑ لگا دی۔ وہ اس طرح دوڑ رہے تھے۔ گویا موت ان کے تعاقب میں ہو۔ ادھر نصف دائرے میں چکر کاٹتے ہوئے وہ لوگ۔ ان لاشوں کے پاس آئے اور خنجروں پر قبضہ کر کے اسی طرف دوڑ پڑے۔ انہیں دشمن کافی دور جاتے دکھائی دے رہے تھے:

"آؤ بھئی۔ جلدی کرو۔ کہیں وہ لوگ خان رحمان تک نہ پہنچ جائیں۔" انسپکٹر جمشید چلائے۔

وہ پوری رفتار سے دوڑتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ ان کے دوڑتے قدموں کی آوازیں دشمنوں نے بھی سن لیں۔ وہ بوکھلا کر پلٹے۔ اور ان پر حملہ آور ہوئے۔

سورج اب سر پر تھا اور اس کی روشنی میں میدان کے اندر خنجر یوں چمک اٹھے جیسے خنجروں کا کوئی کھیت بویا ہوا ہو۔ ادھر خان رحمان نے اپنے پیچھے دوڑتے قدموں کی آواز نہ سنی تو وہ بھی پلٹے اور دوڑ کر نزدیک آ گئے۔

دشمنوں کی تعداد اب بھی ستر کے قریب تھی۔ فرق صرف یہ پڑ گیا تھا کہ اب ان کے پاس بھی خنجر تھے اور خان رحمان کے ہاتھ میں رائفل لاٹھی کا کام دے رہی تھی۔

"ابا جان۔ دوسری پارٹی نہ جانے کہاں رہ گئی۔ کیا انہوں نے گولیاں چلنے کی آواز بھی نہیں سنی ہو گی۔" ایسے میں فرزانہ کو خیال آیا۔

"ہاں، کیوں نہیں سنی ہو گی۔ میرا بھی یہی خیال ہے کہ انہیں اب تک آ جانا چاہیے تھا۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"تب پھر۔ وہ کیوں نہیں پہنچے۔" آصف بڑبڑایا۔

لیکن ان کے پاس سوچنے کا موقع کب تھا۔ ان کے سروں پر تو خنجر چمک رہے تھے، لہٰذا وہ دوسری پارٹی کو بھول کر دشمن پارٹی سے نمٹنے لگے۔

○

"اب ہم کیا کریں انکل۔" ان کے وہاں سے روانہ ہونے کے بعد فاروق نے کہا۔

"کیوں نہ ہم ایک چکر لگا کر ان لوگوں تک پہنچنے کی کوشش کریں۔ اس کا فائدہ یہ ہو گا کہ وہ ہماری آمد سے بے خبر ہوں گے۔"

"ترکیب اچھی رہے گی، لیکن ہم شوکی کا کیا کریں۔" آفتاب نے کہا۔

"م م۔ مجھے آپ یہیں چھوڑ دیں۔" شوکی جلدی سے بولا۔

"ڈر رہے ہو شاید۔" آفتاب مسکرایا۔

"نہیں، ڈر کی کیا بات ہے۔ میں بالکل الگ تھلگ رہ کر کام آنے کی کوشش کروں گا۔ آپ لوگ جائیں۔"

"اچھا، جیسے تمہاری مرضی۔" انسپکٹر کامران مرزا نے کندھے اچکائے اور وہاں سے چل پڑے۔ نصف دائرے کی صورت میں چلنے کی وجہ سے وہ مجمعے سے دور ہوتے جا رہے تھے۔ پھر جب چکر کاٹ چکے تو اپنے خیال کے مطابق مجمعے کی طرف مڑ گئے۔

"لو بھئی۔ سلاٹر۔ اتانیر اور رے راٹا سے ملاقات کرنے کے لیے تیار رہو۔" فاروق کہہ رہا تھا۔

"ہم تو گھر سے ہی تیار ہو کر نکلے تھے۔ تم اپنی فکر کرو۔" آفتاب بولا۔

"اس میں فکر کرنے کی کیا ضرورت۔ ہاں، اگر تمہیں فکر کرنے کا ایسا ہی شوق ہے تو ضرور کرو فکر۔ ویسے سنا ہے۔ فکر کرنے سے آدمی صحت مند ہو جاتا ہے۔"

"صحت مند ہو جاتا ہے۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں فاروق صاحب۔" اشفاق نے حیران ہو کر کہا۔

"کک۔ کیا میں کچھ غلط کہہ گیا۔" فاروق ہکلایا۔

ہم نے تو سنا ہے کہ فکر کرنے سے آدمی کی صحت خراب ہو جاتی ہے۔ بال گرنے لگتے ہیں۔" اخلاق نے جلدی سے کہا۔

"اوہو اچھا، پھر تو ہرگز نہ کرنا بھئی آفتاب۔" فاروق گھبرا گیا۔

"تم سمجھے نہیں اشفاق۔ اخلاق۔ ان حضرت کی عادت ہے۔ ہمیشہ الٹ سلٹ بات کہتے ہیں۔" آفتاب نے جتاتے ہوئے انداز میں کہا۔

"سلٹ تو خیر ہرگز نہیں کہتا۔" فاروق نے آفتاب کو گھورا۔

"اور ان کی ایک عادت یہ بھی ہے کہ الفاظ کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ جاتے ہیں۔" آفتاب مسکرایا۔

"کیوں بھئی اشفاق۔ اخلاق۔ مجھے ہاتھ دھوتے دیکھا ہے، تم لوگوں نے۔"

"نن۔ نہیں تو۔ بالکل نہیں۔" اخلاق بوکھلا اٹھا۔

"دھو بھی کس طرح سکتا تھا یہاں تو دور دور تک پانی نہیں ہے۔" فاروق نے کہا۔

"اور کیا۔ اس سے تو وہ ناریلوں کی وادی اچھی تھی۔ کھانے اور پینے دونوں کا قدرتی انتظام تھا۔ یہ لوگ بھی کس قدر بے وقوف

ہیں۔ اپنا ہیڈ کوارٹر اس جگہ کو بھی تو بنا سکتے تھے؟

"وہ جگہ عین جنڈارا کے علم میں تھی۔ اور وہاں مدد آ سکتی تھی۔ اس لیے سلاٹر وغیرہ نے اس سے بہت دُور اپنا ہیڈ کوارٹر قائم کیا۔ یہ جگہ بالکل ویران ہے اور پھر شاید اس اصل مقام کی طرف راستہ اسی جگہ سے جاتا ہے۔ انہوں نے کسی طرح یہ اندازہ لگا لیا ہوگا۔" فرحت نے بھی اس گفتگو میں حصّہ لیا۔

"شکر ہے۔ تمہاری بھی آواز سنائی دی، ورنہ میں تو سمجھا تھا۔ تمہیں سانپ سونگھ گیا ہے۔" فاروق چہکا۔

"ایک تو تم میں یہ بہت غلط عادت ہے کہ غلط سمجھنے میں بہت جلدی کرتے ہو۔" فرحت نے جھنّا کر کہا۔

"ہاں واقعی۔ اس کی تو میں بھی تائید کرتا ہوں۔" آفتاب نے خوش ہو کر کہا۔

"اپنی تائید کو اپنے پاس رکھو۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"اچھا!" آفتاب فوراً بولا اور وہ مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔ فاروق کا منہ اور بن گیا، وہ بولا:

"بی مینڈکی کو زکام ہوا ہے شاید۔"

"مینڈک کہتے تو ایک بات بھی تھی۔ شاید تم سکول میں مذکر مؤنث میں کمزور ہو۔" فاروق نے جلدی سے کہا۔

"اشفاق اور اخلاق۔ تم دونوں کچھ خیال نہ کرنا۔ اب یہ لوگ زور شور سے مقابلہ کریں گے۔" فرحت نے منہ بناتے ہوئے ان کی طرف دیکھا۔

"کک۔ کیسا مقابلہ۔" اشفاق بولا۔

"باتوں کا۔ جملوں کا۔ محاورات کا۔ اور انہیں کوئی مقابلہ کرنا آتا ہی کیا ہے۔" وہ بولی۔

"ہاں۔ باقی سب مقابلے تو بس فرحت کو آتے ہیں۔"

"لیکن باقی سب مقابلے کون کون سے؟" اشفاق حیران ہو کر بولا۔

"لو۔ ان دونوں کو بھی اُلجھا لیا۔ حد ہے تم سے بھی۔" انسپکٹر کامران مرزا بُرا سا منہ بنا کر رہ گئے۔

"انکل۔ ہماری طرف سے کوئی اعتراض نہیں۔ آپ بھی اُلجھ جائیں۔"

اور وہ مسکرانے لگے۔ اچانک انہوں نے فائروں کی آوازیں سنیں۔ پہلے ایک فائر ہوا۔ اور پھر تو ہوتے ہی چلے گئے۔

"شاید ابّا جان اور ان کی پارٹی دشمنوں تک پہنچ گئی۔" فاروق نے فکر مندانہ لہجے میں کہا۔

"ہاں، اور ان سے ٹکرا بھی چکے ہیں۔ ہمیں ذرا تیز چلنا چاہیے کہیں انہیں ہماری مدد کی ضرورت نہ ہو۔"

انہوں نے رفتار تیز کر دی۔ اچانک انہوں نے سلاٹر کی آواز سنی۔ وہ بلند آواز میں کچھ کہہ رہا تھا، لیکن الفاظ ان کی سمجھ میں نہیں آئے۔ ان کے کان کھڑے ہو گئے:

"ہوشیار۔ ہم نزدیک پہنچ گئے ہیں۔" انسپکٹر کامران مرزا بڑبڑائے۔

"لیکن آس پاس کوئی نظر تو آ نہیں رہا۔ کہیں ہم لوگ اس مجمعے سے دُور تو نہیں نکل آئے۔" فرحت نے پریشان ہو کر کہا۔

"اگر دُور نکل آتے تو سلاٹر کی آواز کس طرح سنائی دے سکتی تھی۔" فاروق نے فرحت کو گھورا۔

"خیال ظاہر کیا ہے۔ میں نے کوئی گھونسہ تو نہیں دے مارا تمہیں جو اس طرح گھور رہے ہو۔" جواب میں فرحت نے بھی اسے گھورا۔

"لیجیے۔ باتوں، جملوں اور محاورات کی بجائے ان کے درمیان تو گھورنے کا مقابلہ شروع ہو گیا۔" اخلاق نے بوکھلا کر کہا۔

"اوہو۔ یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔" انسپکٹر کامران مرزا نے سرسراتی آواز میں کہا۔ اب وہ ان کی طرف مڑے۔ وہ ایک سمت میں بغور دیکھ رہے تھے۔ آنکھوں میں حیرت تھی۔ انہوں نے بھی ادھر دیکھا۔ دوسرے ہی لمحے وہ بھی حیران رہ گئے۔ اس میدان میں ابھی تک انہیں نہ تو کوئی بلند ٹیلا نظر آیا تھا اور نہ کوئی درخت۔ نہ میدان کہیں سے اونچا کہیں سے نیچا، لیکن اب انہوں نے اپنے سامنے میدان کو اونچا ہوتے دیکھا۔ اور اس کے سرے پر تین دُوربینیں رکھی تھیں:

"حیرت ہے۔ یہ دُوربینیں یہاں کہاں سے آ گئیں۔" اخلاق بڑبڑایا۔

"کہیں نہ کہیں سے تو ضرور آئی ہوں گی۔ تمہیں اتنا بھی نہیں معلوم۔" فاروق بولا۔

"ہر بات میں کاٹ کھانے کو نہ دوڑا کرو۔" آفتاب جھنجلا اُٹھا۔

"تمہاری باتیں کام خراب کر دیں گی۔ میرا خیال ہے۔ اس جگہ سلاٹر اور اس کے دونوں ساتھی موجود ہیں۔"

"اوہ۔ تب تو ہمیں اپنے ہونٹ سی لینے چاہییں۔" فاروق نے فوراً کہا۔

"ہونٹ تو خیر سی چکے آپ لوگ۔" اشفاق بولا۔

"ہاں، اشفاق ٹھیک کہتا ہے۔ تم لوگ اور ہونٹ سی لو۔ ہو ہی نہیں سکتا۔" فرحت نے فوراً کہا۔

"تو ساتھ سوئی دھاگا لے آئیں نا۔" فاروق جل کر بولا۔

"یہ تم خاموش ہوئے ہو۔" انسپکٹر کامران مرزا سرد آواز میں بولے۔ اور انہوں نے ہونٹ مضبوطی سے ...

دُوربینوں کے نزدیک پہنچتے پہنچتے انہیں احساس ہو گیا کہ وہاں دُوربینیں تو ضرور موجود ہیں۔ سلاٹر اور اس کے ساتھیوں میں سے کوئی نہیں ہے۔ البتّہ کچھ دیر پہلے وہ ضرور یہاں موجود رہے تھے۔ اس جگہ گڑھا کھود کر تین آدمیوں کے لیٹنے کی جگہ بنائی گئی تھی۔ اس طرح کہ ان کے صرف سر کنارے پر اُبھرے رہیں۔

غالباً وہ اس جگہ لیٹ کر مجمعے کی طرف دیکھتے رہے تھے — وہاں کچھ اور چیزیں بھی نظر آئیں۔ ایک مائک بھی موجود تھا اور اس میں سے تار نکل کر دُور چلی گئی تھی۔ انھوں نے تار کے تعاقب میں دیکھا اور چونک اٹھے —

دُور بہت دُور تین سائے دوڑے جا رہے تھے۔ اور ان سے بھی کافی فاصلے پر کچھ لوگ کھڑے نظر آئے۔ انھوں نے آگ کا ایک الاؤ سلگتے دیکھا۔ بس پھر کیا تھا۔ انھوں نے بھی دوڑ لگا دی۔

"مجھ تو اب کہیں نظر نہیں آ رہا۔" انسپکٹر کامران مرزا دوڑتے ہوئے بولے —

"کہیں گھومنے پھرنے چلا گیا ہوگا۔" فاروق بولا۔

"کیا کہہ رہے ہو۔" فرحت نے بھنّا کر کہا۔

"کیوں۔ کیا مجھ گھومنے پھرنے نہیں جا سکتا۔" فاروق مسکرایا۔

"اچھا، خدا کے لیے خاموش رہو۔ تمھاری باتیں سُن سُن کر سر میں درد ہونے لگا ہے۔" فرحت نے منہ بنایا۔

دوڑتے ہوئے جب وہ الاؤ کے قریب پہنچے۔ تو وہاں نو آدمیوں کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ ان میں تین تو ان کے ملک کے سائنس دان تھے۔ تین آدمیوں کو وہ نہیں پہچانتے تھے۔ البتہ باقی تین سلاٹر، ریے ماٹا اور اقاتیو تھے۔ ان کے قدموں کی آواز سُن کر وہ مڑے اور ٹھٹک کر رہ گئے —

"اوہو۔ تو دوسری پارٹی بھی ہم تک پہنچ گئی۔" سلاٹر مسکرایا —

☆☆☆

"یہ۔ یہ سب کیا ہے۔" اشفاق نے الاؤ اور چرخیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ظلم توڑنے کا سامان۔ پروفیسر صاحبان کی بری حالت دیکھ نہیں رہے۔ ان لوگوں نے انہیں چرخیوں پر چڑھا کر آگ کے اوپر گھمایا ہے۔ تاکہ یہ ان لوگوں کو یہ بتا دیں کہ چھ ماہ تک کہاں رہے ہیں۔"

"ہاں۔ کامران مرزا۔ یہی بات ہے۔" پروفیسر داؤد بولے — اب وہ بولنے کے قابل ہو چکے تھے۔

"آپ فکر نہ کریں پروفیسر انکل۔ ہم ان سے ایک ایک ظلم کا حساب لیں گے۔" فاروق نے پُرجوش لہجے میں کہا۔

"لیکن باقی سب لوگ کہاں چلے گئے؟"

"انسپکٹر جمشید اور ان کے ساتھیوں کے تعاقب میں۔ تھوڑے آدمی تجربوں سے ہیں ان کا پیچھا کر رہے ہیں اور ان کی تکا بوٹی کر کے [illegible] تمھاری باری آئے گی۔" سلاٹر بولا۔

"لیکن ہماری باری اس سے پہلے ہی کیوں نہ آ جائے۔ تکا بوٹی آپ لوگ کیوں نہیں کر دیتے ہماری۔" فرحت نے جل کر کہا۔

"یہ بھی مشکل نہیں۔" ریے ماٹا ہنسا۔

"ہم نے کچھ فائروں کی آوازیں بھی سنی تھیں۔ وہ کیسی تھیں؟"

"خان رحمان کے پاس ایک پستول تھی۔ اس نے اس سے ہمارے ساتھیوں کو ختم کر دیا ہے شاید۔ لیکن بھلا اس طرح ہمارے ساتھی کہاں پیچھے ہٹنے والے۔ وہ ان کا تعاقب بدستور جاری رکھیں گے۔ یہاں تک کہ ان کے سروں پر پہنچ جائیں گے —" اقاتیو نے پُرغرور لہجے میں کہا۔

"اللہ مالک ہے۔" آفتاب نے آسمان کی طرف دیکھا۔

"ہمیں ان لوگوں کی مدد کرنا ہوگی۔" انسپکٹر کامران مرزا نے فکرمندانہ لہجے میں کہا۔

"پروفیسر انکل۔ وہ کس طرف گئے ہیں۔" فاروق بے چین ہو گیا۔

"اس طرف۔" پروفیسر داؤد انگلی اٹھا کر بولے۔

"اور مسٹر سلاٹر۔ آپ لوگ اس حصے کی طرف کیوں دوڑ رہے تھے۔"

"پروفیسر صاحبان کو قابو میں رکھنے کے لیے۔ ہم نے سوچا — کہیں میدان خالی پا کر یہ ادھر اُدھر نہ ہو جائیں۔ اگرچہ اب ہمیں ان کی اتنی ضرورت نہیں رہی۔ ضرورت ہے تو صرف انسپکٹر جمشید کی۔" سلاٹر نے پُرخیال انداز میں کہا۔

"کیا — کیا مطلب۔" وہ چونک کر بولے۔

"لیکن انکل۔ ہم تو اپنے ساتھیوں کی مدد کے لیے جا رہے تھے۔" فاروق نے جلدی سے کہا۔

"اوہ ہاں۔ اچھا تو آؤ چلیں۔"

"تم لوگ کیسے جا سکتے ہو۔" اقاتیو نے ہنس کر کہا۔

"کیوں۔ جا کیوں نہیں سکتے۔ اپنی ٹانگوں سے جائیں گے۔" آفتاب نے بُرا سا منہ بنایا۔

"ادھر [illegible] نے ان کا رُخ کیا۔ ادھر ہم نے پروفیسر صاحبان کو موت کے گھاٹ اتارا۔ اگرچہ ہمارا ایسا کوئی پروگرام نہیں تھا۔ لیکن پروگرام کا کیا ہے۔ کسی وقت بھی کچھ بھی بن سکتا تھا —" ریے ماٹا بولا۔

"اوہ۔ گویا تم ہمیں یہ دعوت دے رہے ہو کہ اگر اپنے ساتھیوں کی مدد کے لیے جانا ہے تو پہلے ہم سے مقابلہ کرو۔" انسپکٹر کامران مرزا چونک کر بولے۔

"ہاں۔ یہی بات ہے۔"

"اور اگر ہم ادھر روانہ ہونے کی کوشش نہ کریں۔"

"پھر ہم اس محاذِ جنگ کے نتیجے کا انتظار کریں گے — اور آپس میں فیصلہ بعد میں کریں۔ اس طرح دونوں فریقوں میں سے ایک فریق فائدے میں رہے گا۔ اگر انسپکٹر جمشید اور ان کے ساتھی شکست کھا گئے تو ہمارے ساتھی کامیاب اور کامران واپس لوٹیں گے اور ہم تم لوگوں کو بھی ان کے حوالے کر دیں گے۔ اس طرح ہمیں ہاتھ پیر ہلانے کی ضرورت نہیں رہ جائے گی اور اگر — انسپکٹر جمشید نے ہمارے ساتھیوں کو شکست دے دی۔ تو ہم تم سب

کے مقابلے پر اکیلے رہ جائیں گے، لیکن ہم اس وقت بھی تم لوگوں سے ذرا خوف زدہ نہیں ہوں گے۔ اب تم سوچ لو۔ کیا کرنا چاہتے ہو۔"

"ہوں۔ تم نے واقعی ہمیں سوچ میں ڈال دیا۔ لیکن خیر ہم ان لوگوں کی مدد کے لیے جائے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اور پروفیسر صاحبان کو بھی تم لوگوں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتے۔ لہٰذا طے یہ رہا کہ پہلے ہم تم لوگوں سے مقابلہ کریں گے۔ پھر ادھر کا رُخ کریں گے۔"

"مشکل ہے۔ اس مقابلے میں تم لوگوں کی اینٹ سے اینٹ بج جائے گی۔" سلاٹر بولا۔

"لیکن مسٹر سلاٹر۔ اس میدان میں اینٹیں کہاں ہیں۔" فاروق نے حیران ہو کر کہا اور سلاٹر ہنس پڑا۔

"یہ باتونی لڑکا اس بار تمہارے حصے میں آیا ہے۔" رے واٹا بولا۔

"نہیں۔ بلکہ میں ان کے حصے میں آیا ہوں۔" انسپکٹر کامران مرزا مسکرائے۔

"اچھا دیکھو۔ ہمارے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہے۔ تم بھی کوئی ہتھیار استعمال نہ کرنا کیونکہ اس میدان کے اس حصے میں کوئی پستول وغیرہ استعمال کرنا بےکار ہے۔ ہاں، خنجر وغیرہ ضرور کام میں لا سکتے ہو۔ تاہم ہم تم لوگوں کو صرف اپنے ہاتھوں سے مزا چکھا دیں گے۔"

"صرف باتیں ہی بنائے جا رہے ہو۔ آگے نہیں آتے۔"

ابھی انھوں نے ایک دوسرے کی طرف قدم اٹھائے ہی تھے کہ انسپکٹر کامران مرزا کو کچھ خیال آیا:

"یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ اب تم لوگوں کو ہمارے ان مظلوم سائنس دانوں کی ضرورت کیوں نہیں رہی۔ کیا تم نے ان سے وہ مقام معلوم کر لیا ہے۔"

"نہیں۔ انہیں معلوم ہی نہیں۔ لیکن انسپکٹر جمشید کا کہنا ہے کہ یہ بات انہیں معلوم ہے۔"

"کیا!" وہ اچھل پڑے، آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"ہاں۔ اس لیے اب ہمیں صرف انسپکٹر جمشید کی ضرورت ہے۔ اور یہ سائنس دان ہماری طرف سے جائیں جہنم میں۔" رے واٹا بولا۔

"جیئی واہ۔ یہ بھی خوب رہی۔ پہلے تو انہیں اتنے جتنوں سے اغوا کیا۔ ظلم کا بازار گرم کیا اور اب انہیں جہنم میں بھیجا جا رہا ہے۔ حد ہو گئی۔" فاروق نے بڑی بوڑھیوں کے انداز میں کہا۔

"اگر انسپکٹر جمشید کو یہ بات معلوم ہے تو ہم تم لوگوں کو کبھی ان تک نہیں پہنچنے دیں گے۔" یہ کہہ کر انسپکٹر کامران مرزا گویا اُڑتے ہوئے ان تک پہنچے۔ انھوں نے پہلا مُکا سلاٹر کی ٹھوڑی پر دیا۔ لیکن اس وقت تک رے واٹا اور اناتیو حرکت میں آ چکے تھے۔ انھوں نے دائیں اور بائیں سے انسپکٹر کامران مرزا پر حملہ کر دیا۔ سلاٹر کو ان کا مُکا وصول کرنا پڑا، لیکن وہ بھی رے واٹا اور اناتیو کے حملے سے بچ نہیں سکے تھے۔

"ہم آ رہے ہیں انکل۔ بے فکر رہیں۔" فاروق نے مکار کر کہا۔

"کیا پدی اور کیا پدی کا شوربا۔" سلاٹر بولا۔

"ہم وہی پدیاں ہیں۔ جو تمہیں پہلے بھی تین بار فرار ہونے پر مجبور کر چکی ہیں۔" آفتاب نے منہ بنایا۔

اب وہ تینوں آگے بڑھے۔ لیکن اشتاق اور اخلاق اپنی جگہ پر کھڑے تھر تھر کانپتے رہ گئے۔

"کیوں بھئی۔ تم نہیں آؤ گے۔"

"آ۔ آپ۔ آپ لوگ جائیں۔" اشتاق ہکلایا۔

اس وقت تک انسپکٹر کامران مرزا جھکائی دے کر ان تینوں کے نرغے سے نکل چکے تھے۔ اس سے پہلے کہ فاروق اور آفتاب بھی اس جنگ میں کود پڑتے۔ دوسری طرف سے دوڑتے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ وہ سب چونک اٹھے۔ انھوں نے دیکھا۔ دُور بہت دُور کچھ لوگ دوڑتے ہوئے آ رہے تھے۔ سورج کی روشنی میں انہیں خنجروں کی چمک بھی دکھائی دی۔ لیکن دُور ہونے کی وجہ سے ابھی انہیں یہ اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ آنے والے سلاٹر وغیرہ کے ساتھی ہیں یا ان کے۔

لڑائی کو بھول کر وہ ان کی طرف دیکھنے لگے۔ اور پھر تھوڑی دیر بعد وہ اتنے نزدیک آ گئے کہ انھوں نے انہیں پہچان لیا۔ آنے والے انسپکٹر جمشید اور ان کے ساتھی تھے:

"وہ مارا۔ پہلی فتح مبارک ہو دوستو۔" فاروق نے بلند آواز میں کہا۔

"تت۔ تت تو انھوں نے ہمارے سو آدمی ٹھکانے لگا دیے۔" اناتیو نے بوکھلا کر کہا۔

"یہ۔ یہ کس طرح ہو سکتا ہے۔ شاید وہ بھاگ کھڑے ہوئے ہوں۔ سب کے سب کا ان کے ہاتھوں سے اتنی جلدی مارا جانا ناممکن ہے۔ جب کہ ان کے پاس خنجر تھے اور یہ لوگ نہتے تھے۔ لے دے کے ان کے پاس بس ایک رائفل تھی۔" سلاٹر نے جلدی جلدی کہا۔

"زیادہ پریشان اور بے چین ہونے کی ضرورت نہیں۔ ابھی دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جاتا ہے۔" فاروق مسکرایا۔

اتنے میں انسپکٹر جمشید بالکل نزدیک پہنچ گئے۔

"کیا رہا ابا جان۔" فاروق نے بے تاب ہو کر پوچھا۔

"ایک شاندار فتح اللہ تعالیٰ نے ہمیں دی ہے۔ ان کے سب ساتھی کھیت رہے۔ اس میدان میں ان کے لاشے بےدم ہو کر بکھرے پڑے ہیں۔" وہ بولے۔

"نعرۂ تکبیر۔" آفتاب اور فاروق ایک ساتھ چلا اُٹھے۔

سلاٹر، رے واٹا اور اناتیو ساکت رہ گئے، پھر ان کی آنکھوں میں خون اتر آیا، سلاٹر سرد آواز میں بولا:

"اگر ہمارے ساتھی مارے گئے تو کیا ہوا، ہم تم لوگوں کے لیے بہت کافی ہیں۔ تم اس میدان سے واپس تو کسی صورت بھی نہیں جا سکو گے۔ ہمارے چند ساتھی بے آواز ہیلی کاپٹر لے کر ہماری خبر گیری کے لیے برابر آتے رہیں گے اور ہمارا اشارہ پا کر ہمیں یہاں سے لے

بھی جائیں گے، لیکن تم لوگ اس میدان میں بھٹک بھٹک کر مر جاؤ گے، واپسی کا راستہ نہیں ملے گا۔"

" یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" انسپکٹر کامران مرزا مسکرائے۔

" کیوں - ہونے کو اس دنیا میں کیا نہیں ہو سکتا - اگر تم لوگ کسی طرح ہم پر غالب بھی آ جاؤ، تو بھی تم یہیں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر بھوکے پیاسے مر جاؤ گے۔"

" ہمیں سمندر کا راستہ معلوم ہے - تم یہ بات کیوں بھول رہے ہو۔" انسپکٹر جمشید نے کہا۔

" اور کیا تم تیر کر اپنے وطن پہنچو گے۔" اناتینو کے لہجے میں گہرا طنز تھا۔

" اللہ تعالیٰ مسبب الاسباب ہیں، کوئی نہ کوئی سبب بنا ہی دیں گے، تم لوگ کیوں اس اندیشے میں دبلے ہو رہے ہو - ہم نے تمہیں یہاں کا قاضی تو مقرر نہیں کیا۔" فاروق نے جلدی جلدی کہا اور وہ مسکرانے لگے۔

" خدا گنجے کو ناخن نہیں دیتا - اس طرح تم بھی انہیں قاضی نہیں بنا سکتے۔" آفتاب نبر ایک نے جل کر کہا۔

" بالکل بے محل جملہ ہے، بے موقع بات ہے - وقت ضائع کرنے کے برابر ہے۔" فاروق جھلا کر بولا۔

" اور تمہارا جملہ تو جیسے وقت آباد کیے دے رہا ہے نا۔" آفتاب بولا۔

" تم دونوں چند قدم پیچھے ہٹ کر اپنی بات چیت مکمل کر لو اور اگر باقاعدہ جھگڑنے کا پروگرام ہے تو دل کی بھڑاس بھی نکال لو - ہمیں ان سے بات کرنے دو۔" انسپکٹر کامران مرزا جل بھن کر بولے۔

" بہت اچھی ترکیب ہے۔" فرزانہ نے خوش ہو کر کہا۔

" اگر اتنی ہی اچھی ہے تو تم عمل کر لو اس پر، ہمیں کوئی اعتراض نہیں، کیوں آفتاب۔"

" بالکل نہیں - اور ابا جان - اب ہم کچھ نہیں بولیں گے - صبر کے گھونٹ پینے میں خود کو مشغول رکھیں گے۔"

وہ پھر مسکرا دیے۔

" اس سے پہلے کہ ہم آپس میں فیصلہ کریں - ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ تم لوگ چاہتے کیا ہو۔" انسپکٹر جمشید پھر ان تینوں کی طرف مڑے۔

" یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے - ہم صرف اس جگہ تک پہنچنا چاہتے ہیں، جہاں یہ لوگ چھ ماہ تک رہے ہیں، وہاں پہنچ کر ہم اس کام کا جائزہ لیں گے، جو ان لوگوں نے کیا ہے اور اسے اپنے ملکوں کے خلاف پا کر تباہ و برباد کر دیں گے - یہ مشن لے کر نکلے ہیں اور اسے پورا کر کے رہیں گے۔"

" لیکن تم یہ بات معلوم کس سے کرو گے۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

" انسپکٹر جمشید سے - انہوں نے تھوڑی دیر پہلے دعویٰ کیا تھا کہ اس راز سے اپنے ملک میں صرف اور صرف یہ واقف ہیں۔" سلاٹر نے کہا۔

" نن - نہیں - یہ کس طرح ہو سکتا ہے، کیوں انسپکٹر جمشید - کیا یہ درست ہے؟"

" بالکل نہیں - میں نے یہ جھوٹ پروفیسر صاحبان کو ظلم سے نجات دلانے کے لیے بولا تھا اور سوچا تھا کہ ان کی جگہ میں چرخی میں بندھ جاؤں گا، لیکن - یہ لوگ مجھے چرخیوں تک لے جا ہی نہیں سکے۔"

" تو تم نے جھوٹ بولا تھا۔"

" ہاں - اس قسم کے موقعوں پر جھوٹ بولا جا سکتا ہے۔" انہوں نے کہا۔

" خیر کوئی بات نہیں - تمہیں اس جھوٹ کا مزا چکھنا ہوگا - پہلے ہم تینوں تم لوگوں کا بندوبست کریں گے اور پھر ان پروفیسروں سے نبٹ لیں گے - ان میں سے کوئی تو ضرور جانتا ہوگا۔"

" نن - نہیں - نہیں - ہم کچھ نہیں جانتے۔" کسی دوسرے ملک کا ایک سائنس دان کانپ کر بولا۔

" بہتر ہوگا کہ اب ہمارے درمیان فیصلہ ہو ہی جائے۔"

ان الفاظ کے ساتھ ہی وہ تینوں ان کی طرف بڑھے۔

" ایک منٹ جناب - ایک منٹ -" فاروق بوکھلا کر بولا۔

" بس ڈر گئے۔" رے راٹا ہنسا۔

" نہیں - ابھی نہیں ڈرے -" فاروق بولا۔

" کیا مطلب - ابھی نہیں - تو کیا تھوڑی دیر بعد ڈرنے کا پروگرام ہے۔" اناتینو نے حیران ہو کر کہا۔

" ہم لوگوں کو تین پارٹیوں میں تقسیم ہو لینے دیں - اور مرنے سے پہلے یہ بھی بتا دیں کہ وہ بوتل کیا بلا ہے؟"

" کون سی بوتل؟"

" ننھی سی بوتل - جو مسٹر اناتینو کے آدمی برمن کے پاس سے برآمد ہوئی تھی - اس کے بعد بھی ہمیں ایک ویسی ہی بوتل ملی تھی۔"

" اچھا اچھا - تم اس کی بات کر رہے ہو - وہ ہمارے لیے آپس میں پہچان کا ایک ذریعہ بھی ہے - اور مدد حاصل کرنے کا ایک آلہ بھی۔" اناتینو نے بتایا۔

" کیا کہا - مدد حاصل کرنے کا آلہ؟" محمود نے حیران ہو کر پوچھا۔

" ہاں! جب ہم میں سے کوئی کہیں گھر جائے تو اس بوتل کو ہاتھ میں لے کر دبانا شروع کر دیتا ہے - آس پاس اگر کوئی بوتل والا موجود ہو تو اس کی جیب میں پڑی بوتل گرم ہونے لگتی ہے - اور اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ آس پاس کسی کو مدد کی ضرورت ہے، لیکن اگر آس پاس کوئی موجود نہ ہو اور آخر وقت تک مدد کے لیے کوئی نہ آ سکے تو پھر بوتل والا خودکشی کر لیتا ہے - لیکن بتاتا کچھ نہیں۔"

" اوہ تو یہ بات ہے۔" فرزانہ کے منہ سے نکلا۔

"ہاں، لیکن ابھی ہم نے ان بوتلوں کو عام نہیں کیا۔ یہ اس مشن کے سلسلے میں صرف چند لوگوں کو تجرباتی طور پر دی گئی تھیں، ایک طرح سے یہ ہمارے سائنس دانوں کی بالکل نئی ایجاد ہے۔ جب ہم پوری دنیا میں چھا جائیں گے تو یہ بوتلیں عام کر دی جائیں گی، ان کی مدد سے ہم بہت کام کر سکیں گے۔"

"تو تم لوگ ابھی تک پوری دنیا پر چھا جانے کے خواب دیکھ رہے ہو؟" آصف کے لہجے میں گہرا طنز تھا۔

"اور تم لوگ ہمارے اس خواب سے بچنے کے خواب دیکھ رہے ہو۔" سلاٹر نے بھی طنزیہ لہجے میں کہا۔

"ہاں بالکل۔ سائنس دانوں کو چھ ماہ تک غائب رکھا گیا۔ کیا یہ صرف اس لیے نہیں کہ ہمارے خطرے کا کوئی توڑ کر لیا جائے اور ہم اس توڑ کو توڑنے نکلے ہیں۔" رے راٹا بولا۔

"توڑ پھوڑ کے تو تم لوگ پرانے عادی ہو۔ کوئی نئی بات تو نہیں۔" فرحت نے بھنا کر کہا۔

"لیکن میں کہے دیتا ہوں۔ پوری دنیا پر غالب آ جانے کا تمہارا خواب کبھی پورا نہیں ہوگا۔" خان رحمان نے بلند آواز میں کہا۔

"تم لوگ خوش فہمی میں مبتلا ہو اور ہم چاہتے بھی یہی ہیں کہ تمام اسلامی ملک خوش فہمی کی گود میں اونگھتے، بلکہ سوتے رہیں اور ہم خاموشی سے اپنا کام کرتے رہیں۔" التانیو نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"لیکن جب تک ہم زندہ ہیں۔ تم لوگ اپنا کام نہیں نکال سکو گے۔" آفتاب نبرایک بولا۔

"میرا خیال ہے۔ ہم بے کار کی باتوں میں اُلجھ گئے ہیں۔ یہ تو کام کا وقت ہے۔ آؤ لڑلیں۔" فاروق جلدی سے بولا۔

"مشورہ ٹھیک ہے۔" سلاٹر مسکرایا۔ اس وقت وہ چونک اٹھا:

"کیا تم لوگوں میں سے کوئی ساتھی پیچھے بھی رہ گیا ہے۔"

"نہیں تو۔ ارے ہاں۔ شوکی شاید ہمارے درمیان نہیں ہے۔" انسپکٹر جمشید چونک کر بولے۔

"ہاں، وہ پیچھے رہ گیا تھا۔"

"لیکن تمہیں یہ خیال کیسے آیا؟" انسپکٹر کامران مرزا نے اسے گھورا۔

"تم لوگوں کو گن کر۔ اور پھر میں نے اس جگہ ایک سر کی جھلک دیکھی ہے۔ جہاں تھوڑی دیر پہلے ہم نے مورچہ بنا رکھا تھا۔" اس نے مسکرا کر کہا۔

"تب وہ شوکی ہی ہوگا۔ شوکی۔ آ جاؤ۔" انہوں نے چیخ کر کہا۔

جلد ہی انہیں شوکی آگے بڑھتا نظر آیا۔ نزدیک آنے پر انہوں نے دیکھا، اس کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار تھے۔

"خیر تو ہے شوکی۔ بہت پریشان ہو۔"

"پریشان یہ اس لیے ہے کہ کوئی کارنامہ نہیں دکھا سکا۔ ہم سے الگ اسی شوق میں ہوا تھا نا۔" محمود نے بُرا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔

"یہ بات نہیں۔ بلکہ۔ بلکہ۔" شوکی ہکلا کر رہ گیا۔

"بس اب بلکہ بلکہ کیے جاؤ۔ یار تم کوئی ریکارڈ نہیں ہو جس پر سوئی اٹک جاتی ہے۔ تم تو انسان ہو۔" فاروق نے گویا اسے یاد دلایا۔

"یہ بات مجھے ہر وقت یاد رہتی ہے کہ میں انسان ہوں۔ اور مجھے انسان ہی رہنا چاہیے۔" شوکی بولا۔

"تو پھر بتاؤ نا۔ تم کیوں پریشان ہو۔" آصف جھنجلا اٹھا۔

"شوکی میری طرف دیکھو۔" اچانک سلاٹر نے کہا۔ شوکی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ دونوں کی آنکھیں ٹکرائیں۔ اس سے پہلے کہ وہ شوکی کو خبردار کرتے۔ وہ زور سے اچھلا۔ اسے شدید جھٹکا لگا تھا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے بجلی کا جھٹکا لگا ہو۔ ساتھ ہی اس نے اپنے جسم سے جان نکلتے محسوس کی۔

انسپکٹر جمشید اور انسپکٹر کامران مرزا وغیرہ سلاٹر کی اس صلاحیت سے بخوبی واقف تھے، لہٰذا خود کو اس کی آنکھوں سے بچائے رکھتے تھے۔ شوکی انجانے پن میں مار کھا گیا۔ اور پھر نیچے گرتا چلا گیا:

"کیا ہوا بھائی جان۔" اشفاق، اخلاق اور آفتاب اس کی طرف جھپٹے۔

"اسے بجلی کا جھٹکا لگا ہے۔ گھبرانے والی کوئی بات نہیں۔ ابھی ٹھیک ہو جائے گا۔" محمود نے کہا۔

"بجلی کا جھٹکا۔ بجلی کا جھٹکا یہاں کہاں سے آ گیا۔" اشفاق حیران ہو کر بولا۔

"یہ جو مسٹر سلاٹر ہیں نا۔ آنکھوں کے ذریعے بجلی کے جھٹکے مارنے میں بہت ماہر ہیں۔"

"معلوم ہوتا ہے، ان لوگوں کو جھٹکے مارنے کے سوا کچھ نہیں آتا۔ مسٹر التانیو نے بھی ہمیں بازوؤں سے پکڑ پکڑ کر جھٹکے دیے تھے۔" آفتاب نے جل کر کہا۔

"ہاں تو مسٹر شوکی۔ کیا تم نے کوئی خاص چیز دیکھی ہے۔"

شوکی کے جسم میں حرکت بھی نہ ہوئی۔

"شاید اس نے جھٹکے کا اثر زیادہ ہی قبول کر لیا ہے۔" انسپکٹر جمشید فکرمندانہ لہجے میں بولے۔ پھر اس کی طرف چند قدم اٹھائے:

"میں دیکھتا ہوں۔"

وہ اس پر جھک گئے۔ پہلے تو اسے جھنجوڑا، پھر بولے:

"شوکی۔ ہوش میں آؤ۔ یہ کوئی سچ مچ کا بجلی کا جھٹکا نہیں تھا۔ انسانی آنکھوں سے نکلی ہوئی لہروں کا جھٹکا تھا۔" یہ کہہ کر انہوں نے اپنی آنکھیں اس کی آنکھوں میں ڈال دیں۔ ایسا کرتے وقت انہوں نے اپنی کمر سلاٹر وغیرہ کی طرف کر لی تھی۔ انہوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کہا:

"خبردار شوکی۔ اگر تم نے کوئی بات معلوم کر لی ہے تو بتانا ہرگز نہیں۔"

اشارا کرنے کے ساتھ ہی وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور بولے:

"یہ۔ ہوش میں آ رہا ہے۔"

اب سلاٹر شوکی کی طرف بڑھا۔

"تم نے کیا دیکھا ہے شوکی۔"

"مم۔ میں۔ میں نے۔" شوکی بُری طرح ہکلایا، رنگ زرد پڑ گیا۔

"ہاں تم نے۔ اور انسپکٹر جمشید مجھے دھوکا نہیں دے سکتے۔ انسپکٹر جمشید تم سے کہہ گئے ہیں کہ کچھ نہ بتانا، لیکن مجھے اگلوانے کا طریقہ آتا ہے۔ ابھی جب میں تمہیں ایک چرخی پر باندھوں گا اور نیچے دہکتے انگارے رکھوں گا تو تمہارے فرشتے بھی فرفر بولنے لگیں گے۔"

"ارے۔ بب۔ باپ رے۔" شوکی بوکھلا اٹھا۔

"جب تک ہم زندہ ہیں شوکی۔ یہ تمہیں چرخی سے نہیں باندھ سکیں گے۔ ہمت جواں رکھو۔"

"لل۔ لیکن۔ لیکن میں نے۔ میں۔" شوکی گڑبڑا کر رہ گیا۔ شاید اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ سلاٹر کے آگے اس کی ہمت بالکل جواب دے رہی تھی۔ شاید یہ بات انسپکٹر جمشید نے بھی بھانپ لی۔ وہ فوراً آگے بڑھے اور سلاٹر کے سینے پر ہاتھ رکھ دیا:

"بس مسٹر سلاٹر۔ یہ ہمارا ساتھی ہے۔ اور ہم تمہارے قیدی نہیں کہ اس پر دباؤ ڈال سکو گے۔ دباؤ ڈالنے سے پہلے تمہیں ہم سے دوٹوک فیصلہ کرنا ہوگا۔"

ان الفاظ کے ساتھ ہی انہوں نے سلاٹر کو ایک زوردار دھکا دیا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا دُور چلا گیا۔

"گھبراؤ نہیں شوکی۔" یہ کہہ کر وہ پھر سلاٹر کی طرف مڑے۔ لیکن اس وقت تک سلاٹر پھر اپنی جگہ آ چکا تھا، لہٰذا اس کا فولادی مُکّا ان کی ٹھوڑی پر لگا۔ وہ دوسری طرف اُلٹ گئے۔ یہ دیکھ کر محمود، فاروق اور فرزانہ آگے بڑھے۔ سلاٹر، انسپکٹر جمشید کی طرف قدم اٹھا چکا تھا کہ وہ تینوں اس کے راستے میں آ گئے۔

"آؤ بھئی۔ تم بھی آؤ۔" وہ ہنسا اور دونوں ہاتھوں کے مکّے ان کی طرف اُچھال دیے۔ وہ تیزی سے جھکے، دوسرے ہی لمحے خان رحمان کا مکّا سلاٹر کی داہنی کن پٹی پر لگا۔ اس نے جھلّا کر اپنی کہنی ان کی پسلیوں میں دے ماری۔ وہ بلبلا اٹھے۔ اتنی دیر میں انسپکٹر جمشید اٹھ کر سلاٹر کی طرف چھلانگ لگا چکے تھے۔ اب وہ سلاٹر اور ان کے درمیان میں آ گئے۔

"یہ کیا انسپکٹر جمشید۔ اپنی پوری فوج لے آئے مجھ اکیلے کے مقابلے میں۔" اس کے لہجے میں گہرا طنز تھا۔

"بھئی تم لوگ بیٹھ جاؤ۔ میں اس سے اکیلا ہی نبٹ لوں گا۔" وہ مُسکرائے۔

ادھر انسپکٹر کامران مرزا رے راٹا کے سامنے کھڑے ہو چکے تھے۔ آفتاب، آصف ان کے دائیں بائیں کھڑے تھے۔ فرحت پیچھے تھی۔ گویا حملے کے لیے پوری طرح تیار تھے۔ رے راٹا انہیں ننھے بچوں کی طرح دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔ اچانک اس نے چھلانگ لگائی اور ان کے سروں پر سے گزر کر دوسری طرف پہنچ گیا، فوراً ہی فرحت کی کمر پر اس کی لات لگی۔ وہ اونچا اچھلی اور انسپکٹر کامران مرزا سے پوری قوت سے ٹکرائی۔ دونوں دھڑام سے گرے، رے راٹا نے دائیں بائیں دو مکّے بجلی کی سی تیزی سے اچھال دیے۔ دونوں مکّے آفتاب اور آصف کے لگے۔ انہیں اپنے سر چکراتے محسوس ہوئے۔

اتنی دیر میں التانیو شوکی برادرز کا رُخ کر چکا تھا:

"تم لوگ مجھے جانتے ہی ہو۔" وہ مسکرایا۔

"جج۔ جی۔ جی۔ بب۔ بالکل۔" شوکی ہکلایا۔

"میں تمہاری ٹھکائی نہیں کرنا چاہتا۔ بس تم یہ بتا دو کہ کیا دیکھا۔ کیا بات معلوم کی ہے۔"

"بھائی جان۔ ہرگز نہ بتائیں۔ ہمیں ٹھکائی منظور ہے۔" آفتاب نے چلّا کر کہا۔

"ٹھٹھ۔ ٹھکائی منظور ہے۔ کیا کہہ رہے ہو۔ کیا مسٹر التانیو کے جھٹکوں کو بھول گئے۔" شوکی نے کانپ کر کہا۔

"نہیں۔ لیکن یہ معاملہ صرف ہمارے ملک کا ہی نہیں۔ تمام اسلامی ممالک کا ہے۔"

"اوہو۔ اچھا۔ تب تو میں ہرگز نہیں بتاؤں گا۔ ہاں۔" اس نے منہ بنایا۔

"تمہارے تو فرشتے بھی بتائیں گے۔" یہ کہتے ہی اس نے شوکی کو بازو سے پکڑ لیا اور وہ بید کی چھڑی کی طرح کانپنے لگا۔

"ہاں، تو بتاتے ہو یا دوں جھٹکا۔"

"دو۔ دے دیجیے۔ جھٹکا ہی دے دیجیے۔" اس نے مسمسی صورت بنائی۔

"اچھا تو یہ لو۔" اس نے کہا اور شوکی دُور تک لڑھکنیاں کھاتا چلا گیا۔ اور آفتاب نمبر ایک سے ٹکرا گیا جو رے راٹا کا مکّا کھا کر گرا تھا:

"السلام علیکم۔" آفتاب نے جلدی سے کہا۔

"و۔ وع۔ وعلیکم السلام۔" اس نے کہا اور پھر آفتاب سے ہاتھ ملا ڈالا۔

"کتنی فرحت ہے تم لوگوں کو۔ چلو اٹھو۔" التانیو کی غرّاتی ہوئی آواز سنائی دی۔ آفتاب نے تلملا کر اس کی طرف لات چلائی۔ وہ بجلی کی سی تیزی سے ایک طرف ہو گیا۔ اور آفتاب اپنے ہی زور میں گرا۔ ساتھ ہی التانیو نے شوکی کو گردن سے پکڑ کر اپنے ہاتھ میں اس طرح لٹکا لیا جیسے کوئی شکاری شکار کی ہوئی مچھلی کو لٹکا لیتا ہے۔

"بتاؤ۔ تم نے کیا دیکھا تھا۔" وہ غرّایا۔ اشفاق، اخلاق اور آفتاب دور کھڑے تھر تھر کانپ رہے تھے:

"مجھے۔ مجھے افسوس ہے۔" شوکی نے جملہ اُدھورا چھوڑ دیا۔

"کس بات پر افسوس ہے۔"

"اس بات پر کہ میں تمہیں کچھ نہیں بتا سکتا۔ اور بتاؤں بھی کیا، جب کہ۔" شوکی کی آواز حلق میں پھنس کر رہ گئی۔ التانیو نے دباؤ بڑھا دیا تھا۔ اس کا سانس رُکنے لگا۔ آنکھیں باہر کو اُبل آئیں۔ عین اُسی وقت التانیو کے سر پر ایک زبردست ہاتھ لگا اور وہ دھپ سے گرا۔ شوکی کی گردن پر سے اس کا ہاتھ ہٹ گیا۔ گرتے ہی وہ پلٹا اور اس کی نظر خان رحمان پر پڑی۔ دوسرے ہی لمحے اس کی آنکھیں سُرخ ہو گئیں۔ اس نے یک دم چھلانگ لگائی اور خان رحمان پر جا پڑا۔ اب خان رحمان اس کے نیچے دبے ہوئے تھے اور ایسا محسوس کر رہے تھے جیسے کسی ہزار پا نے دبوچ لیا ہو۔

اس دوران اشفاق، اخلاق اور آفتاب شوکی کی خبر لینے اس پر جھک چکے تھے اور اشفاق اس کی گردن کی مالش کر رہا تھا۔ ایسے میں آفتاب نے سرگوشی کی:

"آ۔ آپ نے کیا دیکھا ہے بھائی جان۔"

"کک۔ کچھ نہیں۔" شوکی نے ہکلا کر کہا۔

عین اسی وقت انہوں نے ایک سرسراتی آواز سُنی۔ ان سب نے ایک ساتھ اوپر دیکھا۔ اور پھر چونک اٹھے ہیلی کاپٹر کی قسم کا ایک جہاز ان کے سروں پر پہنچ چکا تھا۔ انہوں نے فوراً ہی سلاٹر کی آواز سُنی:

"بہت خوب۔ بہت اچھے موقعے پر آئے۔"

"اور ہم جو چیز ساتھ لائے ہیں۔ اسے دیکھ کر تو آپ کھل ہی اٹھیں گے" ہیلی کاپٹر سے آواز آئی۔

"اوہو اچھا۔" سلاٹر چہکا۔

"ہم اسے نیچے بھیج رہے ہیں۔"

ان الفاظ کے ساتھ ہی سیڑھی لٹکا دی گئی۔ اب سب لڑائی کو بھول کر اس چیز کو دیکھنے کے لیے بے چین ہو گئے۔ جو نیچے بھیجی جانے والی تھی۔ جلد ہی انہیں رسی کی سیڑھی پر ایک آدمی اُترتا نظر آیا۔ ابھی وہ اس کا چہرہ بغور نہیں دیکھ پائے تھے۔ سب کی نظریں اس پر جم کر رہ گئیں۔ وہ ڈرے ڈرے انداز میں اتر رہا تھا۔ پھر اس کا چہرہ انہیں صاف نظر آنے لگا۔ ان میں سے سب سے پہلے انسپکٹر کامران مرزا چونکے۔ پھر کچھ اور لوگوں کے چہروں پر بھی حیرت نظر آنے لگی۔ انسپکٹر کامران مرزا بڑبڑائے:

"اف خدا۔ یہ۔ یہ تو مسٹر عین بھنڈارا ہیں۔"

☆ ☆ ☆

میدان پر موت کا سناٹا طاری ہو گیا، بس ہیلی کاپٹر کے پروں کی سائیں سائیں سنائی دے رہی تھی۔ آخر سلاٹر کی آواز گونجی:

"ہاں، انسپکٹر کامران مرزا۔ یہ مسٹر عین بھنڈارا ہی ہیں، اگر پہلے ہی یہ ہمارے ہاتھ لگ جاتے تو اتنا جھنجھٹ کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ نہ ہم ان پروفیسر صاحبان کو اغوا کرتے اور نہ تم لوگوں سے جھگڑا مول لیتے۔ بس سیدھے اس جگہ تک پہنچ جاتے اور تباہ و برباد کر کے اپنے اپنے ملک کی راہ لیتے۔ خیر۔ چلو۔ یہ ہاتھ لگ گئے ہیں، اب اور آسانی ہو جائے گی۔"

"لیکن مسٹر سلاٹر۔ آپ ان سے کس طرح اگلوا لیں گے۔" محمود نے اعتراض کیا۔

"اب تک ہمیں ایک بات پر یقین نہیں تھا۔ یہ کہ ان کے سوا اور کس شخص کو اس جگہ کے بارے میں معلوم ہے۔ اب ہمیں یہ یقین ہے کہ جو شخص ہمارے قبضے میں ہے، اسے سب کچھ معلوم ہے، لہٰذا ہم ان سے معلوم کر ہی لیں گے۔"

اس وقت تک عین بھنڈارا نیچے اُتر چکے تھے۔ وہ بُری طرح کانپ رہے تھے۔ رنگ بالکل سفید پڑ گیا تھا:

"خوش آمدید مسٹر عین بھنڈارا۔" رے راٹما نے ہنس کر کہا۔

"تت۔ تم۔ تم لوگ کون ہو؟" انہوں نے کانپ کر کہا۔

"ارے۔ ہمیں نہیں پہچانتے۔ میں سلاٹر ہوں۔ یہ مسٹر رے راٹما۔ اور یہ مسٹر التانیو ہیں۔ تم نے ہمارے نام تو سن ہی رکھے ہوں گے۔"

"اوہ!" وہ سکتے میں آ گئے۔

"مسٹر پائنٹ، ابھی تم واپس نہیں جاؤ گے۔ ہمیں تم سے کچھ کام لینا ہے۔" سلاٹر منہ اوپر کر کے بولا۔

"او کے سر!" اس نے کہا۔

"یہاں ہم تینوں کے علاوہ اب ہمارا کوئی ساتھی نہیں ہے۔ گویا ہمارے علاوہ جو لوگ بھی نظر آ رہے ہیں۔ وہ دشمن ہیں تمہارا کام صرف یہ ہے کہ ان لوگوں کو ہیلی کاپٹر کے ذریعے موت کے گھاٹ اتار دو۔ خیال رہے۔ یہ حکم مسٹر عین بھنڈارا کے لیے نہیں ہے۔ انہیں ہم ان چرخیوں کی طرف لے جا رہے ہیں۔ تم دیکھ رہے ہو چرخیوں کو۔" سلاٹر نے کہا۔

"ہاں۔ بالکل صاف نظر آ رہی ہیں۔"

"یہ زبان کھلوانے کے آلے ہیں۔ ان پر چڑھتے ہی مسٹر عین بھنڈارا کی چربی پگھلنے لگے گی۔ اور یہ فرفر بولنے لگیں گے۔ بس تمہارا کام صرف یہ ہو گا کہ یہ لوگ ہماری پریشانی کا باعث نہ بنیں۔"

"او کے سر۔ آپ فکر نہ کریں، ایسا ہی ہو گا۔" پائنٹ نے کہا۔

ان الفاظ کے ساتھ ہی ہیلی کاپٹر اور نیچے ہونے لگا۔ اور کچھ اس تیزی سے نیچے آیا کہ وہ بوکھلا کر اِدھر اُدھر ہو گئے۔ سلاٹر پہلے ہی عین بھنڈارا کا ہاتھ پکڑ کر دُور ہٹ چکا تھا اور اس کے ساتھ رے راٹما اور التانیو بھی تھے۔ پائنٹ نے پہلی کوشش یہی کی کہ ان کے درمیان آ جائے۔ تاکہ یہ لوگ سلاٹر وغیرہ کی طرف نہ جا سکیں۔ ادھر یہ لوگ عین بھنڈارا کے آ جانے کی وجہ سے پریشان ہو کر رہ گئے تھے اور پریشانی کے عالم میں اپنے بچاؤ کی تدبیر نہ کر سکے، لہٰذا

ادھر ادھر منتشر ہونا پڑا۔ پائلٹ نے پہلا کام یہ کیا کہ ان کے اور اپنے ساتھیوں کے درمیان آگیا اور پھر ان کی طرف کا رخ کیا۔ لہٰذا انہیں مخالف سمت میں بھاگنا پڑا۔ یہاں تک کہ زمین پر گر کر قلابازیاں کھانا پڑیں۔ زمین سے چند فٹ اوپر ہیلی کاپٹر ان کے سروں پر سے گزر گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کر سکتے۔ وہ پھر ان کی طرف آتا دکھائی دیا۔

" انسپکٹر جمشید۔ ہم اس سے اس طرح نہیں بچ سکیں گے۔" انسپکٹر کامران مرزا پریشان ہو کر بولے۔

" تب پھر کس طرح بچ سکتے ہیں۔"

" ہمیں چاہیے۔ اسے مار گرائیں۔" وہ بولے۔

" لیکن انکل۔ ہم اسے ہاتھوں اور پیروں کی مدد سے تو گرا نہیں سکتے۔" فرزانہ نے حیران ہو کر کہا۔

" کاش خان رحمان نے رائفل میں ایک گولی بچا لی ہوتی۔ اس وقت وہ گولی بہت کام آتی۔" انسپکٹر کامران مرزا نے سرد آہ بھری۔

" اس وقت کسے معلوم تھا۔ اور پھر اس وقت تو سو دشمنوں کو ٹھکانے لگانے کا مسئلہ تھا۔" خان رحمان بولے۔

" ہوں۔ خیر۔ اس وقت تو سو دشمنوں کو ٹھکانے لگانے کا مسئلہ تھا، اب مسئلہ ہے اس ہیلی کاپٹر کو ٹھکانے لگانے کا۔"

" اور ہم اسے پتھروں کے ذریعے بھی ٹھکانے لگا سکتے ہیں۔ بس چند پتھروں کا بندوبست کرنا ہوگا۔" فرزانہ بول اٹھی۔

انہوں نے پتھروں کی تلاش میں نظریں ادھر اُدھر دوڑائیں۔ اچانک فرحت چونکی:

" لیکن اس جگہ ہم پتھروں سے بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔"

" کک۔ کیا مطلب؟" آصف نے حیران ہو کر کہا۔

" مطلب یہ کہ یہاں لہروں کا جال موجود ہے۔ پتھر اٹھائیں گا تو گر کر گمیں گے۔"

" اوہ۔ واقعی۔ یہ بات بھی ہے۔ پھر ہم کیا کریں؟"

" اس کے سوا ہم کیا کر سکتے ہیں کہ بچتے بچاتے لہروں کے جال سے نکل جائیں اور اس دوران جو بھی پتھر نظر آئے، اسے اٹھا لیں۔ لہروں سے نکلتے ہی اس پر پتھروں سے حملہ کر دیں۔"

" ٹھیک ہے۔ آؤ اس سمت میں دوڑ چلیں جس طرف ان کے ساتھیوں کی لاشیں بکھری ہیں۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

اور انہوں نے اس طرف دوڑ لگا دی۔ اپنے پیچھے انہوں نے سلاٹر، اناتیو اور رے ماٹا کے قہقہے سنے۔ مسٹر بین ہڈرلا کا نہ جانے کیا حال تھا۔ ہیلی کاپٹر کے پائلٹ نے ان کا رُخ تبدیل ہوتے دیکھا تو خود بھی رُخ بدل لیا اور ہیلی کاپٹر کو ان کے تعاقب میں ڈال دیا۔ اب وہ آگے آگے دوڑ رہے تھے اور ہیلی کاپٹر ان کے پیچھے پیچھے۔ ایک بار تو وہ اس قدر نیچے آگیا کہ ان میں سے کئی ایک کے سروں کے بالوں کو چھوتا گزر گیا اور وہ دوڑتے دوڑتے گر گئے۔

" بھئی کامران مرزا۔ بہت برے پھنسے۔"

" ہاں، ہے تو یہی بات۔" وہ مسکرائے۔

" پپ۔ پتھر۔ ابا جان پتھر۔" فرزانہ نے پرجوش انداز میں کہا۔

" کیا کہا۔ ابا جان پتھر۔ لیجیے ابا جان۔ آپ کو پتھر بنانے پر تل گئی۔"

" بُری بات ہے فرزانہ۔ ایسا نہیں کہتے۔" پروفیسر داؤد نے بے خیالی کے عالم میں کہا اور وہ مسکرا اٹھے۔ اچانک انہوں نے محسوس کیا۔ اس بار ہیلی کاپٹر کچھ زیادہ ہی نیچے ہو کر آ رہا ہے۔ وہ فوراً لیٹ گئے، بلکہ زمین سے چپک گئے اور وہ ان کے جسموں کے کپڑے پھڑپھڑاتا گزر گیا۔

" کہاں ہے فرزانہ پتھر؟" انسپکٹر جمشید جلدی سے اٹھتے ہوئے بولے۔

" جی وہ۔ وہ پیچھے رہ گیا۔" وہ بولی۔

" اوہ۔ اس کا مطلب ہے۔ مجھے پیچھے جانا ہوگا۔ خیر۔ تم لوگ یہاں کے قریں لیٹے رہو۔ میں ابھی آیا۔" یہ کہا اور پیچھے کی طرف دوڑ پڑے۔

" ایک تو ہمیں بات بے بات ہوں کا قوں دینا پڑتا ہے۔" فاروق جل کر بولا۔

" چلو اچھا ہے۔ اس طرح دو گھڑی آرام تو کر لیتے ہیں۔" فرحت مسکرائی۔

" یہ آرام کرنا بھی عجیب آرام کرنا ہے۔ ہیلی کاپٹر سروں پر دندنا رہا ہے۔ ایسے میں بھلا آرام کا خیال کہاں۔"

" خیال آئے یا نہ آئے۔ لیتے ہیں ہم آرام ہی۔"

اسی وقت انہوں نے ہیلی کاپٹر کو مڑتے دیکھا۔ ابھی انسپکٹر جمشید سے دور تھے کہ ہیلی کاپٹر ان کے نزدیک پہنچ گیا۔ دور سے انہیں یوں لگا جیسے اس کا نچلا حصہ اب ان کے سر سے ٹکرایا اور اب ٹکرایا۔ یہ دیکھ کر فرزانہ چلا اٹھی:

" گر جائیے ابا جان۔ گر جائیے۔"

اور انہوں نے لیٹ لگا دی۔ اس لوٹ کے نتیجے میں پتھر ان کی گرفت میں چھوٹا۔ انہوں نے فوراً اسے اٹھا لیا۔ اور لیٹے لیٹے ہیلی کاپٹر پر پتھر دے مارنے کے لیے تیار ہو گئے۔ ادھر وہ واپس آ رہا تھا۔ اب سب سکتے کے عالم میں تھے۔ اگر انسپکٹر جمشید کے ہاتھ میں رائفل ہوتی تو وہ ایک ہی گولی سے ہیلی کاپٹر کو بے کار کر سکتے تھے۔ لیکن پتھر کی وجہ سے وہ زیادہ پُرامید نہیں تھے، لیکن پتھر کو آزمانے کے سوا چارہ بھی کیا تھا۔

پھر وہ جونہی ان کے سر پر سے گزرا۔ انہوں نے انجن کا نشانہ لے کر پتھر پوری قوت سے کھینچ مارا۔ وہ انجن سے ٹکرایا۔ کچھ چنگاریاں ابھریں، لیکن وار درست نہیں بیٹھا تھا۔ پتھر نیچے آ رہا۔ انہوں نے پھر اسے اٹھا لیا اور ہیلی کاپٹر کی واپسی کا انتظار کرنے لگے۔ ایسے میں انہوں نے انسپکٹر کامران مرزا کی چیخ سنائی دی تھی:

" ایک پتھر مجھے بھی مل گیا ہے۔ اب ہم بیک وقت دو پتھر

چلائیں گے۔"

" تو پھر میرے پاس ریلنگ آئیے۔ میں بھی آپ کی طرف آ رہا ہوں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

" ٹھیک ہے۔"

دونوں ایک دوسرے کی طرف سرکنے لگے۔ اتنے میں ہیلی کاپٹر پھر آ رہا تھا۔ حیرت یہ تھی کہ ابھی تک ہیلی کاپٹر پر سے فائرنگ نہیں کی گئی تھی۔ شاید اس پر انتظام نہیں تھا۔ جونہی وہ ان کے سروں پر سے گزرا، دونوں نے تاک کر پتھر مارے۔ اچانک انجن سے ایک شعلہ اٹھتا نظر آیا۔

" وہ مارا۔" فاروق نے چیخ کر کہا۔

" یا اللہ تیرا شکر ہے۔" اشفاق نے کانپتی آواز میں کہا۔

انجن نے آگ انتہائی تیزی سے پکڑ لی۔ انہوں نے پائلٹ کو چھلانگ لگاتے دیکھا۔ دوسرے ہی لمحے خان رحمان اس کی طرف دوڑ پڑے۔ اور گرتے ہی اسے قابو میں کر لیا۔ ان کے چند گھونسوں نے ہی اسے بے ہوش ہو جانے پر مجبور کر دیا، ہیلی کاپٹر کافی دور تک اڑتا چلا گیا۔ پھر انہوں نے اسے گرتے دیکھا۔ پائلٹ کے ساتھیوں کو شاید چھلانگ لگانا نصیب نہیں ہوا تھا۔

" ہمیں فوراً ان لوگوں تک پہنچنا چاہیے۔ کہیں وہ مسٹرمین جنڈارا سے اگلوا نہ لیں۔" محمود نے خطرے کا احساس دلایا۔

" ہاں۔ چلو۔"

وہ واپس چرخیوں کی طرف دوڑ پڑے۔ انہیں زبردست امید اس بات کی تھی کہ اس وقت تک سلاٹر وغیرہ مسٹرمین جنڈارا کو چرخی کے ساتھ باندھ چکے ہوں گے اور آگ کے انگارے ان کا حال پتلا کر چکے ہوں گے۔ بس وہ راز اگلنے ہی والے ہوں گے۔

انہوں نے آسمان کی طرف دیکھا اور آفتاب نمبر دو نے کہا:

" کاش۔ ہم ان کے زبان کھولنے سے پہلے وہاں پہنچ جائیں۔"

بے تحاشہ دوڑتے ہوئے وہ الاؤ اور چرخیوں تک پہنچ گئے اور پھر ٹھٹک کر رک گئے۔ تینوں بڑے مجرم اور مسٹرمین جنڈارا وہاں آس پاس کہیں بھی نہیں تھے:

" ارے۔ یہ چاروں کہاں چلے گئے۔" آصف چونکا۔

" شاید ادھر ادھر گھومنے نکل گئے۔" فاروق نے کہا۔

" کیا کہہ رہے ہو۔ گھومنے نکل گئے۔" آفتاب نمبر ایک نے چلا کر کہا۔

" تو اس میں حلق پھاڑنے کی کیا بات ہے۔ آہستہ آواز میں بھی تو تم اپنا خیال پیش کر سکتے ہو۔"

" تت۔ تو کیا۔ مسٹرمین جنڈارا نے اتنی جلدی راز اگل دیا۔" شوکی ہکلایا۔

" امید تو نہیں، لیکن شاید وہ ان سے بہت زیادہ ڈرے ہوئے ہوں۔ میرا خیال ہے۔ ہمیں چاروں اطراف میں دوڑ کر انہیں تلاش کرنا چاہیے۔" فرحت نے تجویز پیش کی۔

" چاروں سمتوں میں دوڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ ہم شوکی سے کیوں نہ پوچھیں کہ کس طرف جانا چاہیے۔" فرزانہ نے جلدی سے کہا۔

" اوہ ہاں۔ شوکی۔ تمہیں کیا چیز نظر آئی تھی۔"

اب سب کی نظریں شوکی پر جم گئیں۔

" م۔ میں نے ایک درخت دیکھا تھا۔" شوکی ہکلایا۔

" درخت دیکھا تھا۔ تو پھر۔ بھلا اس میں عجیب بات کیا ہو گئی۔" آفتاب نمبرا نے برا سا منہ بنایا۔

" کیا کہا۔ درخت دیکھا تھا۔" انسپکٹر کامران مرزا چونک اٹھے۔

" ج۔ جی ہاں۔" شوکی سہم گیا۔

" ان خدا۔ شوکی۔ کیا تم سچ کہہ رہے ہو۔" انسپکٹر جمشید بولے۔ ان کے لہجے پر وہ سبھی چونک اٹھے۔

" لیکن ابا جان۔ اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔ ایک درخت کا نظر آنا کون سی عجیب بات ہے۔" فاروق نے تلملا کر کہا۔

" شاید تمہارا دماغ اس وقت حاضر نہیں۔ بھئی۔ جزیروں کے اس سبزہ زار کے بعد ہمیں دور دور تک کہیں درخت نظر نہیں آئے۔ آخر شوکی کو ایک درخت کس طرح نظر آ گیا۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

" اوہ۔" وہ سب دھک سے رہ گئے۔ چند سیکنڈ بعد محمود نے کہا:

" تب شوکی کو نظر کا دھوکا ہوا ہو گا۔ اس نے خیال ہی خیال میں درخت دیکھا ہو گا۔ یا پھر، درخت بھی سراب کی صورت نظر آیا ہو گا۔ جیسے ریگستان میں سورج کی روشنی میں دور بہت دور چمکتی ریت پانی نظر آتی ہے۔ اسی طرح شوکی کو کوئی درخت نظر آ گیا ہو گا۔ ہو سکتا ہے۔ چند روز پہلے یہاں بارش ہوئی ہے اور اس بارش کی وجہ سے زمین کسی جگہ سبزی مائل ہو گئی ہو۔ یعنی اس پر کائی جم گئی ہو۔ اور سبز رنگ کی کائی کو یہ حضرت درخت سمجھ بیٹھے ہوں۔"

" لیکن بھئی۔ کائی اور درخت میں تو بہت فرق ہوتا ہے۔" شوکی بولا۔

" خدا کا شکر ہے۔ زمین آسمان کا فرق نہیں ہوتا۔ بس بہت فرق ہوتا ہے۔" فاروق مسکرایا، لیکن شاید اس وقت کوئی بھی مذاق کے موڈ میں نہیں تھا۔

" تو تمہیں یقین ہے کہ تم نے ایک درخت دیکھا تھا۔"

" ہاں۔ بالکل۔ اور وہ زیادہ بلند اور تناور نہیں تھا۔" اس نے کہا۔

" اور تمہیں سمت بھی معلوم ہے۔ یعنی وہ کس طرف دیکھا تھا۔"

" بالکل۔ جس جگہ تینوں بڑے دشمن مورچے بنائے بیٹھے تھے، اس کی بالکل سیدھ میں میں نے اسے دیکھا تھا۔ یعنی ان چرخیوں

اور مورچے کی سیدھ میں۔"

"اوہ۔ تو آؤ۔ ہم بھی اسے دیکھ لیں، کیونکہ اس سے پہلے ہم نے آس پاس کوئی درخت نہیں دیکھا۔"

"اور میں اس سے بھی عجیب بات بتا سکتا ہوں۔" شوکی نے ڈرے ڈرے لہجے میں کہا۔

"کوئی اور عجیب بات بھی رہ گئی ہے۔ بھئی ایک بار ہی بتا دو نا۔" آصف نے جھلا کر کہا۔

"میں نے اس درخت کو چلتے پھرتے بھی دیکھا تھا۔ اور یہی چیز دیکھ کر میرا رنگ اڑا تھا۔"

"کیا۔ کہا۔ چلتا پھرتا درخت۔" فرحت نے چیخ کر کہا۔ اس کی آنکھوں میں خوف دوڑ گیا۔

"اف خدا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" پروفیسر داؤد کانپ اٹھے۔

"تب وہ۔ ضرور کوئی جادوئی درخت ہو گا۔ پہلے زمانے میں کہانیوں میں جادو کے درخت بھی تو ہوتے تھے۔" فرزانہ نے فوراً کہا۔

"بھئی باتوں میں وقت ضائع کرنے کی بجائے، ہمیں اس سمت میں چل پڑنا چاہیے۔ لیکن سلاٹر اور اس کے ساتھی دور نہ نکل جائیں اور ان تک پہنچنا ہمارے لیے دشوار نہ ہو جائے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

انہوں نے ایک ساتھ دوڑ لگا دی۔ اس دوڑ میں پروفیسر صاحبان بھی ان کا ساتھ دے رہے تھے۔ مورچے کے پاس سے گزرے تو انہیں دوربینیں نظر نہ آئیں۔ صاف ظاہر ہے ــــ سلاٹر اور اس کے ساتھیوں نے اٹھا لی ہوں گی۔ اب وہ مورچے کو پیچھے چھوڑتے ہوئے آگے نکل چکے تھے۔ لیکن دور دور تک کوئی درخت نظر نہیں آ رہا تھا۔ کچھ دور اور دوڑنے کے بعد شوکی رک گیا اور بولا:

"بس۔ رک جائیے۔ میں نے درخت تقریباً اس جگہ دیکھا تھا۔"

"لیکن یہاں تو کوئی درخت نہیں ہے۔" آصف پھاڑ کھانے والے لہجے میں بولا۔

"اب۔ اس میں میں کیا کر سکتا ہوں۔" شوکی نے بے چارگی کے عالم میں کندھے اچکائے۔

"ہاں۔ ٹھیک تو ہے۔ بھلا تم بے چارے کیا کر سکتے ہو۔ کوئی درخت فوری طور پر اگا کر دینے سے تو رہے۔" آفتاب نمبر ایک نے ہنس کر کہا۔

"دھت تیرے کی کسی کل چین نہیں انہیں۔" محمود نے جھلا کر ران پر ہاتھ مارا۔

"شوکی۔ گھبراؤ نہیں۔ پہلے غور کرو اور پھر بتاؤ۔ تم نے کیا دیکھا تھا۔ وہ درخت کس قسم کا تھا۔"

"بہت ہی عجیب قسم کا۔ اس کے کئی پتلے پتلے تنے تھے، جیسے امرود یا انار کے درخت کے ہوتے ہیں۔ نیچے سے اس کا پھیلاؤ بہت زیادہ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے چھوٹے چھوٹے کئی درخت آپس میں مل گئے ہوں۔"

"ہاں خیر۔ یہ تو ناممکن نہیں۔ درخت بھی آپس میں ملتے تو رہتے ہیں۔" فاروق بول پڑا۔

"شوکی۔ کہیں تمہیں وہم تو نہیں ہو گیا تھا۔" خان رحمان پیار بھرے لہجے میں بولے۔

"خدا نہ کرے انکل۔ کہ مجھے وہم ہوا ہو۔"

"اور مجھے حیرت یہ ہے کہ اتنی جلدی وہ چاروں کہاں غائب ہو گئے۔ آخر وہ کتنی رفتار سے گئے ہیں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"میں بھی اس بات پر حیران ہوں۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے ــــ

"اگر یہ اتنا ہی ضروری ہے تو پھر ہم سبھی حیران ہو لیتے ہیں۔ آؤ بھئی۔ حیران ہو جائیں۔" آفتاب نمبر دو بولا اور وہ مسکرائے بغیر رہ نہ سکے۔

"میرا خیال ہے۔ ہمیں اسی سمت میں آگے بڑھنا چاہیے۔" پروفیسر داؤد بولے۔

"پروفیسر صاحبان۔ میں آپ لوگوں سے پوچھتا ہوں۔ کیا آپ کو واقعی اس جگہ کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔" انسپکٹر جمشید ان کی طرف مڑے اور بغور دیکھنے لگے۔

"نہیں۔ اگر کچھ معلوم ہوتا تو ان چرخیوں پر خاموش نہیں رہ سکتے تھے۔"

"تب تو منصوبہ بنانے والے نے بہت ہی عقل مندی سے کام لیا، لیکن افسوس۔ اب وہ خود مجرموں کے ہتھے چڑھ گیا۔" محمود کے لہجے میں حسرت تھی۔

"اب اگر وہ لوگ عین بھنڈارا کی مدد سے ہم سے پہلے اس جگہ تک پہنچ گئے تو جاتے ہی تباہی مچا دیں گے۔ کاش ہم انہیں راستے میں ہی روک لیں۔"

"اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے۔ جب ہم دوڑ لگا دیں، بے تحاشہ دوڑتے چلے جائیں۔ پروفیسر صاحبان اگر رفتار میں ساتھ نہ دے سکیں تو کوئی حرج نہیں۔ بس دوڑتے آئیں۔ ملاقات ہو ہی جائے گی۔"

"ٹھیک ہے۔ آپ لوگ ہماری فکر نہ کریں۔"

وہ سب کے سب دوڑنے لگے۔ انہیں نہیں معلوم تھا کہ یہ دوڑ انہیں کن حالات سے دو چار کرے گی۔ بس ان پر تو صرف یہ بھوت سوار تھا کہ کہیں سلاٹر وغیرہ ان سے پہلے اس مقام تک نہ پہنچ جائیں ــــ

"کمال ہے۔ شوکی نے جس درخت کو دیکھا تھا، اس کا تو دور دور تک نام و نشان نہیں۔" آفتاب نمبر ایک نے بھاگتے بھاگتے کہا۔

"ہو سکتا ہے۔ اس نے درخت کا سایہ دیکھا ہو۔" فاروق بولا۔

"یہ کیا بات ہوئی۔ سایہ اگر دیکھا تھا تو درخت بھی تو موجود ہوگا۔" آفتاب نمبر ایک نے جھلا کر کہا۔

"اس میں بگڑنے کی کیا ضرورت۔۔۔ تم وہ درخت مجھے دکھا دو، میں تسلیم کر لوں گا کہ شوکی نے واقعی درخت دیکھا تھا۔" فاروق مسکرایا۔

"لیکن میں کس طرح دکھا دوں۔"

"شوکی سے پوچھو۔ مجھ سے کیا پوچھ رہے ہو۔" اس نے منہ بنایا۔

"سنو بھئی۔ شوکی نے درخت دیکھا تھا یا نہیں۔ ہمیں تو اب کسی نہ کسی سمت میں آگے بڑھنا ہی ہے۔ لہذا صبر اور شکر سے بڑھتے چلو۔" خان رحمان مسکرائے۔

"جی انکل۔ صبر اور شکر سے۔۔۔ آپ شاید بھول رہے ہیں، ہم نے نہ جانے کب سے کھانا نہیں کھایا۔ کاش ہم ناریل ہی ساتھ لے آتے۔ وہ کھانے اور پینے دونوں کے کام آ سکتے تھے۔"

"مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے ہم اس میدان میں بھوکے پیاسے مر جائیں گے۔ دوڑتے دوڑتے تھک جائیں گے، لیکن اس درخت تک نہیں پہنچ سکیں گے۔" اشفاق نے زبان ہلائی۔

"ہمیں درخت تک نہیں۔۔۔ اس مقام تک پہنچنا ہے۔ جس کی طرف سلاٹر وغیرہ جا چکے ہیں۔ اور کوشش یہ کرنی ہے کہ ان سے پہلے پہنچ جائیں۔" انسپکٹر کامران مرزا نے کہا۔

"لل۔۔۔ لیکن انکل۔ ہم ان سے پہلے کس طرح پہنچ سکیں گے، جب کہ وہ ہم سے کافی پہلے جا چکے ہیں۔"

"اللہ مالک ہے۔ پہنچنے کی کوشش تو کر ہی سکتے ہیں۔"

دوڑ جاری رہی۔ یہاں تک کہ وہ تھک کر چور ہو گئے۔۔۔ مزید دوڑنا ان کے لیے ناممکن ہو گیا۔ اور وہ دوڑنا بند کر کے تھکے تھکے قدموں سے آگے بڑھنے لگے۔ اس طرح بھی نہ جانے کتنی دیر تک چلے۔ بھوک، پیاس اور دھوپ نے ان کا حال بہت ردی کر دیا تھا۔ اس حالت میں بھی وہ رکنے پر آمادہ نہیں تھے۔۔۔

"ہم تھک کر گر جائیں گے۔ بے ہوش ہو جائیں گے، لیکن ہوش میں رہتے ہوئے آگے بڑھنا نہیں چھوڑیں گے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"ٹھیک ہے ابا جان۔ آپ فکر نہ کریں۔ ہم آپ کا ساتھ دیں گے۔"

اس وقت تک وہ کئی بار مڑ مڑ کر دیکھ چکے تھے، لیکن پروفیسر صاحبان کا دور دور تک پتا نہیں تھا۔ اور پھر اچانک انہوں نے اپنے سامنے وہ چیز دیکھ ہی لی۔۔۔

☆☆☆

وہ ٹھٹک کر رہ گئے۔ آنکھوں میں حیرت کے چراغ جل اٹھے۔ پھر ان کا رخ شوکی کی طرف ہو گیا:

"شش۔ شوکی۔ تم ٹھیک کہتے ہو۔" آفتاب ہکلایا۔

"غلط کہنے کی مجھے عادت ہی نہیں۔" اس نے مسکرا کر کہا۔

"لل۔ لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" فرزانہ بڑبڑائی۔

"ہاں واقعی۔ یہ بات بہت عجیب سی لگتی ہے۔ اس پورے میدان میں، ہمیں کوئی درخت نظر نہیں آیا۔ شاید یہ بالکل بنجر زمین ہے۔ لیکن کچھ دیر پہلے شوکی کو ایک درخت دکھائی دیا۔۔۔ ہم نے اس پہ اعتبار نہ کیا، لیکن اب ہم سب کے سامنے ایک عدد درخت صاحب موجود ہیں۔" فاروق نے بوکھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔۔۔

اور واقعی ان کے سامنے ایک درخت موجود تھا۔ لیکن اس درخت کا پھیلاؤ بہت زیادہ تھا، جب کہ تنا اور شاخیں حد درجے پتلی تھیں اور پتے چھوٹے چھوٹے تھے۔۔۔

"تب یہ ضرور جادو کا ہی درخت ہے، پہلے صرف شوکی بھائی کو نظر آیا، اب ہم سب اسے دیکھ رہے ہیں۔" آصف نے کانپتی آواز میں کہا۔۔۔

"اور چلتا پھرتا بھی ہے۔" فرحت بڑبڑائی۔

"اور میں نے اپنی زندگی میں اس قسم کا درخت پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ جس کا نیچے سے پھیلاؤ تو اس قدر ہو اور شاخیں وغیرہ اس قدر پتلی دبلی ہوں۔" انسپکٹر جمشید نے بغور درخت کی طرف دیکھا۔

"میں نے بھی ایسا درخت کبھی نہیں دیکھا۔" انسپکٹر کامران مرزا بڑبڑائے۔

"تو ہم نزدیک جا کر کیوں نہ دیکھ لیں۔ یہاں کھڑے اس کے بارے میں باتیں کیوں کر رہے ہیں۔" خان رحمان نے جھنجلائی ہوئی آواز میں کہا۔۔۔

"شش۔ شاید۔ ہم اس درخت سے ڈر رہے ہیں۔" آفتاب نمبر دو نے کہا۔

"لیجیے۔ اب ہم لوگ درختوں سے ڈریں گے۔ سلاٹر، رے ماٹا اور اتانیو جیسے مجرموں سے تو ڈرے نہیں۔" فاروق نے جھلا کر کہا۔

"ہم۔ میں۔ آپ کی نہیں۔ صرف اپنی بات کر رہا ہوں۔۔۔ یعنی ہم چاروں۔" آفتاب نمبر دو نے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"اچھا تو بڑی خوشی سے ڈرتے رہو۔ میں تو چلا۔ درخت کی طرف۔" یہ کہہ کر وہ درخت کی طرف چند قدم چلا، ساتھ ہی بولا:

"سن رے پیارے جادو کے درخت۔ میں تیری اینٹ سے اینٹ بجانے آ رہا ہوں۔ ارے۔۔۔ نہیں۔ درخت میں بھلا اینٹیں کہاں ہوتی ہیں۔ ہاں تو میں تیری شاخ سے شاخ اور پتے سے پتا بجا دینے کے لیے آ رہا ہوں۔ اپنا بچاؤ کر سکتا ہے تو کر لے، تیرا سارا جادو دھرا کا دھرا نہ رہ گیا، بلکہ ہوا نہ ہو گیا تو۔ تو۔۔۔" فاروق اٹک گیا، پھر جلدی سے محمود کی طرف مڑا:

"محمود۔۔۔ مجھے تو سے آگے کیا کہنا چاہیے۔"

"تو سے آگے۔" محمود نے بوکھلا کر کہا: "مجھے کیا معلوم۔ تم کیا کہنا

چاہتے ہو، لیکن نظر یہی آتا ہے کہ اِدھر اُدھر کی ہانکے جا رہے ہو، جب کہ یہ وقت کام کی باتوں کا ہے۔"

"میں بھی یہی کہنے والا تھا۔ یہ حضرت وقت ضائع کرنے کا منصوبہ سوچے ہوئے ہیں، لیکن ہم اس کے منصوبے کو خاک میں ملا دیں گے۔" آصف نے تلملا کر کہا اور فاروق کی طرف جھپٹا۔

"لیکن اس سے پہلے میں درخت تک پہنچ چکا ہوں گا۔" فاروق نے بھی درخت کی طرف دوڑ لگا دی۔

جونہی وہ نزدیک پہنچا۔ اور اس کی شاخوں کو ہاتھ لگایا اسے ایک زبردست جھٹکا لگا۔ وہ کئی قدم پیچھے کی طرف الٹ گیا۔

"کیا ہوا فاروق۔" فرزانہ بے چین ہو کر اس کی طرف لپکی۔

"اس بدبخت درخت نے۔ مجھے دھکا دیا ہے۔ اف خدا۔ کتنا خوفناک تھا۔" فاروق کانپ کر بولا۔

"کیا کتنا خوفناک تھا؟" محمود بھی نزدیک آتے ہوئے بولا۔

"دھکا۔" فاروق بولا۔ اور انہوں نے بڑی مشکل سے اپنی ہنسی روکی۔

"تو۔ اب درخت بھی دھکے دینے لگے۔ دماغ تو نہیں چل گیا تمہارا۔" فرحت نے بھنائی ہوئی آواز میں کہا۔

"درخت کو ہاتھ لگا کر دیکھ لو۔ تمہارا دماغ بھی چل جائے گا۔" فاروق نے اسے گھورا۔

"یہ تو خیر ہمیں کرنا ہی ہوگا۔" یہ کہہ کر آصف درخت کی طرف چلا۔

"آصف، کیا کر رہے ہو۔ دیکھ نہیں رہے۔ فاروق چوٹ کھا بیٹھا ہے۔" انسپکٹر کامران مرزا نے اسے ڈانٹا۔

"لیکن انکل۔ آخر ہم اس درخت سے کس طرح نمٹیں گے؟"

"کیا ضرورت ہے۔ آؤ ہم اس کے پاس سے گزر جائیں۔" انسپکٹر جمشید نے عجیب بات کہی۔

"جی۔ کیا فرمایا۔ پاس سے گزر جائیں گے۔ یہ جانے بغیر کہ یہ درخت ہے کیا بلا۔"

"یہ کچھ بھی ہو۔ کیسا بھی ہو، ہمیں کیا۔ ہوگا اپنے گھر کا عجیب۔" آفتاب نمبر ایک بولا۔

"شاید آپ لوگ یہ بھول رہے ہیں کہ میرے بھائی جان اس درخت کو یہاں سے بہت فاصلے پر بھی دیکھ چکے ہیں۔" آفتاب نمبر دو نے بُرا سا منہ بنایا۔

"ضروری نہیں۔ کہ یہ وہی درخت ہو، ہو سکتا ہے، یہ اس سے ملتا جلتا، یا اس کا کوئی بھائی درخت ہو۔" فاروق نے جلدی سے کہا۔

"بھائی درخت۔ بھلا درخت بھی کہیں آپس میں بھائی ہوتے ہیں۔" آفتاب نمبر ایک نے جل بھن کر کہا۔

"پ پ۔ پتا نہیں ہوتے ہیں یا نہیں۔ پوچھ کر بتاؤں گا۔" فاروق نے گھبرا کر کہا۔

"کس سے پوچھ کر بتاؤ گے؟" آفتاب نمبر ایک نے اسے گھورا۔

"در۔ درخت سے۔ اور کس سے؟"

"حد ہو گئی۔ یہ لوگ تو کسی کی سنتے ہی نہیں۔" انسپکٹر کامران مرزا نے بے بسی کے عالم میں پاؤں پٹخے۔

"ایسا تو نہ کہیے انکل۔ سن تو ہم ہر ایک کی رہے ہیں۔" محمود مسکرایا۔

"میری بھی یہی رائے ہے کہ اس درخت سے نہ الجھا جائے، اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ آؤ ہم لوگ چلیں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"اور شاید سلاٹر، رسے راٹا اور اٹانیو بھی اس درخت سے الجھے بغیر آگے نکل گئے۔ اگر ہم یہیں اٹکے رہے تو شاید وہ ہماری پہنچ سے دور نکل جائیں۔" انسپکٹر کامران مرزا نے کہا۔

"اور اس مقام تک پہنچ جائیں۔ جہاں پہنچنے کے لیے وہ اب تک ایڑی چوٹی کا زور لگاتے رہے ہیں۔ اب تو مسٹر مین بھنڈارا بھی ان کے ساتھ ہیں۔ لہٰذا اس مقام تک آسانی سے پہنچ جائیں گے۔" خان رحمان بولے۔

"تو کیا تمہارے خیال میں مسٹر مین بھنڈارا ان لوگوں کو اس مقام کے بارے میں بتا دیں گے؟" پروفیسر داؤد حیران ہو کر بولے۔

"کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ پروفیسر صاحبان کو تو اس مقام کے بارے میں کچھ معلوم ہی نہیں تھا، ان پر اگر ظلم توڑا جاتا، بتاتے کیا۔ لیکن مسٹر مین بھنڈارا صاحب کو سب کچھ معلوم ہے۔ بلکہ یہ معاملہ اس حد تک راز میں رکھا گیا ہے کہ ان کے علاوہ کسی کو بھی کچھ معلوم نہیں۔ لہٰذا اب جڑ کا آدمی ان کے قبضے میں ہے۔ لہٰذا جلدی کرو۔ ہمیں نہ صرف ان تک پہنچنا ہے، بلکہ مسٹر مین بھنڈارا کو ان کے پنجے سے نجات بھی دلانا ہے۔" انسپکٹر جمشید جلدی جلدی بولے۔ اور قدم بڑھا دیے۔ باقی سب لوگوں نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ وہ درخت سے کترا کر گزرتے چلے گئے۔ فاروق نے کئی بار مڑ مڑ کر درخت کو دیکھا تو اشفاق سے رہا نہ گیا:

"آخر آپ مڑ مڑ کر کیا دیکھ رہے ہیں؟"

"مجھے ایسا معلوم ہو رہا ہے۔ جیسے یہ درخت ہمیں گھور گھور کر دیکھ رہا ہو۔" فاروق نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔

"بھئی تمہیں وہم ہو گیا ہے اور کوئی بات نہیں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"اور ابا جان۔ کیا وہ دھکا بھی وہم تھا۔" فاروق نے ان کی طرف دیکھا۔

انسپکٹر جمشید فوری طور پر فاروق کی بات کا جواب نہ دے سکے۔ انہیں خاموش پا کر باقی لوگ بھی ان کی طرف دیکھنے لگے۔

"کیا آپ فاروق کی بات کا جواب نہیں دیں گے؟" محمود سے رہا نہ گیا۔

"سوچ رہا ہوں۔ کیا جواب دوں؟" وہ بولے۔

"جی۔ کیا مطلب؟"

"ان درختوں میں ضرور کوئی نہ کوئی بات ہے، لیکن ہم الجھنا نہیں چاہتے۔ ہمارا آگے بڑھنا بہت ضروری ہے۔ اگر اس درخت کو ضرورت ہوگی تو خود ہی ہمارے راستے میں آجائے گا۔"

"خود ہی ہمارے راستے میں آجائے گا۔" آصف بڑبڑایا۔

"شاید آج ہم سب عجیب و غریب باتیں کرنے پر تل گئے ہیں۔ اللہ اپنا رحم فرمائے۔"

"بے شک وہ اپنا رحم فرمائے گا۔" اشفاق نے فوراً کہا۔

ان کے قدم تیز تیز اٹھنے لگے۔ اچانک کانوں میں عجیب سی آوازیں سنائی دیں:

"یہ۔ یہ آوازیں کیسی ہیں؟" پروفیسر داؤد کانپ اٹھے۔

انہوں نے جلدی سے اپنے سامنے دور تک دیکھا، لیکن آگے میدان بہت اونچا تھا۔ اور آوازیں اس اونچائی کے دوسری طرف سے آ رہی تھیں، لہذا انہیں کچھ بھی نظر نہ آسکا۔ ان کی بے چینی میں اضافہ ہو گیا۔ وہ جلدی جلدی آگے بڑھنے لگے، یہاں تک کہ اونچے کنارے کے نزدیک پہنچ گئے۔

"سب لوگ یہیں ٹھہر جائیں۔ صرف میں اور انسپکٹر جمشید آگے بڑھ کر دیکھیں گے کہ کیا معاملہ ہے۔" انسپکٹر کامران مرزا نے سرگوشی کی۔

ساتھ ہی دونوں زمین پر لیٹ کر رینگنے لگے۔ یہاں تک کہ ان کی آنکھیں ڈھلوان میں دیکھنے کے قابل ہو گئیں۔ چند لمحے تک وہ حیرت زدہ انداز میں اس سمت میں دیکھتے رہے، پھر باقی لوگوں کو بھی رینگ کر آنے کا اشارہ کیا۔ فوراً وہ سب لیٹ گئے اور رینگ کر ان کے دائیں بائیں آگئے۔ اب انہوں نے بھی ڈھلوان میں دیکھا۔ اور ایک عجیب منظر نظر آیا۔

○

سے داما، سلاٹر اور اتانیو زمین پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں تین عجیب وضع کی بندوقیں تھیں۔ ان سے کچھ فاصلے پر مسٹر بین بیٹھے نظر آئے۔ لیکن ان کے ہاتھوں میں کوئی بندوق نہیں تھی۔ البتہ ان کے ہاتھ ضرور بندھے ہوئے تھے۔ ان تینوں سے کچھ فاصلے پر بالکل ویسا ہی درخت موجود تھا۔ وہ تینوں مل کر اس درخت پر اپنی بندوقوں سے فائرنگ کر رہے تھے۔ جو آوازیں انہوں نے سنی تھیں، وہ انہی بندوقوں کی تھیں۔ بندوقوں سے شعلے سے نکلتے محسوس ہو رہے تھے، لیکن ابھی تک انہوں نے درخت کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ گویا بندوقوں کی گولیاں درخت پر کوئی اثر نہیں کر رہی تھیں۔ تینوں بڑے مجرم پریشانی کے عالم میں گولیاں چلا رہے تھے۔ آخر کوئی نتیجہ نہ دیکھ کر انہوں نے بندوقیں درخت پر کھینچ ماریں۔ بندوقیں درخت سے ٹکرائیں، اسی طاقت سے واپس پلٹیں اور ان کے سروں پر سے گزرتی ان کے قریب آگریں۔

"اف خدا۔ یہ کیا ہو رہا ہے۔ یہ لوگ تو اس درخت سے جنگ کر رہے ہیں۔" فرزانہ کانپ کر بولی۔

"ہاں۔ بالکل یہی بات ہے۔ اور۔ یہ بات بھی ہے کہ درخت نے انہیں بے بس کر دیا ہے۔"

اچانک انہوں نے سلاٹر، سے داما اور اتانیو کو پہلو بچا کر درخت کے دائیں طرف سے گزرتے دیکھا، لیکن پھر ان کے اٹھتے قدم رک گئے۔ ادھر ان کی بھی آنکھیں پھیل گئیں۔ ایک درخت دائیں طرف سے بڑھا چلا آ رہا تھا۔ تینوں بوکھلا کر بائیں طرف مڑے، اور اچھل پڑے۔ ایک درخت ادھر سے بھی چلا آ رہا تھا۔ اب تو ان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"یا اللہ۔ یہ ہم کیا دیکھ رہے ہیں۔ اس میدان میں تو درخت حضرات بھی چل پھر رہے ہیں۔ بلکہ جنگ بھی لڑ رہے ہیں۔ اب ہم کیا کریں گے۔" آفتاب نمبر دو نے آسمان کی طرف دیکھا۔

"کرو گے کیا۔ بھاڑ جھونکا۔" فاروق منمنایا۔

"یہ پیشہ آپ کو ہی مبارک۔" اخلاق نے منہ بنایا۔

"بھئی ہماری فکر نہ کریں۔ ہم تو ہمیشہ ہی جھونکا کرتے ہیں۔"

سے داما، سلاٹر اور اتانیو نے گھبرا کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر سے داما تیزی سے جھکا اور مسٹر بین کو اٹھا کر کندھے پر لاد لیا۔ اب تینوں ان کی طرف مڑے۔ یعنی پیچھے کی طرف پلٹے۔ اور اونچائی کی طرف بڑھنے لگے۔ انہوں نے تیزی سے اپنے سر پیچھے ہٹا لیے۔

"لو بھئی۔ ہمارے دشمن ان درختوں کی مہربانی سے ہماری طرف آ رہے ہیں۔" محمود بڑبڑایا۔

"تب تو ان پیارے درختوں کا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔" فاروق نے جلدی سے کہا۔

"شکریہ اے پیارے درختو۔ ہم نے اتنے پیارے درخت پہلے کبھی نہیں دیکھے ہوں گے۔ اور نہ اتنے بہادر درخت دیکھے ہوں گے۔ جنہوں نے اتنے بڑے بڑے اور بین الاقوامی مجرموں کے چھکے چھڑا دیے۔ بلکہ انہیں ناکوں چنے چبوا دیے۔ انہیں دن میں تارے دکھا دیے اور یہ دم دبا کر بھاگنے پر مجبور ہو گئے۔" فاروق جلدی جلدی کہتا چلا گیا۔

"کوئی اور محاورہ تو نہیں رہ گیا۔" آصف نے جل کر کہا۔

"ابھی تو نہ جانے کتنے ہیں۔ اونٹ کی طرح منہ اٹھائے چلے آرہے تھے۔ میں نے اس خیال سے ان کے راستے میں روڑے اٹکا دیے کہ کہیں تم چیں بجبیں نہ ہو جاؤ۔"

"یہ محاورات کا زبردستی استعمال ہے۔ گویا ان سے ناانصافی ہے۔" آفتاب نمبر ایک نے گویا اعلان کیا۔

"تو اس ناانصافی کے خلاف احتجاج کیوں نہیں کرتے۔" دوسرا آفتاب بول پڑا۔

اتنے میں انہوں نے اپنے پیچھے ایک عجیب سی سرسراہٹ سُنی۔ بوکھلا کر مڑے اور پھر ان کی آنکھیں دہشت سے پھیل گئیں، وُہ جس درخت کو پیچھے چھوڑ کر آئے تھے۔ تیزی سے چلا آرہا تھا، اور ان کے بہت نزدیک پہنچ گیا تھا، لیکن اس سے پہلے کہ وہ اس سے اپنا بچاؤ کرنے کی تدبیر کرتے، درخت ان سے کتراتا ہوا گزر گیا اور ڈھلوان کی طرف اس کا رخ ٹھیک اس سمت میں تھا جس سمت میں وہ تینوں آرہے تھے۔ اب وہ بھی پیچھے نہ ہٹ رہ سکے۔ جلدی سے کنارے پر آگئے۔ سلاٹر، رے راٹا اور التانیو چرتے درخت کو اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر رک گئے، پھر تینوں دل کش انداز میں مسکرائے۔

"یوں کام نہیں چلے گا۔" سلاٹر کی آواز سنائی دی۔

"تب پھر۔ کس طرح کام چلے گا۔" التانیو نے کہا۔

"مسٹر مین بھنڈارا کو میرے حوالے کر دیں۔"

"کیوں۔ کیا ارادہ ہے؟" رے راٹا حیران ہو کر بولا۔

"بس دیکھتے جائیں۔" اس نے کہا اور رے راٹا نے مسٹر مین بھنڈارا کو اس کے سامنے کھڑا کر دیا۔ اب سلاٹر آگے بڑھا، اور دونوں ہاتھوں سے ان کی گردن کو دبوچ لیا اور گردن پر دباؤ ڈالتے ہوئے بلند آواز میں بولا:

"میں نے مسٹر مین بھنڈارا کی گردن دبوچ رکھی ہے۔ اگر تم آگے بڑھے تو میں انہیں موت کے گھاٹ اتار دوں گا، لہذا پیچھے ہٹتے چلے جاؤ۔"

"شاید سلاٹر کا دماغ چل گیا ہے۔ وُہ درختوں کو حکم دے رہا ہے۔" اشفاق بڑبڑایا۔

لیکن دوسرا لمحہ حیران کن تھا۔ چاروں درخت پیچھے ہٹنے لگے۔ سلاٹر، رے راٹا اور التانیو کے چہروں پر فاتحانہ مسکراہٹیں کھیلنے لگیں، لیکن پھر یک لخت ان کی مسکراہٹیں بجھ گئیں۔ وہ بھی یہ دیکھ کر چونک اٹھے کہ ایک دائرے کی صورت میں بے شمار درخت ان تینوں کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اس طرح کہ درمیان میں سے نکلنے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔

"ارے باپ رے۔ اب یہ لوگ کیا کریں گے۔" شوکی نے بوکھلا کر کہا۔

"یہ پھر مسٹر مین بھنڈارا کی گردن دبائیں گے۔" انسپکٹر کامران مرزا مسکرائے۔

"تب پھر ان درخت کے بچّوں کو کیا فائدہ ہوگا آنے کا؟" فاروق نے منہ بنایا۔

"بھئی دیکھتے ہیں، اس عجیب وغریب اور دلچسپ ترین جنگ میں کس کی جیت ہوتی ہے۔" خان رحمان پُرجوش لہجے میں بولے۔

"لیکن ہمارے لیے اس وقت یہ کہیں بہتر ہے کہ یہاں سے اس سیدھ میں نکل جائیں جس میں ہم چل رہے ہیں، ان کی لڑائی سے ہمیں آگے بڑھنے کا موقع مل رہا ہے۔" انسپکٹر کامران مرزا نے تجویز پیش کی۔

"میں بھی یہی مناسب خیال کرتا ہوں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"لیکن ابا جان۔ اس قدر دلچسپ جنگ بھلا ہم نے کب دیکھی ہوگی۔ خدا کے لیے اس جنگ کے نظارے سے ہمیں محروم نہ کریں۔" فرزانہ بے چین ہو کر بولی۔

"بالکل انکل۔ یہ لڑائی دیکھے بغیر ہم سے آگے نہیں بڑھا جائے گا۔" فرحت نے رونی آواز میں کہا۔

"بھئی جمشید۔ دل تو میرا بھی آگے بڑھنے کو نہیں چاہتا۔" پروفیسر داؤد بول اٹھے۔

"اچھا۔ جیسے سب لوگوں کی مرضی۔" وہ بولے اور سب مسکرانے لگے۔

رے راٹا، سلاٹر اور التانیو اب پوری طرح گھر چکے تھے۔ اور یہ اس وجہ سے ہوا تھا کہ سلاٹر کی دھمکی پر چاروں درخت پیچھے ہٹتے چلے گئے تھے۔ لہذا وہ ان کی طرف سے بے فکر ہو گئے تھے۔ اب انہیں کیا معلوم تھا۔ درختوں کی پوری فوج ان کے راستے میں آ کھڑی ہوگی۔ آخر سلاٹر نے وہی کیا۔ ایک بار پھر مسٹر مین بھنڈارا کی گردن دبوچ لی۔ اور بلند آواز میں بولا:

"مسٹر مین بھنڈارا کی گردن ایک بار پھر میری گرفت میں ہے، درخت اگر آگے بڑھے تو ان کا کام تمام کر دیا جائے گا۔"

"ضرور۔ ضرور کر دو ان کا کام تمام۔" ایک چہکتی آواز اُبھری، اور وہ حیران رہ گئے۔ آواز دائرے میں کھڑے ایک درخت سے نکلی تھی اور انسانی تھی۔ کسی درخت کی آواز ہرگز نہیں تھی۔

"کیا کہا۔ کر دوں کام تمام ان کا؟"

"ہاں کر دو۔" وہی آواز سنائی دی۔

اچانک انہوں نے سلاٹر کے چہرے پر سراسیمگی کے آثار دیکھے۔ آنکھوں میں خوف تیرنے لگا۔

"کیا ہوا سلاٹر؟"

"ہم۔ ہم مسٹر مین بھنڈارا کو ختم نہیں کر سکتے۔"

"کیا مطلب۔ کیوں نہیں کر سکتے؟" رے راٹا نے حیران ہو کر کہا۔

"اگر ہم نے انہیں ختم کر دیا تو اس مقام تک کس طرح پہنچیں گے۔ یہ ہمارے لیے بہت ضروری ہیں۔ اتنے ضروری جتنے کہ خود ہم"

"اوہ۔ مسٹر سلاٹر۔ تم ٹھیک کہتے ہو، لیکن پھر یہ درخت پہلے کیوں پیچھے ہٹ گئے تھے؟"

"ہمیں پوری طرح گھیرے میں لینے کے لیے۔" التانیو نے منہ بنایا۔

"خیر کوئی بات نہیں۔ یہ درخت بھی کیا یاد رکھیں گے۔" سلاٹر نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ اپنے پھیلاؤ کی وجہ سے درخت اور آگے بڑھنے کے قابل نہیں تھے۔ اس نے اپنے سامنے والے درخت پر نظریں جما دیں اور آنکھوں کی پوری طاقت سے کام لیتے ہوئے جھٹکا دیا۔ وہ درخت سامنے والے درخت سے ٹکرایا۔ ایک خوفناک دھماکا ہوا۔ اور ان سے شعلے اٹھنے لگے۔ دوسرے درخت شعلوں سے بچنے کے لیے یک دم پیچھے ہٹنے لگے۔

"اف خدا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے درخت بوکھلا کر پیچھے ہٹ رہے ہیں۔" فرحت بڑبڑائی۔

"بوکھلا کر نہیں۔ ڈر کر۔" فاروق مسکرایا۔

اسی وقت رے راٹا، التانیو اور سلاٹر نے چھلانگیں لگا دیں اور درختوں کے درمیان سے نکلتے چلے گئے۔ درختوں نے ان کی طرف مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ وہ سلاٹر کی آنکھوں کی طاقت کے مقابلے میں بے کار ہو گئے تھے۔ رے راٹا دوڑنے سے پہلے مسٹر مین بھنڈارا کو ساتھ لینا نہیں بھولا تھا:

"اب لڑائی ختم ہو چکی۔ امید ہے، تم بھی اس دلچسپ ترین لڑائی سے لطف اندوز ہو چکے ہو گے۔ لہٰذا آؤ چلیں۔" انسپکٹر جمشید نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"اگر ہم پہلے ہی چل چکے ہوتے تو اس وقت ان تینوں کے راستے میں کھڑے ہوتے اور کم از کم اتنی آسانی سے انہیں بچ کر نکلنے نہ دیتے۔ جتنی آسانی سے ان درختوں سے۔"

وہ بھی اس سمت میں دوڑ پڑے۔

"آخر یہ درخت ہیں کیا بلا۔ پروفیسر صاحبان۔ آپ تو بتا سکیں گے۔"

"ہاں، کیوں نہیں۔ یہ مصنوعی درخت ہیں۔ ان کی مشینری ٹینکوں کی قسم کی ہے۔ اور یہ ریموٹ کنٹرول ہیں۔ شاید ان میں بجلی بھی بھری ہوئی ہے۔" پروفیسر داؤد بولے۔

"میرا بھی یہی خیال ہے۔" پروفیسر غوری نے کہا۔

"تب تو ان کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔"

"خیر۔ فائدہ تو ان کا کوئی نہ کوئی ضرور ہو گا۔ بس مشکل یہ ہے کہ سلاٹر کی آنکھوں نے معاملہ خراب کر دیا۔ ویسے پروفیسر صاحبان کیا چھ ماہ تک آپ نے ان درختوں کی قسم کی چیزیں ہی تیار کی ہیں؟" انسپکٹر جمشید بولے۔

"نہیں۔ بالکل نہیں۔"

"اور کیا یہ بھی حقیقت ہے کہ آپ لوگوں کو واقعی اس جگہ کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔"

"ہاں۔ بالکل معلوم نہیں۔" پروفیسر عقلان نے کہا۔

"خیر۔ اب ہم ان لوگوں کے تعاقب میں چلنے کے سوا کر ہی کیا سکتے ہیں اور وہ آگے بڑھنے کے معاملے میں ضرور مسٹر بھنڈارا کی مدد لے رہے ہیں، مین بھنڈارا ان کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی کی طرح ہیں۔" انسپکٹر کامران مرزا نے کہا۔

"ہوں۔ میں حیران ہوں کہ ان کے پاس یہ رائفلیں کہاں سے آ گئی تھیں۔"

"اس مورچے میں سے۔ جس میں یہ تینوں چھپے ہوئے تھے، میں نے وہاں دور بینوں کے علاوہ رائفلیں بھی دیکھی تھیں اور۔" شوکی بول پڑا۔

"تب تو۔ تم سے بے وقوف آدمی شاید کوئی نہیں ہو گا۔" محمود جل بھن کر بولا۔

"کیا کہا۔ مجھ سے بے وقوف آدمی۔ خیر بھئی۔ آپ یہ دعویٰ نہیں کر سکتے۔" شوکی نے تلملا کر کہا۔

"تمہیں کم از کم رائفلیں ضرور اٹھا لینی چاہییں تھیں۔ اب اس میدان میں کیا ہم خاک پھانکیں گے۔"

"ضرور پھانک لیجیے گا۔ ہم کوئی اعتراض نہیں کریں گے۔" آفتاب نبرد و بول اٹھا۔

انہوں نے دیکھا۔ دور بہت دور رے راٹا، سلاٹر اور التانیو کھڑے تھے۔ اور اس بار ان کے منہ ان کی طرف تھے:

"شاید انہوں نے ہمیں دیکھ لیا ہے۔"

"دیکھ تو وہ ہمیں بہت پہلے چکے ہیں اور جانتے ہیں کہ ہم بھی پیچھے ہٹنے والوں میں سے نہیں ہیں۔"

"تب پھر۔ وہ کیوں رک گئے۔" فرحت نے بے چین ہو کر کہا۔

"ہم نجومی نہیں ہیں۔ ان سے پوچھنے پر ہی معلوم ہو گا۔" فاروق نے فوراً کہا۔

"ہر وقت مرچیں کیوں چباتے رہتے ہو۔"

"یہ بھی غلط ہے۔ ان دنوں تو بازار سے مرچیں ویسے ہی غائب ہیں۔" فاروق نے کہا۔

"بھئی تم لوگ بے کار کی بحث میں بار بار الجھ جاتے ہو۔ کیا اس کا کوئی علاج نہیں۔" انسپکٹر کامران مرزا تلملا اٹھے۔

"علاج آپ بتا دیں۔ عمل اس پر ہم کر لیں گے۔ کچھ تو آپ بھی کیجیے نا انکل۔" فرزانہ مسکرائی۔

اتنے میں وہ ان کے نزدیک پہنچ گئے۔ انہوں نے دیکھا۔ مین بھنڈارا ان سے کچھ فاصلے پر کھڑے تھے۔ ان کے چہرے پر بے چارگی کے آثار تھے جیسے سوچ رہے ہوں۔ یہ میں کن حالات میں گھر گیا۔

"خیر تو ہے۔ آپ لوگ چلتے چلتے رک کیوں گئے۔" محمود نے

چند قدم اور آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

"ہم نے ایک مشورہ کیا ہے۔ تمہیں بھی بتا دینا چاہتے ہیں۔"

"پہلے خیر۔ مشورہ سن لینے میں کوئی حرج نہیں، کیوں لالہ جان۔"

"ہاں۔ ٹھیک ہے۔ کوئی حرج نہیں۔"

"مشورہ یہ ہے کہ ہم سب لوگ مل کر اس خفیہ مقام کی تلاش میں چلتے ہیں۔" سلاٹر نے کہا۔

"گویا شیر اور بکری ایک گھاٹ پر پانی پینے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔" آصف بولا۔

"پتا نہیں۔ تم نے شیر خود کو کہا ہے یا ہمیں۔" آفتاب نے پوچھا۔

"اس وضاحت میں جانے کی کیا ضرورت ہے۔ اس مہم میں جو بھی فتح یاب ہوا، وہی شیر ہوگا۔ مگر ہم تو شیر ہونے کی بجائے انسان ہونا زیادہ پسند کرتے ہیں۔" محمود نے فلسفیانہ لہجہ اختیار کیا۔

"ایک دوسری تجویز بھی ہے۔" سے وانگ نے کہا۔

"تو یوں کہو۔ تم دو مشورے پیش کرنا چاہتے ہو۔ خیر ایک سے تو چلے، بتاؤ۔ دوسرا مشورہ کیا ہے؟"

"دوسرا مشورہ یہ ہے کہ ہم میں سے صرف ایک پارٹی اس مقام کی طرف جائے۔" سے وانگ نے کہا۔

"اور دوسری؟" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"دوسری۔ وہ تو رہے گی ہی نہیں۔" وہ مسکرایا۔

"رہے گی ہی نہیں۔ ہم نہیں سمجھے۔ تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"یہ کہ ہم لوگ آپس میں فیصلہ کر لیں کہ کون آگے جائے گا اور کون یہیں رہ جائے گا۔"

"اوہ۔ تو تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ کیوں نہ ہم آپس میں ایک مختصر سی جنگ کر لیں، اس طرح صرف ایک پارٹی آگے جائے گی۔"

"ہاں۔ تم لوگ ان دونوں مشوروں پر غور کرنے کے بعد بتاتے ہو۔ ٹھیک ہے نا۔"

"ہاں۔ ٹھیک ہے۔ تو پھر۔" آفتاب نے حیران ہو کر کہا۔

"ہم بھی مشورہ کرنا چاہتے ہیں۔"

"تب تمہیں اجازت ہے۔ خوب مشورہ کرو۔" سلاٹر بولا۔

وہ بیس قدم پیچھے ہٹ آئے۔

"اب بھئی کیا خیال ہے۔ اسی وقت ان سے نپٹ لیا جائے یا اس مقام پر پہنچ کر۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"ہم نے آج تک ان لوگوں کے ساتھ سفر نہیں کیا۔ کیوں نہ اس بار سفر بھی کر لیا جائے۔" محمود نے تجویز پیش کی۔

"جب کہ میں یہ بہتر سمجھتا ہوں کہ ان سے اسی جگہ فیصلہ کر لیا جائے۔ تاکہ خطرہ دور ہو جائے اور وہ جگہ محفوظ ہو جائے۔"

"انسپکٹر کامران مرزا آپ کا کیا خیال ہے؟"

"اگرچہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ ان لوگوں کے ساتھ سفر کرنے میں خطرہ ہے۔ کیونکہ اس طرح یہ ہم لوگوں کے ساتھ وہاں پہنچیں گے۔ اگر ہم یہیں ان سے نپٹ لیتے ہیں تو خطرہ ختم ہو جائے گا لیکن نہ جانے کیوں میرا دل یہی چاہتا ہے کہ ان لوگوں کے ساتھ سفر کر لیا جائے۔ یہ ایک نیا تجربہ ہوگا۔"

"اور کافی خطرناک ہوگا۔" انسپکٹر جمشید بولے۔ "خیر۔ باقی حضرات میں سے کوئی مشورہ پیش کرنا چاہتے ہیں؟"

"اس مقام پر ہمارے ساتھی اور پروفیسر موجود ہوں گے۔ جیسا کہ ظاہر ہے۔ وہ ہم سے الجھنے کی کوشش نہیں کریں گے۔ لہٰذا وہیں چل کر ان سے نمٹنا بہتر ہوگا۔" پروفیسر داؤد بولے۔

چند منٹ تک سب اپنا اپنا مشورہ پیش کرتے رہے۔ آخر یہی طے پایا کہ سب ساتھ ہی سفر کریں گے۔ اس فیصلے کے بعد ان کے قدم پھر ان چاروں کی طرف اٹھنے لگے۔ نزدیک پہنچے تو سلاٹر بول اٹھا۔

"اپنا فیصلہ سنانے سے پہلے یہ سن لیں کہ ہم نے کیا فیصلہ کیا ہے۔"

"چلو بھئی۔ تم ہی بتا دو۔"

"تم لوگوں نے ہمارے ساتھ چلنے کا فیصلہ کیا ہے۔" وہ مسکرایا۔

"اوہ ہاں۔ تمہارا خیال ٹھیک ہے مسٹر سلاٹر۔ ہم ساتھ ساتھ سفر کریں گے اور یہ ہم لوگوں کی زندگی میں پہلا اتفاق ہوگا۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"بہت خوب۔ خوشی ہوئی کہ تم لوگوں نے ہمارے مشوروں کے مطابق فیصلہ کیا۔ کیا خیال ہے، اب چلا جائے۔" سے وانگ نے خوش ہو کر کہا۔ اس کے چہرے پر پھوٹتی خوشی کی کرنوں نے انہیں فکر مند کر دیا اور وہ سوچنے لگے۔ کہیں یہ لوگ ہمیں کسی جال میں تو نہیں پھانس رہے، لیکن اب ایک فیصلہ ہو چکا تھا۔ اسے تبدیل کرنا بھی مناسب نہیں تھا۔

"کیا۔ مسٹر سلاٹر۔ بیڈولا صاحب نے آپ کو ابھی تک نہیں بتایا کہ وہ جگہ کس طرف ہے۔" محمود بولا۔

"نہیں۔ یہ تعاون کرنے پر تیار نہیں ہیں۔ اور ہم ان پر سختی نہیں کر سکتے، کیونکہ اگر یہ مر گئے تو ہم اصل حقیقت کس سے معلوم کریں گے۔"

"ہاں۔ تو یہ بات ہے۔ ویسے مسٹر سلاٹر۔ آپ لوگ اس میدان میں کھا پی کیا رہے ہیں، بھلا [illegible] ہے۔" فاروق نے کہا۔

"فکر نہ کرو۔ ہمارے ساتھ سفر کرتے ہوئے تم بھوکے نہیں رہو گے۔ ہم تمہیں کھانا بھی دیں گے اور پانی بھی۔"

"مگر۔ کیا مطلب۔ کہاں سے دیں گے۔ جب کہ ہم دیکھ رہے ہیں۔ آپ لوگوں کے پاس سامان نام کی کوئی چیز نہیں۔" آصف نے حیران ہو کر کہا۔

"ہاں۔ تم بھی ٹھیک کہتے ہو۔ خیر ٹھہرو۔ میں ابھی تمہارا

اطمینان کیے دیتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور پھر دھک سے رہ گیا:

"اوہ۔" اس کے منہ سے نکلا۔

"جی۔ یہ اوہ کہاں سے ٹپک پڑا۔ آپ تو ہمیں جیب میں سے کھانے پینے کی چیزیں نکال کر دے رہے تھے، اگرچہ ہم جانتے ہیں کہ جیبوں میں کھانے پینے کی چیزیں نہیں رکھی جاتیں۔"

"مسٹر رے واٹا۔ وہ ڈبیا تمہارے پاس تو نہیں۔" سلاٹر نے پریشان ہو کر کہا۔

"نن۔ نہیں تو۔" رے واٹا نے جلدی جلدی جیبیں ٹٹولیں۔ اتنی دیر میں انتانیو بھی جیبوں میں ہاتھ ڈال چکا تھا۔

"وہ۔ وہ تو میرے پاس بھی نہیں ہے۔"

"اب۔ اب کیا ہوگا۔" سلاٹر نے کانپ کر کہا۔

"فکر کی کیا بات ہے۔ ہیلی کاپٹر۔"

رے واٹا کے الفاظ درمیان میں رہ گئے۔ انہیں یاد آگیا کہ ہیلی کاپٹر تو تباہ ہو چکا ہے۔

"آخر اس ڈبیا میں کیا تھا؟"

"ایسی گولیاں جنہیں کھا کر آدمی کی بھوک اور پیاس بالکل مٹ جاتی ہے۔" اس نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔

"اور وہ مزے دار بھی بہت ہیں۔" شوکی بول پڑا۔

"کیا مطلب!" سلاٹر چیخا۔ ساتھ ہی اس نے شوکی پر چھلانگ لگا دی۔ شوکی خوف زدہ انداز میں بھڑک کر جاگا۔

"ارے ارے۔ یہ کیا کر رہے ہو، اس کی کیا ضرورت ہے۔" انسپکٹر جمشید چلائے۔ لیکن شوکی سلاٹر کے چھلانگ لگانے سے پہلے ہی بھاگ کھڑا ہوا تھا۔

"ٹھہرو۔ میں اسے پکڑتا ہوں۔" رے واٹا نے غصے میں آکر کہا اور دوڑ لگا دی۔ وہ گویا ہوا میں اڑنے لگا۔ یہ دیکھ کر فرزانہ چلائی:

"شوکی بھائی۔ رے واٹا آیا۔ تم اس سے نہیں جیت سکتے۔"

شوکی نے فرزانہ کی آواز سن لی۔ اور اچانک نیچے گر کر ڈھکنی کھا گیا۔ رے واٹا اس کے پاس سے گزرتا آگے نکل گیا۔ اتنے میں سلاٹر شوکی کے سر پر پہنچ چکا تھا۔

"نکالو۔ وہ ڈبیا۔"

"ارے میں تو یونہی مذاق کر رہا تھا۔ بھلا میں ڈبیا لے کر کہیں بھاگ سکتا تھا، اب جب کہ تم لوگوں کے ساتھ سفر کرنا ہے۔ تو جھگڑا مول لینے کا کیا فائدہ۔" یہ کہہ کر ڈبیا اس نے اس کے ہاتھ میں دے دی۔

"تو پہلے ہی کیوں نہیں دے دی تھی۔" سلاٹر نے جھنا کر کہا۔

"آپ اچانک تو مجھ پر جھپٹ پڑے۔ دے کس طرح دیتا۔"

"تمہیں اس کی سزا ضرور دی جائے گی۔ تمہارے باقی سب ساتھیوں کو ایک ایک گولی دی جائے گی، لیکن تمہیں اس سے محروم رکھا جائے گا۔" انتانیو نے غرا کر کہا۔

"کوئی بات نہیں مسٹر انتانیو۔ ہم اپنے حصے کی گولی میں سے تھوڑا تھوڑا حصہ اسے دے دیں گے۔" آصف نے کہا۔

"اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ یہ گولی توڑی نہیں جا سکتی۔"

"ارے باپ رے۔ پھر تو میں گیا کام سے۔" شوکی نے کانپ کر کہا۔

"میرا خیال ہے۔ تم لوگوں کو اتنا سخت رویہ اختیار نہیں کرنا چاہیے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"کیوں نہیں کرنا چاہیے۔ جب کہ ہم ایک ساتھ سفر کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ اسے تو فوراً ڈبیا لوٹا دینی چاہیے تھی۔" رے واٹا نے لوٹتے ہوئے کہا۔ اس کے چہرے پر غصے کے آثار تھے۔

"لیکن مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ ڈبیا آپ میں سے کسی کی ہے۔" شوکی نے جھنا کر کہا۔

"خیر چھوڑیں۔ بات آئی گئی ہو گئی۔" انسپکٹر جمشید نے کندھے اچکائے۔

"نہیں۔ اسے گولی نہیں ملے گی۔ باقی سب کو دیں گے۔" سلاٹر بولا۔

"اچھا، جیسے آپ لوگوں کی مرضی۔"

سلاٹر نے ڈبیا کا منہ کھولا اور اس میں سے ایک ایک گولی نکال نکال کر انہیں دینے لگا۔ یہ گولیاں فسواری رنگ کی تھیں۔

"کہیں یہ زہر کی گولیاں تو نہیں۔" فرزانہ بولی۔

"تم لوگوں کو اتنے بزدلانہ طریقے سے نہیں ماریں گے۔ یہ سلاٹر کا وعدہ ہے۔" اس نے ہنس کر کہا۔

"شکریہ۔" انسپکٹر کامران مرزا مسکرائے۔

سب کو ایک ایک گولی مل گئی تو سلاٹر نے اپنے دونوں ساتھیوں اور مسٹر مین بھنڈارا کو بھی دیں۔ انہوں نے لیتے ہی منہ میں ڈال لیں۔

"یہ کیا بات ہے۔ آپ لوگ گولیاں نہیں کھا رہے۔"

"کس طرح کھائیں۔ ہمارے ایک ساتھی کو گولی نہیں ملی۔ لو شوکی۔ تم میری گولی کھا لو۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے انکل۔" شوکی عجیب سے انداز سے مسکرایا۔

"کیا کیسے ہو سکتا ہے۔" انسپکٹر جمشید حیران ہو کر بولے۔

"یہ کہ آپ کے حصے کی گولی میں کھا لوں۔"

"بھئی میں جو کہہ رہا ہوں کہ کھا لو۔" انسپکٹر جمشید جھنجلا اٹھے۔

"جی نہیں۔ ہرگز نہیں کھاؤں گا۔"

"اچھا بھائی جان۔ آپ میرے والی گولی کھا لیں۔" آفتاب نے ہاتھ آگے بڑھایا۔

"کیوں لے لوں۔ خود کھاؤ تم اپنی گولی۔" وہ بولا۔

"اچھا تو پھر میں تمہیں اپنی گولی پیش کرتی ہوں۔" فرحت نے کہا

"جی نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔"

"نہ جانے کیا بات ہے۔ میرے پیٹ میں کل سے گڑبڑ ہے۔ بھوک بالکل نہیں لگ رہی۔ کیوں نہ شوکی میری گولی تم کھا لو۔ یوں بھی میں اسے نہیں کھاؤں گا۔" پروفیسر داؤد نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

"ہرگز نہیں۔ آپ لوگ مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتے۔ میں جانتا ہوں۔ آپ سب بھوک محسوس کر رہے ہیں، لیکن اس کے باوجود ہر کوئی مجھے اپنی گولی دے دینا چاہتا ہے۔ آخر کیوں۔ بس کہتا ہوں۔ کھا لیجیے اپنی اپنی گولی ــ ابھی نہ جانے کتنی دیر تک ہمیں کھانے کو کچھ نہ مل سکے۔"

"میں تو ہرگز نہیں کھاؤں گا۔" پروفیسر داؤد بولے۔

"اور نہ میں کھاؤں گا۔" خان رحمان نے کہا۔

"تو ہم ہی کیوں کھانے لگے۔" محمود بولا۔

"ٹھیک ہے۔ لائیے سب اپنی اپنی گولی مجھے دے دیں۔" انسپکٹر جمشید نے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

"جی۔ کیا مطلب۔" فاروق چونک کر بولا۔

"میں نے کہا ہے۔ سب لوگ اپنی اپنی گولی مجھے دے دیں۔" انہوں نے پھر کہا۔

"لیکن آپ سب گولیوں کا کیا کریں گے۔" آفتاب نمبر ایک حیران ہو کر بولا۔

"اچار ڈالوں گا۔ تم گولیاں دیتے ہو یا نہیں۔" وہ جھنجلا اٹھے۔
اور سب نے جلدی جلدی اپنی اپنی گولی ان کی ہتھیلی پر ٹکا دی۔ اب ان کی ہتھیلی پر اٹھارہ گولیاں تھیں۔ انہوں نے ان پر ایک نظر ڈالی اور بولے:

"مسٹر سلاٹر۔ ایک گولی کتنی دیر کے لیے کافی ہو جاتی ہے۔"

"چوبیس گھنٹے کے لیے۔"

"گویا یہ گولیاں میرے لیے پورے اٹھارہ دن کے لیے کافی ہیں۔" انہوں نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ اب سلاٹر، ریے راٹا اور التانیو انہیں غور سے دیکھ رہے تھے۔

"ہاں۔ لیکن یہ سب ایک ہی وقت میں نہیں کھائی جا سکتیں، اس کا نتیجہ موت ہو گا۔" التانیو نے گویا خبردار کیا۔

"ہاں۔ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ تم لوگوں نے شوکی کو گولی نہیں دی۔ ہم چونکہ اسے بھوکا نہیں دیکھ سکتے۔ اس لیے ہر ایک نے اپنی اپنی گولی اسے پیش کرنے کی کوشش کی، لیکن اس نے نہ مانا۔ چنانچہ ہم بھی نہیں مانتے۔" یہ کہہ کر انسپکٹر جمشید خاموش ہو گئے۔

"کیا مطلب۔ آپ کیا نہیں مانتے۔" ریے راٹا چونک کر بولا۔

"اپنی گولیاں۔ واپس لے لیجیے۔ ہم میں سے کوئی ایک بھی اسے نہیں کھائے گا۔ جب تک کہ شوکی کو بھی ایک گولی نہ دے دی جائے۔ اگر ہم نے ایک ایک گولی نہ کھائی تو ہم اس سفر میں تم لوگوں کا ساتھ نہیں دے سکیں گے۔ لہذا ہم سے کوئی فیصلہ کر لو۔"

یہاں تک کہہ کر انسپکٹر جمشید خاموش ہو گئے۔ صورت حال نے سلاٹر، ریے راٹا اور التانیو۔ تینوں کو پریشان کر دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

چند لمحے تک مکمل طور پر سناٹا طاری رہا، پھر سلاٹر بولا:

"جانتے ہو۔ اگر تم نے ایک ایک گولی نہ کھائی تو بھوک کی وجہ سے بالکل بے کار ہو کر رہ جاؤ گے۔"

"ہاں جانتے ہیں، لیکن اپنے ایک ساتھی کو بھوک سے مرتے کس طرح دیکھ سکتے ہیں۔" آصف بولا۔

"تم لوگ بہت ضدی ہو۔ خیر ہم ایک گولی اور دے دیتے ہیں۔"

"یہ ہوئی نا بات۔" فاروق چہکا۔

"زیادہ پھولنے کی ضرورت نہیں، ہم تم پر ترس کھا کر یہ گولیاں دے رہے ہیں، کیونکہ بھوک کی حالت میں دشمن کو مارنا ہمارا اصول نہیں۔ اس طرح کیا مزا آئے گا کہ تم لوگ پہلے ہی بے دم ہو اور ہم ایک ایک دھپ رسید کر کے تم لوگوں کو اگلے جہان کے سفر پر روانہ کر دیں۔" التانیو نے سرد آواز میں کہا۔

"تت۔ تو کیا۔ آپ لوگوں کا ارادہ ہمیں جان سے مار ڈالنے کا ہے۔" شوکی نے کانپ کر کہا۔

"اور نہیں تو کیا۔ ہم اپنے ملکوں کے چڑیا گھروں میں رکھنے کا پروگرام بنائے بیٹھے ہیں۔" ریے راٹا ہنسا۔

"خیر۔ آپ کا بہت بہت شکریہ کہ ہمیں موت کے گھاٹ اتارنے سے پہلے ہماری بھوک کا انتظام کر رہے ہیں۔ ویسے ہمارے ہاں کے قصاب بھی ایسا ہی کرتے ہیں۔" آفتاب نمبر دو نے مسکرا کر کہا۔

"کیا کرتے ہیں؟" سلاٹر چونک کر بولا۔

"آپ قصاب کے نام پر اتنا چونکے کیوں۔" فرزانہ نے شریر انداز میں کہا۔

"میری بات کا جواب دو۔" سلاٹر غرایا۔

"وہ جانوروں کو ذبح کرنے سے پہلے پانی پلاتے ہیں۔"

"ہوں۔ خیر۔ اب آگے بڑھو۔ اور یاد رکھو۔ اگر کوئی شرارت کی تو ہمارا دوستانہ فضا میں سفر کرنے کا معاہدہ ختم ہو جائے گا اور ہم اسی مقام پر فیصلہ کر لیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔ ہم ہرگز شرارت نہیں کریں گے۔ یوں بھی اب ہمارا شرارتیں کرنے کا وقت گزر گیا۔ ہم اتنے بچے نہیں رہے۔"

"چلو اچھا ہے۔ اتنے بچے نہیں رہے۔" التانیو مسکرایا۔

"مسٹر مین بھنڈارا ہم درست سمت میں جا رہے ہیں نا۔"

"ہاں!" انہوں نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔ ددختوں کی شکست

کے بعد وہ بجھ کر رہ گئے تھے۔

وہ چلتے رہے۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے آپ کا اور ہمارا ایک ساتھ یہ پہلا اور آخری سفر ہے۔" محمود سوچ میں گم لہجے میں بولا۔ وہ ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ درمیان میں کوئی فاصلہ نہیں چھوڑا گیا تھا۔

"پہلا اور آخری۔ تمہارا مطلب ہے، ہم اس کے بعد کبھی ایک ساتھ سفر نہیں کر سکیں گے۔" سلاٹر نے اسے گھور کر دیکھا۔

"ہاں، میرا یہی خیال ہے۔"

"گویا تمہیں اپنی موت ابھی سامنے نظر آنے لگی ہے۔"

"کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ کس کی موت۔" محمود نے منہ بنایا۔

"ویسے یہ اچھا ہی ہوا، تم لوگ اس معاملے میں شامل ہو گئے۔ لگے ہاتھوں تمہارا کانٹا بھی نکل جائے گا۔ ہر معاملے میں ہی ٹانگ اڑا بیٹھتے ہو۔ تم سے نجات حاصل کر کے ہم بہت مزے میں رہیں گے۔" سلاٹر نے خوشی سے بھرپور لہجے میں کہا۔

"تھوڑا سا مزا ہماری طرف بھی کر دینا۔ تاکہ زیادہ مزے میں نہ آ جاؤ۔" آفتاب نمبر ایک نے جلدی سے کہا۔

"ہاں! اس بے چارے کو مزے میں آئے بہت دن ہو گئے ہیں۔" فاروق بولا۔

"میں تم سے بات نہیں کر رہا۔ انکل سلاٹر سے بات کر رہا ہوں۔"

"لیجیے۔ اس نے تو مسٹر سلاٹر کو انکل بھی بنا لیا۔" فرزانہ نے جھلا کر کہا۔

"تو تمہیں کس نے روکا ہے۔ تم بھی بنا لو۔" آفتاب نمبر ایک اس کی طرف الٹ پڑا۔

"وطن کے دشمنوں کو انکل کس طرح بنایا جا سکتا ہے۔" فرحت نے فرزانہ کا ساتھ دیا۔

"جس طرح ہم اس وقت وطن کے دشمنوں کے ساتھ سفر کر رہے ہیں۔" آصف نے جواب دیا۔

"آصف کا جواب معقول ہے۔ ہم اس وقت عارضی طور پر صلح کر چکے ہیں۔ جب تک حالتِ صلح رہے۔ تم لوگ انہیں انکل کہہ سکتے ہو۔" خان رحمان بولے۔

"اگر آپ کہتے ہیں تو کہہ لیں گے انکل۔ ویسے ہمارے دل نہیں مانتے۔" محمود نے کندھے اچکائے۔

"تو کہہ کون رہا ہے کہ دلوں سے بھی منواؤ۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"اوہو۔ یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔" ایسے میں انسپکٹر کامران مرزا کی حیرت میں ڈوبی آواز سنائی دی۔

"خدا کرے۔ آپ جو کچھ بھی دیکھ رہے ہیں۔ خیریت والی چیز ہو۔" اشفاق نے جلدی سے کہا۔ سب نے انسپکٹر کامران مرزا کی طرف دیکھا اور پھر ان کی نظریں بھی اس سمت میں اٹھ گئیں۔ دوسرے ہی لمحے وہ حیرت زدہ رہ گئے۔ دُور بہت دُور انہیں سبزہ نظر آ رہا تھا:

"خدا کا شکر ہے۔ سبزے کی صورت تو دکھائی دی۔ کم از کم ہم وہاں کچھ دیر آرام تو کر سکیں گے۔"

"اور اگر ان درختوں پر پھل وغیرہ لگے ہوئے ملے تو ان سے بھی انصاف کر سکیں گے۔ بے چارے کڑھتے رہتے ہوں گے۔" فاروق بولا۔

"کون کڑھتے رہتے ہوں گے؟"

"پھل۔ یہ سوچ سوچ کر کہ انہیں کھانے والا کوئی آتا ہی نہیں۔" فاروق نے کہا اور وہ مسکرانے لگے۔

"اوہو۔ ارے۔" اچانک سلاٹر کے منہ سے نکلا۔

"یہ اوہو اور ارے آپ نے کس خوشی میں کہا؟" فاروق نے حیران ہو کر پوچھا۔

"یہ۔ یہ درخت۔" سلاٹر ہکلایا۔

"یہ نہیں۔ وہ درخت۔ یہ نزدیک کی چیز کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ جب کہ وہ دُور کی چیز کے لیے۔" آصف بولا۔

"خاموش رہو۔ ہم تم سے گرائمر نہیں پڑھ رہے۔" سلاٹر نے جھلا کر کہا۔

انہوں نے بھی اس طرف نظریں جما دیں۔ درخت اب صاف دکھائی دینے لگے تھے۔ ہر طرف درخت ہی درخت۔ سبزہ ہی سبزہ نظر آ رہا تھا۔ پھر ان کی آنکھیں بھی حیرت سے پھیل گئیں، کیونکہ سلاٹر کی حیرت کی وجہ ان کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ یہ بالکل ویسے ہی درخت تھے۔ جن سے سلاٹر اور ان کے ساتھیوں کی جنگ ہوئی تھی۔

○

"بب۔ بالکل۔ وہی درخت۔" شوکی ہکلایا۔

"یہ تم ہر بات شروع کرتے وقت ہکلاتے کیوں ہو؟" فرحت نے جھلا کر کہا۔

"پپ۔ پتا نہیں۔" شوکی بولا۔

"مم۔ مسٹر۔ بلکہ انکل سلاٹر۔ کیا آپ اپنی آنکھوں کی طاقت سے اتنے بہت سے درختوں کو ٹھکانے لگا سکتے ہیں؟"

"کچھ کہہ نہیں سکتا۔ یہ کام بھی آسان تو نہیں ہوتا۔ سارے جسم کی طاقت آنکھوں میں سمیٹنا پڑتی ہے۔" سلاٹر نے فکر مندانہ لہجے میں کہا۔

"اتنے مصنوعی درخت۔ اتنے بڑے علاقے میں پھیلے ہوئے۔ اف خدا۔ یہ چکر کیا ہے۔" فاروق بڑبڑایا۔

"یہی تو ہم معلوم کرنے آئے ہیں کہ چکر کیا ہے۔"

"اب جب کہ ہم اس مقام تک پہنچ چکے ہیں۔ کیوں نہ صلح ختم کر دیں۔" انتانیو بولا۔

"ابھی نہیں۔ کچھ اور آگے چل کر فیصلہ کریں گے۔"

"مسٹر مین بھنڈارا۔ اب تو ہم پہنچ ہی چکے۔ اب تو بتا دو، یہ سارا راز کیا ہے؟"

"میں نے تمہیں راستہ بتایا اور میری مدد سے تم یہاں تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔ راز بھی تم خود معلوم نہیں کر سکتے۔" مین بھنڈارا کے لہجے میں گہرا طنز تھا۔

"بات تو مسٹر مین بھنڈارا کی بالکل درست ہے۔" آصف نے فوراً کہا۔

"تب تو ان لوگوں کو چلو بھر پانی میں ڈوب مرنا چاہیے۔ کیوں حضرات۔ آپ لوگ چلو بھر پانی میں ڈوب مرنے کا مطلب جانتے ہیں؟"

"ہاں۔ ہم تینوں کو اُردو پر عبور حاصل ہے۔ فکر نہ کرو۔ اور چلو بھر پانی میں ڈوب مرنے کے لیے تو دراصل تم یہاں آئے ہو۔ ابھی تھوڑی دیر میں دیکھ ہی لو گے۔"

"اچھا، اگر آپ کی یہی مرضی ہے تو ضرور دیکھ لیں گے۔ دیکھ لینے میں ہمارا جاتا ہی کیا ہے۔" محمود نے بے چارگی کے انداز میں کہا۔

کچھ اور نزدیک پہنچنے پر درخت انہیں بالکل دکھائی دینے لگے اور انہیں اس بات میں کوئی شک نہیں رہ گیا کہ یہ بالکل ویسے ہی درخت تھے۔ اور سینکڑوں کی تعداد میں تھے۔ جو شاید ایک مربع میل میں پھیلے ہوئے تھے۔

"خدایا۔ کیا اس مرتبہ ہمیں صرف ان درختوں سے لڑنا ہوگا۔" فاروق بڑبڑایا۔

"دماغ تو نہیں چل گیا۔ یہ درخت ہمارے نہیں، ان کے دشمن ہیں۔ بھلا ہم کیوں لڑیں گے ان سے۔"

"بات تو یہ بھی ٹھیک ہے۔ چلیے جناب۔ آپ لوگ ہی لڑیے ان سے۔" آصف نے خوش ہو کر کہا۔

"اور ہم دُور کھڑے تماشہ دیکھیں گے۔" فاروق نے بچوں کے سے انداز میں تالی بجائی۔

"وہ وقت کبھی نہیں آئے گا۔" سلاٹر نے غصیلے انداز میں کہا۔

"کک۔ کیا مطلب۔ کیوں نہیں آئے گا وہ وقت۔ بھلا وقت بھی کبھی آنے سے رُکا ہے۔" محمود نے تلملا کر کہا۔

"جو لوگ اس دُنیا سے کوچ کر جائیں۔ ان کے لیے وقت کس طرح آسکتا ہے۔" رے راٹا غرایا۔

"یہ۔ یہ آپ لوگوں کے تیور بدل کیوں گئے۔ کہیں آپ صلح توڑنے پر تل تو نہیں گئے۔" آفتاب نمبر ایک نے ہکلا کر کہا۔

"ویسے صلح توڑنے پر تُلنا ہے بہت بُری بات۔ کسی اور چیز پر بھی تو آدمی تل ہی سکتا ہے۔" فاروق نے کہا۔

"یہ آپ لوگوں کو بات بے بات تلنے کی کیا ضرورت پڑ جاتی ہے۔" آفتاب نمبر دو نے حیران ہو کر کہا۔

"لو بھئی۔ ہوا۔ بی مینڈکی کو بھی زکام۔" آفتاب نمبر ایک نے کہا۔

"بی مینڈکی ہو گے تم خود۔ میں تو ہوں۔"

اس کے ان الفاظ کے ساتھ ہی آفتاب نمبر ایک نے اُس کو ٹھوڑی پر بھرپور مُکّا دے مارا۔ آفتاب نمبر دو دوسری طرف اُلٹ گیا۔

"ارے ارے۔ یہ کیا۔ یہ تم کیا کر رہے ہو۔ آپس میں لڑ پڑے تو ان لوگوں سے مقابلہ کس طرح کرو گے۔" محمود چلّایا اور گرے ہوئے آفتاب کو اٹھانے کے لیے تیزی سے آگے بڑھا۔ اتنی دیر میں آصف آفتاب کو روکنے کے لیے آگے بڑھ چکا تھا۔ نتیجہ یہ کہ دونوں آپس میں ٹکرا گئے اور دونوں لڑکھڑاتے ہوئے سلاٹر سے جا لگے۔ اس نے ہنس کر ایک مُکّا آصف کی ٹھوڑی پر اُچھال دیا۔ مُکّا آصف کی ٹھوڑی پر لگا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ اور وہ نیچے گرتا چلا گیا۔ یہ دیکھ کر محمود غصّہ میں آگیا۔ اس نے اچھل کر سلاٹر پر حملہ کیا، لیکن اس سے پہلے کہ اس کے سر کی ٹکر سلاٹر کے سینے میں لگتی، اس کے ہاتھوں نے اسے اس زور سے دھکیلا کہ وہ کئی فٹ پیچھے جا گرا۔ اب انسپکٹر جمشید رہ نہ سکے۔ پُرسکون انداز میں آگے بڑھے اور سلاٹر کی گردن پر ہاتھ دے مارا۔ وہ فوراً ان کی طرف مڑا۔

اب تو گویا باقاعدہ جنگ چھڑ گئی۔ انسپکٹر کامران مرزا نے رے راٹا کا رُخ کیا۔ خان رحمان الثانیو کی طرف بڑھے۔ بچّے ان کی مدد کے لیے پوری طرح تیار ہو گئے۔ اس وقت تک آصف بھی اٹھ چکا تھا۔ گویا ایک ہڑبونگ سی مچ گئی۔ ہاں شوکی، اشفاق، اخلاق اور آفتاب کھسکتے کھسکتے ان سے دور ہوتے چلے گئے۔ وہ بُری طرح کانپ رہے تھے۔ اور ڈرے ڈرے انداز میں اس خوفناک ہنگامے کو دیکھ رہے تھے۔ اچانک شوکی کو گھبراہٹ سی محسوس ہوئی۔ اس نے دائیں بائیں دیکھا اور پھر سناٹے میں آگیا۔ چار درخت انہیں اپنے گھیرے میں لے چکے تھے اور گھیرا لمحہ بہ لمحہ تنگ ہو رہا تھا۔

"ارے باپ رے۔ یہ۔ یہ درخت تو۔" شوکی اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکا۔ کیونکہ اتنی دیر میں چاروں درخت دائرے کی صورت میں مل چکے تھے۔ اور ان کے لیے درمیان میں سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ ان درختوں کو چھو وہ سکتے نہیں تھے۔ اس طرح انہیں جھٹکا لگتا۔ ان کے رنگ اُڑ گئے۔

"ہم۔ ہم ان درختوں کے قیدی بن چکے ہیں۔" شوکی ہکلایا۔

"اللہ اپنا رحم فرمائے۔ درختوں کے قیدی۔" آفتاب نے تھرتھر کانپتی آواز میں کہا۔

ان کی نظریں دوسروں کی طرف اُٹھ گئیں۔ اور پھر انہوں نے ایک اور منظر دیکھا۔ تمام کے تمام درخت حرکت کرتے نظر آ رہے تھے۔ گویا وہ ان سب کو قیدی بنانے والے تھے۔

"یہ۔ یہ درخت ہمیں اپنا قیدی بنا رہے ہیں۔" شوکی چلّایا۔

لیکن انہیں اتنی فرصت ہی کہاں تھی کہ درختوں کی طرف متوجہ ہوتے۔ وہ تو موت اور زندگی کی جنگ لڑ رہے تھے۔ ایسے میں مسٹر مین بھنڈارا کی آواز گونجی:

"بھئی اس بے ترتیب جنگ کا کیا فائدہ۔ کیوں نہ یہ جنگ سلیقے سے لڑی جائے۔"

"لیکن مسٹر میں جھنڈلا صاحب۔ سلیقہ ہم لائیں کہاں سے۔ معمولی درختوں کے اس جنگل میں سلیقہ لے چلے آنے سے رہا۔" تعلق بولا۔ ساتھ ہی اس کے منہ پر الٹا تیر کا تختا لگا۔ وہ اس وقت تک انکل خان رحمان کی مدد کرنے کے لیے بڑھ چکے تھے۔

"سلیقہ تم لوگوں کو میں دوں گا۔" مسٹر میں جھنڈلا عجیب سے لہجے میں بولے۔

"اب ہمیں کیا معلوم تھا جناب کہ آپ کل سے سلیقہ بھی ساتھ لے کر چلے ہیں۔" آفتاب تیر ایک نے کہا۔

"میں جانتا تھا۔ تم لوگوں کو اس کی ضرورت پڑے گی۔ الٹا تیر، سنو۔ اس طرح مزا نہیں آئے گا۔"

"لیکن جناب یہاں مزے کی ضرورت ہی کیا ہے۔" آفتاب تیر دو نے منہ بنایا۔

"اپنے چاروں طرف دیکھ لو۔ اب تم میرا حکم ماننے پر مجبور ہو۔ یہ درخت میرے اشاروں پر ناچیں گے۔ اور میں ان کے ذریعے تمہارا بھرکس نکال دوں گا۔ اگر تم نے میری ہدایت پر عمل نہ کیا۔"

"جی۔ کیا فرمایا۔ بھرکس نکال دیں گے۔" تعلق حیران ہو کر بولا۔

"ہاں۔ بالکل۔"

"تب۔ معلوم ہوتا ہے۔ بہت ماہر ہیں بھرکس نکالنے میں۔" شوکی چہکا۔

"لیکن مسٹر میں جھنڈلا۔ آپ تو ایک اسلامی ملک کے صدر ہیں اور یہاں جو کچھ ہوا ہے، اسلامی ملکوں کی منظوری سے ہوا ہے۔ پھر آپ ہم سے دشمنوں جیسا سلوک کیوں کر رہے ہیں؟" محمود نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔

"یہی بات میں بھی پوچھنا چاہتی تھی۔" فرزانہ جلدی سے بولی۔

"تو پھر پوچھ کیوں نہ لی۔" فرحت اس پر الٹ پڑی۔

اس گفتگو نے ان کی لڑائی ایک بار پھر روک دی تھی۔ وہ اب پوری طرح درختوں میں گھر گئے تھے۔ کسی طرف سے نکلنے کی کوئی جگہ نظر نہیں آ رہی تھی۔

"اور کیا مسٹر میں جھنڈلا یہ بھی بھول گئے کہ میں ان درختوں کا کیا حشر کر سکتا ہوں۔" سلاٹر ہنسا۔

"اب تم ان درختوں کو نقصان نہیں پہنچا سکو گے۔" مسٹر میں جھنڈلا ہنسے۔

"کیوں نہیں پہنچا سکوں گا۔" سلاٹر نے حیران ہو کر کہا۔

"تجربہ کر کے دیکھ لو۔" میں جھنڈلا بولے۔ "ان کا نقش مضبوط کر دیا گیا ہے۔"

سلاٹر نے اپنے سامنے کے دو درختوں پر نظریں جما دیں۔ اس کی آنکھیں شعلے اگلتی معلوم ہوئیں اور پھر اس نے ایک زور دار جھٹکا دیا۔ لیکن درخت اپنی جگہ سے ہلے تک نہیں۔

"بہت خوب۔ اس بات پر تو یقین آ گیا کہ میں ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا، لیکن تمہارا سر تو توڑ ہی سکتا ہوں۔" یہ کہہ کر سلاٹر میں جھنڈلا کی طرف جھپٹا، لیکن فوراً ایک درخت اس کے راستے میں آ گیا اور وہ اس سے ٹکرا گیا۔ دوسرے ہی لمحے اسے زور دار جھٹکا لگا۔

"دیکھا۔ میں نے کیا کہا تھا۔" مسٹر میں جھنڈلا ہنسے۔

"میرا خیال ہے۔ ہمیں ان کی بات مان لینی چاہیے۔" رسلا نے کچھ سوچ کر کہا۔

"ٹھیک بات ہے۔ ہاں تو مسٹر جھنڈلا۔ تم چاہتے کیا ہو؟"

"سب لوگ الگ الگ کھڑے ہو جائیں۔ یعنی کہ سلاٹر اور اس کے دونوں ساتھی الگ کھڑے ہو جائیں اور باقی لوگ الگ۔" میں جھنڈلا بولے۔ ان کا لہجہ عجیب سا ہو گیا تھا۔

"اس سے کیا ہو گا۔" رسلا نے منہ بنایا۔

"جنگ ختم سلیقے سے ہو جائے گی۔"

"ٹھیک بات ہے۔ ہم ایسا کیے لیتے ہیں۔" انسپکٹر کامران مرزا نے کہا اور اپنے ساتھیوں کو لے کر ایک طرف ہو گئے۔ سلاٹر، رسلا اور الٹا تیر الگ جا کھڑے ہوئے۔ دوسرے ہی لمحے درختوں نے انہیں اپنے گھیرے میں لے لیا۔

"اب تم سب ہماری اس دنیا کے قیدی ہو۔" مسٹر میں جھنڈلا نے ہنس کر کہا۔

"کک۔ کیا مطلب؟"

"اس میں مشکل الفاظ کیا ہیں کہ مطلب بتاؤں۔ تم لوگ ہماری اس دنیا کے قیدی ہو۔"

"خیر یوں تو دنیا کا ہر آدمی اس دنیا کا قیدی ہے۔ گویا کرۂ ارض کے تمام انسان اس دنیا کے قیدی ہیں اور مر کر ہی اس قید سے رہا ہو سکیں گے۔ لیکن یہ آپ کس دنیا کی بات کر رہے ہیں؟" محمود نے جلے کٹے لہجے میں پوچھا۔

"یہیں دیکھ لو۔ یہ ساری دنیا اب ہمارے اشاروں پر ناچے گی۔ ہم انتظام کر چکے ہیں۔" مسٹر میں جھنڈلا نے اسے گھورا۔

"دنیا کے قیدی۔ یہ لو بھئی، یہ تو کسی ناول کا نام ہو سکتا ہے۔" تعلق نے گویا میں جھنڈلا کا جملہ سنا ہی نہیں۔

"ہم۔ تمہیں اس حالت میں بھی ناولوں کے ناموں کی پڑی ہے۔" آصف نے جھلا کر کہا۔

"تو اس حالت میں اور کس چیز کی پڑنی چاہیے۔ ذرا بتاؤ تو۔ قید تو ہو کر رہ گئے ہیں۔" تعلق نے بھی جلے بھنے لہجے میں کہا۔

"آپ نے کیا کہا مسٹر میں جھنڈلا۔ ساری دنیا آپ کے اشاروں پر ناچے گی۔ آپ کا مطلب ہے، ساری دنیا اسلامی ملکوں کے اشاروں پر ناچے گی۔" خان رحمان پرجوش لہجے میں بولے۔

"ہاں۔ لیکن یہ وقت ان باتوں کا نہیں۔ یہ باتیں تم میں سے فتح یاب پارٹی کو تفصیل سے بتا دی جائیں گی۔ اب جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ۔ اس جنگ کا تماشائی میں ہوں گا۔"

"جنگ کے لیے تیار ہو جائیں۔ کیا مطلب؟" محمود بولا۔

"میں اس لڑائی کو ایک ترتیب سے شروع کراؤں گا اور آخر تک ترتیب قائم رہے گی۔"

"سوال تو یہ ہے کہ ہم تمہارا حکم کیوں مانیں۔" سلاٹر غرایا۔

"اس لیے کہ تم مجبور ہو۔ بے شک تم لوگ بین الاقوامی مجرم ہو اور عالمی شہرت کے مالک ہو، لیکن اس وقت میرے شکنجے میں ہو۔ میں جو چاہوں۔ تم سے منوا سکتا ہوں۔" مسٹر عین بھنڈارا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"پہلے تو تم یہ ثابت کرو کہ اپنا حکم منوا سکتے ہو۔" رے راٹا نے تیز نظریں گھمائیں۔

"ٹھیک ہے۔ ابھی ثابت کیے دیتا ہوں۔ یہ کیا مشکل ہے۔"

اس کے ان الفاظ کے ساتھ ہی درختوں کا گھیرا تنگ ہونے لگا۔ صرف سلاٹر اور اس کے ساتھیوں کے گرد کے درختوں کا ہی نہیں۔ ان کے گرد موجود درختوں کا گھیرا بھی تنگ ہو رہا تھا۔ وہ سمٹتے چلے گئے۔ درخت اور نزدیک ہوتے چلے گئے۔ پھر ان کی شاخیں ان کے سروں پر جھک آئیں۔ وہ بیٹھ گئے تو شاخیں اور جھک گئیں۔

"اب تم لوگ کیا کہتے ہو۔" مسٹر عین بھنڈارا نے ہنس کر کہا۔

"اف خدا۔ جسے ہم اپنا دوست اور ساتھی خیال کرتے رہے وہ تو ہمارا دشمن نکلا۔" خان رحمان نے بوکھلا کر کہا۔

"اسی لیے یہ شخص مجھے ہیلی کاپٹر پر بٹھا کر ناریلوں کی وادی میں چھوڑ گیا تھا، کیونکہ اس کے آدمی وہاں موجود تھے۔ اور انہیں اس نے پہلے ہی اشارا کر دیا تھا۔ افسوس۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"لیکن انکل۔ اب افسوس کس کے کام کا۔" فاروق بولا۔

"ہاں۔ یہ بھی ٹھیک ہے۔ خیر۔ دیکھا جائے گا۔" انہوں نے کندھے اچکائے۔

"جنگ کا پروگرام شروع ہوتا ہے، لیکن اس کے لیے پہلے درمیان میں ایک میدان چھوڑا جائے گا۔" اس کے ان الفاظ کے ساتھ ہی درختوں کے دائرے سرکنے لگے۔ ان کے ساتھ ساتھ وہ بھی سرکتے چلے گئے اور کافی پیچھے ہٹ گئے۔ اس طرح درمیان میں ایک کشادہ میدان بن گیا، اب یہ اور بات ہے کہ یہ میدان بھی بے شمار درختوں کے گھیرے میں تھا۔ مسٹر عین بھنڈارا خود بھی درختوں کے ایک دائرے میں کھڑے تھے۔

"یہ بات سمجھ میں نہیں آئی انکل۔ اگر یہ سارا منصوبہ مسلم ممالک کا تیار کردہ ہے اور ان ملکوں نے اس منصوبے کا انچارج مسٹر عین بھنڈارا کو بنایا تھا تو یہ ہمارے خلاف کارروائی کیونکر کر سکتے ہیں۔" فرحت سے رہا نہ گیا۔

"کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ یہ شخص عین بھنڈارا میری سمجھ میں نہیں آیا۔"

"سب سے پہلے مسٹر التانیو میدان میں آئیں۔" عین بھنڈارا نے کہا۔

"آؤں کس طرح۔ درختوں کا گھیرا کس طرح توڑوں۔"

"دائرے میں سے ایک آدمی کے نکلنے کی جگہ بن جائے گی، لیکن جونہی تم باہر نکلو گے۔ جگہ پھر بند ہو جائے گی، لہٰذا مسٹر سلاٹر اور مسٹر رے راٹا نکلنے کی کوشش نہ کریں۔"

"ہمیں ضرورت ہی کیا ہے۔" رے راٹا نے تلملائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"شاید تم لوگ بری طرح پیچ و تاب کھا رہے ہو۔ کہ میں نے کتنی آسانی سے تم لوگوں کو قابو میں کر لیا۔ اتنے بڑے بڑے جاسوس۔ اور اتنے مشہور و معروف سراغ رساں اور ان کے بچے۔ سب کتنی آسانی سے میرے جال میں آ گئے۔" وہ فخریہ انداز میں کہتا چلا گیا۔

اتنی دیر میں التانیو کے لیے راستہ بن چکا تھا۔ رے راٹا اور سلاٹر نے اس کے پیچھے نکلنے کی کوشش نہیں کی۔ التانیو میدان میں نکل کر کھڑا ہو گیا۔

"مسٹر التانیو۔ تم کس سے مقابلہ کرو گے؟"

"میں کیا جانوں۔ جو مقابل آئے گا، اسی سے کر لوں گا۔" اس نے کندھے اچکائے۔

"بات تو ٹھیک ہے۔ تو پھر شوکی برادرز باہر آئیں اور اس سے مقابلہ کریں۔"

"گگ۔ گگ۔ کیا۔ کیا۔" شوکی برادرز حلق پھاڑ کر چلائے اور پھر ان کی آنکھیں خوف اور دہشت سے پھیل گئیں۔ باقی لوگ مسکرانے لگے۔ اب شوکی برادرز کے جسموں میں باقاعدہ تھرتھری دوڑنے لگی تھی۔

☆ ☆ ☆

"میں نے کہا ہے۔ التانیو سے مقابلہ شوکی برادرز کریں گے۔ چاروں باہر نکل آئیں۔" اس نے غرا کر کہا۔

"یہ۔ یہ انصاف نہیں۔" شوکی ہکلایا۔

"انصاف نہیں۔ تو پھر کیا ہے۔ کیا التانیو۔ اس بار تم سے نہیں ٹکرایا تھا اور کیا پروفیسر عقلان تمہارے شہر سے اغوا نہیں کیے گئے؟" اس نے کہا۔

"ہاں! اس میں تو کوئی شک نہیں۔" اشفاق بولا۔

"بس تو پھر۔ تم ہی التانیو کا مقابلہ کرو گے۔"

"لل۔ لیکن جناب۔ ہم کس طرح مقابلہ کریں گے۔ ہمیں کیا معلوم کہ مقابلہ کیا ہوتا ہے۔ ہم نے کبھی کسی سے مقابلہ کیا ہے کہ اب کریں گے۔ خدا کے لیے۔ کچھ تو سوچیے۔ ذہن پر زور ڈالیے۔" آفتاب نمبر دو جلدی جلدی بوکھلائے ہوئے لہجے میں کہتا چلا گیا۔

"کیا بک رہے ہو۔ تمہیں اس سے مقابلہ کرنا ہی ہو گا۔ مرد یا

زندہ رہو۔"

"ارے باپ رے۔" اخلاق نے کانپ کر کہا۔

"بھئی اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے۔ بہادر بن کر مقابلے میں جاؤ۔ تم چار ہو اور وہ اکیلا، پھر بھی ڈر رہے ہو۔" فاروق نے بُرا سا منہ بنایا۔

"آپ کو کیا معلوم۔ کہ اس میں ڈرنے کی بات ہے یا نہیں۔" اشفاق بولا۔

"ہاں۔ بالکل۔ یہ تو صرف ہم جانتے ہیں۔" شوکی نے کانپتے ہوئے کہا۔

"اچھا تو پھر ڈرتے رہو۔ ہمارا کیا جاتا ہے۔" محمود نے بھنّا کر کہا۔

"یہ یوں باہر نہیں نکلیں گے۔" مسٹر عین بھنڈارا نے غرّا کر کہا۔

"ہاں، خیر یہ تو ٹھیک ہے۔ ہم اس طرح تو ہرگز نہیں نکلیں گے۔" شوکی بولا۔

"میں ان کے لیے راستہ بنا رہا ہوں۔ تم لوگ انہیں دھکا دے دو۔" عین بھنڈارا نے پہلی بار مسکرا کر کہا۔

"کیا کہا۔ دھکا دے دو۔ یہ لوگ اور ہمیں دھکا دیں گے۔ یہ تو ہمارے ساتھی ہیں، جانتے نہیں۔ میری خاطر انہوں نے بھوک مٹانے والی گولیاں کھانے سے انکار کر دیا تھا۔" شوکی نے جلدی جلدی کہا۔

"ہاں، لیکن نہ چاہتے ہوئے بھی انہیں تم لوگوں کو دھکا دینا ہی ہوگا۔ کیا خیال ہے انسپکٹر جمشید۔ تم انہیں دھکا دے رہے ہو یا نہیں۔"

"دینا ہی ہوگا۔" انہوں نے مایوسانہ لہجے میں کہا۔

"انکل۔ یہ آپ کہہ رہے ہیں۔" شوکی ان کی طرف اُلٹ پڑا۔

"ہاں، اس لیے کہ میں خود بھی مجبور ہوں۔ تم خود سوچو شوکی۔ جب وہ درختوں کا گھیرا تنگ کرے گا اور شاخیں ہم پر جھکیں گی تو ہم اس کا حکم ماننے پر مجبور ہو جائیں گے یا نہیں۔"

"ہاں واقعی۔ یہ تو ٹھیک ہے۔ تب تو ہم خود ہی نکل جاتے ہیں۔ مسٹر عین بھنڈارا۔ راستہ بنائیے۔" شوکی بولا۔

"یہ ہوئی نا بات۔" عین بھنڈارا نے ہنس کر کہا۔

"ویسے مسٹر بھنڈارا۔ کیا مناسب نہیں ہوگا کہ شوکی برادرز کی بجائے میرے یا انسپکٹر کامران مرزا کے بچے اتانیو سے مقابلہ کر لیں۔"

"نہیں۔ یہ لڑائی میری مرضی کے مطابق لڑی جائے گی۔" اس نے کہا۔

"جاؤ بھئی شوکی برادرز۔ تمہارا خدا حافظ۔" خان رحمان بولے۔

"جی اچھا۔ آپ لوگوں کا بھی خدا حافظ۔" شوکی نے کہا اور تھر تھر کانپتے قدم راستے کی طرف اٹھا دیے۔ جلد ہی وہ اتانیو کے سامنے کھڑے تھے اور اس کے مقابلے میں بہت ہی کمزور اور پتلے دبلے نظر آ رہے تھے۔

"یہ بالکل بے جوڑ مقابلہ ہے مسٹر بھنڈارا۔ مجھے مزا نہیں آئے گا۔" اتانیو نے منہ بنایا۔

"تم بھی حکم ماننے پر مجبور ہو مسٹر۔" عین بھنڈارا نے کہا۔

"اچھا۔ ویسے مجھے ان پر ترس آ رہا ہے۔"

"آنے دو۔ کچھ دیر بعد تمہیں خود پر بھی ترس کھانا پڑے گا۔"

"ایسا نہیں ہو سکتا۔ تم نہیں کیا جانو۔ یہ ٹھیک ہے، اس وقت حالات کی باگ ڈور تمہارے ہاتھ میں ہے، لیکن اگر میرے ہتھے چڑھ گئے تو نانی اماں یاد آ جائیں گی۔"

"باتیں نہ بناؤ۔ ان سے مقابلہ کرو۔ یہ مقابلہ جس قدر جلد ختم ہو جائے۔ اتنا ہی اچھا ہے۔"

"تو پھر یہ لو۔ ختم سمجھو۔" یہ کہہ کر اتانیو ان چاروں پر جھپٹا۔ وہ بھڑک کر بھاگے۔ اور الگ الگ سمت میں رُخ کر لیے۔ بھاگتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ درخت ان کے سامنے آ گئے۔ اب بھی اگر وہ نہ رکتے تو انہیں پھر جھٹکے کھانے پڑتے۔ اتانیو اس وقت تک اشفاق کے سر پر پہنچ چکا تھا۔

"کیا میں انہیں جان سے مار دوں۔" وہ عین بھنڈارا کی طرف مڑا۔

"جان سے مارنا ضروری نہیں۔ شکست دینا ضروری ہے۔ چاہے شکست دینے میں یہ لوگ اپنی زندگیوں سے ہاتھ کیوں نہ دھو بیٹھیں۔" اس نے کہا۔

دوسرے ہی لمحے اشفاق کی گردن اس کے ہاتھ میں تھی۔ انہوں نے اشفاق کی آنکھیں باہر اُبلتے دیکھیں۔ ان کے دل ڈوبنے لگے۔ آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ ان کا ایک ساتھی موت کی دہلیز پر تھا اور وہ اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ انہوں نے خود کو بڑی مشکل سے درختوں کی طرف بڑھنے سے روکا۔ آخر اتانیو نے اشفاق کو ایک جھٹکا دیا اور وہ دُور جا کر گرا۔ اس کا جسم ساکت تھا۔

"بہت خوب۔ کیا یہ مر گیا ہے؟" عین بھنڈارا نے خوش ہو کر پوچھا۔

"پتا نہیں۔ شاید مر گیا۔ یا مرنے کے قریب ہوگا۔" یہ کہہ کر اتانیو اخلاق کی طرف جھپٹا۔ تینوں اپنے بھائی کا حشر دیکھ چکے تھے اور بید کی چھڑی کی طرح کانپ رہے تھے۔ اخلاق نے دوڑ لگانے کی کوشش کی، لیکن اتانیو نے ٹانگ اڑا دی۔ وہ منہ کے بل گرا۔ ساتھ ہی اتانیو نے اسے بازو سے پکڑ کر اٹھایا اور پرے جھٹک دیا۔ وہ بے دم ہو کر گرا اور پھر اٹھ نہ سکا۔ اب اس نے آفتاب کا رُخ کیا۔

"م۔ میں اتنی آسانی سے تمہارے ہاتھ نہیں آؤں گا۔" وہ بولا اور دائرے میں دوڑنے لگا۔ اتانیو اس کے پیچھے دوڑا۔ ایسے میں شوکی نے ہمت کی اور دوڑتے ہوئے اتانیو کی ٹانگ میں ٹانگ اڑا دی۔ وہ منہ کے بل گرا۔ آفتاب فوراً پلٹا۔ دونوں نے مل کر اسے چاپ لیا، لیکن وہ کئی فٹ اونچے اچھلے اور زمین پر زور سے گرے، ان میں حرکت کے آثار نہ پا کر اتانیو، عین بھنڈارا کی طرف مڑا۔

"لیجیے مسٹر مین بھنڈارا۔ یہ تو گئے کام سے۔"

"انہیں اٹھا کر ایک طرف ڈھیر کر دو۔ میں تمہارے مقابلے میں محمود، فاروق اور فرزانہ کو بھیج رہا ہوں۔"

"بہتر ہو گا کہ آفتاب، آصف اور فرحت کو بھی ساتھ ہی بھیج دو۔ مجھے اس طرح مزا نہیں آ رہا۔" الٹانیو نے کہا۔

"چلو یونہی سہی۔ تم چھ کے چھ میدان میں آ جاؤ۔"

"آ رہے ہیں۔ فکر نہ کرو۔" محمود بولا۔

اتنی دیر میں الٹانیو شوکی برادرز کو ایک طرف ڈھیر کر چکا تھا۔ نہ جانے وہ کس حالت میں تھے۔ وہ چھ ان کے سامنے آ کر کھڑے ہو گئے۔ چہروں پر طنز بھری مسکراہٹیں تھیں۔

"یہ تم مسکرا کیوں رہے ہو؟" الٹانیو نے بھی مسکرا کر پوچھا۔

"ہم شوکی برادرز نہیں ہیں۔ وہ بے چارے لڑائی بھڑائی جانتے ہی نہیں، البتہ اپنی ذہانت سے بڑوں بڑوں کو الٹا دیتے ہیں، لیکن یہاں مجبور تھے۔"

"آؤ آؤ۔ تمہیں بھی دیکھ لیتا ہوں۔"

"الگ الگ ہو جاؤ۔ ہر طرف سے اس پر حملہ کر دو۔" محمود نے کہا۔

انہوں نے اس کی ہدایت پر فوراً عمل کیا۔ الٹانیو نے طنزیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھا اور پھر سب سے پہلے محمود کی طرف جھپٹا، ابھی محمود تک پہنچا نہیں تھا کہ فاروق نے کمر کی طرف سے اس پر حملہ کیا اور سر کی ٹکر دے ماری۔ وہ چند قدم لڑکھڑایا۔ محمود کو بھول کر جھلا کر مڑا اور فاروق کے ایک جھانپڑ رسید کر دیا۔ فاروق کا پورا جسم گھوم گیا۔ لیکن اس وقت آصف دائیں طرف سے اس پر حملہ آور ہو چکا تھا۔ اس نے ایک بھرپور مکا اس کی کن پٹی پر دیا۔ محمود نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ دوڑ کر اس کی کمر پر دونوں لاتیں جھاڑ دیں۔ وہ زور سے لڑکھڑایا، لیکن پھر سنبھل گیا۔ فرزانہ اور فرحت نے ابھی تک اس پر حملہ آور ہونے کی کوشش نہیں کی تھی۔

"تم کھڑی کیا منہ دیکھ رہی ہو؟" فاروق نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

"تمہیں مار کھاتے دیکھ رہی ہیں۔ لو اب تم ہمیں مار کھاتے دیکھو۔" فرزانہ نے جل بھن کر کہا۔

"مجھے کیا ضرورت ہے۔ دیکھنے کی۔" یہ کہہ کر وہ پھر الٹانیو کی طرف بڑھا۔

اب ان کا دائرہ تنگ ہو چکا تھا۔ الٹانیو ان کے نرغے میں تھا۔ فرزانہ اور فرحت بھی اب لڑائی میں شامل ہو چکی تھیں۔ دائرے میں شامل ہوتے ہی اس نے نئی حرکت کی۔ الٹانیو ان پر مکے اور لاتیں اچھال رہا تھا۔ وہ بلا کی تیزی سے نیچے بیٹھ گئی اور جونہی الٹانیو نے ٹانگ اٹھائی، اس نے پیر پکڑ کر گھسیٹ لیا۔ الٹانیو توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ بس پھر کیا تھا۔ وہ اس پر چھا گئے۔ محمود نے فوری طور پر اس کی ایک ٹانگ پر قبضہ جما لیا، آصف دوسری ٹانگ سے لپٹ گیا۔ فاروق نے ایک ہاتھ پکڑ لیا اور آفتاب نے دوسرا ہاتھ۔

"اب۔ مسٹر الٹانیو۔ تم اٹھ نہیں سکو گے۔" فاروق مسکرایا۔ ادھر الٹانیو اپنے ہاتھ اور پیر چھڑانے کے لیے ایڑی اور چوٹی کا زور لگا رہا تھا۔

"فرزانہ۔ فرحت۔ تمہارے لیے میدان صاف ہے۔" محمود بولا۔

"ہاں۔ آؤ فرحت۔" فرزانہ نے کہا۔

دونوں پیچھے ہٹتی چلی گئیں، پھر دوڑ کر آئیں۔ اونچی چھلانگیں لگائیں اور الٹانیو کے سینے پر ایک ساتھ گریں۔ الٹانیو کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

"ایک ہائی جمپ اور فرزانہ۔" آصف بولا۔

"ابھی لو۔"

انہوں نے پھر یہی کیا۔ اور پھر تو وہ مسلسل اچھلتی چلی گئیں، الٹانیو کے منہ سے نکلنے والی بھیانک چیخوں سے فضا تھرا اٹھی۔ ایسے میں آفتاب نمبر دو نے سر ابھارا۔ اور تھر تھر کانپتی آواز میں کہا،

"اف خدا۔ کتنی بھیانک چیخیں ہیں اس شخص کی۔ اسی لیے تو ہم مقابلہ نہ کر سکے۔"

"ارے۔ آفتاب۔ تم زندہ ہو۔" آفتاب نمبر ایک نے پُر مسرت لہجے میں کہا۔

"ہاں۔ اللہ کی مہربانی ہے۔"

"ارے۔ تو تم بھی آؤ۔ اور اس سے اپنا انتقام لے لو۔"

"ہم بے چارے کیا انتقام لیں گے۔ ہماری طرف سے تم ہی لے لو اس سے جو کچھ لینا ہے۔" آفتاب نے کہا اور وہ مسکرا دیے۔ فرحت اور فرزانہ کا کھیل اس وقت تک جاری رہا، جب تک الٹانیو کا جسم ساکت نہ پڑ گیا۔

"بس کرو فرحت۔ یہ۔ یہ جا چکا ہے۔" آصف ہکلایا۔

"کیا کہا۔ جا چکا ہے۔ اوہ۔" نہ صرف وہ، بلکہ ان کے تمام ساتھی اور سلاٹر اور رے راٹا بھی دھک سے رہ گئے۔ شاید وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ الٹانیو ان حالات میں دنیا سے رخصت ہو گا۔

○

"انتہائی دلچسپ، حیرت انگیز اور سنسنی خیز۔ بلکہ ہنگامہ آرا بھی۔ میں نے اتنی دلچسپ لڑائی اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھی۔" مسٹر مین بھنڈارا نے پُر مسرت لہجے میں جلدی جلدی کہا۔

"تو کیا آپ اپنی زندگی میں بس لڑائیاں ہی دیکھتے رہتے ہیں۔" آصف نے منہ بنایا۔ مین بھنڈارا نے اسے گھور کر دیکھا۔

"اب تم لوگ واپس اپنے ڈبے میں آ جاؤ۔"

"جو حکم۔ لیکن ہم شوکی برادرز کا کیا کریں۔"

"اگر یہ خود چل کر جانے کے قابل ہوں تو انہیں بھی لے جاؤ۔ ورنہ پڑے رہنے دو یہیں۔"

انہوں نے ان کا جائزہ لیا۔ حالت ردی تھی۔ سہارا دے کر انہیں اٹھایا اور اس طرف لے چلے جس طرف سے آئے تھے۔

"اور اب میدان میں آئیں گے مسٹر رے راٹا۔"

"ضرور ضرور۔ کیوں نہیں۔" رے راٹا نے فخریہ لہجے میں کہا اور اپنے دائرے سے نکل کر میدان میں آ گیا۔

"ادھر سے میں یہ سمجھتا ہوں کہ مسٹر کامران مرزا مقابلہ کریں گے، یا اگر انسپکٹر جمشید چاہیں تو وہ بھی مقابلہ کر سکتے ہیں۔"

"ہم کیا چاہ سکتے ہیں۔ ہمارے چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"ہاں، ٹھیک ہے۔ رے راٹا نے پروفیسر غوری کو اغوا کیا ہے، لہٰذا انسپکٹر کامران مرزا ہی رے راٹا کا مقابلہ کریں گے۔"

"ٹھیک ہے۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے، ساتھ ہی ان کے لیے بھی راستہ بن گیا۔

"یار جمشید۔ اس طرح میری باری تو آئے گی ہی نہیں۔" ایسے میں خان رحمان بول اٹھے۔ ان کی آواز مین ہنڈارا نے سن لی۔

"انسپکٹر جمشید۔ تمہارا ساتھی کیا کہہ رہا ہے۔"

"یہ کہ اس سلیقے کی جنگ میں ان کی باری تو آ ہی نہیں رہی۔"

"ہاں۔ یہ بات بھی ٹھیک ہے۔ تو پھر ہم پہلے رے راٹا کا مقابلہ ان سے کرا لیتے ہیں۔"

"لیکن اس کی ضرورت ہی کیا ہے۔" انسپکٹر جمشید بول اُٹھے۔

"خیر۔ تو پھر ٹھیک ہے۔ انسپکٹر کامران مرزا ہی آئیں۔" اور وہ آگے بڑھ گئے۔

"یہ کیا کیا جمشید۔ مجھے لڑنے کا موقع مل رہا تھا۔"

"فکر نہ کرو خان رحمان۔ ابھی ہمیں اور مواقع ملیں گے۔" وہ بولے۔

اس وقت تک انسپکٹر کامران مرزا، رے راٹا کے سامنے پہنچ چکے تھے۔ رے راٹا نے شاید انہیں مہلت نہ دینے کے لیے فوراً ہی دوڑ لگا دی۔ سب کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ اُڑتا ہوا ان کی طرف آ رہا ہو۔ وہ پُرسکون انداز میں کھڑے رہے اور پھر اچانک خود کو نیچے گرا دیا۔ ساتھ ہی ٹانگیں اوپر اٹھا دیں، لیکن رے راٹا ان کی ٹانگوں کی زد میں نہ آ سکا اور اوپر سے نکلتا چلا گیا۔ اس نے خود کو درخت سے ٹکرانے سے بال بال بچایا۔

پھر مڑا اور ایک بار پھر دوڑ لگا دی۔ انسپکٹر کامران مرزا نے پھر جھکائی دی اور خود کو صاف بچا لے گئے۔ رے راٹا زمین پر گرا، لیکن فوراً ہی اٹھ گیا۔ دوسرے ہی لمحے اس نے جھنجھلائی ہوئی آواز میں کہا:

"مسٹر مین ہنڈارا۔ یہ جگہ میرے لیے کافی نہیں۔ اس میدان کو اور کشادہ کیا جائے۔"

"بہت بہتر۔ یہ لو۔" مین ہنڈارا نے کہا اور میدان وسیع ہونے لگا۔ دائرہ پیچھے ہٹنے لگا۔ جب میدان کافی وسیع ہو گیا تو وہ بولا:

"بس اتنا کافی ہے۔"

درختوں کا دائرہ رک گیا۔ رے راٹا پیچھے ہٹنے لگا۔ انسپکٹر کامران مرزا جوں کے توں کھڑے رہے۔ رے راٹا ہمیشہ اسی طرح مقابلہ کرتا تھا۔ پوری طاقت سے دوڑتا ہوا آتا اور مقابل سے ٹکرا جاتا۔ بس پھر مقابل اپنے پیروں پر کھڑا نہیں رہ سکتا تھا۔ اب پھر اس نے اسی طرح وار کیا۔ ابھی تک انسپکٹر کامران مرزا اس پر وار نہیں کر سکے تھے۔ کرتے بھی کیسے، وہ موقع ہی نہیں دے رہا تھا۔ وہ پھر دوڑتا ہوا آیا، اس مرتبہ انسپکٹر کامران مرزا نے گرنے کی کوشش نہیں کی، بلکہ انہوں نے ایک نئی چال چلی۔ جونہی رے راٹا ان کے بالکل نزدیک پہنچا۔ انہوں نے اس کے پیروں پر ہاتھ ڈال دیا۔ رے راٹا اس خیال میں تھا کہ وہ پہلے کی طرح گر جائیں گے۔ یا ادھر اُدھر ہٹ جائیں گے۔ نتیجہ یہ کہ اس کے دونوں پاؤں ان کے ہاتھوں میں آ گئے۔ اور وہ منہ کے بل گرا۔ ساتھ ہی انسپکٹر کامران مرزا کے ہاتھ کی ہڈی اس کے کندھے پر لگی۔ وہ تڑپ کر سیدھا ہو گیا۔ فوراً ہی دوسرے ہاتھ کا ایک مکّا اس کی ٹھوڑی پر لگا۔ لیکن اس نے دونوں ہاتھوں سے ان کے سینے پر دھکا دیا۔ انسپکٹر کامران مرزا اس دھکے کو برداشت نہ کر سکے اور دوسری طرف اُلٹ گئے؛ تاہم اٹھتے اٹھتے بھی انہوں نے ٹانگ چلا دی۔ اور رے راٹا جو اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا، پھر دھڑام سے گرا۔ اس بار دونوں ایک ساتھ اٹھے۔ اس سے پہلے کہ انسپکٹر کامران مرزا اس پر حملہ آور ہوتے۔ اس نے مخالف سمت میں دوڑ لگا دی۔

"یہ کیا مسٹر رے راٹا۔ بھاگ لیے۔" محمود ہنسا۔

"نہیں۔ ابھی آ رہا ہوں۔" اس نے بھی ہنس کر کہا اور درختوں کے نزدیک پہنچ کر مڑا اور ایک بار پھر بلا کی رفتار سے دوڑتا ہوا آیا۔ انسپکٹر کامران مرزا نے اس کی لپیٹ میں نہ آنے کی پوری کوشش کی، لیکن بچ نہ سکے۔ انہیں ایک زبردست دھکا لگا اور درختوں کی طرف لڑھکتے چلے گئے۔ ابھی سنبھل نہیں پائے تھے کہ رے راٹا نے پھر دوڑ لگا دی۔ اور انہیں ایک اور دھکا لگا۔ انہیں یوں محسوس ہوا کہ جیسے ان کی ہڈی پسلی ایک ہو گئی ہو۔ رے راٹا تیسری بار پھر آ رہا تھا اور اس بار ان کا درختوں سے ٹکرا جانا یقینی ہو گیا تھا۔ وہ بے حس و حرکت پڑے رہے، رے راٹا اسی طرح دوڑتا ہوا آیا، لیکن وہ انہیں غچہ دے گئے۔ اس قدر تیزی سے لڑھکنی کھائی کہ رے راٹا ان سے ٹکرا نہ

سکا اور سیدھا چلا گیا۔ رفتار اس قدر تیز تھی کہ خود کو روکے نہ روک سکا۔ دوسرا لمحہ ہولناک تھا۔ وہ پوری طاقت سے درخت سے ٹکرایا اور اسی طاقت سے درخت نے اسے دھکا دیا۔ اس کے حلق سے ایک بھیانک چیخ نکلی۔ اتنی دیر میں انسپکٹر کامران مرزا اُٹھ چکے تھے۔ انہوں نے بہت دُور رے راٹا کو گرتے دیکھا۔ بلا کی تیزی سے دوڑتے اس تک پہنچے، تاکہ ان کے پہنچنے سے پہلے وہ سنبھل نہ جائے، لیکن نزدیک پہنچنے پر وہ کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔

☆ ☆ ☆

"خیر تو ہے انکل، کیا رے راٹا کو معاف کرنے کا ارادہ کر لیا ہے۔" محمود حیران ہو کر بولا۔

"اب میرے معاف کرنے، نہ کرنے سے کچھ فرق نہیں پڑے گا۔ یہ رخصت ہو چکا ہے۔"

"کیا!" وہ چلا اٹھے۔ آنکھیں پھیل گئیں۔

"اس۔ اس کا مطلب ہے۔ التانیو اور رے راٹا اب کبھی ہمارے مقابلے میں نہیں آ سکیں گے۔" آصف نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

"اگر ان سے اتنا ہی لگاؤ تھا تو پہلے ہی بتا دیتے۔" فاروق جل بھن کر بولا۔

"تو رے راٹا ختم ہو چکا ہے۔ حیرت ہے۔ خیر۔ اب رہ گئے سلاٹر اور انسپکٹر جمشید۔ میرا خیال ہے، ان کے درمیان بھی فیصلہ ہو ہی جائے۔" مسٹر عین بھنڈارا نے کہا۔

"مسٹر بھنڈارا۔ ایک بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔ آخر آپ کا تعلق دونوں گروہوں میں سے کس سے ہے۔ آپ اسلامی ملک سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس ملک کے صدر ہیں۔ آپ کے منصوبے کے تحت اور آپ کی درخواست پر دوسرے ملکوں نے اپنے نامور سائنس دان بھیجے۔ انہیں چھ ماہ تک نامعلوم جگہ پر رکھا گیا اور نہ جانے کیا کام لیا گیا۔ اب آپ ہمیں ان لوگوں سے لڑا رہے ہیں، جب کہ اگر آپ ہمارے ساتھی ہوتے تو کبھی بھی ہمیں جنگ کی آگ میں نہ جھونکتے، جب کہ آپ کو یا ہمیں کوئی مجبوری نہیں تھی، کیونکہ آپ ان درختوں کے ذریعے ہی ان تینوں کا کام تمام کر سکتے تھے۔ مہربانی فرما کر ذرا وضاحت کر دیں۔" خان رحمان نے جلدی جلدی کہا۔

"کیا یہ بہتر نہیں ہو گا کہ وضاحت سے پہلے ان دونوں کا مقابلہ کرا لیا جائے۔" عین بھنڈارا نے کہا۔

"ہم دونوں کہیں بھاگے نہیں جا رہے۔ مقابلے کا کیا ہے۔ وہ تو ہو گا ہی۔ مہربانی فرما کر ہماری یہ اُلجھن دور کر دیں۔" انسپکٹر جمشید نے کہا۔

"نہیں۔ پہلے مقابلہ ہو گا۔" عین بھنڈارا کا لہجہ سخت تھا۔

"جیسے آپ کی مرضی، لیکن اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ ہم میں سے ایک یہ اُلجھن لیے ہی مر جائے گا۔" سلاٹر بولا۔

"تو کیا ہوا۔ مرنے کے بعد تو اسے معلوم ہو ہی جائے گا کہ راز کیا تھا۔" عین بھنڈارا نے مسکرا کر جواب دیا۔

"آیئے مسٹر سلاٹر۔ یہ صاحب اپنی ہٹ کے پکے ہیں، ہم یوں بھی اس وقت ان کے شکنجے میں ہیں۔ کر ہی کیا سکتے ہیں۔ یہ ہمیں کٹھ پتلیوں کی طرح نچانے پر تل گئے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" سلاٹر نے کہا۔

"مسٹر سلاٹر۔ آپ کے دو ساتھی رُخصت ہو چکے۔ کہیں آپ ڈر تو نہیں رہے۔ ویسے میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ آج کا دن آپ لوگوں کی بدبختی کا دن ہے۔" آفتاب نمبر ایک نے شوخ لہجے میں کہا۔

"میں ان باتوں میں پڑنے والا نہیں۔ نہ وہمی ہوں۔ التانیو اور رے راٹا اپنی غلطی سے مارے گئے، میں ایسی کوئی غلطی نہیں کروں گا۔" سلاٹر نے فخریہ لہجے میں کہا۔

"اور ہمیں افسوس ہے۔ آپ اپنی آنکھوں کی طاقت سے ان درختوں کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکے۔" محمود مسکرایا۔

"پروا نہیں۔ میرے پاس صرف آنکھوں کی ہی طاقت نہیں۔" سلاٹر بھی مسکرایا۔

"انکل۔ کیا آپ اطمینان کر چکے ہیں۔ رے راٹا میں کوئی سانس باقی نہیں۔"

"ہاں۔ پوری طرح اطمینان کر چکا۔ اس کا سر پھٹ گیا ہے اور بھیجہ باہر نکل آیا ہے۔ اور ایسا درخت سے ٹکرانے کی وجہ سے ہوا۔" انہوں نے کہا۔

"گویا اب رے راٹا کے جی اٹھنے کا کوئی امکان نہیں رہا۔"

"ہاں۔ یہی بات ہے۔ اور کیا تم لوگ التانیو کے بارے میں اطمینان کر چکے ہو۔"

"جی ہاں۔ اس کی موت میں بھی اب کوئی شک نہیں رہا۔"

"چلو۔ اب تیسرا مقابلہ دیکھو۔ ویسے تمہیں میرا شکریہ ادا کرنا چاہیے کہ بغیر ٹکٹ اتنے دلچسپ مقابلے دکھا رہا ہوں۔"

"شکریہ۔ آپ بھی فکر نہ کریں۔ بدلے میں ہم آپ کو ان سے بھی اچھا بغیر ٹکٹ مقابلہ دکھائیں گے۔" فاروق نے جلے کٹے لہجے میں کہا۔

"مسٹر سلاٹر۔ میں راستہ بنا رہا ہوں۔ میدان میں نکل آؤ۔"

"اچھی بات ہے۔" اس نے کہا اور آگے بڑھا۔

"اور آپ بھی انسپکٹر جمشید۔"

"کیا یہ بہتر نہیں ہو گا کہ جمشید سے پہلے میں مسٹر سلاٹر سے دو دو ہاتھ کر لوں۔" خان رحمان بے تابانہ بولے۔

"اگر انسپکٹر جمشید اس میں کوئی حرج نہیں سمجھتے تو مجھے کوئی

اعتراض نہیں۔" مین بھنڈارا نے کہا۔

"نہیں خان رحمان۔ تم سلاٹر کے مقابلے میں نہ جاؤ۔ اس سے صرف مجھے ہی نبٹ لینے دو۔ میں محسوس کر رہا ہوں۔ ہمیں تمہارے تجربے سے فائدہ اٹھانے کی ضرورت پڑے گی۔"

یہ کہہ کر وہ بھی میدان کی طرف بڑھے۔ ان کے دل دھک دھک کرنے لگے۔ اس وقت تک وہ دو شاندار مقابلے جیت چکے تھے۔ انٹانیو اور رے راٹا دونوں خطرناک ترین دشمن تھے، لیکن سلاٹر بھی ان سے کسی طرح کم نہیں تھا۔

"آج کا مقابلہ یاد رہے گا۔ میں اس مقابلے کی تفصیلات مدتوں اپنے دوستوں کو سناتا رہوں گا۔" سلاٹر نے پرسکون آواز میں کہا۔

"لیکن مسٹر سلاٹر۔ یہ تو صرف اس صورت میں ممکن ہے۔ جب آپ اس مقابلے میں زندہ بچ جاتے ہیں۔" آفتاب نمبر دو بولا۔

"انسپکٹر جمشید کو شکست دینا مشکل ضرور ہے، ناممکن نہیں۔ میں ان کے لڑنے کے انداز سے بخوبی واقف ہوں۔ ان کے ہر داؤ پیچ کا جواب دے سکتا ہوں۔" اس نے جواب دیا۔

"خیر۔ یہ تو وقت بتائے گا۔ کہ آپ واقف ہیں یا انکل۔" فرحت نے جل بھن کر کہا۔

"ہاں، کیوں نہیں۔ وقت تو آیا ہی چاہتا ہے۔ آئیے انسپکٹر جمشید۔ ہم اپنی زندگی کی یادگار جنگ لڑیں۔" سلاٹر نے دونوں ہاتھ آگے کو پھیلا دیے۔

"میں تیار ہوں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔ اور خود بھی ہاتھ آگے بڑھا کر اس کی طرف قدم اٹھانے لگے۔ یہاں تک کہ دونوں کے ہاتھ ایک دوسرے کو چھونے لگے۔ انہوں نے پرسکون انداز میں انگلیوں میں انگلیاں پھنسائیں۔ اور زور لگانے لگے۔ پورے ایک منٹ تک دونوں نے زور لگایا، لیکن کوئی کسی کا ہاتھ نہ موڑ سکا:

"کیوں کیسی رہی۔" سلاٹر مسکرایا۔

"بالکل ویسی۔ جیسی تمہارے ساتھ رہی۔" انسپکٹر جمشید بھی مسکرائے۔

"خیر۔ یوں بات نہیں بنتی۔ اب ذرا دوسرے طریقے سے جنگ ہو جائے۔" سلاٹر نے کہا۔

"تیسرے طریقے سے بھی مجھے اعتراض نہیں۔" انہوں نے کہا۔

سلاٹر نے اپنی آنکھیں ان کی آنکھوں میں گاڑ دینے کی کوشش کی، لیکن وہ اس کے سر کے اوپر دیکھنے لگے۔ وہ نظریں ان کے چہرے پر جمائے رہا اور پھر ایک شدید جھٹکا دیا، لیکن انسپکٹر جمشید اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکے۔

"تمہارا یہ حربہ صرف میری آنکھوں پر ہی اثر انداز ہو سکتا ہے اور آنکھیں میں تم سے ملاؤں گا کیوں۔"

"کوئی بات نہیں۔ تم میرے تیسرے وار کو نہیں سنبھال سکو گے۔"

یہ کہتے ہی سلاٹر فضا میں اچھلا اور دونوں پاؤں ان کے سینے پر دے مارے۔ انسپکٹر جمشید اگرچہ پوری طرح ہوشیار تھے۔ لیکن۔ پھر بھی بچ نہ سکے اور کمر کے بل گرے۔ ساتھ ہی سلاٹر نے ان پر چھلانگ لگائی۔ لیکن اس وقت وہ کروٹ لے چکے تھے، نتیجہ یہ کہ سلاٹر کا جسم زمین سے ٹکرایا۔ ادھر کروٹ لیتے ہی انہوں نے دائیں ہاتھ کی ہڈی اس کے سر پر رسید کی، لیکن وہ بھی کم نہیں تھا۔ وار بچا گیا۔ اور ان کا ہاتھ زمین پر لگا۔ تکلیف کو پیتے ہوئے وہ تیزی سے اٹھے اور اس پر چھلانگ لگائی۔ سلاٹر نے پھر غچہ دیا اور وہ دھپ سے منہ کے بل زمین پر گرے۔ عین اسی وقت انہیں اپنی کمر پر بھاری بوجھ محسوس ہوا۔ انہوں نے بوجھ کو پرے دھکیل کر اٹھ جانے کی کوشش کی، لیکن یہ ممکن نہ ہوا، سر گھما کر دیکھا تو معلوم ہوا، سلاٹر نے اپنا ایک پیر ان کی کمر پر رکھا ہوا تھا۔

"انسپکٹر جمشید۔ اٹھ کر دکھاؤ تو مانوں۔"

انہوں نے منہ سے کچھ کہے بغیر زور لگایا، لیکن اپنے جسم کو زمین سے انچ کے دسویں حصے کے برابر بھی نہ اٹھا سکے۔ انہیں پسینہ آ گیا۔ دماغ بھائیں بھائیں کرنے لگا۔

"کیا سوچنے لگے انسپکٹر جمشید۔" انہوں نے سلاٹر کا قہقہہ سنا۔ ادھر محمود، فاروق، فرزانہ اور باقی سب کا برا حال تھا۔ مین بھنڈارا البتہ پوری دلچسپی سے اس منظر میں گم تھے۔

"کیا خیال ہے انسپکٹر۔ کیا میں پاؤں تمہاری کمر پر سے ہٹا لوں۔"

"نہیں۔ اگر میں تمہاری گرفت سے خود آزاد نہ ہو سکا تو ہرگز نہ اٹھانا۔ پھر میرا مر جانا ہی بہتر ہوگا۔" وہ بولے۔

"تب پھر زور لگاؤ۔ تمہارے سینے پر کوئی فولادی ستون نہیں ہے کہ اٹھا نہ سکو۔ صرف میرا پیر ہے۔" سلاٹر نے کہا۔

"لو سنبھلو۔ میں زور لگانے لگا ہوں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"زور تو تم پہلے بھی لگا چکے ہو۔" سلاٹر نے ہنس کر کہا۔

"ہاں، لیکن ابھی میں نے ایڑی چوٹی کا زور نہیں لگایا تھا۔ وہ اس بار لگاؤں گا۔ اور تم جمے نہیں رہ سکو گے، انشاء اللہ۔" انہوں نے کہا اور خدا کو یاد کرتے ہوئے زور لگانا شروع کیا۔ ان کی حیرت کا کوئی ٹھکانا نہ رہا جب انہوں نے خود کو اوپر اٹھتے محسوس کیا۔ دوسری طرف سلاٹر بھی حیران تھا۔ چند انچ اٹھتے ہی انہوں نے بائیں طرف پلٹنی کھائی۔ اور سلاٹر دھڑام سے گرا۔ فوراً ہی اٹھا اور کچھ فاصلے پر پہنچتے ہوئے بولا:

"یہ بات میرے لیے حیران کن ہے۔ آج تک کوئی بھی میرے پیر کے نیچے سے نہیں نکلا تھا۔"

"آپ کا پیر۔ ہاتھی کا پیر تو نہیں ہے۔" آفتاب نمبر دو نے بوکھلا کر کہا اور وہ مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔

"ہاتھی کیا چیز ہے۔" اس نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

"ہاتھی ایک سونڈ والا جانور ہوتا ہے۔ شاید آپ نے چڑیا گھر

کی سیر نہیں کی۔ یا پھر آپ کے ملک کے چڑیا گھر میں ہاتھی ہوگا ہی نہیں۔" فاروق جلدی جلدی بولا۔

"میرا وار سنبھالو انسپکٹر جمشید۔ اگر تم یہ وار بھی سہہ گئے تو میں سمجھوں گا۔ آج واقعی کسی سے پالا پڑا ہے۔"

"تو ابھی آپ کو کسی سے پالا ہی نہیں پڑا۔" آفتاب نمبر ایک حیران ہو کر بولا۔

"تم دونوں کو ایسے میں بھی چین نہیں۔ خدا کے لیے خاموش رہو۔" فرزانہ جل بھن کر بولی۔

"ہم لڑنے والوں کا دل بہلا رہے ہیں۔" فاروق نے مسکرا کر کہا۔

"انہیں اس وقت دل بہلاوے کی نہیں، حوصلے کی ضرورت ہے۔" فرحت نے تلملا کر کہا۔

"تو پھر دے آؤ جا کر۔ ہم نے کوئی اعتراض کیا ہے۔" آفتاب نے بھی بھنا کر کہا۔

اتنے میں سلاٹر ایک بار پھر حرکت میں آ چکا تھا۔ لیکن اس کا انداز عجیب سا تھا۔ وہ پُر سکون انداز میں ان کی طرف چند قدم بڑھا، پھر اچانک نیچے گرا اور ان کی طرف لڑھکنیاں کھا گیا، یہاں تک کہ انسپکٹر جمشید کی ٹانگوں سے ٹکرایا۔ وہ سنبھل بھی نہ سکے۔ کیونکہ وہ تو حیران ہی ہوتے رہ گئے کہ یہ سلاٹر کرتب کیا کر رہا ہے۔ یہاں تک کہ وہ ان سے ٹکرا گیا۔ وہ ایک بار پھر گرے۔

اور کچھ اس طرح گرے کہ سنبھلنے سے پہلے سلاٹر ان کے اوپر تھا۔ دوسرے ہی لمحے اس نے ان کے سر کے بال پکڑ لیے۔ اوپر کی طرف جھٹکا جو دیا تو ان کا منہ اوپر اٹھ گیا۔ وہ ان کی کمر پر سوار تھا اور بالکل اس طرح بیٹھا تھا جیسے گھوڑے پر بیٹھتے ہیں۔

"کیوں انسپکٹر۔ یہ یادگار مقابلہ ہی ہے نا۔"

انسپکٹر جمشید کے منہ سے کوئی لفظ نہ نکل سکا۔ وہ خود کو بہت تکلیف میں محسوس کر رہے تھے۔ سلاٹر نے بال کچھ اس بُری طرح پکڑ رکھے تھے کہ کوئی اور ہوتا تو اس کے منہ سے چیخوں کا طوفان اُبل پڑتا، لیکن انہوں نے ابھی تک ایک سسکاری تک نہیں لی تھی۔

اب سلاٹر بالوں کو اور اوپر کھینچ رہا تھا۔ انسپکٹر جمشید دونوں ہاتھوں کو کئی بار سلاٹر کے جسم تک لانے کی کوشش کر چکے تھے، لیکن ابھی تک انہیں کوئی کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ کیونکہ جونہی ان کے ہاتھ ان کی گردن تک پہنچنے لگتے۔ وہ بالوں کو اور بھی زور سے جھٹکا دیتا۔ اور مارے تکلیف کے ان کے ہاتھ پھر نیچے گر جاتے۔

ان کے ساتھیوں کا حال بُرا تھا۔ ایسے میں مسٹر مین بھنڈارا نے کہا:

"کیا خیال ہے انسپکٹر جمشید کے ساتھیو۔ کیا تم میں سے کوئی ان کی مدد کو جانا چاہتا ہے؟"

"نہیں۔ جب مقابلہ ایک اور ایک کا ہے تو ہم میں سے کوئی کس طرح جا سکتا ہے۔" محمود نے پُرسکون آواز میں کہا۔

"خوب۔ تم لوگ بھی ہو پکے۔" مسٹر مین بھنڈارا نے کہا۔

اچانک انہوں نے انسپکٹر جمشید کی ٹانگوں کو اوپر اٹھتے دیکھا اور وہ حیران رہ گئے۔ دم سادھ لیے، کیونکہ انسپکٹر جمشید اگر سیدھے ہوتے تو کبھی کے اپنی ٹانگوں کو استعمال کر چکے تھے۔ اوندھے منہ لیٹے ہونے کی وجہ سے ٹانگوں کو استعمال کرنا کافی مشکل تھا، لیکن اب جب کہ وہ ہاتھوں سے کام نہیں لے پا رہے تھے۔ انہوں نے ٹانگوں کو حرکت دینا شروع کی۔ ان کے ساتھی آنکھیں پھاڑے اس منظر کو دیکھ رہے تھے، ایسے میں مسٹر مین بھنڈارا کی آنکھوں میں بھی حیرت نظر آئی۔

عین اسی وقت ان کی ٹانگیں سلاٹر کے سر تک پہنچ گئیں، پھر دونوں پیر اس کی گردن پر پھیل آئے۔ اس کوشش میں انہیں خود کو تقریباً دوہرا کرنا پڑا۔ اور پھر دونوں پیروں نے سلاٹر کی گردن دبوچ لی۔ یہ منظر سب کے لیے حیران کن تھا۔ سلاٹر کے چہرے پر پہلی بار بوکھلاہٹ کے آثار نظر آئے۔ شاید وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ الٹے ہوتے ہوئے بھی انسپکٹر جمشید اپنے پاؤں اس کی گردن تک لا سکتے ہیں۔

اب صورت حال یہ تھی کہ سلاٹر کے دونوں ہاتھ ان کے سر کے بالوں کو جکڑے ہوئے تھے اور انسپکٹر جمشید کے دونوں پیر اس کی گردن کو دبا بھی رہے تھے اور اوپر کی طرف بھی کھینچ رہے تھے۔ ان حالات میں انسپکٹر جمشید کے ہاتھ حرکت میں آئے۔ اب چونکہ سلاٹر بھی مشکل میں تھا، اس لیے وہ ان کے بالوں کو جھٹکا نہ دے سکا۔ ان کے ہاتھ سلاٹر کے سینے پر آ ٹکے۔ اوپر کی طرف جو دباؤ دیا۔ وہ اچھل گیا۔ بالوں پر سے ہاتھ ہٹ گئے۔ دوسرے ہی لمحے انسپکٹر جمشید زمین سے اٹھ چکے تھے۔ سلاٹر ابھی سنبھلا بھی نہیں تھا کہ اس کی کمر پر ان کی ٹھوکر لگی۔ وہ منہ کے بل گرا۔ گرتے ہی پلٹا۔ ادھر اس کے گرنے پر انسپکٹر جمشید چھلانگ لگا چکے تھے۔ لہٰذا منہ کے بل زمین پر گرے۔ چوٹ تو بہت آئی۔ لیکن زمین پر پڑے رہنے کا مطلب یہ تھا کہ پھر سلاٹر کے شکنجے میں آ جاتے۔ لہٰذا بلا کی تیزی سے لڑھکنی کھا گئے۔ سلاٹر بھی ان پر چھا جانے کے لیے چھلانگ لگا چکا تھا۔ نتیجہ یہ کہ اس بار وہ منہ کے بل گرا۔ انسپکٹر جمشید فوراً اٹھے اور اس کی کمر پر ایک لات رسید کر دی۔ وہ تڑپ کر اٹھا۔ ساتھ ہی دوسرا پاؤں اس کے سینے پر لگا۔ یہ وار ایسے نہیں تھے کہ کوئی برداشت کر سکتا۔ کوئی اور ہوتا تو اب تک لمبا لیٹ چکا ہوتا، لیکن سلاٹر نہ جانے کس ہڈی کا بنا تھا۔ یہ وار آسانی سے سہہ گیا۔ تیسری مرتبہ جو انسپکٹر جمشید نے پاؤں اس کے سینے پر مارنا چاہا، اس نے دونوں ہاتھوں سے پکڑ

کر چکر دے ڈالا۔ انسپکٹر جمشید ایک پاؤں پر چکرائے اور سنبھل نہ سکے، لیکن گرنے کے ساتھ ہی پاؤں کو جھٹکا دیا، وہ سلاٹر کی گرفت سے نکل گیا۔

مقابلہ ابھی تک زور شور سے جاری تھا۔ دونوں کے دم خم بدستور تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی بھی شکست کھانے کے لیے تیار نہیں۔ اور تیار ہوتا بھی کیسے۔ شکست کا دوسرا نام اس جگہ موت تھا۔

"مقابلہ کچھ لمبا ہو گیا، لیکن دلچسپی میں ذرا کمی نہیں ہوئی۔" مسٹر عین بھنڈارا نے تبصرہ کیا۔

"آپ کیا چاہتے ہیں۔ مقابلہ مختصر ہو جائے۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"نہیں۔ مجھے تو بہت مزا آ رہا ہے۔ مقابلہ ختم ہو جانے کی صورت میں مزا بھی ختم ہو جائے گا۔ لہٰذا میں تو چاہتا ہوں، یہ مقابلہ گھنٹوں جاری رہے۔" عین بھنڈارا نے کہا۔

"لیکن جناب۔ عین۔ غغ۔ صاحب۔" آفتاب نمبر دو عین غین صاحب کہتے کہتے رُک گیا۔

"غغ کیا۔" عین بھنڈارا نے اسے گھورا۔

"یہ کہ گھنٹوں کھڑے کھڑے تو ہم سوکھ جائیں گے۔"

"تو بیٹھ کر مقابلہ دیکھ لو۔ میں نے تمہیں بیٹھنے سے منع تو کیا نہیں۔"

"شکریہ۔ پہلے ہی بتا دیا ہوتا۔ ہم یونہی تھکتے رہے۔" فاروق نے منہ بنایا۔ اور ان میں سے کئی بیٹھ گئے۔

ادھر انسپکٹر جمشید اور سلاٹر میں تابڑ توڑ مقابلہ شروع ہو گیا تھا۔ سلاٹر نے ایک دھواں دھار مکا ان کی ٹھوڑی پر بلا کی تیزی سے مارا۔ وہ بھی بجلی کی طرح گھومے اور وار بچاتے ہوئے اپنا مکا اس کی ناک پر دے مارا۔ سلاٹر ناک کو بچانے کے لیے غوطہ کھا گیا۔ لیکن انسپکٹر جمشید نے ٹانگ آگے کر دی۔ اور وہ منہ کے بل گرا۔ چاپ بیٹھنے کی بجائے۔ انسپکٹر جمشید اسی طرح کھڑے رہے، جونہی سلاٹر اٹھا۔ انہوں نے ایک دوہتڑ اس کے سر پر رسید کر دیا اور وہ دھپ سے گرا۔ اس کا منہ خاک آلود ہو گیا۔ دونوں ہاتھوں کے بل پر پھر اُٹھنا چاہا تو کمر پر لات لگی اور وہ پھر گرا۔ اس بار اٹھنے کی بجائے پلٹنی کھا گیا اور ان کے وار سے بچنے کے لیے لڑھکنیاں کھانے لگا، انسپکٹر جمشید بھی اس کے ساتھ ساتھ چھلانگیں لگاتے چلے گئے۔ اچانک وہ درخت سے ٹکرایا۔ اسے ایک زبردست دھکا لگا اور ان سے آ ٹکرایا۔ انہیں بھی شدید دھکا لگا۔ دونوں گرے اور ایک بار پھر گتھم گتھا ہو گئے۔

"اف خدا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے یہ لڑائی کبھی ختم نہیں ہو گی۔" فرحت کانپ کر بولی۔

"یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ کبھی ختم نہ ہو۔ آخر کسی نہ کسی کو تو شکست اٹھانا ہی ہو گی۔" فرزانہ نے جل کر کہا۔

"میرے تو رونگٹے کھڑے ہو چکے ہیں۔" فرحت بولی۔

"بہتر ہو گا کہ انہیں بٹھا دو۔ بلکہ سلا دو۔" آفتاب نمبر ایک بولا۔

"ارے۔ یہ کیا۔" اچانک محمود چلا اٹھا۔

سب کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ سلاٹر نے نہ جانے جسم کے کس حصے کے ساتھ چپکا ہوا ایک بڑا سا خنجر نکال لیا تھا اور اب اسے تولتا ہوا انسپکٹر جمشید کی طرف بڑھ رہا تھا۔

"مسٹر سلاٹر۔ یہ کیا۔" عین بھنڈارا نے گویا اعتراض کیا۔

"جنگ میں سب کچھ جائز ہے۔"

"لیکن اس طرح طاقت کا توازن بگڑ جائے گا۔ یا تو ایک خنجر انسپکٹر جمشید کے ہاتھ میں بھی ہو۔"

"سوری۔ میں اتنا با اُصول نہیں۔" سلاٹر نے انکار میں سر ہلایا۔

"کوئی بات نہیں مسٹر عین بھنڈارا۔ آپ فکر مند نہ ہوں۔"

"لیکن اگر میں چاہوں۔ تو سلاٹر خنجر استعمال نہیں کر سکتا۔" مسٹر عین بھنڈارا نے کہا۔

"نہیں جناب۔ اسے اپنے دل کی حسرت نکال لینے دیں۔"

"اچھا، جیسے تمہاری مرضی۔" عین بھنڈارا نے کندھے اچکائے۔

سلاٹر خنجر تولتے ہوئے ان پر جھپٹا اور دل پر وار کیا، وہ جھکائی دے گئے اور گھوم کر اس کی کمر پر ایک ہاتھ رسید کیا۔ اس نے گرتے گرتے بھی خنجر والا ہاتھ گھما ڈالا۔ خنجر کی نوک انسپکٹر جمشید کے شانے کو چھوتی گزر گئی۔ انہیں یوں لگا، جیسے کندھے میں آگ سی لگ گئی ہو۔ سلاٹر گر چکا تھا۔ انہوں نے کندھے کی پروا نہ کی اور خنجر والے ہاتھ پر پاؤں رکھ دیا۔ اب ان کا پورا وزن اس کی کلائی پر تھا اور وہ بُری طرح چیخ رہا تھا، یہاں تک کہ خنجر اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ انسپکٹر جمشید جھکے اور خنجر اٹھا لیا۔

"مسٹر سلاٹر۔ اب اگر میں چاہوں تو یہ خنجر تمہارے سینے میں اُتار سکتا ہوں۔"

"میرا پھر بھی کچھ نہیں بگڑے گا۔" سلاٹر ہنسا۔

اور انہیں یاد آ گیا۔ ان لوگوں نے تو بلٹ پروف لباس پہن رکھے تھے:

"تب میں خنجر تمہاری آنکھوں میں تو بھونک ہی سکتا ہوں۔"

"ہاں۔ تم ایسا کر سکتے ہو، لیکن تمہیں مہلت ہی کب ملے گی۔" یہ کہتے ہی اس کی لات ان کی کمر پر لگی اور وہ دوسری طرف الٹ گئے۔ تاہم فوراً مڑے۔ اب خنجر ان کے ہاتھ میں تھا۔ سلاٹر بھی اٹھ چکا تھا اور خنجر سے ذرا بھی پریشان نظر نہیں آ رہا تھا۔ ادھر انسپکٹر جمشید کے کندھے سے خون بہہ رہا تھا اور ان کی قمیص اب سُرخ نظر آ رہی تھی۔ انہوں نے خنجر والا ہاتھ تیزی سے لہرایا۔ سلاٹر پیچھے ہٹا۔ وہ آگے کی طرف جھپٹے اور خنجر سے پھر اس پر وار

کیا — وہ اچھل کر اور پیچھے ہٹا۔ یہ آگے بڑھے — اور پھر اچانک نیچے بیٹھ گئے — کیونکہ اسی وقت سلاٹر درخت سے ٹکرایا گیا تھا، لہٰذا اسے دھکا لگنا ضروری تھا — ہوا بھی یہی — سلاٹر ان کے اوپر سے گویا اڑتا ہوا دور جا گرا اور اٹھ نہ سکا — وہ اس کی طرف لپکے — انہیں اپنی طرف آتے دیکھ کر سلاٹر کی آنکھوں میں خوف جاگ اٹھا —

"تم — تم مجھے ہلاک نہیں کر سکتے۔"

یہ کہہ کر اس نے ایک بار پھر اٹھنے کی کوشش کی، لیکن منہ کے بل گرا اور ساکت ہو گیا۔

"کیا یہ مر چکا ہے انسپکٹر جمشید؟"

"پتا نہیں — ابھی دیکھ کر بتاتا ہوں۔" انسپکٹر جمشید اس کی طرف بڑھے —

"ابا جان — ہوشیار — کہیں یہ مکر نہ کر رہا ہو۔"

"فکر نہ کرو۔" وہ بولے — اور اس کے سر کی طرف سے ہو کر دل پر ہاتھ رکھ دیا — دل باقاعدگی سے دھڑک رہا تھا:

"مسٹر مین بھنڈارا — یہ ابھی زندہ ہے۔"

"تب تم اس کا کام تمام کر سکتے ہو۔"

"نہیں جناب — میں اس حالت میں اس پر ہاتھ نہیں اٹھاؤں گا — ہوش میں آنے پر ضرور وار کر سکتا ہوں۔"

"لیکن ہم کب تک اس کے ہوش میں آنے کا انتظار کر سکتے ہیں۔"

"تب اسے اس کے حال پر چھوڑ دیں۔"

"یہ کس طرح ہو سکتا ہے مسٹر جمشید — یہ تمہارا بہت بڑا دشمن ہے اور تم اسے زندہ چھوڑے دے رہے ہو۔"

"ہاں — یہ میرا دشمن ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ یہ آپ کا دشمن ہے یا دوست۔" انسپکٹر جمشید چبھتے ہوئے انداز میں بولے۔

"پہلے اس سے نبٹ لو، پھر بات کرنا — وہ پھر اٹھ رہا ہے۔"

"ارے نہیں —" انسپکٹر جمشید چونک کر اس کی طرف مڑے — اس طرح کہ خنجر کی نوک کا رخ اسی کی طرف تھا — ادھر وہ اندھا دھند ان پر چھلانگ لگا چکا تھا — اور پھر بغیر کسی کوشش کے خنجر اس کی گردن میں ترازو ہو گیا — وہ گر کر بری طرح تڑپنے لگا۔

"اف خدا — تو یہ ہے انجام سلاٹر کا۔" فرحت کانپ کر بولی۔

"تو اور تم کس قسم کا انجام چاہتی تھیں۔" آفتاب نمبر ایک نے بھنّا کر کہا۔

"کاٹ کھانے کو کیوں دوڑ رہے ہو — اب تو جنگ ختم ہو چکی ہے۔"

"جنگ ختم کہاں ہوئی ہے — ابھی تو مسٹر مین بھنڈارا باقی ہیں، اور ہم ابھی تک نہیں سمجھ سکے — وہ ہمارے دوست ہیں یا دشمن۔" محمود نے کہا۔

"اب اس بات میں کیا شک رہ گیا ہے کہ وہ ہمارے دشمن ہیں۔" آصف نے کہا۔

"لیکن یہ سلاٹر اور اس کے ساتھیوں کے دوست بھی تو نہیں تھے۔" اشفاق نے کہا۔

"ہاں، یہ ان کے بھی دشمن تھے — گویا انہوں نے ہمارے ذریعے اپنے تین خطرناک ترین دشمنوں سے نجات حاصل کی ہے۔" اخلاق نے کہا۔

"ان سے اور تم سے نجات حاصل کرنا میرے لیے ذرا بھی مشکل نہیں تھا — میں تو بس ذرا لطف اندوز ہونا چاہتا تھا — اب جبکہ خوب اچھی طرح لطف اندوز ہو چکا ہوں — تم لوگوں سے رخصت ہوتا ہوں۔" اس نے ہنس کر کہا۔

"رخصت ہوتے ہیں — یہ کیا بات ہوئی — ابھی تو آپ نے کچھ بھی نہیں بتایا — راز سے پردہ تک نہیں اٹھایا — اور پھر رخصت ہوتے وقت ہمیں کس کے حوالے کر کے جا رہے ہیں — ہم یہاں کیا کریں گے — کہاں جائیں گے۔" فاروق نے ہونقوں کی طرح کہا۔

"کہیں جانے کی ضرورت ہی کیا ہے — یہ درخت تم لوگوں کو کہیں جانے دیں گے ہی نہیں — لہٰذا اب تم جب تک زندہ ہو، درختوں کے ان دائروں کے درمیان رہو گے — یہاں تک کہ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر ختم ہو جاؤ گے — انسپکٹر جمشید — تم بھی سلاٹر کی لاش کے ساتھ اپنے ساتھیوں سے الگ ہی رہ لو — میں چلا۔"

یہ کہہ کر مین بھنڈارا مڑا —

"ارے — ارے — مسٹر مین بھنڈارا — یہ کیا بات ہوئی — کچھ تو بتاتے جائیے — آپ ہمیں الجھن کے عالم میں مارنے پر کیوں تل گئے ہیں۔" آصف نے بوکھلا کر کہا۔

"سوری — تم لوگ بار بار بچ جاتے ہو — اور پھر حاصل کی ہوئی معلومات سے فائدہ اٹھا لیتے ہو — اس مرتبہ تمہیں کچھ بھی نہیں بتایا جائے گا — تم یونہی تڑپ تڑپ کر مر جاؤ گے۔"

وہ مڑا — اور قدم اٹھانے لگا — انہوں نے دیکھا — اس کے گرد درختوں کا دائرہ اس کے ساتھ ساتھ بڑھ رہا تھا —

☆ ☆ ☆

"لیجیے — مسٹر مین بھنڈارا تو چل دیے ہمیں چھوڑ کر۔" آفتاب نے گنگنانے کے انداز میں کہا۔

"اور یہ درخت ہماری جان چھوڑتے نظر نہیں آتے۔" فاروق نے کہا —

"کیوں نہ ہم ان درختوں سے درخواست کریں۔" آفتاب نمبر دو نے کہا —

"درختوں سے درخواست — تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا۔" آصف بھنّا اٹھا —

"ان حالات میں دماغ نہیں چلے گا تو اور کیا چلے گا۔" محمود مسکرایا۔

"آپ لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میرا دماغ چلنے پھرنے کا عادی نہیں۔" آفتاب نمبر دو نے مسمی صورت بنائی۔

"تو کیا گھاس چرنے کا عادی ہے۔" فرحت مسکرائی۔

"دیکھیے۔ میں انسان ہوں۔ گدھا یا گھوڑا نہیں۔" آفتاب نے اسے گھورا۔

"ہاں واقعی۔ بُری بات ہے فرحت۔" فرزانہ نے اسے ڈانٹا۔

"آپ لوگ پنجے جھاڑ کر ہمارے بھائی کے پیچھے پڑ گئے۔ کچھ تو خیال کیجیے۔ ہم پہلی بار آپ کے ساتھ مہم میں شریک ہو رہے ہیں۔" اشفاق نے بُرا سا منہ بنایا۔

"کوئی بات نہیں اشفاق۔ بُرا مت مانو۔" شوکی نے کہا۔

"کیوں نہ مانوں بُرا۔" اشفاق، شوکی پر اُلٹ پڑا۔

"اچھا تو پھر مان لو۔ جتنا بُرا ماننا چاہو، مان لو۔" اخلاق نے کندھے اچکائے۔

"شاید ہم یہ سوچنے چلے تھے کہ ان درختوں کے جھنجٹ سے کس طرح نکلیں۔" انسپکٹر جمشید نے تنگ آ کر کہا۔ انہوں نے اپنا ہاتھ کندھے کے زخم پر رکھ لیا تھا۔ وہ درختوں کے دائرے کی وجہ سے ان سے دور ہو گئے تھے۔

"افسوس، اباجان۔ ہم آپ کے کندھے پر پٹی بھی نہیں کر سکتے۔" محمود بولا۔

"فکر نہ کرو۔ زخم گہرا نہیں ہے۔ خون رُک گیا ہے۔" وہ بولے۔

"ہاں، تو ہم درختوں سے درخواست کرنے چلے تھے، یہ درخواست فاروق کرے گا، کیونکہ درخواست کرنے میں اسے بہت مہارت ہے۔" خان رحمان نے اعلان کرنے والے انداز میں کہا۔

"آپ بھول رہے ہیں انکل۔ میں درخواست کرنے میں نہیں۔ درختوں پر چڑھنے میں بہت ماہر ہوں۔"

"تب پھر۔ درخواست کون کرے گا؟"

"شوکی۔" انسپکٹر کامران مرزا مسکرائے۔

"ہاں ٹھیک ہے۔ چلو شوکی۔ درختوں سے درخواست کرو۔ کیا خبر یہ تمھاری سن ہی لیں۔"

"نہیں بھائی جان۔ درختوں سے درخواست نہ کیجیے گا۔ ہاں، اللہ تعالیٰ سے ضرور درخواست کریں۔" اشفاق بول اٹھا۔

"یہ بھی درست ہے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"اے اللہ میاں۔" شوکی نے آسمان کی طرف دیکھا۔ "ان عجیب و غریب قسم کے درختوں سے ہمیں نجات دے۔ ان کا بیڑہ غرق کر انہیں تہس نہس کر دے۔ تو ان میں آگ لگا دے۔ تاکہ یہ جل کر راکھ ہو جائیں اور ہم ان کے درمیان سے نکل جائیں۔" شوکی گھبرائے ہوئے لہجے میں دعا مانگتا چلا گیا۔

"اف توبہ۔ کس قدر غلط دُعا مانگ لی۔ اب اگر اللہ تعالیٰ نے تمہاری دُعا قبول کر لی تو۔" محمود نے گھبرا کر کہا۔

"کیا مطلب۔ غلط دُعا مانگ لی۔" شوکی نے بوکھلا کر کہا۔

"ہاں، اگر درختوں کو آگ لگ گئی تو ساتھ میں ہم بھی تو جل کر بھسم ہو جائیں گے۔"

"اوہ۔ تب تو غلط دُعا کے جواب میں درست دعا مانگنا ہو گی۔ یا اللہ۔ درختوں کو آگ لگنے سے بچا لے۔ اور ہمارے نکلنے کی کوئی اور تدبیر سجھا دے۔" اس نے جلدی جلدی کہا۔

"بس رہنے دو۔ تم لوگ مانگ چکے دُعا۔ ارے بھئی۔ خالی دعاؤں سے کام نہیں چلا کرتا۔ اگر ایسا ہوتا تو ہمارے نبی کریم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کیا ضرورت تھی، جنگیں لڑنے کی اور اللہ کو ایک منوانے کے سلسلے میں پتھر کھانے کی۔ بس دُعا مانگ لیتے اور سارے کام ہو جاتے۔" انسپکٹر جمشید جلدی جلدی کہتے چلے گئے۔

"ہوں، بات تو ٹھیک ہے۔ تو پھر سب لوگ مل کر کوئی ترکیب سوچیں کہ آخر ہم ان کے درمیان سے کس طرح نکل سکتے ہیں اور ساتھ میں دُعا بھی کریں۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"ترکیب ہم سب مل کر کیوں سوچیں۔ جب کہ فرزانہ اور فرحت نے اس کام کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔ اور یہ ٹھیکہ کسی اور کے نام چھوٹ جائے۔ یہ ان سے برداشت ہی نہیں ہو سکتا۔"

"ٹھیک ہے۔ فرزانہ اور فرحت تو غور کریں گی ہی، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ دوسرے اپنے ذہنوں کے گھوڑے دوڑانے کی کوشش ہی نہ کریں۔"

وہ سب سوچ میں گم ہو گئے۔ آخر فرزانہ نے ہی سر اٹھایا اور مسکرا کر بولی:

"اجازت ہو تو میں ایک عدد ترکیب داغ دوں۔"

"ضرور۔ کیوں نہیں۔ ہم تو پہلے ہی جانتے تھے۔ یہ میدان تم ہی مارو گی۔" محمود نے کہا۔

"لیکن میرا خیال تھا کہ فرحت جیتے گی۔" فاروق بولا۔

"فکر نہ کرو فاروق۔ میں بھی ترکیب بتاؤں گی۔" فرحت کی آواز سنائی دی۔

"ویری گڈ۔ یہ ہوئی نا بات۔ اب تم دونوں کی ترکیبوں کا بھی مقابلہ کرایا جائے گا۔" آفتاب نمبر ایک نے خوش ہو کر کہا۔

"تت۔ ترکیبوں کا مقابلہ۔" شوکی ہکلایا۔

"ایک ترکیبوں کا ہی کیا۔ یہاں تو کسی بھی چیز کا مقابلہ ہو سکتا ہے۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"وقت ضائع کر رہے ہو تم سب۔ ہاں فرزانہ، جلدی بتاؤ تم نے کیا سوچا ہے۔"

"اباجان۔ تجربے کے طور پر آپ سلاٹر کی لاش کو اٹھا کر ایک درخت پر زور سے دے ماریں۔"

"اس سے کیا ہو گا؟" انہوں نے حیران ہو کر کہا۔

"درخت اسے اسی طاقت سے دھکا دے گا اور ہو سکتا ہے،"

وہ دوسرے درخت سے جا ٹکرائے۔اس ٹکراؤ سے کچھ نتیجہ نکل ہی سکتا ہے۔"

"ہوں، ترکیب دل کو لگتی ہے۔تجربہ کر دیکھنے میں کوئی حرج نہیں۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"فرزانہ کی ترکیب اور دل کو نہ لگے۔یہ کیسے ہو سکتا ہے۔۔۔" فاروق نے جھنا کر کہا۔

"اس سے پہلے کہ ہم فرزانہ کی ترکیب پر عمل کریں۔کیوں نہ فرحت بہن کی ترکیب بھی سُن لی جائے۔" اخلاق نے مشورہ دیا۔

"ہاں، یہ بھی ٹھیک ہے۔۔فرحت۔تم کیا کہتی ہو۔"

"ہم اس خنجر کو کام میں لا سکتے ہیں۔" اس نے کہا۔اشارا اس خنجر کی طرف تھا۔جو سلاٹر نے انسپکٹر جمشید پر نکال لیا تھا۔اب وہ ان کے پاس تھا۔

"تمہارا شاید دماغ چل گیا ہے۔بھلا ہم خنجر سے کیا کام لے سکتے ہیں۔ان درختوں کو کاٹنے سے تو رہے۔اس طرح بھی دھکا ضرور لگے گا۔" آفتاب نمبر ایک نے منہ بنایا۔

"اور نہ اسے دشمن پر تان کر اپنا حکم منوا سکتے ہیں۔" فاروق نے جلدی سے کہا۔

"واقعی فرحت۔تم سے ایسی ترکیب کی امید نہیں تھی۔" آصف نے مایوسانہ لہجے میں کہا۔

"تو پھر کیسی ترکیب کی امید تھی۔" اس نے جھنا کر کہا۔

"زور دار۔پھڑک دار۔جیسی ترکیب فرزانہ نے بتائی ہے۔" آفتاب نمبر دو نے کہا۔

"بھئی پہلے اس بے چاری کو مکمل طور پر ترکیب بتا تو لینے دو۔" انسپکٹر کامران مرزا تلملائے۔

"ارے۔تو کیا اس نے ابھی ترکیب مکمل طور پر نہیں بتائی۔" شوکی نے حیران ہو کر کہا۔

"نہیں۔ابھی تو اس نے صرف یہ کہا ہے کہ ہم خنجر سے بھی کام لے سکتے ہیں۔کیا کام لے سکتے ہیں، یہ بتانے کی تم لوگوں نے اسے مہلت ہی نہیں دی۔ایسا بھی کیا۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"اوہ۔واقعی۔اچھا خیر۔اب مہلت دیتے ہیں۔فرحت۔مہربانی فرما کر ترکیب مکمل طور پر بتا دو۔"

"ابھی نہیں بتاؤں گی۔پہلے فرزانہ کی ترکیب پر عمل کر کے دیکھ لیا جائے۔" فرحت نے غصیلے لہجے میں کہا۔

"اوہو۔فرحت بہن کو تو شاید غصہ آ گیا۔" اشفاق نے جلدی سے کہا۔

"شاید نہیں۔مجھے یقیناً غصہ آ رہا ہے۔"

"تب ٹھیک ہے۔فرحت کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لیے پہلے اسی کی ترکیب پر عمل کر لیا جائے۔" محمود بولا۔

"عمل تو اس وقت کیا جا سکتا ہے۔جب وہ پوری طرح بتلائے۔آخر ہم اس خنجر کو کیا کریں۔کیا چاٹیں۔" آصف بولا۔

"پیچھے۔اب خنجر بھی چاٹے جانے لگے۔بھئی کیوں اپنی زبان کے پیچھے پڑے ہو۔" آفتاب نمبر ایک مسکرایا۔

"ہاں اور کیا۔پیچھے ہی پڑنا ہے تو ان کی زبانوں کے پیچھے پڑیں۔" اخلاق نے فوراً کہا۔

"میرا خیال ہے۔ہم دُور نکل گئے۔میں سلاٹر کی لاش کو اٹھا کر درخت پر مارنے لگا ہوں۔" یہ کہہ کر انسپکٹر جمشید لاش پر جھکے۔

"اگر سلاٹر زندہ ہوتا تو کبھی اپنی لاش کے ساتھ یہ سلوک نہ کرنے دیتا۔" فاروق نے افسوس زدہ لہجے میں کہا۔

"کیا کہہ رہے ہیں۔" اشفاق نے پھاڑ کھانے والے لہجے میں کہا۔

"کیوں۔کیا میں کچھ غلط کہہ گیا ہوں۔" اس نے حیران ہو کر کہا۔

"کچھ نہیں۔بالکل غلط۔سلاٹر زندہ ہوتا تو اس کی لاش کہاں سے آ جاتی۔" آفتاب نمبر دو نے جھنا کر کہا۔

"اوہ۔ارے۔ہائیں۔اس بات کا تو مجھے خیال ہی نہیں رہا۔" فاروق نے گڑبڑا کر کہا۔

"معلوم ہو گیا۔تم ڈھنگ کی بات سوچ ہی نہیں سکتے۔" فرزانہ نے اسے گھورا۔

اتنے میں انسپکٹر جمشید سلاٹر کو دونوں ہاتھوں پر بلند کر چکے تھے۔دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے لاش کو درختوں پر دے مارا۔اور خود فوراً ایک طرف ہٹ گئے۔لاش درخت سے ٹکرائی۔ایک زور دار کڑاکا ہوا۔اور پھر لاش گویا ہوا میں اڑتی ہوئی سامنے کے درخت سے ٹکرا گئی۔اور پھر نہ اچھل سکی، کیونکہ بُری طرح شاخوں سے اُلجھ گئی تھی۔۔۔

"یہ۔یہ تو کچھ بھی نہ ہوا۔" آفتاب نمبر دو نے مایوسانہ لہجے میں کہا۔

"ہاں، واقعی۔فرزانہ کی ترکیب بے کار گئی۔اور شاید پہلی مرتبہ ہوا۔" محمود نے کہا۔

"نہیں محمود۔ایسی تو کوئی بات نہیں۔پہلے بھی میری ترکیبیں ناکام ہوتی رہی ہیں۔" فرزانہ نے خوش دلی سے کہا۔

"فرحت۔تم بتاؤ۔تم نے کیا سوچا تھا۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"یہ کہ ہم اس خنجر سے کسی درخت کو کاٹنا شروع کر دیں۔" فرحت کی بجائے اشفاق بولا۔

"نہیں۔فرحت اتنی بے وقوفانہ بات نہیں سوچ سکتی۔" آصف جھلا کر بولا۔

"انکل۔اس خنجر کے ذریعے ہم ایک سرنگ کھود سکتے ہیں۔یہ سرنگ ان درختوں کے دائرے سے باہر نکلنی چاہیے۔اس طرح ہم درختوں سے ٹکرائے بغیر باہر نکل سکیں گے۔" فرحت پُرجوش لہجے میں کہتی چلی گئی۔

"اف خدا۔اتنی زوردار ترکیب۔فرحت اس مرتبہ تو تم میرے بھی کان کاٹ گئیں۔" فرزانہ نے خوش ہو کر کہا۔

"ارے باپ رے۔تن۔نہیں تو۔" فرحت نے بوکھلا کر فرزانہ

کے کانوں کو ٹٹولا، پھر سکون کا سانس لے کر بولی:

"صحیح سلامت تو ہیں ــ دونوں کان۔"

"لیکن ــ فرحت کی ترکیب آسان نہیں ــ خنجر اس وقت میرے پاس ہے ــ میں اکیلا اس دائرے میں پھنسا ہوا ہوں ــ اگر خنجر آپ لوگوں کے پاس ہوتا تو آپ لوگ باری باری زمین کھود سکتے تھے ــ میں اکیلا تو اس کام میں بہت دیر لگا دوں گا۔" وہ بولے۔

"تب پھر ــ کیا کیا جائے؟"

"کیوں نہ میں یہ خنجر تم لوگوں کی طرف اچھال دوں۔"

"لیکن درخت اسے واپس لوٹا دیں گے ــ جس طرح لاش ــ" انسپکٹر کامران مرزا نے اعتراض کیا۔

"ہاں ــ یہ بات بھی ٹھیک ہے۔"

"اس کی آسان ترکیب میں بتائے دیتی ہوں۔" فرزانہ نے پُر جوش لہجے میں کہا۔

"شکر ہے ــ تم اب بھی ترکیب بتانے کے قابل ہو، میں تو سمجھا تھا ــ"

"بس بس رہنے دو جو کچھ تم سمجھے تھے ــ پہلے فرزانہ کی ترکیب سُن لو۔" انسپکٹر کامران مرزا نے آفتاب کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"ابا جان ــ آپ پہلے ایک چھوٹی سی سرنگ ہمارے دائرے تک بنائیں ــ اس طرح ہم ایک جگہ جمع ہو جائیں گے۔"

"میرا خیال ہے ــ یہ ترکیب مناسب رہے گی۔" خان رحمان نے بہت دیر بعد منہ کھولا۔

"شکر ہے انکل آپ کی بھی آواز سنائی دی۔"

"جہاں اتنے بہت سے بولنے والے جمع ہو جائیں اور ان بہت سے بولنے والوں میں فاروق اور آفتاب جیسے بھی شامل ہوں تو دوسروں کو بولنے کے مواقع بہت کم ملا کرتے ہیں۔" پروفیسر داؤد نے مسکرا کر کہا۔

"لیجیے ــ پروفیسر انکل نے اپنی موجودگی کا ثبوت بھی دے دیا۔" فاروق نے چہک کر کہا۔

"اچھا تو میں سرنگ بنانے لگا ہوں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"ٹھیک ہے۔" انہوں نے ایک ساتھ کہا۔

انسپکٹر جمشید خنجر لے کر زمین پر جھٹ گئے ــ جلد ہی وہ بولے:

"ارے ــ یہ تو بہت ہی نرم زمین ہے ــ سرنگ بنانے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔"

"یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔" شوکی نے خوش ہو کر بولا۔

وہ انسپکٹر جمشید کو زمین کھودتے اور کھود کر مٹی باہر نکالتے دیکھتے رہے ــ اچانک ٹھک کی آواز آئی ــ انہوں نے انسپکٹر جمشید کو چونکتے دیکھا:

"ارے ــ یہ کیا ــ"

سب بے چین ہو کر ان کی طرف دیکھنے لگے ــ ادھر وہ کھدی ہوئی جگہ کا بغور جائزہ لے رہے تھے ــ پھر وہ سیدھے ہوتے نظر آئے ــ ان کا چہرہ ستا ہوا تھا ــ انہوں نے سُنا ــ وہ کہہ رہے تھے:

"نہیں ــ ہم سرنگ کھودنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔"

☆ ☆ ☆

چند لمحے کے لیے موت کی سی خاموشی چھائی رہی، آخر خان رحمان کی آواز اُبھری۔

"لیکن کیوں جمشید ــ ہم سرنگ کیوں نہیں کھود سکتے۔"

"اس لیے کہ نیچے زمین بہت سخت ہے۔" وہ بولے۔

"سخت ہے ــ کیا نیچے چٹانیں ہیں۔" انسپکٹر کامران مرزا حیران ہو کر بولے ــ

"نہیں، بلکہ سیمنٹ کیا ہوا ٹکڑا نظر آ رہا ہے۔" ان کے منہ سے نکلا ــ

"کیا مطلب ــ زمین کے نیچے سیمنٹ ــ" وہ سب بول اٹھے ــ چہروں پر حیرت کے آثار دوڑ گئے۔

"ہاں ــ ٹھہریں ــ میں کچھ اور زمین کھودتا ہوں، شاید اس طرح کچھ اندازہ لگا سکوں۔"

انہوں نے جلدی جلدی خنجر چلانا شروع کر دیا ــ اور اپنے چاروں طرف کی زمین کھودتے چلے گئے ــ اوپر مٹی بالکل نرم تھی، انہیں ذرا بھی دقت نہیں ہوئی ــ یہاں تک کہ کافی گولائی میں انہوں نے مٹی کھود ڈالی، ساتھ ساتھ ہاتھوں سے مٹی اٹھا اٹھا کر دور پھینکتے جا رہے تھے ــ آخر انہوں نے کام بند کر دیا اور ان کی طرف مڑتے ہوئے بولے:

"اب میں یہ بات یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ان مصنوعی درختوں کے اس جنگل کے نیچے کوئی بہت بڑی اور پختہ عمارت موجود ہے، جسے جدید ترین سائنسی آلات کے ذریعے بنایا گیا ہے ــ"

"تت ــ تو ــ تو کیا ــ یہی وہ جگہ ہے ــ جہاں ہمارے سائنسدانوں کو رکھا گیا تھا۔" محمود ہکلایا۔

"اس کے علاوہ کیا کہا جا سکتا ہے۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"کیوں انکل غوری صاحب ــ آپ کو کچھ یاد پڑتا ہے ــ یہیں لائے گئے تھے آپ ــ"

"ہمیں ہوش و حواس کی حالت میں تو لایا ہی نہیں گیا تھا ــ ہم تو اس وقت گہری نیند میں تھے ــ شاید ہمارے کھانے میں کوئی نیند طاری کر دینے والی چیز شامل کی گئی ہو گی ــ"

"چلیے ــ اتنا تو بتا دیں کہ اپنے ملک سے آپ لوگ کہاں

پہنچے تھے۔"

"ہم سیدھے مسٹر مین بھنڈارا کے پاس پہنچے تھے۔ انہوں نے ہمیں رات کا کھانا کھلایا، اس کے بعد ہم نے خود کو اسی عمارت میں پایا جس میں ہمیں چھ ماہ تک رکھا گیا۔" پروفیسر عزری بولے۔

"یہ مین بھنڈارا میری سمجھ میں تو آئے نہیں۔ یہ ایک مسلمان ملک کے صدر ہیں۔ اور مسلمان ملکوں کے سائنس دانوں کو اپنے ہاں جمع کیا۔ پھر ایک نامعلوم مقام تک پہنچا دیا۔ اور چھ ماہ تک وہاں رکھا، لیکن سوال یہ ہے کہ ان حالات میں تو انہیں ہماری مدد کرنی چاہیے تھی۔ لیکن ہوا کیا۔ انہوں نے ہمیں سلاٹر، الانیو اور ربے راٹا سے موت اور زندگی کی جنگ لڑنے پر مجبور کر دیا۔ آخر کیوں۔ انہوں نے ایسا کیوں کیا۔ وہ چاہتے کیا ہیں۔ اور اب کہاں غائب ہو گئے ہیں۔"

"شاید اسی عمارت میں ہوں۔ کاش ہم بھی نیچے پہنچ سکتے۔"

"خیر۔ ہمیں سب سے پہلے تو ان درختوں سے نجات حاصل کرنی چاہیے۔ اس کے بعد ہی ہم اس عمارت میں داخل ہونے کی بات سوچ سکتے ہیں۔"

"لیکن درختوں سے کیسے نکلیں ابا جان۔ یہ درخت اتنے شریف اور سیدھے سادے تو ہیں نہیں کہ راستہ دے دیں۔" فاروق نے کہا۔

"بھئی تم بھی ان سے درخواست تو کر کے دیکھو۔ کیا خبر یہ تمہاری بات مان لیں۔" آصف مسکرایا۔

"درخواست کرنا کیا مشکل ہے، لیکن مجھے معلوم ہے یہ صرف مسٹر مین بھنڈارا کا حکم مانتے ہیں۔" فاروق نے اسے گھور کر دیکھا۔

"میں حکم کی نہیں۔ درخواست کی بات کر رہا ہوں۔" آصف نے بھی فوراً کہا۔

"یہ تمہاری بہت پرانی عادت ہے۔ بات بے بات ___ درخواست کرنے لگتے ہو۔" فاروق مسکرایا۔

"اوہو۔ ارے بھئی۔ میں تم سے کہہ رہا ہوں کہ درختوں سے درخواست کرو۔" اس نے برا مان کر کہا۔

"اچھا۔ یہ لو بھئی۔" اس نے آصف کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، پھر درختوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا:

"ارے پیارے درختو ___ تم کتنے اچھے ہو۔ صرف دوسروں کے لیے جیتے ہو۔ دوسروں کو فائدہ پہنچاتے ہو۔ انسان کی طرح نہیں کہ بس ہر وقت، خود غرضی کی باتیں سوچتا رہتا ہے۔ تم نے اور تمہاری تمام نسلوں نے ہمیشہ بنی نوع انسان کی خدمت ہی کی ہے ___ تو اب بھی میری بات سن لو۔ ادھر ادھر ہٹ جاؤ۔ اور ہمیں راستہ دے دو۔ ارے۔ لیکن تم تو مصنوعی درخت ہو۔" وہ کہتے کہتے رک گیا۔

"راستہ لے کر کرو گے کیا۔" ایک درخت سے گھٹی گھٹی آواز آئی۔ وہ چونک اٹھے۔

"لو بھئی۔ درخواست کرنے کا کم از کم اتنا تو فائدہ ہوا کہ درخت بھائی بات چیت تو کرنے لگے۔ امید ہے۔ ہم انہیں رام کر لیں گے۔"

"تو پھر کوشش جاری رکھو۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"جی بہتر۔" اس نے کہا اور اس درخت کی طرف مڑ کر بولا:

"شکریہ اے پیارے درخت۔ تم نے جواب تو دیا۔ ہاں تو تم نے پوچھا ہے کہ ہم راستہ لے کر کیا کریں گے۔ بھئی کرنا کرانا کیا ہے۔ بس ادھر ادھر گھومیں پھریں گے۔ آزادانہ ماحول میں تم سے بات چیت کریں گے۔"

"کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ تم بھٹک بھٹک کر مر جاؤ گے۔" درخت بولا۔

"اوہو۔ بھئی تم لوگ راستہ دے کر دیکھو تو سہی۔ فائدے اور نقصان کی بات بعد میں دیکھی جائے گی۔ ویسے تم بول کیسے لیتے ہو، ہم نے تو کبھی درختوں کو باتیں کرتے نہیں دیکھا۔"

"یہ سوال تم اپنے کسی پروفیسر سے کیوں نہیں کرتے۔"

"اوہ ہاں۔ خیر۔ ان سے تو ہم پوچھ ہی لیں گے۔ تمہاری آواز دراصل بہت ہی بھلی لگ رہی ہے کانوں کو۔ کیا کبھی ہمارے کانوں نے اتنی گھٹی گھٹی آواز سنی ہو گی۔"

"تمہاری چکنی چپڑی باتیں اثر نہیں کریں گی۔ میں ان سے واقف ہوں۔" آواز سنائی دی۔

"گویا۔ تم لوگ ہمیں راستہ نہیں دو گے۔" اس بار فرزانہ نے غصے میں آ کر کہا۔

"نہیں۔ بالکل نہیں۔ تم ایڑیاں رگڑ رگڑ کر بھوکے پیاسے مر جاؤ گے۔" سفاک لہجے میں جواب ملا۔

"ہرگز نہیں۔ ہم وہ نہیں ہیں جو ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جاتے ہیں۔ لو دیکھو۔ تم بھی کیا یاد کرو گے۔ میں تم سے ٹکرانے چلی ہوں۔" یہ کہتے ہی فرزانہ نے اس درخت کی طرف دوڑ لگا دی۔

"ارے ارے۔ فرزانہ۔ کیا کر رہی ہو۔ ہوش میں آؤ۔ اس طرح دوڑ کر درخت سے ٹکرانے کا مطلب جانتی ہو تم۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"رک جاؤ فرزانہ۔" انسپکٹر جمشید چلائے۔

لیکن فرزانہ نے جیسے سنا ہی نہیں۔ پورے زور میں درخت سے ٹکرائی۔ درخت نے اسے اچھالا اور وہ دھڑام سے نیچے گری اور ساکت ہو گئی۔ انسپکٹر کامران مرزا اس کی طرف لپکے، ایک لمحے کے لیے اس کی طرف جھکے، پھر چیخ پڑے:

"فرزانہ۔ تمہارے بعد میں بھی جی کر کیا کروں گا۔ لو میں بھی اسی راستے تک آ رہا ہوں۔"

ان الفاظ نے سنسنی پھیلا دی۔ دوسرے ہی لمحے انسپکٹر کامران مرزا ایک درخت پر حملہ آور ہوئے۔ ان کی بھی چیخ نکل گئی۔ دھڑام سے گرنے کے بعد وہ بھی اٹھ نہ سکے۔

"اب ہم سب نہیں رہ سکتے۔ کیا کریں گے ایڑیاں رگڑ کر ___

آؤ۔ سب مل کر درخت پر حملہ آور ہوں۔" خان رحمان بولے۔

"تت۔ تت۔ تم لوگ شاید پاگل ہو گئے ہو۔ ٹھہرو۔ میں تم تک آ رہا ہوں۔ پہلے مجھے ساتھ لے لو، پھر درخت پر حملہ کرنا۔" انہوں نے انسپکٹر جمشید کے الفاظ سنے۔ ساتھ ہی انہوں نے دو درختوں کے درمیان سے نکلنے کے لیے ایک لمبی چھلانگ لگائی۔ لیکن منہ کے بل گرے اور ساکت ہو گئے۔

یہ دیکھ کر کوئی بھی رک نہ سکا۔ سب کے سب مل کر اس درخت کی طرف بڑھے۔ جس سے اب تک آواز آتی رہی تھی، شوکی برادرز اور سائنس دان حضرات تک نہ رہ سکے۔ سب کے سب پاگلوں کے سے انداز میں درختوں سے جا ٹکرائے۔

ایک زور دار کڑاکا ہوا۔ بالکل آسمانی بجلی کی مانند۔ اور وہ بھی لیٹے لیٹ گئے۔

○

آنکھ کھلی تو ان درختوں کا دور دور تک پتا نہیں تھا۔ ان کے جسموں پر پٹیاں بندھی تھیں اور وہ سب ایک بہت بڑے ہال میں موجود تھے۔ ہال بالکل ہسپتال کے کمروں کی طرح تھا۔ بستر ایک ترتیب سے لگے تھے اور یوں لگتا تھا جیسے ماہر ڈاکٹروں نے ان کی مرہم پٹی کی ہے۔

"اوہو۔ ہم تو زندہ ہیں۔ کمال ہے۔" سب سے پہلے فاروق کی چہکتی آواز گونجی۔

"اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔ ہاں، خوشی کی بات ضرور ہے۔" آفتاب نمبر ایک نے بُرا سا منہ بنایا۔

"لیکن میں سمجھتا ہوں کہ حیرت اور خوشی دونوں کی ہی بات نہیں، یہ شاید دوسری دُنیا کے ہسپتال کا کمرہ ہے۔" آفتاب نمبر دو نے کہا۔

"ارے باپ رے۔ تو کیا ہم مر چکے ہیں۔" آصف چونک کر بولا۔

"یہ کمرہ لگتا تو اسی دنیا کا ہے۔" محمود نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔

"لگنے کا کیا ہے۔ کیا خبر دوسری دنیا کی سب چیزیں ہماری دُنیا کی سب چیزوں جیسی ہوں۔" شوکی نے جواب دیا۔

"مجھے تو ایسا لگتا ہے۔ جیسے ہم آسمان سے گر کر کھجوروں میں اٹک گئے ہیں۔" فرزانہ بولی۔

"لیکن وہ درخت کھجوروں کے تو نہیں تھے۔" فرحت نے حیران ہو کر کہا۔

"یہ کیا بات ہوئی۔ میں نے کیا کہا اور تم کیا کہہ رہی ہو، دماغ تو نہیں چل گیا۔" فرزانہ اس پر اُلٹ پڑی۔

"ویسے فرزانہ۔ تمہاری ترکیب تھی بہت زور دار۔" انسپکٹر کامران مرزا مسکرا کر بولے۔

"ترکیب۔ کون سی ترکیب ابا جان۔" آفتاب نے حیران ہو کر کہا۔

"درخت سے ٹکرا کر تقریباً مردہ ہو کر گر پڑنے کی۔ اور پھر جب میں اس پر جھکا تو اس نے آنکھ کا ہلکا سا اشارا کر دیا۔ میں فوراً اس کی ترکیب جان گیا اور پھر میں نے بھی فوراً ہی درخت کی طرف چھلانگ لگا دی۔ فرزانہ کی ترکیب یہ تھی کہ کیوں نہ ہم سب درختوں سے ٹکرا ٹکرا کر بے ہوش ہو جائیں یا بے ہوشی کا ڈراما رچائیں، اس طرح مسٹر عین بھنڈارا کم از کم ہمیں وہاں سے تو اٹھوا ہی لے گا اور کیا خبر زمین کے نیچے بنی اس عمارت میں منگوا لے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ نتیجہ یہ کہ ہم ان درختوں کی قید سے نکل آئے ہیں۔" انہوں نے جلدی جلدی کہا۔

"فرزانہ نے ذرا جلدی کی۔ ہم لوگ ان درختوں سے نجات حاصل کرنے کی ترکیب پر غور کر رہے تھے۔" پروفیسر داؤد بولے۔

"ہاں، اس طرح ہم چوٹیں کھانے سے بچ جاتے۔" پروفیسر غوری بولے۔

"لیکن پروفیسر صاحبان۔ اس طرح ہم نیچے نہیں پہنچ سکتے تھے۔" انسپکٹر کامران مرزا نے اعتراض کیا۔

"خیر۔ جو ہوا درست ہوا۔ کیا آپ لوگ بتا سکتے ہیں۔ یہ وہی عمارت ہے۔ جہاں آپ لوگوں نے چھ ماہ گزارے ہیں؟"

"اس ایک کمرے کو اندر سے دیکھ کر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اگر ہمیں گھومنے پھرنے کی اجازت مل جائے۔ اور ہم تمام حصّوں کو دیکھ لیں تو پھر ضرور اندازہ لگا لیں گے۔"

"تو پھر ہم ابھی دروازہ کھول کر دیکھ لیتے ہیں۔" محمود نے کہا، بستر سے اترا اور دروازے کی طرف بڑھا۔

"دیکھو۔ کہیں پھر چوٹ نہ کھا لینا۔" انسپکٹر جمشید نے خبردار کیا۔

"چوٹ کھائے بغیر تو شاید ہم کچھ بھی نہیں کر سکیں گے ابا جان۔" محمود نے کہا اور دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ ڈال دیا۔ کچھ بھی نہ ہوا، لیکن دروازہ تو باہر سے بند تھا۔

"ہم اب اس کمرے میں قید کر دیے گئے ہیں۔"

"تم لوگ یہاں تک آ ہی گئے ہو تو سیر بھی کر لو گے۔ فکر نہ کرو۔" وہی گھٹی گھٹی آواز سنائی دی۔

"شکریہ مسٹر عین بھنڈارا۔ ہم تو تمہاری آواز کو ترس ہی گئے تھے۔ آخر آپ کہاں ہیں، سامنے آ کر بات کریں نا۔"

"دس منٹ بعد اس کمرے کا دروازہ کھلے گا، پھر تم اس پوری عمارت کی سیر کر سکو گے۔ عجیب ترین بات تمہارے دیکھنے میں یہ آئے گی کہ اس عمارت کی حفاظت کے لیے ایک بھی محافظ موجود نہیں۔ تمہیں بھی یہاں میری مرضی سے لایا گیا ہے۔ ورنہ تم لوگ وہیں درختوں کے درمیان سسک سسک کر مر جاتے۔ اوّل تو ان درختوں کے درمیان سے نکل ہی نہ پاتے اور اگر کسی طرح نکل بھی جاتے تو بھی یہاں تک پہنچنے کا کوئی راستہ تلاش نہ کر سکتے۔ خیر۔ اب تم لوگ تیاری کر لو۔"

"آپ نے کہا ہے مسٹر عین بھنڈارا - کہ یہاں حفاظت کے لیے کوئی محافظ نہیں - تو کیا عمارت اپنی حفاظت خود ہی کرتی ہے"۔ فرزانہ نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ہاں - یہاں کسی محافظ کی ضرورت نہیں۔"

"تب پھر آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟"

"مجھے تو تم لوگوں کی خاطر آنا پڑا - بلکہ تم لوگوں کی وجہ سے بھی نہیں - سلاٹر، رے راٹا اور اتانیو کی وجہ سے آنا پڑا۔ وہ لوگ ایسے نہیں تھے کہ ان کے اس طرف بڑھنے کی اطلاع ملنے پر بھی میں آرام سے بیٹھا رہتا۔ مجھے ان کے خاتمے کے لیے یہ قدم اٹھانا پڑا - میں جان بوجھ کر محل میں ہی نظر آیا، پھر ایک کار میں بیٹھ کر محل سے نکل آیا - کیونکہ جانتا تھا، ان کے ساتھی میری تاک میں ہیں - لہٰذا جان بوجھ کر ان کے ہتھے چڑھا - اور انہوں نے ہیلی کاپٹر میں بٹھا کر مجھے اس میدان تک پہنچا دیا۔ ان لوگوں کو ختم کرنے کے لیے یہ پاپڑ بیلے گئے۔"

"تو کیا آپ کے خیال میں وہ تینوں اس عمارت تک پہنچ جاتے؟" محمود نے پوچھا۔

"ہاں، شاید - وہ بہت خطرناک تھے - بہت ہی زیادہ۔"

"لیکن آپ کا تعلق تو اسلامی ملکوں سے ہے، پھر آپ نے ہمیں قیدی کیوں بنایا؟"

"دراصل یہ ایسا منصوبہ ہے کہ کسی کو بھی اجازت نہیں - اس کی سن گن لینے کی - تم لوگ یہ کوشش کر چکے تھے - لہٰذا مجھے تم لوگوں کو درختوں میں الجھانا پڑا - دوسرے یہ کہ ان تینوں سے خود لڑنے کی بجائے تمہارے مقابل لا کھڑا کیا - اس طرح خود ہاتھ پیر ہلانے سے بچ گیا۔"

"تو کیا - مسٹر عین بھنڈارا - آپ ان تینوں سے خوفزدہ تھے۔" شوکی بول اٹھا۔

"خوف زدہ تو خیر نہیں تھا - تاہم انہیں کم خطرناک نہیں سمجھتا تھا۔ تم لوگوں نے دیکھا تو تھا، سلاٹر نے کس طرح دو درختوں کو آپس میں ٹکرا کر جلا دیا تھا۔"

"ہاں، دیکھا تھا - واقعی اس کی یہ صلاحیت یاد رہے گی۔ اس کے ساتھ ہی ہمیں اس پر بھی حیرت ہے کہ درختوں کی اس کمزوری کو کیسے ختم کر دیا گیا، شاید آپ وضاحت نہیں کریں گے - ویسے کیا وہ تینوں بالکل مر چکے ہیں؟" فاروق نے پوچھا۔

"بالکل سے تمہاری کیا مراد ہے، کیا کوئی آدھا بھی مرتا ہے، ویسے اطلاع کے لیے بتا دوں - وہ واقعی مر چکے ہیں۔"

"اوہ - بہت افسوس ہوا یہ سن کر - اگرچہ وہ دشمن تھے، لیکن تھے بہادر دشمن اور بڑے جوڑ توڑ والے - ہمارا ان سے بہت دفعہ آمنا سامنا ہوا - افسوس - اب وہ کبھی ہمارے سامنے نہیں آئیں گے۔" آفتاب نمبر ایک نے جلدی جلدی کہا۔

"آخر اس عمارت میں ہے کیا - سائنس دانوں سے چھ ماہ تک یہاں کیا کام لیا گیا؟"

"پہلے عمارت کی سیر کر لو - اس کے بعد تمہارے سوالات کے جواب بھی دے دیے جائیں گے - یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ درختوں کی کمزوری کس طرح دور ہو گئی۔"

"سوال یہ ہے کہ سائنس دانوں کو یہ بات کیوں معلوم نہیں کہ یہاں ان سے کیا کام لیا گیا ہے؟"

"اس لیے کہ کام صرف حصوں میں لیا گیا ہے - جب تک مکمل طور پر کوئی کام نہ لیا جائے - اس وقت تک کس طرح اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔" جواب ملا۔

"گویا یہ منصوبہ واقعی اسلامی ریاستوں کے فائدے کے لیے ہے؟"

"ہاں - سو فیصد۔"

"پھر تو مسٹر عین بھنڈارا، ہمیں بہت افسوس ہے - ہم آپ کو اپنا دشمن سمجھتے رہے - خاص طور پر اس وقت جب آپ نے ہمیں درختوں میں قید کر دیا تھا۔"

"وہ مجبوری تھی - تم لوگ سلاٹر وغیرہ کے ساتھ ہی اوپر پہنچے تھے - ان لوگوں کو گھیرنا ضروری تھا۔ لہٰذا ساتھ میں تم لوگ بھی قابو میں آ گئے۔" اس بار ہنس کر کہا گیا۔

"اف خدا - ہم نے آپ کے خلاف کیا کیا نہیں سوچا۔" خان رحمان نے کانپ کر کہا۔

"کوئی بات نہیں - لو اب تیار ہو جاؤ - عمارت کی سیر کر لو، اس کے بعد تم لوگوں کو بحفاظت تمام تمہارے ملک پہنچا دیا جائے گا۔"

"لیکن کیسے - یہاں تو کوئی ہے ہی نہیں۔"

"اس کی فکر نہ کرو - بغیر کسی کی مدد کے تم لوگ یہاں سے پرواز کر سکو گے - یوں بھی میرے ملک کی سرزمین پر ہو - کوئی پریشانی والی بات نہیں۔" جواب ملا - اور ساتھ ہی دروازہ کھل گیا۔

وہ سب تھوڑے بہت زخمی تھے، لیکن سب کے سب زخموں کو بھول کر دروازے کی طرف لپکے - اس وقت تک یہ سوال ان کے ذہنوں میں ہزاروں بار گونج چکا تھا کہ آخر چھ ماہ تک یہاں کیا کام ہوتا رہا ہے - دروازے سے نکلتے ہی انہیں مسٹر عین بھنڈارا نظر آئے - وہ ان کے سامنے کھڑے تھے - چہرے پر ایک دوستانہ مسکراہٹ تھی - ان کے پیچھے ایک برآمدہ تھا۔

"آپ لوگوں سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔" یہ کہہ کر مسٹر عین بھنڈارا آگے بڑھے اور ان سے باری باری ہاتھ ملانے لگے:

"یقین جانیے مسٹر عین بھنڈارا صاحب - آپ سے مل کر ہمیں بھی کچھ کم خوشی نہیں ہوئی - آپ سے زیادہ ہی ہوئی ہو گی۔" فاروق شوخ لہجے میں بولا۔

"شکریہ - شکریہ۔" انہوں نے کہا۔ "آئیے میرے ساتھ۔"

وہ ان کے پیچھے چلتے برآمدے سے نکل آئے - عمارت کافی

پھیلاؤ لیے ہوئے تھی۔ اور ساری کی ساری مضبوط ترین چیزوں سے بنائی گئی تھی۔ روشنی اور ہوا کا انتظام قابلِ دید تھا۔ انہیں ذرا بھی گھٹن یا گرمی کا احساس نہیں ہوا۔ ایک کھلے صحن میں ایک طرف انہیں نو کمرے دکھائی دیے۔ درمیان والا کمرہ باقی آٹھ سے بڑا تھا، سب کمروں کے دروازے بند تھے۔ ان کے اوپر عجیب وغریب قسم کی چمنیاں سی لگی ہوئی تھیں۔

"اف خدا۔ یہ۔ یہ تو بالکل وہی جگہ ہے۔ ہم نے چھ ماہ یہیں گزارے تھے، لیکن اس وقت تو یہاں میلہ سا لگا رہتا تھا۔ ہزاروں آدمی کام کرتے نظر آتے تھے اور اب۔ اب یہاں کوئی بھی نہیں ہے۔" پروفیسر عقلان نے تھرتھر کانپتی آواز میں کہا۔

"اب ان کی یہاں ضرورت نہیں رہی۔ کام ختم ہونے پر انہیں واپس بھیج دیا گیا۔ ان سبھی کو آپ لوگوں کی طرح خفیہ طور پر لایا گیا تھا۔ واپس جاکر وہ کسی کو بھی کچھ بتانے کے قابل نہیں تھے۔" عین بھنڈارا نے بتایا۔

"اوہ!" ان سب کے منہ سے نکلا۔

ان کمروں کے علاوہ بھی عمارت کافی دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ گویا ایک ننھا منا سا شہر آباد تھا، لیکن اس شہر میں آبادی نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔

"ان کمروں میں کیا ہے مسٹر عین بھنڈارا؟" انسپکٹر جمشید بولے۔

"آیئے۔ پہلا کمرہ کھول کر دکھا دوں۔"

یہ کہہ کر مسٹر عین بھنڈارا آگے بڑھے، دروازہ خود بخود کھل گیا، پھر وہ پیچھے ہٹ گئے تو دروازہ اپنے آپ بند ہو گیا۔

"دیکھا آپ لوگوں نے، یہ ہے سائنس کا کمال، لیکن آپ لوگوں میں سے کوئی بھی، ان میں سے کسی دروازے کو نہیں کھول سکتا۔"

"کیوں نہیں کھول سکتے۔ میرا خیال ہے۔ یہ کام تو میں کر سکتا ہوں۔" محمود نے فوراً کہا۔

"اچھا۔ ذرا کرکے دکھاؤ۔" عین بھنڈارا مسکرائے۔

"ضرور، کیوں نہیں۔ دیکھیے۔ میں چلا دروازہ کھولنے۔" یہ کہہ کر محمود نے چند قدم دروازے کی طرف اٹھائے، لیکن دروازہ ٹس سے مس نہ ہوا، مسٹر عین بھنڈارا ہنس پڑے۔ آخر بولے:

"نہیں کھلے گا بھئی۔ خیر۔ میں ہی کھولتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ پھر آگے بڑھے اور دروازہ کھل گیا۔ ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔

"اب آپ لوگ اندر آسکتے ہیں۔"

وہ ان کے پیچھے اندر داخل ہوئے۔ اور حیران سے رہ گئے۔ اندر ایک بہت بڑی الیکٹرانک مشین لگی ہوئی تھی۔ لاکھوں تار ادھر سے ادھر آ جا رہے تھے۔ مشین گنبد نما تھی۔ گویا ایک بہت بڑا گنبد تھی۔ اور اس گنبد میں ہزاروں ننھے منے بلب جل اور بجھ رہے تھے اور ایک باریک سی آواز ٹک ٹک کی ابھر رہی تھی:

"اف خدا۔ یہ۔ یہ کیا ہے؟" فرزانہ نے کانپ کر کہا۔

"یہ ایک بہت بڑا مشینی دماغ ہے۔" عین بھنڈارا نے سرسراتی آواز میں کہا۔

"مشینی دماغ۔" وہ حیرت زدہ انداز میں بول اٹھے۔

"ہاں۔ الیکٹرانک مشینی دماغ۔ دائیں اور بائیں طرف کے آٹھ کمروں میں بالکل اسی قسم کے دماغ ہیں۔ درمیان والا کمرہ جو سب سے بڑا ہے، اس میں مشینی دماغ بھی سب سے بڑا ہے۔ یا یوں کہہ لیں کہ وہ ان آٹھوں کا سردار دماغ ہے۔ یہ سب کے سب ہمارے دشمن ملکوں کی خبریں بڑے دماغ تک پہنچاتے ہیں اور بڑا دماغ براہِ راست مجھے پہنچاتا ہے۔ اس طرح میں اپنے محل میں بیٹھا تمام دشمن ملکوں کی کارروائیوں اور منصوبوں سے خبردار ہوتا رہتا ہوں اور جونہی کوئی خطرناک بات معلوم ہوتی ہے۔ دوست ملک کو اطلاع کر دیتا ہوں، اس طرح وہ دوست ملک اپنا بچاؤ۔ یا دشمن ملک کے منصوبے سے بچنے کے انتظامات کر لیتا ہے۔" وہ کہتے چلے گئے۔

"اوہ۔ اوہ۔" ان کے منہ سے مارے حیرت کے نکلا۔

"لیکن بڑا دماغ آپ کو کیوں اطلاع دیتا ہے۔ براہِ راست اس ملک کو کیوں اطلاع نہیں دیتا؟" انسپکٹر جمشید نے سوال کیا۔

"اس سارے نظام کی باگ ڈور میں نے سنبھال رکھی ہے، کسی کو بھی معلوم نہیں کہ یہ منصوبہ عمل میں لایا گیا ہے۔ کیونکہ اس طرح بات راز نہیں رہتی۔ بس صرف صدر صاحبان کو معلوم ہے، لیکن یہ انہیں بھی معلوم نہیں کہ منصوبہ کیا ہے اور کہاں ہے۔"

"ہوں۔ بات تو ٹھیک ہے۔ گویا مطلب یہ ہوا کہ اسلامی ممالک کے دشمن ممالک کی خبریں۔ ہر قسم کی خبریں یہ دماغ آپ تک پہنچاتے ہیں اور آپ دوست ملکوں تک۔ اس طرح ہم ان کی سازشوں سے ہر وقت خبردار ہو جاتے ہیں اور توڑ کر لیتے ہیں۔"

"بالکل یہی بات ہے۔"

"اور سلاٹر وغیرہ کو اس منصوبے کی پھر بھی سن گن مل گئی تھی، اور وہ اسے تباہ و برباد کرنے کے لیے آتے تھے، لیکن آپ ان سے خوف زدہ کیوں تھے، جب کہ وہ یہاں پہنچ کر کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"میں نے یہ کب کہا کہ وہ کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ تینوں دنیا بھر کے مانے ہوئے جاسوس تھے۔ کچھ نہ کچھ تو کر ہی گزرتے۔ تاہم اگر مجھے یہ یقین ہوتا کہ وہ کچھ بھی نہیں کر سکیں گے۔ تب بھی انہیں اس طرف آنے کی اجازت کس طرح دی جا سکتی تھی۔ وہ اپنے دوست ممالک کو تو خبردار کر ہی دیتے۔ جب کہ اس سارے معاملے کو راز رکھا گیا ہے۔"

"ہوں۔ خیر جو ہوا، اچھا ہی ہوا۔ کیا آپ ہمیں بڑا دماغ نہیں دکھائیں گے۔" انسپکٹر جمشید نے کہا۔

"ہاں، کیوں نہیں۔ دیکھنے کو تو آپ سب دماغ دیکھ لیں۔ لیکن باقی سات کمروں کے دماغ تو بالکل اسی جیسے ہی ہیں۔ درمیان

والا سردار دماغ بھی بس جسامت میں بڑا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ درمیان والے کمرے کی طرف بڑھے۔ انہوں نے دیکھا۔ کمرے کا دروازہ کھل گیا تھا۔ حیرت زدہ سے وہ اندر داخل ہوئے۔ اس عظیم دماغ کو دیکھ کر وہ بھونچکا رہ گئے۔ کئی سیکنڈ تک سکتے کی حالت طاری رہی۔ پھر آفتاب نمبر ایک نے تھر تھر کانپتی آواز میں کہا:

"اف خدا۔ اتنا بڑا دماغ۔"

"یہ منصوبہ پورے پانچ سال میں تیار ہوا ہے۔" مین بھنڈارا نے فخریہ لہجے میں کہا۔

"پورے پانچ سال میں، لیکن ہمارے ملک کے سائنس دان تو صرف چھ ماہ یہاں رہے ہیں۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"ہاں، انہوں نے صرف اپنے حصے کا کام کیا ہے۔ جب کہ یہاں اور بہت کام ہوا ہے۔ اس جگہ کی حفاظت کے لیے۔ وہ سیکڑوں مصنوعی درخت بنائے گئے۔ ان درختوں کے نیچے بھی دراصل ٹینک کی قسم کی الیکٹرانک مشینیں لگی ہیں اور ان میں کرنٹ دوڑتا ہے، پھر ان سے بھی پہلے یہ عمارت تیار کرائی گئی۔ یہ بم پروف ہے۔ اور بھی کوئی چیز اسے نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ کوئی جہاز، ہیلی کاپٹر وغیرہ آس پاس اترنے کی کوشش کرے تو یہ درخت اس سے خود ہی نبٹ لیتے ہیں۔ سب سے زیادہ وقت مشینی دماغوں کی تیاری میں لگا۔ اور ہمارے سائنس دانوں نے مسلسل چھ ماہ تک ان پر کام کیا۔"

"گویا دماغ صرف چھ ماہ میں تیار ہوئے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"نہیں، ان کی تیاری میں بھی بہت زیادہ وقت لگا۔"

"منصوبہ واقعی بہت عظیم ہے۔ اور شاندار بھی ہے۔ داد دینی پڑتی ہے، لیکن اس میں غلط بات بس یہی ہے کہ ہر قسم کی اطلاع صرف آپ کو ملتی ہے۔ اب فرض کیجیے۔ خدانخواستہ آپ کو کچھ ہو جائے تو اطلاعات کون وصول کرے گا؟"

"میرا نائب۔" وہ فوراً بولے۔

"اور اگر آپ کا نائب دشمن ممالک کے ہاتھوں بک جائے۔ وہ اس کے ضمیر کا سودا کرلیں۔"

"یہ۔ یہ نہیں ہو سکتا۔" مسٹر مین بھنڈارا نے کہا۔

"ہونے کو اس دنیا میں کیا نہیں ہو سکتا جناب۔" محمود بولا۔

"لہٰذا ہونا یہ چاہیے کہ ہر ملک کے بارے میں اطلاع اسے براہِ راست دماغ کی طرف سے ملے۔"

"خیر۔ یہ انتظام بھی کر لیا جائے گا۔" انہوں نے جواب دیا۔

"اب آپ کا کیا پروگرام ہے؟" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"پروگرام کیا ہونا ہے، بس آپ لوگوں کو واپس بھیج دیا جائے گا، آئیے میرے ساتھ۔ لیکن مہربانی فرما کر اس سارے منصوبے کی تفصیلات کسی دوسرے کے سامنے بیان نہ کیجیے گا۔"

"آپ فکر نہ کریں۔ ہم وہ لوگ نہیں ہیں۔ اسلام کے خلاف ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتے۔"

"شکریہ۔ آئیے میرے ساتھ۔"

وہ باہر نکل آئے۔ سردار دماغ کے کمرے کا دروازہ بھی بند ہو گیا۔ اب مسٹر مین بھنڈارا کا رخ ایک اور سمت میں تھا۔ آخر وہ ایک کھلے میدان میں پہنچے۔ یہاں ہیلی کاپٹر کی قسم کے تین چھوٹے چھوٹے سے جہاز کھڑے تھے۔

"آپ میں سے کسی کو جہاز چلانا تو آتا ہی ہوگا؟"

"جی ہاں۔ آپ فکر نہ کریں۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"تو پھر بسم اللہ کریں۔ نیلے جہاز میں سوار ہو جائیں۔" اس نے کہا۔

"اور آپ؟"

"میں علیحدہ جہاز میں اپنے محل میں پہنچ جاؤں گا، میری فکر نہ کریں۔"

"اچھی بات ہے۔ آؤ بھئی چلیں۔" انسپکٹر جمشید بولے، پھر اپنے ساتھیوں کی طرف مڑے:

"مسٹر مین بھنڈارا صاحب سے کسی کو کوئی اور بات تو نہیں پوچھنی۔"

سب نے نفی میں سر ہلائے۔ پوچھنے کے لیے اب رہ ہی کیا گیا تھا؛ چنانچہ سب نے جہاز کی طرف قدم اٹھائے۔ مسٹر مین بھنڈارا اپنی جگہ کھڑے رہے۔ گویا یہ مہم ختم ہو رہی تھی۔ انسپکٹر جمشید چلتے چلتے رک گئے اور انسپکٹر کامران مرزا سے بولے:

"آپ کا کیا خیال ہے؟"

"آپ کس سلسلے میں ابا جان کا خیال پوچھ رہے ہیں؟" آفتاب نے حیران ہو کر پوچھا۔

"یہ جانتے ہیں۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"کیا جانتے ہیں؟" اس نے حیران ہو کر کہا۔

"بھئی ذرا تم خاموش رہو۔" انسپکٹر کامران مرزا نے بُرا سا منہ بنایا۔

"واقعی۔ بعض اوقات تو اس کی آواز زہر لگنے لگتی ہے۔" آصف نے فوراً کہا۔

"تو کان بند کر لیا کرو۔" آفتاب نے جل بھن کر کہا۔

"ہاں، تو آپ کیا کہتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں۔"

"حیرت ہے۔ یہ چپ چپاتے کس بات پر اتفاق ہو رہا ہے۔"

"اس بات پر کہ ان دماغوں والے کمروں کے دروازے صرف مسٹر مین بھنڈارا ہی نہیں۔ پروفیسر داؤد بھی کھول سکتے ہیں۔ نہ صرف یہ۔ بلکہ میں اور انسپکٹر جمشید بھی کھول سکتے ہیں۔"

"غلط۔ یہ نہیں ہو سکتا۔" مسٹر مین بھنڈارا نے حیران ہو کر کہا۔

"ہم کھول کر دکھا دیتے ہیں۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔"

"بہت خوب۔ ضرور دکھائیں۔ اگر آپ لوگوں نے کوئی دروازہ کھول کر دکھا دیا تو میں آپ کا لوہا مان جاؤں گا۔"

"خیر۔ یوں تو ہمیں اپنا لوہا منوانے کا ایسا شوق نہیں۔" فاروق مسکرایا۔

"اچھا تو آئیے" جیمن بھنڈارا نے انہیں دعوت دی۔
انسپکٹر جمشید درمیان والے کمرے کی طرف بڑھے۔ دوسرے ہی لمحے ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ سردار دماغ والے کمرے کا دروازہ آواز پیدا کیے بغیر کھل گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"بہت خوب۔ شاندار۔ حیرت انگیز۔" مسٹر جیمن بھنڈارا تے تالی بجاتے ہوئے کہا۔

"لل۔ لیکن۔ اباجان۔ یہ کیسے ہو گیا۔"

"بغور دیکھنے سے۔ جب پہلی بار مسٹر جیمن بھنڈارا پہلے دروازے کی طرف بڑھے۔ اس وقت ہمیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ دروازہ خودبخود کھل جائے گا۔ لہذا ہم مسٹر جیمن بھنڈارا کی حرکات نوٹ نہ کر سکے۔ دوسری بار بغور ان کے حرکت کرنے اور چلنے کے انداز کو دیکھا۔ پھر بڑے کمرے کے دروازے کی باری پر بھی ہم نے ان پر نظر رکھی۔ اور ہم جان گئے کہ دروازے ریموٹ کنٹرول ہیں۔ اشاروں یا آوازوں کے ذریعے کھلتے ہیں۔ مسٹر جیمن بھنڈارا نے اپنے دائیں پاؤں سے تین بار ہلکی سی دھمک پیدا کی تھی۔ اس قدر ہلکی کہ محسوس بھی نہ کی جا سکے۔ لیکن چونکہ ہم بغور جائزہ لے رہے تھے اس لیے حرکات کو نوٹ کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ وہ درخت بھی ریموٹ کنٹرول ہیں۔ کیوں مسٹر جیمن بھنڈارا؟"

"ہاں۔ واقعی۔ آپ لوگوں میں بھی بے شمار صلاحیتیں ہیں جنہیں تسلیم کرنا ہی پڑتا ہے۔" انہوں نے جھینپی ہوئی مسکراہٹ چہرے پر لاتے ہوئے کہا۔

"تو کیا اب ہمیں اجازت ہے۔"

"ہاں، بالکل۔"

"کون سے جہاز پر سوار ہوں؟" انسپکٹر جمشید نے پوچھا۔

"نیلے پر۔"

"لیکن ہمیں نیلا رنگ پسند نہیں۔ کیوں نہ سرخ رنگ والے جہاز میں بیٹھ جائیں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔ محمود، فاروق اور فرزانہ کو حیرت سی ہوئی، کیونکہ ان کے والد ان وہموں میں نہیں پڑا کرتے تھے۔

"نہیں، سرخ جہاز کچھ خراب ہے۔ سفید میرے لیے مخصوص ہے۔"

"چلیے خیر۔ کوئی بات نہیں۔ ہم نیلا ہی لے جاتے ہیں۔ لیکن آپ نے یہ نہیں بتایا کہ جہاز کی واپسی کی کیا صورت ہو گی؟"

"میں اپنے آدمی کے ذریعے منگوا لوں گا۔ آپ لوگ فکر نہ کریں۔"

"آؤ بھئی جہاز پر چڑھ جائیں۔ ارے۔ مگر اوپر تو چھت ہے۔ جہاز اوپر کس طرح جائے گا۔ چھت سے ٹکرا کر گر نہیں جائے گا"

"نہیں۔ جس جگہ یہ جہاز کھڑا ہے۔ اس کے بالکل اوپر ربڑ کی چھت ہے۔ اور اس میں بہت بڑا شگاف ہے، لیکن یہ شگاف نظر نہیں آتا۔ کیونکہ ربڑ کے سرے آپس میں مل جاتے ہیں۔ جہاز بغیر کسی رکاوٹ کے ہیلی کاپٹر کی طرح اوپر اٹھے گا۔ دراصل یہ ہیلی کاپٹر بھی ہے اور جہاز بھی۔ اوپر اس جگہ کو درختوں نے گھیر رکھا ہے۔ اس جگہ کو چھپانے کے لیے ہی یہ مصنوعی درخت بنائے گئے ہیں۔"

"اوہ۔ اب ہم سمجھ گئے۔ بہت بہت شکریہ۔ لیکن مسٹر جیمن بھنڈارا ہمارے ذہنوں میں ایک بات اب تک صاف نہیں ہو سکی۔"

"اور وہ کیا۔"

"آپ جب ہیلی کاپٹر سے اترے تھے۔ اس ہیلی کاپٹر نے ہمیں کچل دینے کی پوری کوشش کی تھی۔ اگر آپ ہمارے دوست ہیں تو ایسا کیوں ہوا تھا۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"دوسری بات یہ کہ آپ مجھے ایک ہیلی کاپٹر میں بٹھا کر ناریوں کی وادی سے کچھ دُور ایک چٹان پر چھوڑ گئے تھے، لیکن جب میں ناریوں سے بنے مکان تک پہنچا تو مجھے اس طرح جال میں پھانسا گیا جیسے انہیں پہلے سے میری آمد کے بارے میں معلوم تھا۔ جب کہ ہیلی کاپٹر بے آواز تھا، اس کا رنگ بھی بالکل آسمانی رنگ کا تھا۔ اسے آسانی سے دیکھا نہیں جا سکتا تھا۔ آپ ان دونوں باتوں کا جواب دے کر ہماری الجھن رفع کر دیجیے۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"ہاں، کیوں نہیں۔ میں نے تم لوگوں کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا، لیکن ذہن ان تمام باتوں کو تسلیم کرنے پر تیار نہیں تھا، لہذا میں نے سوچا، لگے ہاتھوں تم لوگوں کی صلاحیتوں کا امتحان بھی ہو جائے۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے ہیلی کاپٹر سے حملہ کرنے کا اشارا کیا۔"

"اور کیا آپ نے مجھے صرف آزمانے کے لیے جال میں پھنسوایا تھا۔"

"نہیں۔ اس مکان پر سلاٹر وغیرہ کے ساتھی قابض ہو چکے تھے، جب کہ مجھے اس کا کوئی علم نہیں تھا۔"

"لیکن انہیں میری آمد کی اطلاع کس طرح دی گئی۔" انسپکٹر کامران مرزا نے حیران ہو کر کہا۔

"پتا نہیں۔ شاید انہوں نے ہیلی کاپٹر کو اترتے دیکھ لیا ہو گا۔"

"ہوں۔ خیر۔ تو کیا اب ہم جائیں۔"

"ہاں۔ اس میں کوئی شک نہیں، سلاٹر، رے ٹا راٹا اور الیانو سے مقابلہ میں نے نہیں، تم لوگوں نے جیتا ہے۔ اور اگر تم لوگ نہ ہوتے تو مجھے ان لوگوں کو قابو میں کرنے کے لیے کافی پاپڑ بیلنے پڑتے۔"

"خدا کا شکر ہے۔ آپ پاپڑ بیلنے سے بچ گئے۔" فاروق خوش ہو کر بولا۔ دوسرے مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔

"اچھا تو پھر خدا حافظ۔ یہ مہم یاد رہے گی۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"خدا حافظ۔" مسٹر مین ہنڈارا نے کہا۔

وہ ایک ایک قدم چلتے جہاز کے نزدیک پہنچ گئے۔ انسپکٹر جمشید نے سیڑھی کی طرف ہاتھ بڑھایا اور مڑ کر مسٹر مین ہنڈارا کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

"کیا خیال ہے انسپکٹر کامران مرزا۔ اب ہم کیا کریں۔"

"ہمیں ان سے صاف صاف بات کہہ لینی چاہیے۔" انسپکٹر کامران مرزا کی آواز گونجی۔

"صاف صاف بات۔ کیا مطلب۔ کیا اب تک ہم لوگ ان سے ناصاف گفتگو کرتے رہے ہیں۔" آفتاب نمبر دو نے حیران ہو کر کہا۔

"مسٹر مین ہنڈارا۔ ایک اور بات بتا دیجیے۔"

"ضرور۔ پوچھیے۔"

"جب ہم درختوں کے درمیان بے ہوش ہو گئے تھے تو ہم سب کو نیچے اس عمارت تک کس طرح لایا گیا، جب کہ آپ کا کہنا یہ ہے کہ آپ یہاں بالکل تنہا ہیں۔"

"ہاں، میں یہاں بالکل اکیلا ہوں۔ دراصل۔ اس خفیہ مقام پر کسی کو رکھا جا ہی نہیں سکتا، اس طرح تو کچھ لوگ راز میں شریک ہو جائیں گے۔ اور ان میں سے کوئی بھی دشمن ممالک سے مل سکتا ہے۔"

"تو کیا آپ خود ہم سب کو اٹھا کر یہاں تک لائے تھے۔" انسپکٹر جمشید حیران ہو کر بولے۔

"نہیں۔ ریموٹ کنٹرول درختوں کے ذریعے میں تم سب لوگوں کو اس جگہ تک لے آیا۔ جہاں اس عمارت کی چھت ربڑ کی ہے، نیچے نرم ملائم گدیلے رکھ دیے۔ اور تم لوگ چھت سے ان گدوں پر آ گرے۔ وہاں سے بھی ریموٹ سسٹم کے تحت اس کمرے میں پہنچایا گیا۔"

"اوہ۔ تو یہ بات تھی۔ بس یہی آخری الجھن ہمارے ذہنوں کو پریشان کر رہی تھی۔ اب ہم اطمینان سے رخصت ہو سکیں گے۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"تو کیا۔ واقعی ہم یہاں سے مطمئن لوٹ سکیں گے۔" انسپکٹر جمشید نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

"نہیں۔ واقعی تو نہیں۔ میں تو یہ بات مسٹر مین ہنڈارا کا دل رکھنے کے لیے کہہ رہا ہوں۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"جی کیا مطلب۔ ان کا دل رکھنے کے لیے۔" محمود نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔

"ہاں۔ دل رکھنے کے لیے۔"

"یہ کیا بات ہوئی۔" مسٹر مین ہنڈارا بھی حیران ہو کر بولے۔

"بات دراصل یہ ہے مسٹر مین ہنڈارا کہ آپ کی باتوں پر ہمیں اب تک یقین نہیں آیا اور نہ کبھی آئے گا۔"

"ک۔ کیا۔ مطلب۔" مین ہنڈارا نے چونک کر کہا۔

"مطلب یہ کہ ہم اتنے بچے نہیں ہیں۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"میں اب تک نہیں سمجھا۔ آپ لوگ کیا کہنا چاہتے ہیں۔"

"انسپکٹر کامران مرزا۔ ذرا انہیں بتائیے۔ ہم کیا کہنا چاہتے ہیں۔"

"بہت اچھا۔ بتائے دیتا ہوں۔ بتانے میں میرا کیا جاتا ہے۔ ہاں تو مسٹر لی کاف۔ آپ مسٹر مین ہنڈارا ہرگز نہیں ہیں۔"

"لی۔ کاف۔"

سرسراہٹ زدہ آوازیں خوف کے بوجھ سے لد گئیں۔

○

کتنے ہی لمحے گزر گئے۔ وہ بتوں کی طرح مسٹر مین ہنڈارا کی طرف دیکھتے رہے، ادھر وہ بھی بت بنے دیکھ رہے تھے۔

"لی۔ کاف۔ یہ کیا کہا آپ نے۔ ان کا نام تو مسٹر مین ہنڈارا ہے۔"

"نہیں۔ یہ مسٹر لی کاف ہیں۔"

"لی کاف ہوں یا مین کاف۔ ہمیں اس سے کیا۔" فرحت بول پڑی۔

"تم سمجھے نہیں۔ اور سمجھو گے بھی کیسے۔ جب کہ لی کاف کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ ہاں۔ محمود، فاروق اور فرزانہ ضرور اس سے مل چکے ہیں اور میں بھی۔ انسپکٹر کامران مرزا بھی بہت پہلے یہ جان چکے تھے کہ دراصل مسٹر مین ہنڈارا کے بھیس میں کوئی اور ہی شخص موجود ہے، لیکن یہ بات شاید انہیں بھی نہیں معلوم تھی کہ یہ لی کاف ہیں۔ ہاں، میں ضرور سمجھ گیا تھا اور وہ بھی اس لیے کہ ایک بار پہلے ملاقات کر چکا ہوں۔ میک اپ واقعی بہت کمال کا ہے، لیکن حرکات، سکنات اور پھر وہ گھٹی گھٹی آواز جو ہم نے درختوں کے درمیان سے ابھرتی سنی۔ مسٹر مین ہنڈارا کی نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا ہمیں اس بات میں ایک فیصد بھی شک نہیں کہ ہمارے سامنے اس وقت دنیا کا خطرناک ترین آدمی لی کاف کھڑا ہے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا مسٹر لی کاف۔" انسپکٹر جمشید کے لہجے میں گہرا طنز تھا۔

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو انسپکٹر جمشید۔ میں واقعی لی کاف ہوں، اب جاؤ اور اچھے بچوں کی طرح جہاز میں سوار ہو جاؤ، ان حالات میں بھی میں تمہیں واپس جانے کی اجازت دیتا ہوں۔" اس نے ہنس کر کہا۔

"جہاز میں سوار ہو جائیں۔ تمہیں یہ بتائے بغیر کہ دراصل منصوبہ کیا تھا اور تم نے ہمارے سامنے اسے کس رخ پر پیش کیا۔"

"اچھا تو تم منصوبے کے بارے میں بھی کچھ بتاؤ گے۔" لی کاف نے مسکرا کر پوچھا۔

"ہاں۔ تم نے سب سے پہلے مسٹر مین بھنڈارا کو خریدا۔ اسے یہ لالچ دیا کہ اس کی ریاست جوں کی توں قائم رہے گی اور ریاست کا حکمران بھی ہمیشہ وہی رہے گا۔ لیکن اگر اس نے تعاون نہ کیا تو سب سے پہلے اس کی ریاست کی باری آئے گی۔ مسٹر مین بھنڈارا خوف زدہ ہو گیا۔ دوسری طرف لالچ نے اس کے دل میں گھر کر لیا اور وہ اس منصوبے کی چابی بن گیا۔ یعنی اس کے ذریعے ہمارے ملک کے سائنس دانوں کو اس جگہ تک پہنچایا گیا۔ اور ظاہر یہ کیا گیا کہ مسلمان ممالک کی بہتری اور بھلائی کے لیے یہ سب کچھ کیا جا رہا ہے۔ ہمارے ملک کے سائنس دانوں کو بلانا اس لیے ضروری ہوا کہ ان کے بغیر تھوڑا سا کام نہیں نکل رہا تھا۔ اگر وہ کام بھی تمہارے سائنس دان کر لیتے تو شاید اس منصوبے کی ہمیں سن گن تک نہ لگتی۔ اور تم لوگ گھر بیٹھے ہمارے ملکی حالات سے باخبر ہوتے رہتے۔ اور اس کے مطابق جڑیں کاٹتے رہتے۔ ہم ہر کام میں ناکام ہوتے رہتے۔ ہر منصوبہ ہمارا فیل ہو جاتا۔ دوست ممالک سے تعلقات خراب ہوتے چلے جاتے۔ یہاں تک کہ تمام اسلامی ممالک چوں چوں کا مربہ بن جاتے۔ لیکن ہوتا تو وہی ہے جو اللہ تعالیٰ کرتا ہے۔ تم لوگ ساری دنیا پر قابض ہونے کے خواب دیکھ رہے ہو۔ اصل منصوبہ یہ ہے کہ ان دماغوں کے ذریعے پوری دنیا پر حکومت کی جائے۔ لیکن رہو گے پھر بھی اس دنیا کے قیدی۔ دنیا میں گھرے ہوئے ہو، دنیا کے ہو کر رہ گئے ہو، اس دنیا کے بعد اور اس دنیا سے آگے کچھ تو نظر نہیں آتا تمہیں۔ بس دوسروں کو ہڑپ کر لینا چاہتے ہو۔ تاکہ ساری دنیا پر تمہارا راج ہو۔" انسپکٹر جمشید روانی کے عالم میں کہتے چلے گئے۔

"لیکن انکل۔ آپ کو کس طرح معلوم ہوا کہ انہوں نے مسٹر مین بھنڈارا کو خرید لیا۔" آصف بولا۔

"اگر ایسا نہ ہوتا تو انسپکٹر کامران مرزا جال میں پھنسے ہوئے نہ ہوتے۔ جب یہ مین بھنڈارا کے محل میں پہنچے۔ تو اس نے پہلا کام یہ کیا کہ لی کاف کو اطلاع دے دی۔ اور لی کاف جو پہلے ہی سلاخ وغیرہ کے سلسلے میں فکر مند تھا، مین بھنڈارا کے روپ میں میدان میں آ کودا۔ اسی نے محل میں انسپکٹر کامران مرزا سے ملاقات کی تھی، اصل مین بھنڈارا تو ان کے سامنے آیا ہی نہیں۔ یہ چاہتا تھا کہ نہ صرف ان لوگوں کو بلکہ ہمیں بھی آگے بڑھنے سے روک دے، اسی لیے تو ہیلی کاپٹر سے ہمیں کچل دینا چاہتا تھا۔ اور پھر ہمیں بھی ان سے لڑوایا۔" انہوں نے جلدی جلدی کہا۔

"اف توبہ۔ تو یہ مسٹر لی کاف ہیں اور یہ تو مشینی دماغ پوری دنیا کی جاسوسی کریں گے۔ اف خدا۔ یہ تو بہت ہی ہولناک بات ہو گی۔" محمود بولا۔

"صرف ہولناک۔ بھئی یہ تو ہیبت ناک۔ خطرناک اور وحشت ناک بھی ہے۔" آصف نے بوکھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ہوں۔ تم لوگوں نے مجھے پہچان لیا ہے۔ خیر کوئی بات نہیں، تمہاری بہتری اب بھی اسی میں ہے کہ جہاز پر سوار ہو جاؤ اور یہاں سے چلتے بنو۔"

"ہم اس طرح واپس نہیں جا سکتے۔" انسپکٹر جمشید اس کی طرف مڑے اور بھونچکے رہ گئے۔

باقی سب بھی دھک سے رہ گئے۔ اب مسٹر مین بھنڈارا کا حلیہ ہی اور تھا۔ اس نے چہرے پر سے میک اپ کی تہیں اُتار دی تھیں۔ پھر وہ اچانک مڑا اور عمارت کی طرف دوڑ پڑا۔ بوکھلاہٹ کے عالم میں وہ اس کے پیچھے دوڑ پڑے۔

"ارے ارے۔ مسٹر لی کاف۔ کہاں بھاگے جا رہے ہو، ایسی بھی کیا بزدلی۔" محمود نے چیخ کر کہا۔

لیکن لی کاف کے تو گویا پَر نکل آئے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ دوڑتے دوڑتے وہ اس جگہ تک پہنچ گئے جہاں سے وہ غائب ہوا تھا۔ انہوں نے دیکھا۔ سامنے ایک کمرے کا دروازہ تھا۔ انسپکٹر جمشید نے پاؤں سے دھمک پیدا کی، لیکن دروازہ نہ کھلا۔

"شاید لی کاف نے دوسری طرف سے چٹخنی لگا دی ہے۔" وہ بڑبڑائے۔

"پہلی تو حیرت انگیز ترین بات یہ کہ مین بھنڈارا لی کاف میں تبدیل ہو گیا، دوسری اس سے بھی بڑھ کر حیرت یہ کہ وہ بھاگ نکلا۔" خان رحمان نے بڑبڑانے کے انداز میں کہا۔

"اس کا اس طرح بھاگ نکلنا بھی بلاوجہ نہیں ہو سکتا۔ وہ ضرور کچھ سوچ کر ہی بھاگا ہے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"مجھے تو اب تک یقین نہیں آ رہا۔" فرزانہ بولی۔

"انکل۔ مہربانی فرما کر ذرا جلدی سے ہمیں بھی لی کاف کے متعلق بتا دیں۔" فرحت بے چین ہو کر بولی۔

"اور ہمیں بھی۔" شوکی نے کانپ کر کہا۔

"اس سے کہیں ضروری یہ ہے کہ ہم اس تک پہنچنے کی کوشش کریں۔ کہیں وہ فرار ہونے میں کامیاب ہو جائے۔" محمود نے منہ بنایا۔

"ہم اس عمارت کی بھول بھلیوں سے واقف نہیں۔ لہٰذا اس کو کس طرح تلاش کر سکتے ہیں۔" آفتاب نمبر ایک نے اس سے بھی بُرا منہ بنایا۔

"آپ لوگوں کا بُرے بُرے منہ بنانے کا مقابلہ تو ہو گیا۔ اگر ایسی بات ہے تو مہربانی فرما کر ہمیں بھی اس مقابلے میں شریک کر لیں۔ ہم بھی کسی سے پیچھے نہیں رہیں گے۔" شوکی بولا۔

"ہاں، تم لوگ تو بس لڑائی بھڑائی میں پیچھے رہتے ہو۔" فرزانہ مسکرائی۔

انسپکٹر جمشید انہیں جلدی جلدی لی کاف کے بارے میں بتانے لگے۔ ان کے خاموش ہوتے ہی آصف خوف زدہ انداز میں بولا :

"اف خدا ۔ زہریلی زبان والا آدمی۔"

"اور چینیر سانپ سے بھی زیادہ زہریلا ۔ باپ رے۔" فرحت نے کانپ کر کہا۔

"لیکن انکل ۔ اگر وہ اتنا ہی ہولناک اور خطرناک ہے تو بھاگ کیوں نکلا؟" آفتاب نمبر ایک نے منہ بنایا۔

عین اسی وقت دروازہ کھلا اور وہ سب ٹھٹک کر رہ گئے، لی کاف اب عجیب ترین حلیے میں ان کے سامنے موجود تھا۔

☆ ☆ ☆

اس کے جسم پر ایک قسم کا خول تھا۔ یہ خول ایک ہاتھ پر آ کر حد درجے خوفناک ہو گیا تھا۔ اس خول پر بڑے بڑے نوک دار اُبھار تھے اور ہاتھ نے مُکّے کی صورت اختیار کر لی تھی، گویا اس کے مُکّے پر نوک دار خول چڑھا ہوا تھا ۔ یہ نوک دار اُبھار بالکل کانٹوں کی صورت کے تھے ۔ اس عجیب و غریب ہتھیار نے لی کاف کو اور بھی خطرناک اور پُرخوف بنا دیا تھا ۔ وہ پہلے ہی کچھ کم خطرناک نہیں تھا اور یہ چیز گویا سونے پر سہاگہ تھی ۔ اب اس کا مکّا خوف ناک حد تک بڑا ہو گیا تھا۔

"تم لوگوں کا خیال تھا ۔ میں بھاگ نکلا ہوں ، لیکن میں بھاگ نکلنے والوں میں سے نہیں۔ یوں بھی تمہیں زندہ نہیں چھوڑ سکتا ۔ تمہیں زندہ چھوڑنے کا مطلب اس پورے منصوبے کی موت ہے۔ اس منصوبے پر میں نے بہت محنت کی ہے ۔ پوری اسلامی دُنیا ہماری مٹھی میں ہو گی، لیکن اگر تمہیں زندہ چھوڑ دیا گیا تو یہ سب کچھ بے کار ہو کر رہ جائے گا۔ تمہارے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہے۔ میں نے زندگی میں کسی آدمی کو کسی ہتھیار سے ہلاک نہیں کیا۔ اپنے جسم کے زہر سے مارا جب بھی مارا ۔ آج بھی یہی ہو گا، تم لوگ سانپ کے کاٹے کو بھول جاؤ گے۔"

"اگر کبھی ہتھیار استعمال نہیں کیا، تو آج کیا ضرورت پڑ گئی۔" فرزانہ جل بھن کر بولی۔

"تمہارا اشارا کانٹوں والے اس لباس کی طرف ہے۔ تو یہ کوئی ہتھیار نہیں ہے ۔ یہ لباس تو میرے جسم کا بس ایک حصّہ ہے ۔ ہتھیار کا طعنہ تو تم اس وقت دے سکتے تھے جب میرے ہاتھ میں کوئی شعاعی پستول ہوتا۔ کوئی اور الیکٹرونک ہتھیار ہوتا میں اس کا ٹریگر ایک ہی بار دباتا اور تم لوگ بھسم ہو جاتے۔ لیکن میں نے ایسی کوئی کوشش نہیں کی۔ میں تو خود تم سے جنگ کر کے لطف اٹھانا چاہتا ہوں ۔ میں نے سلاٹر، رے راٹا اور اناٹیو سے تم لوگوں کی جنگ کے مناظر دیکھے تھے اور اس وقت میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی تھی کہ میں بھی تم لوگوں سے مقابلہ کروں ۔ سو یہ موقع بھی آ ہی گیا۔ اگرچہ میں نے کوشش یہ کی تھی کہ تم لوگ کچھ جانے بوجھے بغیر جہاز میں سوار ہو جاؤ۔"

"اور موت کا لقمہ بن جائیں ۔ کیوں ۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"اوہ ۔ تو تم یہ بات بھی بھانپ چکے ہو۔" اس کے لہجے میں حیرت در آئی۔

"ہاں ۔ لی کاف ہونے کی صورت میں بھلا تم یہ کس طرح پسند کر سکتے تھے کہ ہم اس راز سے آگاہ بھی ہوں اور بچ کر نکل بھی جائیں۔ لہذا تم نے ضرور اس جہاز میں کوئی بم پہلے ہی رکھ دیا تھا، ہم اس میں بیٹھ کر پرواز کر جاتے اور فضا میں جہاز پھٹ جاتا۔ ہمارے پرخچے اڑ جاتے۔ کیوں۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا۔"

"ہاں ۔ تم لوگ واقعی ذہین ہو ۔ لیکن خیر ۔ اب پروگرام ذرا تبدیل ہو گیا ہے اور پُر لطف بھی۔ لیکن انجام وہی ہو گا۔ تم موت کے گھاٹ پہلے بھی اترتے ۔ اب بھی اترو گے، اب میرے ہاتھوں اترو گے۔"

ان الفاظ کے ساتھ ہی وہ آگے بڑھا۔ جگہ بہت کھلی تھی اور وہ آزادانہ آگے پیچھے۔ دائیں بائیں اور اوپر نیچے ہو سکتے تھے، لہذا بوکھلا کر پیچھے ہٹے ۔ ان سب کے مقابلے میں صرف ایک آدمی تھا، لیکن اس کے باوجود وہ سب کے سب خطرے کی زد میں تھے ۔

"چاروں طرف پھیل جاؤ۔ ایک جگہ جمع ہرگز نہ رہو۔" انسپکٹر جمشید چیخ اٹھے۔ اور وہ سب دور دور تک دوڑتے چلے گئے ۔ یوں بھاگ رہے تھے، جیسے شیر کے آگے گیدڑ۔ یہاں تک کہ عمارت کی دیواروں سے جا لگے ۔

اب لی کاف درمیان میں رہ گیا۔ اس نے چاروں طرف طنز بھری نظریں ڈالیں اور چہک کر بولا :

"انسپکٹر جمشید ۔ یہ کیا۔"

"اسے حفاظتی اقدام کہتے ہیں ۔ یہ نہیں کہ ہم بھاگ لیے ہیں۔"

"تم لوگ بھاگ بھی کس طرح سکتے ہو۔ بھاگنے کے لیے تمہارے پاس ذریعہ ہی کیا ہے ۔ صرف ہوائی جہاز، لیکن ان تک پہنچنے سے پہلے میں تم لوگوں کو ٹھکانے لگا دوں گا۔"

"بے فکر رہو مسٹر لی کاف ۔ ہم تم سے مقابلہ کریں گے ۔ بھاگنے کی کوشش ہرگز نہیں کریں گے۔ لو میں تمہارے مقابل آتا ہوں ۔ اگر تم نے مجھے شکست دے دی تو انسپکٹر کامران مرزا تمہارے مقابلے پر آئیں گے اور اگر خدا نخواستہ یہ بھی شکست کھا گئے تو تمہیں میرے دوست اور بچوں کی فوج سے مقابلہ کرنا ہو گا ۔ اور وہ وقت تمہارے لیے سخت آزمائش کا وقت ہو گا۔" انسپکٹر جمشید کہتے چلے گئے۔

"سخت آزمائش کا وقت ۔ کیا مطلب ؟"

"مطلب یہ کہ یہ فوج تمہیں تگنی کا ناچ نچا دے گی۔"

"ہو سکتا ہے، میں انہیں ناچنے پر مجبور کر دوں۔" لی کاف بولا۔

"دیکھا جائے گا۔ ان سب تک پہنچنے سے پہلے تمہیں مجھ سے دو دو ہاتھ کرنا ہوں گے۔"

"انسپکٹر جمشید۔ کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ اس سے پہلے میں مقابلہ کروں۔" انسپکٹر کامران مرزا بول پڑے۔

"کیا آپ یہ سوچ رہے ہیں کہ میں اس کے مقابلے میں کمزور پڑ جاؤں گا۔" وہ مسکرائے۔

"یہ بات نہیں۔ میں تو بس یہ چاہتا ہوں کہ آپ ہر خطرے سے محفوظ رہیں۔" انہوں نے کہا۔

"تو کیوں نا۔ ہم تینوں مل کر اس کا مقابلہ کریں۔" خان رحمان بولے۔

"میری طرف سے تو اجازت ہے۔ تم سب مل کر مجھ پر حملہ کر سکتے ہو۔" لی کاف ہنسا۔

"خان رحمان۔ اور باقی سب۔ غور سے میری بات سن لیں۔ لی کاف سے مقابلہ۔ کوئی عام قسم کا۔ یا خاص قسم کا مقابلہ نہیں ہے۔ ہمیں تو صرف ان کے ہاتھوں اور پیروں سے خود کو بچانا ہوگا۔ بلکہ اس کے جسم کا کوئی حصہ بھی ہمارے جسم کو چھو گیا تو ہم زہر وصول کر لیں گے اور ہم بچ نہیں سکیں گے۔ لہٰذا پوری کوشش یہ کرنا ہوگی۔ کہ یہ ہم سے ایک کو بھی چھونے نہ پائے۔"

"ارے باپ رے۔" شوکی کی لرزتی آواز ابھری۔

"لہٰذا بہتر یہی ہے کہ سب لوگ دور رہیں اور صرف مجھے اس سے مقابلہ کر لینے دیں۔"

"لیکن میں یہ بہتر سمجھتا ہوں کہ میں اور خان رحمان آپ کی مدد کریں۔"

"چلیے خیر۔ ضرورت پڑنے پر آپ دخل اندازی کر سکتے ہیں۔"

"کیا ہم اپنے جوتے کے ذریعے بھی اسے ضرب نہیں لگا سکتے۔" خان رحمان بولے۔

"نہیں۔ یہ بھی خطرناک ہوگا۔ اس سے جیتنے کا بس ایک ہی طریقہ ہے۔ اور وہ یہ کہ ہم اسے تھکا ماریں۔"

"ہاں۔ ٹھیک ہے۔ لیکن اس سے پہلے کہ میں تھک جاؤں، تم لوگوں کو پانی بنا دوں گا۔" وہ غرایا۔

اس کی غراہٹ نے ان کے جسموں میں تھرتھری دوڑا دی۔ شاید اس سے زیادہ خطرناک مقابلہ انہوں نے کبھی نہیں کیا تھا۔ انسپکٹر جمشید اب اس کی طرف ایک ایک قدم بڑھ رہے تھے۔ انسپکٹر کامران مرزا اور خان رحمان بھی کچھ آگے بڑھ آئے تھے۔ تینوں مخالف سمت میں تھے۔ یعنی انہوں نے لی کاف کو تین طرف سے گھیر لیا تھا۔ اچانک لی کاف نے انسپکٹر جمشید پر چھلانگ لگا دی۔ وہ پوری طرح تیار تھے۔ فوراً جھکائی دے گئے اور لی کاف آگے نکلتا چلا گیا۔ پھر فوراً رکا اور پلٹا تو انسپکٹر کامران مرزا اس کے سامنے تھے۔ اس نے ان پر چھلانگ لگائی۔ انسپکٹر کامران مرزا بھی اچھلے اور بائیں سمت میں جا رکے۔ لی کاف کا یہ وار بھی خالی گیا تھا۔

اب وہ مڑا تو خان رحمان اس کے سامنے تھے۔ وہ ان کی طرف ایک ایک قدم بڑھنے لگا۔ آنکھیں سانپ کی آنکھوں سے بھی زیادہ چمکدار نظر آ رہی تھیں۔ خان رحمان کو خوف محسوس ہونے لگا، تاہم انہوں نے ہمت نہ ہاری اور خود بھی پیچھے ہٹنے لگے۔ ادھر انسپکٹر جمشید اور انسپکٹر کامران مرزا، لی کاف کی طرف بڑھ رہے تھے، لیکن پروگرام کے مطابق پیچھے سے حملہ نہیں کر سکتے تھے۔ اچانک وہ خان رحمان پر جھپٹا۔ وہ بوکھلا کر پیچھے ہٹے اور دیوار کے نزدیک پہنچ گئے۔ اس جگہ دیوار سے آصف لگا ہوا تھا۔ وہ ان کا رخ دیوار کی طرف دیکھ کر پہلے ہی کھسک چکا تھا اور دور ہٹتا ہوا آفتاب سے جا لگا تھا۔

"یار آصف۔ یہ۔ یہ کک۔ کیسا مقابلہ ہے۔" آفتاب نمبر ایک نے ہکلا کر کہا۔

"تت۔ تم تو۔ بالکل شوکی کی طرح کانپ رہے ہو۔"

"تب۔ تب پھر مجھے کس کی طرح کانپنا چاہیے؟" اس نے کانپ کر پوچھا۔

"چپ رہو۔ اور مقابلہ دیکھو۔" آصف نے برا سا منہ بنایا۔

ان کی نظریں لی کاف پر جمی تھیں۔ اچانک خان رحمان دیوار سے جا لگے۔ ساتھ ہی مارے خوف کے ان کے بدن میں تھرتھری دوڑ گئی۔ باقی لوگ بھی خوف زدہ ہو گئے۔ لی کاف ان کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ انسپکٹر کامران مرزا اور انسپکٹر جمشید اگرچہ لی کاف کی کمر کی طرف تھے، لیکن خان رحمان کی مدد کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے، کیونکہ لی کاف کو ان سے کوئی خطرہ نہیں تھا، لہٰذا وہ ان کی طرف کیوں مڑتا؛ تاہم انسپکٹر جمشید نے ایسے میں نفسیاتی حملہ کیا:

"خان رحمان۔ گھبرانا نہیں۔ ہم اس کے سر پر پہنچ چکے ہیں۔"

انسپکٹر جمشید نے سوچا تھا۔ لی کاف ان کا جملہ سن کر پلٹ پڑے گا، لیکن ایسا نہیں ہوا۔ ان کا نفسیاتی حملہ ناکام گیا، ایسے میں لی کاف کا نوکیلا مکا خان رحمان کے سر کی طرف لپکتا نظر آیا۔ خان رحمان بجلی کی سی تیزی سے نیچے بیٹھ گئے اور لی کاف کی پھیلی ہوئی ٹانگوں کے درمیان سے نکل گئے۔ انہوں نے انتہائی خطرناک کوشش کی تھی۔

"بہت خوب، خان رحمان۔ تم نے کمال کر دیا۔ اب دور چلے جاؤ۔" انسپکٹر جمشید چہک کر بولے۔

لی کاف خونخوار انداز میں ان کی طرف مڑا اور رکے بغیر ان کی طرف دوڑ پڑا۔ انسپکٹر جمشید پہلے تو پرسکون انداز میں کھڑے رہے، لیکن جونہی وہ ان کے نزدیک ہوا۔ اپنا رخ تبدیل کرتے ہوئے دوڑ پڑے۔ لی کاف نے ایک جھٹکا کھایا اور ان کے پیچھے دوڑا۔ انسپکٹر جمشید یہ سوچ کر دوڑ رہے تھے کہ وہ صرف اسی طرح لی کاف کو تھکا سکتے ہیں۔ دوڑتے ہوئے وہ دیوار تک پہنچ

گئے۔ لی کاف بدستور ان کے پیچھے تھا۔ دیوار سے اس جگہ فاروق چپکا ہوا تھا۔ اپنے والد کو اس طرف آتے دیکھ کر دیوار سے لگا لگا ایک طرف ہٹنے لگا:

"ابا جان۔ کیا میں آپ کی کوئی مدد کر سکتا ہوں۔"

"اپنا بچاؤ کرو۔ یہی میری مدد ہوگی۔ اگر تم میں سے کسی کے جسم پر لی کاف نے ایک خراش بھی ڈال دی تو میں پُرسکون رہ کر نہیں سکوں گا۔"

"بہت بہتر۔ میں پیچھے ہٹ جاتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ بلا کی رفتار سے ہٹنے لگا۔ یہاں تک کہ اندھا دھند محمود سے جا ٹکرایا۔

"دھت تیرے کی۔ دیکھ کر پیچھے نہیں ہٹ سکتے۔" محمود نے جھنا کر ران پر ہاتھ مارا۔

"دیکھ تو رہا ہوں۔ لی کاف کو۔" وہ بولا۔

"بھگوڑے کہیں کے۔ تم نے تو شوکی برادرز کو بھی مات کر دیا۔"

"شوکی برادرز کو۔ اگر اتنے ہی بہادر ہو تو آگے بڑھ کر لی کاف کے راستے میں آ جاؤ نا۔" فاروق نے کاٹ کھانے والے لہجے میں کہا۔

"یہ وقت آپس میں لڑنے کا نہیں۔ اور نہ بے چارے شوکی برادرز کو طعنے دینے کا۔ اس وقت تو ہم سب کونوں کھدروں میں دبکے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔ ان کا تو قصور کیا۔" فرزانہ ان کی طرف کھسک آئی۔ اسی وقت انہوں نے لی کاف کو انسپکٹر جمشید پر چھلانگ لگاتے دیکھا۔ اس کی یہ چھلانگ بہت خطرناک تھی۔ انہیں یوں لگا۔ جیسے وہ ان پر جا گرا ہو، لیکن دراصل وہ منہ کے بل فرش پر گرا تھا۔ انسپکٹر جمشید تو فرش پر گرنے کے فوراً بعد لوٹ لگا گئے تھے۔ لی کاف اٹھا اور انسپکٹر کامران مرزا کی طرف دوڑ پڑا۔ انہوں نے بھی فوراً دوڑ لگا دی۔ اور دیوار تک پہنچ گئے۔ اس جگہ دیوار سے آفتاب نمبر دو لگا ہوا تھا۔ وہ بوکھلا اٹھا:

"ارے باپ رے۔ انکل۔ آپ تو ادھر آ گئے۔ کم از کم آپ کو ادھر تو نہیں آنا چاہیے تھا۔" یہ کہہ کر وہ دور کھسکتا چلا گیا۔ اور اشفاق سے جا لگا۔

"یہ۔ یہ کیا ہو رہا ہے۔ مکمن۔" اشفاق ہکلایا۔

"م۔ مقابلہ۔ ایک خونی مقابلہ۔ بلکہ زہریلا مقابلہ۔ بھائی جان، آپ نے۔ ارے۔ م۔ مگر۔ بھائی جان کہاں ہیں؟" آفتاب ہکلایا۔

اسی وقت لی کاف نے انسپکٹر کامران مرزا پر وحشیانہ انداز میں چھلانگ لگا دی۔ وہ دیوار سے لگے ہوئے تھے۔ بلا کی رفتار سے ایک طرف ہو گئے۔ لی کاف بڑی رفتار سے دیوار کے ساتھ ٹکرایا۔ اور دوسری طرف الٹ گیا۔ اس نے اس مرتبہ شاید چوٹ کھائی تھی۔ چند سیکنڈ تک تو وہ اٹھ نہ سکا۔ ان کے چہروں پر رونق دوڑ گئی، لیکن پھر یہ دیکھ کر وہ سکتے میں آ گئے کہ لی کاف اٹھ رہا تھا۔ اس وقت تک انسپکٹر کامران مرزا اس سے کافی فاصلے پر پہنچ چکے تھے اور ایک بار پھر انسپکٹر جمشید اس کے مقابل تھے۔ ایسے میں آفتاب نمبر دو کی آواز ان میں سے چند ایک کے کانوں سے ٹکرائی:

"بھائی جان شوکی۔ آپ کہاں ہیں۔"

لیکن اس کے جملے کی طرف یا شوکی کی طرف توجہ دینے کی کسے فرصت تھی۔ لی کاف انسپکٹر جمشید پر جھپٹ جھپٹ کر حملے کر رہا تھا اور وہ جھکائی پر جھکائی دے کر خود کو اس سے بچا رہے تھے۔ لی کاف پر گویا اب دیوانگی سی طاری ہو گئی تھی۔ جھکائیاں دینے کے چکر میں ایک بار اچانک انسپکٹر جمشید دیوار سے جا ٹکرائے۔ ادھر لی کاف نے ان پر چھلانگ لگا دی۔ وہ دھپ سے زمین پر گرے اور لوٹ لگا گئے۔ لی کاف پوری رفتار سے دیوار سے ٹکرایا۔ اس کے منہ سے چیخ نکل گئی، لیکن یہ دیکھ کر اس کی حیرت بڑھی کہ انسپکٹر جمشید صرف ایک فٹ دور دیوار سے لگے ہوئے تھے۔ اس مرتبہ انہوں نے دور بھاگنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ یہ دیکھ کر لی کاف کی باچھیں کھل گئیں۔ وہ بلا کی رفتار سے مڑا اور سامنے کی طرف سے ان پر حملہ آور ہوا۔ وہ پہلے ہی اسی انتظار میں تھے۔ یک دم اچھلے اور لی کاف کے سر کے اوپر سے ہوتے ہوئے دوسری طرف جا گرے۔ لی کاف پھر دیوار سے ٹکرایا۔ اس مرتبہ انہوں نے اس کی پیشانی سے سیاہ رنگ کا خون چھلکتے دیکھا، سیاہ خون نے انہیں اور بھی خوف زدہ کر دیا۔

ایسے میں انسپکٹر جمشید کو اپنے پیچھے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ وہ گھبرا کر مڑے اور یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ وہاں شوکی کھڑا تھا۔

"شوکی۔ تم یہاں کیوں آئے۔ بھاگ جاؤ۔ یہاں بہت خطرہ ہے۔"

"یہ۔ یہ۔ یہ آپ کو یہ دینے آیا ہوں۔" شوکی نے تھر تھر کانپتی آواز میں کہا۔

"کیا دینے آئے ہو؟" انہوں نے حیران ہو کر کہا۔

"جی۔ یہ اینٹ۔ پتھر کی بنی ایک اینٹ۔ یہ۔ یہ میں نے جہاز کے پہیوں کے ساتھ لگی دیکھی تھی۔ بس یہی اٹھانے اس طرف چلا گیا۔"

"وہ مارا۔ شوکی۔ تمہارا جواب نہیں۔" انسپکٹر جمشید خوشی سے بھرپور لہجے میں چلائے۔

"م۔ میں نے۔ میں نے تو کچھ بھی نہیں۔ م۔ مارا جناب انکل۔" وہ بوکھلا کر بولا۔

"جناب انکل۔" انسپکٹر جمشید بے خیالی میں بولے۔ ان کی نظریں دراصل لی کاف پر جمی تھیں۔ نظریں اس طرف رکھتے ہوئے انہوں نے اینٹ شوکی کے ہاتھ سے لے لی اور بولے:

"پیچھے ہٹ جاؤ شوکی۔ دیوار سے جا لگو۔ تم اپنا کام کر چکے۔"

شوکی نے ان کی ہدایت پر عمل کیا۔ وہ دراصل اینٹ کو اپنی قمیص کے نیچے چھپا کر لایا تھا، اس لیے کوئی دیکھ نہیں سکا تھا۔ یوں بھی سب تو لی کاف کی طرف متوجہ تھے۔ آفتاب وغیرہ کو شوکی کی غیر حاضری کا خیال آیا بھی تھا تو صرف ایک لمحے کے لیے۔ پھر وہ بھی لڑائی میں گم ہو گیا تھا۔ اور اب انسپکٹر جمشید ہاتھ میں اینٹ لیے کھڑے تھے۔ ان کا ہاتھ کمر کے پیچھے تھا۔ جونہی لی کاف ان کی زد پر آیا... انہوں نے اینٹ اس پر دے ماری۔ لی کاف کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ انسپکٹر جمشید کے ہاتھ میں کوئی اینٹ بھی ہو سکتی ہے۔ شوکی نے عقل مندی یہ کی تھی کہ ان کی کمر کی طرف اس طرح بڑھا تھا کہ لی کاف اسے نہ دیکھ سکا۔ چنانچہ اینٹ اس کے سینے پر لگی۔ وہ لڑکھڑا گیا۔ سینے سے ٹکرا کر اینٹ اس کے پیروں کے پاس گری۔ چند سیکنڈ تک لڑکھڑانے کے بعد وہ گر ہی گیا۔ موقع اچھا تھا اور انسپکٹر کامران مرزا اس وقت زیادہ دور نہیں تھے۔ لہٰذا انہوں نے اینٹ کی طرف دوڑ لگا دی۔ اور اسے اٹھاتے ہوئے دور نکل گئے۔ کافی دور جا کر رکے اور لی کاف کی طرف مڑے۔ لی کاف اٹھنے کی کوشش کرتا نظر آیا۔

"ابا جان۔ یہی موقع ہے۔ دے ماریے ایک اور اینٹ اس کے سر پر۔" آفتاب چلّا اٹھا۔

انسپکٹر کامران مرزا آگے بڑھے ہی تھے کہ لی کاف اٹھ کھڑا ہوا۔ اور خونخوار انداز میں انسپکٹر جمشید کی طرف بڑھا، لیکن اب وہ مشکل میں گھر چکا تھا۔ کیونکہ انسپکٹر کامران مرزا پیچھے سے اس پر حملہ کر سکتے تھے۔ اور یہ احساس اسے اس وقت ہوا جب وہ اس کے عین پیچھے پہنچ چکے تھے۔ وہ چونک کر مڑا۔ ساتھ ہی اس کے سر سے اینٹ ٹکرائی۔ وہ سر کو دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر بیٹھتا چلا گیا۔ اتنے میں خان رحمان اینٹ اٹھا چکے تھے۔ اس کے سر پر مارنے کے لیے انہوں نے ہاتھ بلند کیا ہی تھا کہ انسپکٹر جمشید چلّا اٹھے:

"نہیں خان رحمان۔ ہم اسے زندہ حالت میں اپنے ملک لے جائیں گے۔"

خان رحمان کا ہاتھ رک گیا۔ وہ سب لی کاف کی طرف بڑھنے لگے۔ خان رحمان اینٹ لیے اس کے سر پر موجود تھے۔ تاکہ جونہی اس کے جسم میں حرکت ہو، وہ ایک ہلکا سا وار کر دیں۔ لیکن اس کا بغور جائزہ لینے پر انہوں نے جان لیا کہ وہ مکمل طور پر بے ہوش ہو چکا تھا۔ اس کے سر سے سیاہ خون رس رہا تھا اور فرش پر پھیل رہا تھا۔ پھر انہوں نے اس خون سے دھواں سا اٹھتے دیکھا۔ سیاہ رنگ کا دھواں۔ وہ خوف زدہ ہو کر پیچھے ہٹ گئے۔

"اس کے خون سے بھی خود کو بچاؤ اور دھوئیں سے بھی۔"
انسپکٹر جمشید بولے۔

وہ سب پیچھے ہٹنے لگے۔ بس خان رحمان اینٹ لیے نزدیک کھڑے رہ گئے۔

"اس فتح میں شوکی کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"لل۔ لیکن انکل۔ میرا ہاتھ تو اتنا ہی ہے جتنا پہلے تھا۔" اس نے بوکھلا کر کہا اور وہ مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔

"لو بھئی۔ اس طرح تو سہرا شوکی لے گیا۔" فاروق بول اٹھا۔

"سہرا۔ نہیں تو۔ میں نے تو کوئی سہرا نہیں لیا۔ یہ مجھ پر سراسر الزام ہے۔" شوکی نے بوکھلاتے ہوئے انداز میں کہا۔

"اب کیا کیا جائے۔"

"ہم ان مشینی دماغوں کو تباہ کیے بغیر یہاں سے نہیں جا سکتے سوال یہ ہے کہ انہیں تباہ کس طرح کیا جائے؟"

"اس بم کے ذریعے جو جہاز کو اڑانے والا ہے۔" فرزانہ نے فوراً کہا۔

"ارے واہ۔ بہت اچھی ترکیب ہے۔ میں ابھی جہاز میں سے بم نکال کر لے آتا ہوں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"لیکن اس میں بہت خطرہ ہے۔ نہ جانے بم کب پھٹ جائے۔"

"یہ خطرہ مول لینا ہی ہوگا۔ ورنہ ہم ان دماغوں کو تباہ نہیں کر سکیں گے۔"

"ہم اپنے ملک پہنچ کر بھی تو ان کی تباہی کا سامان کر سکتے ہیں۔" خان رحمان نے پریشان ہو کر کہا۔

"نہیں۔ ہم اپنا کام مکمل کر کے ہی جائیں گے۔" یہ کہتے ہی انسپکٹر جمشید نے جہازوں کی طرف دوڑ لگا دی۔ وہ سب پریشان ہو گئے۔ پندرہ منٹ بعد وہ لوٹے تو بم ان کے ہاتھ میں تھا۔

"میں نے اس کا وقت بدل دیا ہے۔ اب یہ اس وقت سے پہلے نہیں پھٹ سکے گا۔ کیا خیال ہے۔ اسے سردار دماغ کے ساتھ کیوں نہ رکھ دیا جائے۔ اس طرح سب دماغ تباہ ہو جائیں گے۔"

"بہت اچھی ترکیب ہے۔"

وہ سیدھے گئے اور سردار دماغ والے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئے۔ بم مناسب جگہ رکھ کر باہر نکلے۔ دروازہ بند ہو گیا۔

"اب ہمیں دیر نہیں کرنی چاہیے۔" خان رحمان بولے۔

"لل۔ لیکن۔ ہم لی کاف کا کیا کریں۔ ہم اس کے جسم کو ہاتھ تو لگا نہیں سکتے۔"

"ہاں ٹھیک ہے۔ جہاز میں پیرا شوٹ موجود ہے۔ ہم اسے پیرا شوٹ میں لپیٹ سکتے ہیں۔"

"لیکن ہوش میں آنے پر یہ خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔"

"ہم اسے جہاز کی لیٹرین میں بند کر دیں گے۔ پیرا شوٹ کی

رسیوں سے اسے جکڑ بھی دیں گے۔اس صورت میں بھلا یہ کس طرح خطرناک ثابت ہوگا اور لیٹرین کے دروازے کو نظر میں رکھیں گے۔خان رحمان اینٹ لیے تیار رہیں گے۔"

"بہت خوب۔بالکل ٹھیک۔"

ایسا ہی کیا گیا۔پیراشوٹ کی رسیوں سے اسے اس طرح باندھا گیا کہ جسم کو ہاتھ نہ لگانا پڑا۔اور پھر پیراشوٹ کو پکڑ کر اسے جہاز کی طرف لے چلے۔یہاں تک کہ لیٹرین میں بند کر دیا گیا۔اب وہ سب جہاز کی سیٹوں پر بیٹھ گئے۔انسپکٹر جمشید نے پائلٹ سیٹ سنبھالی۔

"تو لی کاف کا ملک سلاٹر، رے راٹا اور التانیو کے ملکوں کا بھی دوست نہیں ہے۔"

"نہیں۔اگر یہ آپس میں دوست ملکوں سے تعلق رکھتے تو لی کاف انہیں ہمارے ہاتھوں موت کے گھاٹ اترتے کبھی نہ دیکھ سکتا۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"اس بار کی مہم ہر لحاظ سے انوکھی تھی۔پہلی انوکھی بات تو یہ کہ اس میں ہمارے ساتھ شوکی برادرز بھی شریک ہوئے۔دوسری یہ کہ سلاٹر، رے راٹا اور التانیو دوسری دنیا کو سدھار گئے اور اب وہ ہمارے مقابلے میں کبھی نہیں آسکیں گے۔تیسری یہ کہ لی کاف سے مقابلہ انتہائی خطرناک تھا۔ایسا مقابلہ ہم نے اپنی زندگیوں میں کبھی نہیں دیکھا ہوگا اور نہ شاید دیکھیں۔کیونکہ لی کاف اب ہمارے قبضے میں ہے۔" فاروق کہتا چلا جارہا تھا۔اسے بہت دیر بعد زبان چلانے کا موقع ملا تھا۔

"خاص باتیں تو اور بھی کئی ہیں۔جو تم شاید گول کر گئے۔" آفتاب نمبر ایک نے جل بھن کر کہا۔

"کیوں۔مجھے گول کرنے کی کیا ضرورت۔گول کرنا تو بس تم پر ختم ہے۔" فاروق بھنا اٹھا۔

"بھئی جہاز چھوٹا سا ہے۔خیال رہے۔" محمود نے گھبرا کر کہا۔

"کک۔کیا مطلب۔" آفتاب نمبر دو نے ہکلا کر کہا۔

"کہیں ان کے لڑنے بھڑنے سے جہاز نیچے نہ جا پڑے۔" محمود مسکرایا۔

"ارے باپ رے۔تب۔تب تو انہیں روکیے۔خدا کے لیے۔لڑیے مت۔" آفتاب نمبر دو نے تھر تھر کانپتی آواز میں کہا۔

"آفتاب تم یونہی ڈر رہے ہو۔کہیں جہاز اس طرح بھی گرا کرتے ہیں۔" آفتاب نمبر ایک ہنسا۔

"تت۔تو پھر کس طرح گرا کرتے ہیں؟"

"اب مجھے کیا معلوم۔کس طرح گرا کرتے ہیں۔میں کوئی ہوائی جہازوں کا سپیشلسٹ ہوں۔"

"دو۔دیکھیے۔آپ لوگ جہاز کے گرنے کی باتیں نہ کریں۔مجھے ڈر لگ رہا ہے۔" اشفاق کی آواز سنائی دی۔

"حد ہو گئی۔ایسی بھی کیا ڈرپوکی۔" آصف جھنا کر بولا۔

"تو پھر کیسی ڈرپوکی ہونی چاہیے۔" اخلاق نے منہ بنایا۔

"ڈرپوکی کی اقسام پر کوئی کتاب پڑھوں گا، پھر جواب دوں گا۔" آصف نے تلملا کر کہا۔

"لیکن اس وقت تک تو جہاز اتر چکا ہوگا۔" اخلاق بولا۔

"لیجیے۔شروع ہو گئے یہ تو۔اور بے چارے شوکی برادرز کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔" فرزانہ نے جلے کٹے لہجے میں کہا۔

"اب اور کیا کریں، کرنے کے لیے کام ہی کیا رہ گیا ہے۔وہ بھی جہاز میں۔" فرحت نے جواب دیا۔

"تم بھی ان کا ساتھ دے رہی ہو فرحت۔"

"ہاں، فرحت بہن۔تمہیں تو چاہیے۔بس فرزانہ بہن کا ساتھ دو۔" شوکی کی آواز سنائی دی۔

"لیجیے۔ہوائی مینڈکی کو بھی زکام۔شوکی صاحب بھی بولے۔" فرزانہ نے منہ بنایا۔

"بی مینڈکی نہیں۔مسٹر مینڈک کہو۔" محمود بولا۔

"کک۔کک کیا آپ لوگ ہمارا مذاق اڑا رہے ہیں۔" شوکی نے برا مان کر کہا۔

"نہیں تو۔بھلا جہاز میں بھی کسی کا مذاق اڑایا جا سکتا ہے۔" فاروق بولا۔

"ہاں، یہ بھی ٹھیک ہے۔تب تو آپ لوگوں کا شکریہ۔" شوکی نے فوراً کہا۔

"شوکی بھائی۔تم سے یہ ملاقات یاد رہے گی۔" فرحت بولی۔

"اچھا۔پھر تو ہمیں بھی اسے یاد رکھنا پڑے گا۔" آفتاب نمبر دو بول اٹھا۔

"بھئی کسی کاپی میں جا کر لکھ لینا اور یاد کرتے رہنا۔" فاروق بول اٹھا۔سب کو ہنسی آگئی۔اسی وقت انہوں نے اپنے پیچھے شعلے بلند ہوتے دیکھے۔بم پھٹ گیا تھا۔انہوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ان کا جہاز برابر اوپر اٹھ رہا تھا۔اور پھر شعلے نظروں سے اوجھل ہو گئے۔وہ بادلوں میں تیرنے لگے۔لمحہ بہ لمحہ وہ اپنے ملک کی سرزمین سے نزدیک ہوتے جا رہے تھے۔

○☆○

Pakistanipoint Waqar Azeem